آج

۷۰

علاء الاسوانی

خالد طور

ارشد محمود

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 70

جون 2011

سالانہ خریداری:
پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 700 روپے (بشمول ڈاک خرچ)
بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 70 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)
بینک: میزان بینک، صدر برانچ، کراچی
اکاؤنٹ: City Press Bookshop
اکاؤنٹ نمبر: 0100513669

رابطہ:
پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 35650623 35213916
ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:
Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ساجد رشید
کی یاد میں

Scanned with CamScanner

شمس الرحمٰن فاروقی کی کتابیں

لغاتِ روزمرہ

(اردو میں زبان کے غیر معیاری

استعمالات کی فہرست)

قیمت:250روپے

سوار اور دوسرے افسانے

(ہندوستانی ایڈیشن)

قیمت:350روپے

ساحری، شاہی، صاحب قرانی

(داستانِ امیر حمزہ کا مطالعہ

جلد اوّل تا سوم

قیمت:1110روپے

آسماں محراب

(شاعری)

۱۹۷۶ سے ۱۹۹۶ تک کے کلام کا انتخاب

قیمت:315روپے

کئی چاند تھے سرِ آسماں

(ناول)

قیمت:600روپے

تنقیدی افکار

(ہندوستانی ایڈیشن)

قیمت:250روپے

افسانے کی حمایت میں

(نظر ثانی اور اضافہ شدہ اشاعت)

قیمت:240روپے

The Colour of Black Flowers

(Selected Poems)

قیمت:250روپے

Scanned with CamScanner

ترتیب

علاء الاسوانی
7
عمارتِ یعقوبیان
(ناول)

❁

خالد طور
255
حصار شکن
317
ایراوتی

❁

ارشد محمود
327
دوسرا رخ
(منتخب کالم)

Scanned with CamScanner

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور
(کہانیاں)
قیمت :80روپے

انیس
(سوانح)
قیمت:375روپے

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
قیمت:280روپے

معرکۂ انیس و دبیر
(تنقید و تحقیق)
قیمت:150روپے

افسانے کی تلاش
(تنقیدی مضامین)
قیمت:240روپے

ایرانی کہانیاں
(ترجمے)
قیمت :90روپے

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
قیمت:150روپے

کافکا کے افسانے
(افسانے)
قیمت:70روپے

گنجفہ
(کہانیاں)
قیمت:200روپے

ادبستان
(نثری ادب)
قیمت:140روپے

Scanned with CamScanner

علاء الاسوانی

عمارتِ یعقوبیان

(ناول)

عربی سے ترجمہ:

محمد عمر میمن

Scanned with CamScanner

مصری ادیب علاء الاسوانی کے ناولا الذی اقترب ورأی (جو قریب آیا اور جس نے دیکھا) کا ترجمہ آج کے شمارہ 67 میں شامل تھا۔ اس بار محمد عمر میمن ہی کا کیا ہوا الاسوانی کے مشہور ناول عمارتِ یعقوبیان کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ یہ ترجمہ زیادہ تر عربی اصل کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے لیکن اس کے دوران کتاب کے انگریزی ترجمے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو ہمفرے ڈیویز (Humphrey Davies) نے کیا اور جو 2005 میں قاہرہ کی امریکی یونیورسٹی کے اشاعت گھر سے شائع ہوا۔ ناول میں درج کی جانے والی قرآنی آیات کے اردو روپ کے لیے عبدالماجد دریابادی کا ترجمہ استعمال کیا گیا ہے۔

الاسوانی کا زیرِ نظر ناول بعد از نوآبادیاتی دور میں مصری معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کو بڑی باریک بینی سے پیش کرتا ہے۔ اگرچہ یہ ترجمہ مصر میں اس برس پیش آنے والی سیاسی ہلچل سے بہت پہلے کیا گیا تھا لیکن اس سے اس ہلچل کے سماجی پس منظر کو سمجھنے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔ پاکستانی پڑھنے والوں کے لیے اس ناول کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی معنویت رکھتا ہے کہ تبدیلیوں کا یہی سلسلہ، ملتے جلتے عوامل کے زیرِ اثر، ہمارے معاشرے میں بھی چل رہا ہے، اگرچہ اسے ہمارے تخلیقی ادیبوں کی کچھ خاص توجہ عموماً حاصل نہیں ہوتی۔

1957 میں پیدا ہونے والے الاسوانی پیشے کے اعتبار سے دنداں ساز ہیں اور انھوں نے اس ہنر کی تربیت قاہرہ کے علاوہ امریکی شہر شکاگو میں بھی حاصل کی جہاں وہ سترہ برس مقیم رہے اور جو ان کے تازہ ترین ناول کا عنوان بھی ہے۔ عمارتِ یعقوبیان کو اسی عنوان سے 2006 میں ایک فلم اور 2007 میں ایک ٹی وی سیریز کی صورت میں بھی پیش کیا گیا ہے۔

1

گزرگاہِ بہلر سے، جہاں زکی بک الدسوقی رہتا ہے، عمارتِ یعقوبیان میں واقع اس کے دفتر تک کا درمیانی فاصلہ سو میٹر سے زیادہ نہیں، لیکن اسے طے کرنے میں اسے ہر صبح گھنٹہ بھر لگ جاتا ہے، کیونکہ راستے میں اسے اپنے دوستوں سے علیک سلیک کرنی پڑتی ہے: کپڑوں اور جوتوں کی دکانوں کے مالک، ان کے یہاں کام کرنے والے مرد عورتیں، ویٹر، سینما کے کارندے، برازیلی کافی کی دکانوں کے مستقل گاہک، حتیٰ کہ دربان بھی، جوتے چمکانے والے، فقیر اور ٹریفک کے سپاہی، زکی بک جن کے ناموں تک سے واقف ہے اور ان سے سلام علیک اور خبروں کا تبادلہ کرتا ہے۔ زکی بک شارعِ سلیمان باشا کے قدیم ترین ساکنوں میں سے ہے۔ فرانس میں اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر وہ یہاں انیس سو چالیس کی دہائی کے آخر میں آیا تھا، اور پھر کبھی یہاں سے جدا نہیں ہوا۔ گرمی سردی تھری پیس سوٹ ڈانٹے، جو اپنے پھیلاؤ میں اس کے مختصر سے چمرخ بدن کو خوب ڈھانپے رہتا ہے، بڑی نفاست سے استری کیا ہوا رومال، ہمیشہ اس کی ٹائی کے رنگ کا، کوٹ کی سینے والی جیب سے لٹکائے، اس کا مشہورِ زمانہ سگار، جو خوشحالی کے دنوں میں کیوبا کا بڑا اعلیٰ سگار ہوا کرتا تھا لیکن اب جس کی جگہ بدبودار، سختی سے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے گھٹیا سے مقامی سگار نے لے لی ہے، سال خوردہ، جھرّیوں سے اَٹا ہوا چہرہ، موٹے موٹے عدسوں والی عینک، چمکتے ہوئے نقلی دانت، اور کالے رنگے ہوئے بال، جن کے معدودے چند لچھے بائیں سے دائیں قطاروں کی صورت میں اس کے سر پر اس امید میں آراستہ کیے گئے ہیں کہ وہ اس کے بڑے بڑے برہنہ، گنج زدہ رقبوں کی ستر پوشی کر سکیں گے: جب وہ نمودار ہوتا ہے تو شارع کے ساکنوں کو کوئی محبوب، لوک کہانیوں کی سی شخصیت نظر آتا ہے۔ الغرض، زکی بک الدسوقی اسطور سے ملتی جلتی کوئی شے ہے، جو اس کی موجودگی کو دوسروں کے لیے اشتیاق بھرا اور قطعی غیر حقیقی بنا دیتی ہے، یوں جیسے کوئی دم جاتا ہے کہ وہ اڑن چھو ہو جائے، یا جیسے وہ اداکار ہو جو کوئی کردار پیش کر رہا ہو، جس سے فارغ ہوتے ہی وہ کھیل کے

Scanned with CamScanner

کپڑے اتار کر اپنا اصلی لباس پہن لے گا۔ اگر ہم ان باتوں میں اس کی زندہ دل روح، اس کے لگاتار ناشائستہ لطیفے، اور ہر کس و ناکس سے کسی پرانے رفیق کی طرح گھل مل کے گفتگو کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت کا اور اضافہ کر لیں، تو ہم اس گرمجوش پذیرائی کا راز جان لیں گے جس کے ساتھ ہر کوئی اس سے سڑک پر سلام علیک کرتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ زکی بک صبح ساڑھے دس بجے اِدھر سڑک کے ابتدائی سرے پر نمودار ہوتا اور اُدھر ہر طرف سے تسلیم و نیاز گونجنے لگتے، اور اکثر دکانوں میں کام کرنے والے اس کے نوجوان چیلوں میں سے کئی ایک چھلانگیں لگا کر اس کے پاس پہنچ جاتے اور مذاق مذاق میں بعض ایسے جنسی معاملات کے بارے میں پوچھنے لگتے جو انھیں مخمصے میں ڈالے ہوتے۔ اس صورت میں زکی بک اس موضوع کے بارے میں اپنی وسیع اور انسائیکلوپیڈیائی معلومات سے استفادہ کرتے ہوے ان جوانوں کے لیے بڑے شرح و بسط اور بے حد مسرت کے ساتھ، سب کو سنائی دینے والی آواز میں، جنس کے عمیق ترین رازوں سے پردہ اٹھاتا۔ بعض اوقات یہاں تک کہ وہ کاغذ اور قلم طلب کرتا، جو آنکھ جھپکتے میں بہم پہنچا دیے جاتے، تا کہ وہ ان جوانوں کے لیے بعض عجیب و غریب آسنوں کو تصویر بنا کے واضح کرے جو وہ خود اپنی جوانی میں آزما چکا تھا۔

❋

زکی بک الدسوقی کے بارے میں بعض اہم معلومات مہیا کر دینی چاہییں۔ وہ وفد پارٹی کے مشہور رکن رکین عبدالعال باشا الدسوقی کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے جو کئی موقعوں پر وزیر اعظم رہ چکا تھا اور انقلاب سے پہلے متموّل ترین شخص تھا، وہ اور اس کے اہل خاندان بہترین زرعی زمین کے پانچ ہزار فدّان کے مالک تھے۔

زکی بک نے پیرس میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ بات متوقع تھی کہ ایک دن وہ اپنے والد کے اثر و رسوخ اور مال و دولت کے بل بوتے پر مصر میں ایک ممتاز سیاسی کردار انجام دے گا، لیکن انقلاب ناگہانی پھٹ پڑا اور سارے حالات بدل گئے۔ عبدالعال باشا کو گرفتار کر کے انقلاب کی خصوصی عدالت میں پیش کیا گیا اور، اگرچہ سیاسی فساد کا الزام تو اس پر ثابت نہیں ہو سکا، وہ ایک عرصے تک قید میں رہا اور اس کی زیادہ تر املاک ضبط کر کے زرعی اصلاحات کے تحت کسانوں میں

Scanned with CamScanner

بانٹ دی گئیں۔ اس واردات سے متاثر ہوکر باشا جلد ہی دنیا سے کوچ کر گیا، اور اس کی نکبت اپنا نشان اس کے لڑکے پر بھی چھوڑ گئی۔ اپنا جو انجینئرنگ کا دفتر زکی بک نے عمارتِ یعقوبیان میں کھولا تھا، جلد ہی ٹھپ ہو گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ ایک ایسی جگہ میں تبدیل ہو گیا جہاں وہ ہر روز اپنا خالی وقت اخبار بینی، قہوہ نوشی، دوستوں اور معشوقاؤں سے ملنے ملانے میں گزارتا ہے، یا بالکنی پر بیٹھا گھنٹوں شارع سلیمان باشا پر راہگیروں اور گاڑیوں کی آمدورفت پر غور کیا کرتا ہے۔

یہاں یہ ذکر بھی ہو جائے کہ وہ ناکامی جس سے انجینئر زکی الدسوقی اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں دوچار ہوا، اس کی ساری ذمے داری انقلاب کے سر نہیں ڈالی جاسکتی۔ اس کے بجائے، بنیادی طور پر یہ اس کے حوصلے کی پستی اور عیش وعشرت میں پڑ جانے کا نتیجہ ہے۔ درحقیقت اس کی زندگی، جس کے اب پینسٹھ سال پورے ہورہے ہیں، اپنے سارے مسرت بخش اور تکلیف دہ حوادث کے ساتھ تقریباً ایک ہی لفظ — 'عورت' — کے گرد گردش کرتی رہی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو مکمل اور لاعلاج طور پر عورت کی لطیف قید کے اسیر ہو جاتے ہیں اور جن کے لیے عورت ایسی شہوت نہیں جو کسی وقت بھڑک اٹھتی ہے اور تسکین پا کر بجھ جاتی ہے، بلکہ سحرانگیزی کا وہ عالم ہے جو اپنا اظہار لبھاؤ کے لامتناہی نت نئے پیکروں میں کرتا ہے — تنی ہوئی، شہوت بھری چھاتیاں اور ان کی لذیذ، سخت انگوروں جیسی گھنڈیاں؛ گداز، لچکدار کولھے، یوں لرزہ براندام جیسے پشت کی جانب سے اس کی شدید پیش قدمی کے متوقع ہوں؛ سرخی لگے ہونٹ جو بوسے پی جانے کے حریص ہوں اور لذت سے کراہتے ہوں؛ بال اپنے تمام مظاہر میں: لمبے، سیدھے، اور شرمیلے، یا لمبے، وحشی، آشفتہ، یا درمیانہ طوالت والے، گھریلو اور ٹھہرے ٹھہرے سے، یا وہ چھوٹے تراشیدہ ویٹروں والے بال جو لڑکوں کی نامانوس قسم کی جنس کی یاد دلاتے ہیں؛ اور آنکھیں... آہ، ان کی نگاہیں کتنی من موہنی ہوتی ہیں — راست باز یا ریاکار اور بہانہ ساز؛ بےباک یا خجل؛ یہاں تک کہ مغضوب، ملامت آمیز، اور تنفر سے بھرپور!

چنانچہ زکی بک عورتوں سے اتنی محبت کرتا تھا، یا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ وہ ان کی ہر قسم سے واقف رہا تھا، سابقہ شاہ کی ماموں زاد خانم کاملہ سے ابتدا کرتے ہوئے، جس سے اس نے شاہی شبستانوں کے آداب سیکھے تھے — ساری رات جلتی رہنے والی موم بتیاں، فرانسیسی شراب کے جام جو خواہش کو بھڑکاتے اور خوف کو مٹا دیتے ہیں، جسموں کی باہم سپردگی سے پہلے کا غسل، جب جسم کو

کریموں اور عطروں میں بسایا جاتا ہے۔ خانم کاملہ سے (جس کی شہوت نا قابلِ تسکین تھی) اس نے یہ سیکھا تھا کہ ابتدا کیسے کرنی چاہیے، کب بس کرنا چاہیے، اور جماع کے بہت متروک طریقوں کی خواہش کا اظہار حد سے زیادہ شائستہ فرانسیسی میں کیسے کرنا چاہیے۔ زکی بک تمام طبقوں کی عورتوں کے ساتھ ہم بستری کر چکا ہے — مشرقی رقاصائیں، غیر ملکی عورتیں، سوسائٹی کی بیگمات، اور ممتاز اور معزز لوگوں اور یونیورسٹی اور ثانوی اسکول کے طلبا کی بیویاں، یہاں تک کہ گری پڑی عورتیں، دہقان عورتیں، اور گھروں کی ملازمائیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنا رنگ و بو رکھتی تھی، اور وہ کبھی کبھی مذاقاً خانم کاملہ کے بستر کے آداب کے قواعد نامے کا مقابلہ اُس بھکاری عورت کی ہم بستری سے کرتا جسے ایک رات، جب وہ بہت پیے ہوے تھا، اپنی بیوک کار میں اٹھا کر گزرگاہِ بہلر پر اپنے اپارٹمنٹ میں لے آیا تھا، اور اس کی انتہائی ناداری کا اندازہ اسے اس وقت ہوا تھا جب وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کے جسم کی صفائی کرنے اسے غسلخانے میں لے گیا تھا۔ وہ اتنی مفلس تھی کہ اس نے اپنے داخلی کپڑے سیمنٹ کے ایک خالی تھیلے سے سیے تھے۔ وہ اب بھی رحم دلی اور دکھ کے امتزاج کے ساتھ اس عورت کی ندامت کو یاد کر سکتا تھا جو اسے اپنا زیر جامہ اتارتے وقت محسوس ہو رہی تھی، وہ زیر جامہ جس پر بڑے بڑے حروف میں 'پورٹ لینڈ سیمنٹ، طرہ' نقش تھا۔ اسے یہ بھی یاد آتا ہے کہ ان تمام عورتوں میں جن سے اس کی شناسائی رہی تھی، وہ سب سے زیادہ حسین اور معاملاتِ عشق میں سب سے زیادہ گرمجوش عورت تھی۔

ان تمام مختلف النوع اور کثیر تجربات نے زکی الدسوقی کو عورتوں کا مستند ماہر بنا دیا ہے، اور 'علم النسا' میں — وہ اسے یہی نام دیتا ہے — اس کے عجیب و غریب اور انوکھے نظریات ہیں؛ اب آپ چاہے انھیں قبول کریں یا نہ کریں، لیکن یہ غور و فکر کے یقیناً مستحق ہیں۔ چنانچہ وہ، مثال کے طور پر، اس پر یقین رکھتا ہے کہ غیر معمولی طور پر حسین عورت بستر میں ایک سرد سی شریک ثابت ہوتی ہے، لیکن درمیانہ خوبصورت، حتیٰ کہ کسی قدر بدصورت عورتیں بھی نسبتاً زیادہ شہوت انگیز ہوتی ہیں، کیونکہ وہ حقیقت میں محبت کی حاجت مند ہوتی ہیں اور اپنے عاشقوں کو خوش کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتی ہیں۔ زکی بک یہ یقین بھی رکھتا ہے کہ عورت خاص طور پر جس طرح حرفِ 'سین' ادا کرتی ہے، اس سے پتا چل جاتا ہے کہ وہ وصل کے وقت کتنی خیزش دکھائے گی۔ چنانچہ، مثلاً اگر عورت 'سوسو' یا 'بسبوسہ' جیسا کلمہ لرزتے ہوے اور اشتعال انگیز انداز میں منھ سے نکالے، تو وہ اس سے فوراً یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ وہ

Scanned with CamScanner

بستر کے معاملات میں خداداد صلاحیت سے سرفراز ہوئی ہے، اور اس کا برعکس بھی صحیح ہوگا۔ زکی بک یہ یقین بھی رکھتا ہے کہ روے زمین پر ہر عورت ایک قسم کے ایتھری دائرے میں گھری ہوتی ہے جس میں ارتعاشات موجزن ہوتے ہیں، جو دکھائی یا سنائی نہ دینے کے باوجود بھی مبہم طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں، اور وہ شخص جس نے ان ارتعاشات کا ادراک حاصل کرلیا ہے، یہ پہچان سکتا ہے کہ عورت جنسی اعتبار سے کس درجہ آسودہ ہے۔ اب چاہے عورت کتنی ہی باعزت اور باحیا ہو، زکی بک اس کی آواز کی تھرتھراہٹ یا اس کی اعصابی، بناوٹی طور پر مبالغہ آمیز ہنسی، حتیٰ کہ مصافحے کے دوران اس کے ہاتھ سے اٹھنے والی حرارت سے اس کی جنسی بھوک کا اندازہ کرلیتا ہے۔ باقی رہیں وہ عورتیں جن پر شہوت کا بھوت سوار ہو، جو کبھی آسودہ ہو کر ہی نہ دیں — وہ عورتیں جنھیں زکی بک فرانسیسی میں 'دخترانِ لذت' (les filles de joie) کا نام دیتا ہے، وہ پراسرار عورتیں جن کے خیال میں ان کا حقیقی وجود صرف دورانِ مباشرت ہی ہوتا ہے اور جو زندگی کی کسی اور لذت کو جنسی لذت کا مساوی نہیں سمجھتیں، وہ جن کی لذت کی حد سے بڑھی ہوئی پیاس کی قسمت میں بڑا دہشت ناک اور ناگزیر انجام لکھا ہوتا ہے — تو یہ عورتیں، زکی بک دعوے سے کہتا ہے، بلا استثنیٰ ایک جیسی ہوتی ہیں، اگرچہ ان کے چہرے ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی اس میں شک کرے تو وہ اسے اخباروں میں چھپنے والی ان عورتوں کی تصویروں کے معائنے کی دعوت دے گا جنھیں اپنے آشناؤں کی ملی بھگت سے اپنے شوہروں کو قتل کرنے پر پھانسی کی سزا سنائی گئی ہو، اور کہے گا کہ "ہم پر جلد ہی یہ بات منکشف ہوجائے گی کہ ان سب کے چہرے مہرے ایک جیسے ہیں: ہونٹ عام طور پر بھرے بھرے، شہوانی، کسی قدر ڈھیلے پن سے کھلے ہوئے، بھنچے ہوئے نہیں؛ خط و خال موٹے موٹے اور شہوانی، اور نگاہیں کسی بھوکے جانور کی طرح چمکتی ہوئی اور خالی۔"

❁

اتوار کا دن تھا۔ شارع سلیمان باشا کی دکانوں کے دروازے مقفل تھے، اور شراب خانے اور سینما گھر گاہکوں سے کھچا کھچ بھرے تھے۔ سڑک اپنی مقفل دکانوں اور دقیانوسی یورپی طرز کی عمارتوں کے ساتھ تاریک اور خالی نظر آ رہی تھی، جیسے کہ یہ کسی غم انگیز رومانی یورپی فلم میں واقع ہو۔ دن کے آغاز میں بوڑھے دربان الشاذلی نے اپنی کرسی لفٹ کے برابر سے اٹھا کر عمارتِ یعقوبیان

کے سامنے والے فٹ پاتھ پر منتقل کر لی تھی تا کہ چھٹی کے دن عمارت میں آنے جانے والوں کی نگرانی کرتا رہے۔

زکی الدسوقی ظہر کے تھوڑی ہی دیر بعد دفتر پہنچا اور پہلے ہی لمحے اس کا چپراسی ابسخرون صورت حال کو سمجھ گیا۔ بیس سال زکی بک کے یہاں کام کرتے کرتے ابسخرون اس کے مزاج کی کیفیتوں کو ایک ہی نگاہ میں تاڑنے لگا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جب اس کا مالک خوب بن ٹھن کر دفتر آتا ہے، اس طرح کہ اس کے قیمتی، خاص خاص موقعوں پر لگائے جانے والے عطر کی مہک اس کے آگے آگے چل رہی ہوتی ہے، اور وہ اعصابی تناؤ میں نظر آتا ہے، بار بار اٹھتا اور بیٹھتا ہے، جھلاہٹ سے اِدھر اُدھر چکر لگاتا ہے، اور کسی ایک حالت میں برقرار نہیں رہتا، اور اپنی بے چینی کو اکھڑ پن اور چڑچڑاہٹ میں چھپاتا ہے — تو ان سب کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ زکی بک کسی نئی معشوقہ سے اپنی پہلی ملاقات کے انتظار میں ہے۔ اسی لیے جب بک نے ابسخرون کو سخت سست سنانی شروع کیں تو وہ اس سے پریشان نہیں ہوا، بلکہ اس آدمی کی طرح سر ہلا دیا جو معاملے کو سمجھتا ہو۔ اس نے جلدی جلدی ملاقاتی کمرے کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا اور اپنی چوبی بیساکھیاں سنبھال کر طویل راہداری کے ٹائلوں والے فرش پر انھیں تیز تیز اور پُرقوت انداز میں کھٹکھٹاتا ہوا بڑے کمرے میں جا پہنچا جہاں زکی بک بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایسی آواز میں، جسے تجربے نے اسے بالکل غیر جانبدارانہ بنانا سکھا دیا تھا، کہا، ”عالیجاہ، کوئی ملاقات ہونے والی ہے؟ کیا 'لوازمات' تیار کر دوں، عالیجاہ؟“

بک نے اس کی سمت میں دیکھا اور لمحہ بھر اس پر غور کیا جیسے جواب کے لیے مناسب لہجے کا متلاشی ہو۔ اس نے ابسخرون کے دھاری دار فلالین کے جلباب پر نظر ڈالی جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا، پھر اس کی بیساکھیوں اور اس کی کٹی ہوئی ٹانگ پر، پھر اس کے سالخوردہ چہرے اور اس کی ٹھوڑی کی بھوری کھنڈیوں پر، پھر اس کی تنگ، عیار آنکھوں اور اس کی نرم خو، سہمی ہوئی مسکراہٹ پر جو کبھی اس کے لبوں سے جدا نہیں ہوتی تھی، اور کہا: ”ملاقات کے تمام لوازمات تیار کر لو، جلدی جلدی۔“

یہ بات زکی بک نے بالکنی میں جاتے ہوئے اپنے اکھڑ لہجے میں کہی۔ ان کی مشترکہ لغت میں 'ملاقات' کا مطلب تھا بک کا دفتر میں کسی عورت کے ساتھ تنہا ہونا، اور 'لوازمات' سے مراد وہ معینہ رسوم تھیں جو ابسخرون کو اپنے آقا کے لیے ہم بستری کے موقعے سے پہلے بجا لانی ہوتی تھیں۔

شروعات ٹرائی بی وٹامن کے درآمدی انجکشن سے ہوتی تھی جو وہ اس کے کولھے میں لگاتا تھا، اور اس سے اسے اتنی تکلیف ہوتی تھی کہ وہ زور زور سے کراہنے لگتا اور گدھے ابسخر ون کو اس کے ہاتھوں کی سختی اور وحشی پن پر صلواتیں سناتا۔ اس کے بعد بغیر شکر کے اور جائفل ملے قہوے کے پیالے کا نمبر آتا جو زکی بک اپنی زبان کے نیچے افیم کی ایک چھوٹی سی ٹکیہ دبا کر آہستہ آہستہ چسکیاں لیتے ہوئے پیتا۔ یہ رسوم میز کے بیچ میں 'بلیک لیبل' وسکی کی بوتل کے برابر سلاد کی ایک بڑی سی پلیٹ، دو خالی گلاس، اور برف کے ڈلوں سے لبالب بھری ہوئی شیمپین کی ایک دھاتی ڈولچی رکھنے کے ساتھ ختم ہوتیں۔

ابسخر ون جلدی جلدی سارے لوازمات تیار کرنے میں جٹ گیا۔ اس دوران زکی بک شارع سلیمان باشا کی جانب کھلنے والی بالکنی میں ایک نشست پر آ کر بیٹھ گیا اور سگار سلگا کر راہگیروں کا نظارہ کرنے لگا۔ اس کے جذبات آنے والی حسین ملاقات پر طرارے بھرتی بے صبری اور اِن وسوسوں کے درمیان جھول رہے تھے کہ اس کی محبوبہ رباب اگر ملاقات کے لیے نہ آئی تو؟ اس صورت میں پورے ایک ماہ کی بھاگ دوڑ جو اس نے اس کے تعاقب میں کی تھی، ضائع جائے گی۔ جب سے اسے توفیق چوک پر واقع 'کائرو بار' (Cairo Bar) میں دیکھا تھا، جہاں وہ مہمان نوازی کے فرائض انجام دیتی تھی، اس پر اُسی کا بھوت سوار تھا۔ وہ اس کے سحر میں اس بری طرح آ گیا تھا کہ صرف اس کی دید کی خاطر روز روز وہاں جانے لگا تھا۔ ایک عمر رسیدہ دوست سے اس نے اسے یوں بیان کیا، ''وہ عام لوگوں کے حسن و جمال کی، اس کے تمام سوقیانہ پن اور ترغیب انگیزی کے ساتھ، نمائندگی کرتی ہے۔ اسے دیکھو تو لگتا ہے کہ محمود سعید کی کسی پینٹنگ سے اٹھ کر چلی آ رہی ہے۔'' زکی بک نے پھر اس کی اپنے دوست سے مزید وضاحت ان الفاظ میں کی: ''تمھیں اپنے گھر کی وہ خادمہ یاد ہے جس پر تم اپنی جوانی کے جنسی خوابوں میں فریفتہ تھے؟ اور تمھاری دلی تمنا یہ ہوتی تھی کہ جب وہ باورچی خانے میں برتن مانجھ رہی ہو تو تم اس کے پیچھے چپک جاؤ اور اس کی بڑی بڑی نرم و گداز چھاتیاں اپنے ہاتھوں میں بھر لو؟ اور یہ کہ وہ اس انداز میں خم ہو جائے کہ تم اس سے اور زیادہ قریب ہو جاؤ، اور خود کو تمھارے سپرد کر دینے سے پہلے بڑے ترغیب انگیز طور پر سرگوشی میں انکار کرے، 'صاحب... یہ اچھی بات نہیں، صاحب...'؟ رباب وہ خزانہ ہے جس پر اتفاقاً میرا پاؤں پڑ گیا ہے۔''

لیکن خزانے پر پاؤں کے اتفاقاً آ پڑنے کا مطلب لامحالہ اس کو پا لینا نہیں ہوتا، اور زکی بک

Scanned with CamScanner

کو اپنی محبوبہ رباب کی خاطر بار بار کوفت اٹھانی پڑی تھی، مثلاً یہی کہ 'کارڈ وبار' جیسی غلیظ، نیم تاریک اور گھٹی گھٹی فضا والی جگہ میں پوری پوری راتیں گزارنی پڑی تھیں۔ بھیڑ اور سگریٹ کے کثیف دھویں سے اس کا دم تقریباً گھٹنے کو آجاتا اور اسپیکروں سے اٹھتے ہوئے شور وشغب سے، جو ایک لمحے کے لیے بھی تنفر انگیز اور سوقیانہ گانے نشر کرنا بند نہ کرتے، وہ اپنی سماعت کھونے کے قریب پہنچ جاتا۔ گالی گلوچ سے پُر بحثا بحثیوں اور مکے بازیوں کا تو خیر ذکر ہی کیا جو یہاں کے مستقل گاہکوں (جو ہنرمند مزدوروں کا ملغوبہ ہوتے)، لچّوں لفنگوں اور غیر ملکیوں کے مابین ہوا کرتیں، یا پھر معدے میں آگ لگا دینے والی گھٹیا بدبودار برانڈی جو اسے ہر رات زہر مار کرنی پڑتی، اور بل میں کی گئی بھاری غلطیاں جن کی بابت اسے کورچشمی سے کام لینا پڑتا، اس پر وہ کثیر بخشش جو وہ بار والوں کے لیے چھوڑتا تھا، اور اس سے بھی خطیر بخشش جو وہ رباب کی فراک کے گلے سے جھانکتے ہوئے پستانوں کی درمیانی ڈھلان میں اُڑس دیتا تھا، اور اس کی بھری بھری، جھولتی چھاتیوں سے اپنی انگلیوں کے مس ہوتے ہی گرم گرم خون کو اپنی رگوں میں ابلتے ہوئے محسوس کرتا، اور ایسی ہیجانی خواہش جس کی منہ زوری اور دباؤ سے اسے تقریباً اذیت محسوس ہونے لگتی۔

زکی بک کو یہ سب محض رباب کی خاطر جھیلنا پڑتا۔ وہ اسے بار بار کہیں اور ملنے کی دعوت دیتا، وہ بڑے ناز وادا سے منع کر دیتی۔ وہ پھر دعوت دیتا، امید کا دامن کبھی ہاتھوں سے نہ جانے دیتا، یہاں تک کہ آخر کار کل اس نے اس کے دفتر میں ملنے کے لیے ہاں کر دی تھی۔ فرطِ مسرت سے اس نے جھٹ پچاس پاؤنڈ کا نوٹ، ادنیٰ سے افسوس کے بغیر، اس کے گریبان میں ٹھونس دیا؛ وہ اتنے قریب آگئی کہ اسے اپنے چہرے پر اس کی سانسوں کی حدت محسوس ہونے لگی، اور اپنا زیریں لب دانتوں سے کترتے ہوئے اس نے اتنی ترغیب انگیز آواز میں سرگوشی کی، جو اس کا رہا سہا سکون بھی غارت کر دینے کے لیے کافی تھی، ''اے عزیز، میں کل ہر اس چیز کا بدلہ چکا دوں گی جو آپ نے میری خاطر کی ہے...''

زکی بک نے ٹرائی پی کا وہ قیامت تکلیف دہ انجکشن برداشت کیا، افیم کو حل کیا، اور وسکی کا پہلا گلاس پیا، اور اس کے بعد دوسرا، اور پھر تیسرا، جس سے جلد ہی اس کا سارا تناؤ جاتا رہا۔ وہ شگفتہ خاطری میں ڈوب گیا اور راحت بخش احساسات اس کے سر کو لطیف نغموں کی طرح ہولے ہولے

Scanned with CamScanner

سہلانے لگے۔ رباب سے ملاقات ایک بجے طے تھی۔ جب دیوار کی گھڑی نے دو بجائے تو اس وقت تک زکی بک ساری امید کھو چکا تھا، لیکن اچانک اسے راہداری کے ٹائلوں پر ابسخر ون کی بیساکھیوں کے کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی، جس کے فوراً ہی بعد دروازے سے اس کا چہرہ نمودار ہوا جو جوش سے کپکپاتی آواز میں، جیسے اس خبر نے اسے واقعی مسرت پہنچائی ہو، کہہ رہا تھا، ''عالیجاہ، مادام رباب تشریف لے آئی ہیں۔''

❄

مصر میں آرمینی جماعت کے سربرآوردہ لکھ پتی ہاجوب یعقوبیان کو 1934 میں اپنے نام سے اپارٹمنٹوں کا ایک بلاک تعمیر کرنے کا خیال آیا۔ اس کے لیے اس نے شارع سلیمان باشا پر بہترین جگہ کا انتخاب کیا اور ایک مشہور اطالوی انجینئرنگ فرم کو اس کی تعمیر کا کام تفویض کیا۔ فرم نے ایک دیدہ زیب نقشہ بنا کر پیش کیا — اعلیٰ یورپی کلاسیکی طرز کی دس بلند و بالا منزلیں، پتھر پر یونانی چہروں کی کندہ کاری سے مزین بالکنیاں، ستون، زینے اور راہداریاں، سب کے سب قدرتی سنگِ مرمر کے، اور 'شنڈلر' کمپنی کی جدید ترین ماڈل کی لفٹ۔ تعمیر پورے دو سال تک جاری رہی، جس کے ختم پر ایک تعمیراتی جوہر پارہ نمودار ہوا، جو توقعات سے اتنا بڑھ چڑھ کے ثابت ہوا کہ مالک نے اطالوی ماہرِ تعمیرات سے درخواست کی کہ وہ داخلے کے دروازے کی اندرونی طرف اس کا نام — 'یعقوبیان' — بڑے بڑے لاطینی حروف میں لکھوا دے جو رات کے وقت نیون کی روشنی میں جگمگا اٹھیں، گویا کہ اس کے نام کو جاوداں بنانا اور اس انوکھی عمارت پر اس کی ملکیت کی تاکید کرنا چاہتے ہوں۔

اس دور کے معاشرے کے چنیدہ لوگوں نے عمارتِ یعقوبیان میں سکونت اختیار کی — وزرا، بڑے بڑے جاگیردار باشا، غیر ملکی صنعت کار، اور دو یہودی کروڑپتی (جن میں سے ایک کا تعلق مشہورِ زمانہ موصیری خاندان سے تھا)۔ عمارت کا نچلا حصہ دو مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا: ایک طویل و عریض گیراج، جس کے عقب میں متعدد دروازے تھے، جہاں ساکنانِ عمارت کی کاریں (جن میں زیادہ تر پرتکلف طرز کی تھیں، جیسے رولز رائس، بیوک، اور شیورلے) رات کو کھڑی کی جاتی تھیں، اور پیش رخ میں بہت بڑی سی سہ طرفی جگہ جو یعقوبیان نے اپنے کارخانوں میں بنائی جانے والی چاندی کی مصنوعات کی نمائش کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ یہ نمائش گاہ چار دہائیوں تک نہایت

Scanned with CamScanner

کامیابی کے ساتھ کام کرتی رہی، پھر آہستہ آہستہ ڈھلنے لگی، یہاں تک کہ ابھی حال ہی میں الحاج محمد عزام کے ہاتھ بک گئی، جس نے اسے کپڑوں کی دکان کے طور پر کھول لیا۔ عمارت کی کشادہ چھت پر دو کمرے، جملہ سہولیات کے ساتھ، دربان اور اس کے گھر والوں کے رہنے کے لیے الگ کر دیے گئے تھے، جبکہ چھت کی دوسری طرف پچاس چھوٹے چھوٹے کمرے یا کوٹھریاں بنائی گئی تھیں اور ان میں سے ایک ایک کو عمارت کے ہر اپارٹمنٹ کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ہر تنگ کمرہ دو میٹر لمبا اور دو میٹر چوڑا تھا، دیواریں اور دروازے سب ٹھوس لوہے کے تھے اور ان پر قفل پڑے ہوئے تھے۔ کنجیاں مالکانِ اپارٹمنٹ کے حوالے کر دی گئی تھیں۔ اس زمانے میں ان کمروں کو مختلف کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، جیسے خوردنی اجناس کی ذخیرہ گاہ، سگ خانہ (اگر کتے دیو قامت یا خونخوار ہوں)، کپڑے دھونے کی جگہ جو (کپڑے دھونے کی برقی مشینوں کے رواج سے پہلے) اس زمانے میں پیشہ ور دھوبنوں کا کام تھا۔ وہ کپڑوں کو کمرے میں دھو کر چھت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تنی ہوئی لمبی سی رسّی پر لٹکا دیتیں۔ ملازموں کے سونے کی جگہ کے طور پر ان کمروں کا استعمال کبھی نہیں ہوتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ان وقتوں میں ساکنانِ عمارت روسا یا غیر ملکی ہوا کرتے تھے جو اتنی تنگ، بھِچی جگہ میں کسی انسان کے سونے کے امکان کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بجائے، وہ اپنے کشادہ اور ٹھاٹ باٹ کے اپارٹمنٹوں ہی میں (جو بعض اوقات دو منزلوں پر پھیلے ہوئے آٹھ دس کمروں پر مشتمل ہوتے جنھیں ایک اندرونی زینے کے ذریعے ملا دیا گیا ہوتا) نوکروں کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیتے۔

1952 میں انقلاب آیا اور سب کچھ بدل گیا۔ مصر سے یہودیوں اور غیر ملکیوں کا انخلا شروع ہوا اور ہر وہ اپارٹمنٹ جو اپنے مالک کے رخصت ہونے سے خالی ہوا، مسلح افواج کے کسی نہ کسی عہدیدار کے قبضے میں آ گیا، جو اب اِن وقتوں کے بارسوخ اصحاب بن گئے تھے۔ 1960 کے آتے آتے آدھے اپارٹمنٹوں میں مختلف درجے کے فوجی عہدیدار اقامت گزیں ہو چکے تھے، فرسٹ لیفٹیننٹ، نئے نئے بیاہتا کیپٹن، اور ان سے بھی آگے جرنیل تک، جو اپنے بڑے بڑے خاندانوں کے ساتھ عمارت میں منتقل ہو جاتے۔ جرنیل الدکروری جو کسی وقت صدر محمد نجیب کے دفتر کا منتظم ہوا کرتا تھا، اس نے تو دسویں منزل پر برابر برابر دو خوب بڑے اپارٹمنٹ کسی نہ کسی طرح

حاصل کر لیے تھے، جن میں سے ایک میں اس کی اور اس کے خاندان والوں کی رہائش تھی اور دوسرا دفتر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں وہ بعد دوپہر عرضداشت کرنے والوں سے ملتا تھا۔

عہدیداروں کی بیویوں نے چھت کے آہنی کمروں کا ایک بالکل مختلف مصرف پیدا کر لیا تھا: اب پہلی بار یہ کارندوں، باورچیوں، اور ان نوکرانیوں کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہونے لگے جنھیں وہ اپنے دیہاتوں سے گھر والوں کی نوکری چاکری کے لیے ساتھ لیتی آئی تھیں۔ بعض عہدیداروں کی بیویاں عامی الاصل تھیں اور انھیں آہنی کمروں میں چھوٹے موٹے جانور (خرگوش، بطخیں، مرغیاں) پالنے میں کوئی عار نظر نہیں آتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قاہرہ کے مغربی منطقے کے رجسٹروں میں عمارت کے قدیم رہنے والوں کی طرف سے چھت پر اس قسم کے جانوروں کی پرورش کے خلاف شکایتیں درج ہونے لگیں، لیکن یہ کسی کارروائی کے بغیر ہی داخلِ دفتر کر دی جاتیں، یہاں تک کہ عمارت کے باشندوں نے جرنیل الدکروری سے شکایت کی اور وہ اپنے اثر ورسوخ کے طفیل اس غیر صحت مند مظہر کو ختم کرنے میں کامیاب ہوا۔

1970 کی دہائی میں 'انفتاح' یا 'کھلے دروازوں کی پالیسی' کا آغاز ہوا اور ثروت مند لوگ شہر کا وسطی علاقہ چھوڑ کر المہندسین اور مدینۃ نصر کی جدید بستیوں میں منتقل ہونے لگے۔ بعض نے عمارتِ یعقوبیان میں اپنے اپارٹمنٹ بیچ ڈالے، بعض دوسروں نے انھیں اپنے حال ہی میں سند یافتہ بیٹوں کو دفتروں اور کلینکوں کے طور پر استعمال کرنے کے لیے دے دیا، یا سیر وسیاحت پر نکلے ہوئے عربوں کو کرائے پر اٹھا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چھت پر واقع آہنی کمروں اور عمارت کی نچلی منزلوں کے اپارٹمنٹوں میں جو تعلق تھا وہ رفتہ رفتہ منقطع ہونے لگا۔ سابقہ کارندے اور ملازم پیسے کی خاطر اپنے چھت کے کمروں سے دستبردار ہو گئے اور انھیں مضافات سے تازہ تازہ آنے والے نادار مقیموں کے حوالے کر دیا یا ان لوگوں کو سونپ دیا جو نہیں شہر کے وسط میں روزی کماتے تھے اور سر چھپانے کے لیے کسی ایسی جگہ کے متلاشی تھے جو ان کے دھندے کے قریب بھی ہو اور سستی بھی۔

یہ انتقالِ قبضہ عمارت کے آرمینی نگران، موسیو گریگور، کی وفات سے اور بھی آسان ہو گیا جو کروڑپتی ہاجوب یعقوبیان کی املاک کا پوری دیانتداری اور عرق ریزی سے انصرام کرتا تھا۔ وہ ہر سال دسمبر میں ساری آمدنی سوئٹزرلینڈ بھیج دیتا تھا، جہاں یعقوبیان کے ورثا انقلاب کے بعد ہجرت

کر گئے تھے۔ گریگور کے بعد، ایجنٹ کی حیثیت میں اس کی جانشینی استاذ فکری عبد الشہید نے کی جو، اگر ہاتھ گرم کیے جائیں تو، کوئی چیز نہیں تھی جو نہ کر سکتا ہو۔ مثال کے طور پر، چھت کے کسی کمرے کا کرایہ نامہ تیار کرنے کے لیے وہ اس آہنی کمرے کے سابقہ مقیم سے ایک بھاری رقم وصول کرتا اور اتنی ہی بھاری رقم نو وارد کرائے دار سے۔

اس کا آخری نتیجہ چھت پر ایک نئے گروہ کی نشوونما کی صورت میں نکلا جو بقیہ عمارت سے مستقل طور پر کٹا ہوا تھا۔ بعض نو واردوں نے برابر برابر دو کمرے کرائے پر لے لیے اور ان کو جوڑ کر ایک مختصر سی رہائش گاہ بنالی، جس میں (پاخانے اور حمام جیسی) تمام سہولیات موجود تھیں، جبکہ نادار ترین کرائے داروں نے مل ملا کر ہر تین یا چار کوٹھریوں کا مشترکہ پاخانہ بنوالیا، اور اس طرح چھت کے مکینوں کی اس جماعت کے خط وخال مصر کے کسی دوسرے عوامی گروہ سے مختلف نہ رہے۔ ساری چھت پر بچے ننگے پیر اور نیم برہنہ دوڑتے پھرتے ہیں اور عورتیں سارا دن کھانے پکانے، دھوپ میں بیٹھ کر گپ بازی کے جلسے کرنے اور اکثر لڑائی جھگڑے کرنے میں گزارتی ہیں، اور جب جھگڑتی ہیں تو بدترین مغلظات کا تبادلہ کرتی ہیں اور ایک دوسرے پر وہ تہمتیں لگاتی ہیں جو ان کی عزت وآبرو تک کو لپیٹ میں لے لیتی ہیں، مگر پھر جلد ہی صلح صفائی کر کے ایک دوسرے کے ساتھ مکمل بھلائی کا طرزِ عمل اختیار کر لیتی ہیں، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ تو ایک دوسرے کے گالوں پر گرم گرم، ہونٹ چٹخاتے بوسے دینے سے بھی باز نہیں رہتیں، یہاں تک کہ وفورِ جذبات اور محبت سے رونے بھی لگتی ہیں۔

عورتوں کی جھگڑے بازیوں پر مرد کوئی توجہ نہیں دیتے، اور انھیں اسی ناقص العقلی کا ایک اور مظہر سمجھتے ہیں جس کا ذکر ایک مشہور حدیث شریف میں آیا ہے۔ چھت کے یہ باسی روٹی کے ایک لقمے کے لیے اپنا پورا دن بڑی تلخ وترش محنتِ شاقہ میں گزارتے ہیں اور شام پڑے تھکن سے چور اور عجلت میں گھر لوٹتے ہیں تا کہ اپنی تین تعیشات سے بہرہ اندوز ہو سکیں — مزیدار گرم گرم کھانا، تمباکو کے، یا (اگر میسر آئے تو) حشیش کے چند پائپ، جو وہ یا تو اکیلے بیٹھ کر اپنی گڑگڑی میں پیتے ہیں یا گرمیوں کی راتوں میں چھت پر دیر تک بیٹھے دوسروں سے بات چیت کرتے ہوئے۔ تیسرا عیش مباشرت ہے، اور چھت کے مکین اس کے خوب مزے اڑاتے ہیں اور، جب تک یہ حلال حدود میں رہے، انھیں اس کی بابت کھل کر ہر قسم کی باتیں کرنے میں بھی کوئی عار نہیں ہوتا۔ یہاں ایک تضاد ہے: کوئی بھی چھت والا،

Scanned with CamScanner

تمام نچلے طبقے کے لوگوں کی طرح، دوسروں کے سامنے اپنی بیوی کا نام لینے میں شرم محسوس کرے گا، اور اس کی طرف ''فلانے کی ماں'' یا ''بچوں'' کے حوالے سے اشارہ کرے گا، جیسے ''آج بچوں نے ملوخیہ پکایا،'' اور حاضرین سمجھ جائیں گے کہ اس کا اشارہ اپنی بیوی کی طرف ہے۔ تاہم، ٹھیک یہی آدمی دوسرے آدمیوں کی محفل میں اپنی بیوی سے اپنے بے حد خاص تعلقات کا ذکر کرنے میں کوئی شرم نہیں محسوس کرے گا، حتیٰ کہ چھت کے مکین ایک دوسرے کی جنسی کارگزاریوں کی تقریباً ہر بات جان گئے ہیں۔ باقی رہیں عورتیں، تو وہ سب کی سب، اپنے دینداری اور اخلاق کے درجے سے قطع نظر، ہم بستری کو بے محابا پسند کرتی ہیں اور ایک دوسری سے اپنے بستر کے راز سرگوشیوں میں کہہ دیتی ہیں، اور بعد میں جب تنہا ہوتی ہیں تو اس پر بے فکر، بلکہ فحش قہقہے بلند کرتی ہیں۔ انھیں اس عمل سے صرف اس لیے ہی محبت نہیں ہے کہ اس سے ان کی شہوت کی تسکین ہوتی ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ جنسی ملاپ، اور اس کے لیے ان کے شوہروں کی حرص، انھیں یہ احساس دلاتی ہے کہ سارے عذاب جھیلنے کے باوجود ہنوز وہ عورتیں ہی ہیں: حسین اور اپنے مردوں کو مرغوب عورتیں۔ اس خاص لمحے جب بچے سو چکے ہوں، رات کا کھانا کھایا اور خدا کا شکر ادا کیا جا چکا ہو، اور گھر میں کھانے پینے کی اشیا ہفتے بھر یا اس سے زیادہ کے لیے کافی ہوں، اور ناگہانی اخراجات کے لیے تھوڑی، بہت رقم پس انداز ہو، اور رہائش کا کمرہ صاف ستھرا اور سلیقے سے ترتیب دیا ہوا ہو، اور شوہر جمعرات کی شب حشیش کے زیر اثر خوشگوار طبیعت کے ساتھ گھر لوٹا ہو اور اپنی بیوی کو طلب کر رہا ہو، تو اس صورت میں کیا یہ بیوی کا فرض نہیں کہ اس کی پکار پر لبیک کہے، اور اس سے پہلے نہائے، اپنے کو بنائے سنوارے، اور خوشبو لگائے؟ کیا مسرت کی یہ مختصر گھڑیاں اس بات کی دلیل نہیں کہ اس کی آفت زدہ زندگی کسی نہ کسی طرح، ہر چیز کے باوجود، کامیاب رہی ہے؟ اُس تاثر کو ہم تک پہنچانے کے لیے کسی مشاق مصور کی ضرورت ہوگی جو جمعے کی صبح چھت کی مکین کسی عورت کے چہرے پر ہوتا ہے جب اس کا شوہر نماز پڑھنے کے لیے نیچے جا چکا ہوتا ہے اور وہ مباشرت کے آثار دھو دھا چکنے کے بعد بستر کی دھوئی ہوئی چادر کو سکھانے کے لیے نکلتی ہے — اس لمحے، اس حال میں کہ بال گیلے، چہرہ گلنار، اور آنکھوں میں آسودگی کا تاثر ہوتا ہے، وہ صبح کی شبنم سے بھیگے ہوئے اس گلاب کی طرح دکھائی دیتی ہے جو اپنے درجۂ کمال کو پہنچ چکا ہو۔

❁

رات کا اندھیرا چھٹنے لگا تھا اور نئی صبح کی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ ایک مدھم سی بے بضاعت روشنی دربان الشاذلی کے کمرے کی کھڑکی سے ہوتی ہوئی چھت پر آرہی تھی جہاں اس کے نوخیز بیٹے طٰہٰ نے شدید اضطراب کے عالم میں پوری رات گزاری تھی۔ اب وہ فجر کی نماز مع دو رکعت سنت کے ادا کر کے اپنا سفید جلباب پہنے پلنگ پر بیٹھا کتاب الدعاء المستجاب پڑھ رہا تھا اور کمرے کی خاموشی میں بڑی کمزور سی آواز میں دہرا رہا تھا: ''اے خدا، میں تجھ سے آج کے دن کی خیر چاہتا ہوں اور اس کے اور اس میں مکتوم شر سے تجھ میں پناہ ڈھونڈتا ہوں۔ اے خدا، اپنی کبھی نہ سونے والی آنکھ سے میری نگہبانی کر اور اپنی قدرت سے میری مغفرت فرما، اور مجھے نہ ہلاک کر؛ تو ہی میری امید ہے۔ میرے رب، اے ذوالجلال والاکرام، میرا چہرہ تیری طرف ہے، سو اپنا وجہِ کریم میری طرف کر اور مجھے اپنی عفوِ محض و کرم کے ساتھ قبول کر، اس حال میں کہ تو مجھ پر مسکرا رہا ہو اور اپنی رحمت میں مجھ سے راضی ہو!''

طٰہٰ دعائیں پڑھتا رہا یہاں تک کہ صبح کا اجالا کمرے میں در آیا اور زندگی آہستہ آہستہ آہنی کمروں میں سرسرانے لگی — آوازیں، چیخ پکار، قہقہوں اور کھانسنے کا شور، دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کا غل، اور گرم پانی، چائے، قہوے، کوئلوں، اور تمباکو کی مہک۔ چھت کے مکینوں کے لیے یہ دوسرے دنوں جیسا ہی دن تھا؛ لیکن طٰہٰ الشاذلی جانتا تھا کہ اِس دن اس کی قسمت کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ ہونے والا ہے۔ چند گھنٹوں بعد وہ پولیس اکیڈمی میں کرداری انٹرویو کے لیے پیش ہونے والا ہے — امید کی طویل دوڑ کی آخری رکاوٹ۔ بچپن سے وہ پولیس افسر بننے کا خواب دیکھتا رہا ہے اور اس نے اپنی ساری تگ و دو اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے وقف کر دی ہے۔ اس نے ہائی اسکول کے امتحان کے واسطے سب کچھ حفظ کرنے کی کلفت اٹھائی ہے، اور بغیر پرائیوٹ مدرّس کی مدد کے (مدرسے کی ان چند سبق دہرانے کی جماعتوں میں شمولیت کے سوا جن کے واسطے اس کا باپ بمشکل پیسہ جوڑ سکا تھا) ادب میں نواسی فیصد نمبر حاصل کیے ہیں۔ گرمیوں کی تعطیلات میں (دس پاؤنڈ ماہانہ کے صرفے پر) اس نے 'عابدین یوتھ سنٹر' کی رکنیت لی اور جسم بنانے کی کڑی مشقیں جھیلیں تاکہ وہ کسرتی جسم پیدا ہو جو اسے پولیس اکیڈمی کے جسمانی پختگی کے امتحانات میں کامیابی کا اہل بنا سکے۔

اس خواب کو پورا کرنے کے لیے، طٰہٰ نے اس علاقے کے پولیس افسروں سے تعلقات پیدا کیے ہیں، اس حد تک کہ اب وہ سب، قصر النیل پولیس تھانے اور اس کے ماتحت توسیکا کے ذیلی

تھانے کے اہلکار بھی، اس کے دوست بن گئے ہیں۔ انھیں سے اسے پولیس میں داخلے کے امتحانوں کی تمام تفصیلات معلوم ہوئی ہیں اور یہ بھی کہ دولت مند لوگ اپنے بچوں کی اکیڈمی میں قبولیت کی ضمانت کے لیے بیس ہزار پاؤنڈ بطور رشوت دیتے ہیں (اس کی کتنی تمنا ہے کہ اس کے پاس اتنی رقم ہوتی!) اس خواب کو زندہ بنانے کے لیے طٰہ الشاذلی کو عمارتِ یعقوبیان کے ساکنوں کی کمینگی اور نخوت کو بھی برداشت کرنا پڑا ہے۔

لڑکپن ہی سے وہ لوگوں کی چھوٹی موٹی خدمتیں بجالانے میں اپنے باپ کی مدد کرتا آیا ہے، اور جب اس کی ذہانت اور پڑھائی میں فضیلت آشکار ہوئی تو عمارت میں رہنے والوں نے مختلف انداز میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ بعضوں نے حوصلہ افزائی کی، اچھے اچھے تحفے دیے، اور ایک تابناک مستقبل کی بشارت کی۔ اس کے برخلاف، بعض دوسروں کو (جن کی تعداد خاصی تھی) 'چوکیدار کے پر نکالتے بیٹے' کے خیال سے نہ جانے کیوں بے چینی محسوس ہوئی، اور انھوں نے اس کے باپ کو اس پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ اسے مڈل اسکول ختم کرتے ہی کسی ہنر کی تربیت کے واسطے بھرتی کرادے ''تاکہ وہ کوئی ایسا روزگار کر سکے جو تمھارے اور خود اس کے کام آسکے،'' جیسا کہ وہ بڈھے چچا شاذلی سے ظاہرا اس کی بھلائی کی خاطر کہتے۔ لیکن جب طٰہ ہائی اسکول میں داخل ہو گیا اور اچھی کارکردگی جاری رکھی تو وہ ٹھیک امتحان کے دنوں میں اسے مختلف کاموں کے لیے طلب کرنے لگے۔ وہ خاصے مشکل کام اس کے سپرد کر دیتے جنھیں نبٹانے میں بہت وقت لگ جاتا، اور اسے للچانے کے لیے خطیر بخشش دیتے، جس کے پیچھے ان کی طٰہ کو اپنی پڑھائی سے دور رکھنے کی ایک خبیث خواہش پوشیدہ ہوتی۔ وہ مالی ضرورت کے باعث ان کے یہ کام قبول کر لیتا، لیکن پڑھائی میں خود کو فنا بھی کیے جاتا، حتیٰ کہ بعض اوقات دو دو راتیں جگ کر گزار دیتا۔

جب ہائی اسکول کے امتحان کا نتیجہ نکلا اور اس کے نمبر عمارت کے بہت سے بچوں سے کہیں زیادہ آئے، تو بس پھر کیا تھا، بڑبڑانے والے اب کھلم کھلا بات کرنے لگے۔ لفٹ کے پاس مڈبھیڑ کے دوران ایک، دوسرے سے طنزیہ انداز میں پوچھتا کہ کیا اس نے چوکیدار کو اس کے بیٹے کے اعلیٰ نمبر حاصل کرنے پر مبارکباد دے دی ہے۔ پھر وہ بڑے کاٹ کھانے والے انداز میں کہتا کہ کوئی دن جاتا ہے، چوکیدار کا لونڈا پولیس اکیڈمی میں داخل ہو جائے گا اور افسر بن کر نکلے گا، جس کے کندھے پر

Scanned with CamScanner

دوستارے جڑے ہوں گے۔ تب دوسرا بے کم وکاست اپنی برہمی کا اظہار کرتا۔ پہلے تو وہ طٰہ کے کردار اور جانفشانی کی تعریف کرتا، پھر بڑی گمبھیر آواز میں اضافہ کرتا (یوں جیسے کہ عام اصول کی بات کر رہا ہو، کسی خاص فرد کی نہیں) کہ پولیس، عدالت اور عام طور پر تمام نازک ملازمتیں صرف انھیں لوگوں کی اولاد کو ملنی چاہییں جن کی کوئی حیثیت ہے، کیونکہ چوکیداروں، دھوبیوں، اور ایسے ہی دوسروں کی اولاد کو اگر اقتدار حاصل ہو گیا تو وہ اسے ان احساساتِ کمتری اور دوسرے نفسیاتی نقائص کی تلافی کے لیے استعمال کریں گے جو شروع بچپن میں انھیں لاحق ہوئے ہوں۔ پھر وہ اپنی تقریر کا خاتمہ جمال عبدالناصر پر لعنت بھیج کر کرتا، جس نے مفت تعلیم کو رواج دیا تھا، یا سند کے طور پر یہ حدیث نقل کر دیتا، ”لا تعلموا اولاد السفلہ“ (سفلوں کے بچوں کو نہ پڑھاؤ)۔

جب نتیجہ نکلتا تو عمارت کے یہی باسی طٰہ کی عیب چینی کرتے اور بے حد معمولی معمولی باتوں پر اس میں عیب نکالنے شروع کر دیتے، جیسے کار تو دھوئی لیکن فرشی پائدان اپنی جگہ لوٹانا بھول گیا، یا کہیں دور کام پر بھیجا تھا تو چند منٹ دیر سے واپس آیا، یا یہ کہ دس چیزیں تو خرید لایا لیکن ایک بھول گیا۔ وہ جان بوجھ کر اور بالکل واضح انداز میں اس کی اہانت کرتے تاکہ وہ یہ جواب دینے پر مجبور ہو جائے کہ میں پڑھا لکھا آدمی ہوں، یہ اہانت برداشت نہیں کر سکتا، جس سے انھیں وہ زریں موقع مل جائے گا کہ اس پر حقیقتِ حال واضح کر سکیں: کہ یہاں اس کی حیثیت بس ایک چوکیدار کی ہے، نہ زیادہ نہ کم، اور اگر اسے یہ کام پسند نہیں تو کسی اور ضرورت مند کو کرنے دے۔ لیکن طٰہ نے انھیں کبھی یہ موقع نہیں دیا۔ وہ ان کی اشتعال انگیزی کا جواب سر جھکا کر، اور خفیف سے تبسم کے ساتھ خاموش رہ کر دیتا، اور اس کا خوبصورت آبنوسی چہرہ اس وقت یہ کہہ رہا ہوتا کہ اس کی طرف جو کچھ اچھالا جا رہا ہے وہ اس سے متفق نہیں، کہ وہ ان اہانتوں کے رد کی پوری پوری قدرت رکھتا ہے، لیکن دوسرے کی عمر کا لحاظ مانع ہے۔

یہ ان بہت سی وضعوں میں سے ایک تھی جنھیں اس کی دفاعی حکمت عملیاں کہنا چاہیے۔ طٰہ انھیں کٹھن حالات میں اختیار کرتا تھا، تاکہ اس کے حقیقی جذبات کا اظہار تو ہو جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ مشکلوں سے بھی گریز کیا جا سکے۔ یہ وضعیں پہلے پہل اس کے لیے اداکاری ہوا کرتی تھیں لیکن جلد ہی صدق دلی سے برتی جانے لگیں، جیسے یہی حقیقت ہوں۔ مثال کے طور پر، اسے چوکیدار کی بنچ پر بیٹھنا پسند نہیں تھا، کیونکہ اس صورت میں اسے ہر مکین کے لیے احترام کے ساتھ کھڑا ہونا پڑتا تھا، اور اگر وہ

Scanned with CamScanner

بنچ پر بیٹھا ہوتا اور کسی باسی کو آتا ہوا دیکھتا تو خود کو کسی کام میں مصروف کر لیتا، جس کے باعث اٹھنے کے فریضے کی ضرورت جاتی رہتی۔ اسی طرح، وہ عمارت میں رہنے والوں کو احترام کی بڑی نپی تلی قلیل مقدار کے ساتھ مخاطب کرنے، اور ان کے ساتھ اس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرنے کا عادی تھا جو ایک تنخواہ دار ملازم اپنے برتر افسر کے ساتھ اختیار کرتا ہے، ویسا نہیں جیسا ایک نوکر کا اپنے آقا کے ساتھ ہوتا ہے۔ باقی رہے ان مکینوں کے بچے جو عمر میں اس سے قریب ہوتے، تو انھیں وہ بالکل اپنے برابر کا سمجھتا۔ وہ انھیں ان کے نام لے کر پکارتا اور ان کے ساتھ قریبی دوستوں کی طرح باتیں یا کھیل کود کرتا، ضرورت نہ ہونے کے باوجود ان کی کتابیں مستعار لیتا، تاکہ انھیں جتا دے کہ اپنی دربان کی حیثیت کے باوجود وہ تعلیم کے معاملے میں ان کا سنگی ساتھی ہے۔

یہ اس کی روز مرہ کی زندگی کے پھیکے سیٹھے معمولات تھے: غربت، کمر توڑ محنت، عمارت میں رہنے والوں کا غرّہ، اور ہمیشہ تہہ کیا ہوا وہ پانچ پاؤنڈ کا نوٹ جو اس کا باپ ہر سنیچر کے روز اسے عطا کرتا تھا، جس سے پورا ہفتہ کام چلانے کے لیے وہ ہزار ہا حیلہ سازیاں کرتا تھا؛ اسے دینے کے لیے کار کی کھڑکی کے باہر کاہلی سے نکلا ہوا کسی مکین کا سپاٹ، گرم ہاتھ (جسے دیکھتے ہی اس پر اٹھ کر فوجی انداز کی سلامی دینا اور اپنے محسن کا گرمجوشی سے اور بہ آوازِ بلند شکریہ ادا کرنا واجب ہو جاتا)؛ وہ نگاہ، گستاخ، اپنے میں از حد مگن یا در پردہ ہمدردانہ اور روادار، اس 'معاملے' پر خجالت کی زائیدہ جو اسے اپنے مدرسے کے ساتھیوں کی آنکھوں میں نظر آتی تھی جب وہ اس سے ملنے آتے اور دیکھتے کہ وہ 'چھت پر' چوکیدار کی کوٹھری میں رہتا ہے؛ وہ نفرت بھرا اور شرم دلانے والا سوال "کیا تم چوکیدار ہو؟" جو عمارت سے ناواقف لوگ اس کی طرف اچھال دیتے؛ اور عمارت میں داخل ہوتے وقت مکینوں کا وہ دانستہ رفتار سست کر دینا کہ وہ تیزی سے بڑھ کر جو سامان بھی وہ اٹھائے ہوں خود اٹھا لے، خواہ یہ سامان کتنا ہی ہلکا پھلکا اور فضول سا کیوں نہ ہو۔

دن اسی کی قسم ناگواریوں میں گزرتا ہے، لیکن جب رات پڑے طہ بستر پر آتا ہے تو ہمیشہ پاک صاف اور باوضو ہوتا ہے، اور نمازِ عشا سے، مع شفع و وتر، فارغ ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر وہ دیر تک کمرے کی تاریکی میں گھورتا رہتا ہے، بتدریج پرواز کرنے لگتا ہے اور چشمِ خیال سے خود کو ایک پولیس افسر کے روپ میں دیکھتا ہے، خوبصورت وردی میں فخر سے اتراتا ہوا، کندھوں پر تانبے کے ستارے

دمکتے ہوئے، حکومت کی عطا کردہ، ہیبت پیدا کر دینے والی پستول کمر سے جھولتی ہوئی۔ وہ تصور کرتا ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ بثینہ السید سے شادی کر لی ہے اور وہ دونوں چھت کے شور وغوغا اور غلاظت سے دور ایک بہتر محلے میں واقع شایانِ شان اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے ہیں۔

اسے پورا یقین تھا کہ خدا اس کے سارے خواب پورے کر دے گا، اول تو یوں کہ اس نے اس کے سارے احکام بجالانے میں حتی المقدور جدوجہد کی ہے، فرائض پورے کیے ہیں اور کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا ہے (اور خدا نے اپنے متقی عبادت گزاروں کو آیت کریمہ میں یہ بشارت دی ہے: ''اگر اہلِ قریہ ایمان لاتے اور خوفِ خدا رکھتے، تو ہم نے آسمانوں اور زمین کی برکات ان پر وا کر دی ہوتیں،'' اور دوسرے یوں کہ وہ خدا کے کہے پر حسنِ ظن رکھتا ہے، کیونکہ خدائے عزوجل نے اپنی حدیثِ قدسی میں کہا ہے: ''میں اپنے عبد کی توقعات کے مطابق ہوں: اگر یہ اچھی ہیں تو اچھا ہوں، اور بری ہیں تو برا ہوں'')۔ اور دیکھا نا، خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہائی اسکول کے امتحان میں کامیابی عطا کی، اور وہ، الحمدللہ، پولیس اکیڈمی کے تمام امتحانوں میں پاس ہو گیا۔ بس اب کرداری انٹرویو ہی باقی رہ گیا ہے، جسے وہ آج پاس کر لے گا، انشاءاللہ۔

طٰہ بیدار ہوا اور فجر کی دو رکعتیں ادا کیں، اور قضائے حاجات کے طور پر دو اور۔ پھر غسل کیا، ڈاڑھی بنائی، اور کپڑے پہننے شروع کیے۔ اس نے کرداری انٹرویو کے موقعے پر پہننے کے لیے ایک نیا سرمئی سوٹ خریدا تھا، ایک چمچماتی ہوئی سفید قمیص، اور ایک خوشنما نیلے رنگ کی ٹائی۔ جب اس نے آئینے میں اپنے اوپر ایک آخری نظر ڈالی تو خود کو بڑا طرح دار نظر آیا۔ جب وہ ماں کو الوداعی بوسہ دینے لگا تو اس نے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھا، منھ ہی منھ میں کچھ جنتر منتر بڑبڑائی، اور اتنی دلسوزی سے طٰہ کے لیے دعائیں مانگنے لگی کہ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ عمارت کے پیش ایوان میں اسے اپنا باپ بنچ پر حسبِ عادت ٹانگیں تہہ کیے بیٹھا نظر آیا۔ بوڑھا آہستہ آہستہ اٹھا اور ایک ٹک طٰہ کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرایا، اس کی سفید مونچھیں پھڑک رہی تھیں اور اس کے پوپلے منھ کو نمایاں کر رہی تھیں، اور فخر سے کہا، ''پیشگی مبارکباد، آفیسر صاحب!''

دس سے آگے کا وقت ہو رہا تھا اور شارع سلیمان باشا پر کاروں اور پیدل چلنے والوں کی ریل پیل تھی۔ زیادہ تر دکانیں بھی کھل چکی تھیں۔ طٰہ کو معاً خیال آیا کہ انٹرویو شروع ہونے میں ایک پورا

گھنٹہ باقی ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں اس کا سوٹ لدی پھندی بسوں میں گندا نہ ہو جائے، اس نے ٹیکسی لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کا جی چاہا کہ کاش وہ بقیہ وقت بثینہ کے ساتھ گزار سکتا۔ ملاقات کے لیے ان کا متفقہ قاعدہ یہ تھا کہ وہ 'شنن' نامی کپڑوں کی دکان کے سامنے سے گزرتا جہاں بثینہ کام کرتی تھی؛ جب وہ اسے دیکھتی تو دکان کے مالک طلال سے گودام سے کوئی نہ کوئی چیز لانے کی اجازت مانگ کر باہر نکل آتی، پھر توفیقیہ چوک کے نئے باغ میں ان کی پسندیدہ جگہ پر اس کے پاس آ جاتی۔

طٰہ نے حسبِ دستور یہی عمل دہرایا اور کوئی پاؤ گھنٹہ بیٹھا راہ تکتا رہا، تب کہیں جا کر وہ نمودار ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ طٰہ کو اس کا چلنے کا انداز بہت پسند تھا۔ وہ آہستہ آہستہ، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر، زمین پر نگاہ جمائے چلتی، اور یہ تاثر دیتی جیسے خجل ہو یا کسی بات پر نادم، یا کسی بے حد نازک سطح پر بڑی احتیاط سے چل رہی ہو، کہ کہیں قدموں سے ٹوٹ نہ جائے۔ یہ دیکھ کر کہ وہ سرخ رنگ کا تنگ لباس پہنے ہوئے ہے جس سے اس کے جسم کے خطوط نمایاں ہو رہے ہیں اور جس کے نیچے تک کھلے گلے سے اس کی خوب بھری بھری چھاتیاں نظر آ رہی ہیں، طٰہ کو غصہ محسوس ہوا اور یاد آیا کہ وہ اس سے پہلے اس پر لڑ چکا ہے کہ وہ یہ لباس نہ پہنا کرے۔ لیکن وہ ایک اچھے موقعے کا ستیاناس نہ کرنے کے خیال سے غصہ پی گیا۔ بثینہ مسکرا دی، جس سے اس کے چھوٹے چھوٹے، سفید، باترتیب دانت اور اس کے منھ اور گہری سرخی لگے ہونٹوں کے دونوں جانب کے دو خوشنما گڑھے نمایاں ہو گئے۔ وہ باغ کی نیچی سی سنگ مرمر کی دیوار پر اس کے برابر بیٹھ گئی، اس کی طرف رخ کیا اور اپنی پھیلی پھیلی بظاہر حیران، شہد رنگ آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی، ''واہ، ذرا دیکھو تو بانکے میاں کو!''

اس نے بھڑکتی ہوئی جذباتی سرگوشی میں کہا، ''اس وقت کرداری انٹرویو کے لیے جا رہا ہوں اور تم سے مل کر جانا چاہتا تھا۔''

''خدا کی امان میں جاؤ!'' بثینہ نے سچی چاہت سے کہا۔ طٰہ کا دل پھڑپھڑانے لگا اور اس لمحے اس کا جی چاہا کہ اسے اپنے سینے سے لگا لے۔

''ڈر لگ رہا ہے؟'' بثینہ نے پوچھا۔

''میں نے اپنا معاملہ خدائے عزوجل کو سونپ دیا ہے۔ اب وہ جو بھی کرے، مجھے بخوشی منظور

ہوگا، انشاء اللہ،'' وہ یوں جلدی جلدی بولا جیسے پہلے سے جواب تیار کر رکھا ہو، یا ان الفاظ سے خود کو تسکین دینا مقصود ہو۔ لمحہ بھر رکنے کے بعد اس نے بثینہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، ''میرے لیے دعا کرنا۔''

''اللہ تمھیں کامیاب کرے، طٰہ،'' اس نے گرمجوشی سے کہا، پھر، جیسے اس نے اپنے احساسات کے اظہار میں افراط سے کام لیا ہو، رک کر یہ اضافہ کیا، ''اب میں چلتی ہوں۔ طلال صاحب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

جب وہ واپس ہونے کو ہوئی، طٰہ نے اسے روکے رکھنے کی کوشش کی، لیکن بثینہ نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور اس سے نظریں ملانے سے گریز کرتے ہوئے روزمرہ کے رسمی انداز میں کہا، ''انشاء اللہ، تم ضرور کامیاب ہوگے۔'' بعد میں، ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے، طٰہ نے سوچا کہ اس کے بارے میں بثینہ کا رویہ بدل گیا ہے اور اسے اس حقیقت سے تجاہل نہیں کرنا چاہیے: وہ اسے بہت اچھی طرح جانتا ہے اور اس کے عمیق ترین خیالات میں اتر جانے کے لیے اسے بس ایک نظر ہی کافی ہے۔ اس کا سارا احوال اسے حفظ تھا — اس کا چہرہ، چاہے خوشی سے دمکتا ہوا یا غمناک، اس کی مبہم سی مسکراہٹ اور جس انداز سے وہ لجا کر سرخ پڑ جاتی تھی، غصے کی حالت میں اس کی آگ بگولہ اور چبھتی ہوئی (تاہم حسین) آنکھیں: وہ تو اس وقت بھی اس کی دید کا شیدائی تھا جب وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی ہو اور نیند کا خمار اب بھی اس کے چہرے پر باقی ہو، جب وہ ایک فرمانبردار اور نرم دل بچی نظر آتی تھی۔

وہ اسے چاہتا تھا اور اسے اپنی یاد میں ایک بچی کے پیکر میں محفوظ کیے ہوئے تھا جو اس کے ساتھ چھت پر کھیلا کرتی تھی، اور وہ اس کے پیچھے بھاگتا پھرتا تھا اور جان بوجھ کر اس پر جھک جاتا تھا تاکہ اس کے بالوں سے اٹھتی ہوئی صابن کی مہک اس کی ناک کو گدگدائے؛ اور ایک سیکنڈری اسکول کی طالبہ کے پیکر میں، سفید فراک اور نیلا اسکرٹ پہنے، کالے جوتے اور ان کے اوپر اسکول کے کوتاہ، سفید موزے، اپنے بستے کو یوں چمٹائے ہوئے جیسے اپنی بالغ ہوتی ہوئی چھاتیوں کی پردہ پوشی مقصود ہو؛ اور ان کے پلوں اور چڑیا خانوں کی سیروں کے پیکر، اور اس دن کا پیکر جب انھوں نے ایک دوسرے سے اپنی محبت کا اعتراف اور شادی کرنے کا اقرار کیا تھا، جس کے بعد وہ کس قدر والہانہ انداز میں اس سے چمٹ گئی تھی اور اس کی زندگی کی تفصیلات کے بارے میں سوال پر سوال پوچھ

Scanned with CamScanner

ڈالے تھے، گویا وہ اس کی چھوٹی سی بیوی ہو اور اس کی نگہداشت کر رہی ہو۔ انھوں نے باہمی اتفاق سے مستقبل کی ہر چیز کا فیصلہ کر لیا تھا، حتیٰ کہ یہ بھی کہ کتنے بچے پیدا کریں گے، ان کے کیا نام رکھیں گے، اور ان کا پہلا اپارٹمنٹ کس طرح کا ہوگا۔

پھر یکایک وہ بدل گئی تھی۔ طٰہ میں اس کی دلچسپی کم ہوتی گئی اور اپنے منصوبے کے بارے میں وہ ڈھیلے ڈھالے اور تمسخرانہ انداز میں بات کرنے لگی تھی۔ اکثر لڑنے جھگڑنے، ملنے سے کترانے، اور طرح طرح کے بہانے بنانے لگی تھی۔ یہ سب ٹھیک بثینہ کے باپ کے انتقال کے وقت سے شروع ہوا تھا۔ وہ کیوں بدل گئی؟ کیا ان کی محبت محض کوئی نوخیزی کا کھیل تھی، جس سے بالغ ہونے پر انھیں نکل آنا تھا؟ یا وہ کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی؟ یہ آخری خیال اسے کسی کانٹے کی طرح چبھنے لگا، یہاں تک کہ اس سے خون رسنے لگا۔ اس نے اپنی چشمِ خیال سے شامی طلال (اس دکان کے مالک جہاں وہ کام کرتی تھی) کو دیکھا کہ بثینہ کی بانہہ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہے اور شادی کا سوٹ زیب تن کیے ہوئے ہے۔

طٰہ کو محسوس ہوا کہ ایک بھاری فکر اس کے دل پر بوجھ بنی ہوئی ہے، لیکن جیسے ہی ٹیکسی پولیس اکیڈمی کی عمارت کے سامنے آ کر رکی، وہ اپنے خیالات کے تانے بانے سے باہر نکل آیا۔ عمارت اس لمحے مہیب اور تاریخی نظر آ رہی تھی، جیسے یہ قضا و قدر کا وہ قلعہ ہو جس میں اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو۔ امتحان کا ہول لوٹ آیا اور پھاٹک کی طرف بڑھتے ہوئے وہ دبی دبی آواز میں آیت الکرسی پڑھنے لگا۔

❋

ابسخرون کی جوانی کے دنوں کے بارے میں بے حد قلیل معلومات ملتی ہیں۔

ہمیں یہ نہیں معلوم کہ وہ چالیس سال کی عمر سے پہلے کیا کرتا رہا اور وہ کیا حالات تھے جن کے سبب اس کی دائیں ٹانگ کاٹنی پڑ گئی۔ ہماری ساری معلومات کا آغاز بیس سال پہلے مہاوتوں کے اس دن سے ہوتا ہے جب ابسخرون مادام سناء فانوس کی سیاہ شیورلے گاڑی میں عمارتِ یعقوبیان میں وارد ہوا۔ وہ بالائی مصر کی رہنے والی ایک قبطی بیوہ تھی: دولت مند، اور دو بچوں والی، جن کی تربیت کے لیے اس نے شوہر کی وفات کے بعد اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی۔ بچوں پر جان چھڑکنے کے

Scanned with CamScanner

باوجود، وہ وقتاً فوقتاً اپنے جسم کے من موجی تقاضوں سے بھی عہدہ برآ ہو لیتی۔ زکی الدسوقی کی اس سے جان پہچان 'آٹوموبیل کلب' میں ہوئی تھی اور وہ بھی کچھ عرصے تک اس کا رفیق رہا۔ اس تعلق سے کافی لذت اٹھانے کے باوجود اس کا دینی ضمیر اسے مسلسل بے کل رکھتا اور وہ لذت و راحت کے حصول کے بعد زکی کی آغوش میں پڑے پڑے اکثر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی، اور اپنے جرم کے مداوے کے طور پر گرجے کی وساطت سے بہت سے کارہائے خیر کی ذمے داری لے لیتی۔ چنانچہ یوں ہوا کہ زکی کے دفتر کے قدیم خادم برعی کے مرتے ہی اس نے اصرار کر کے ابسخر ون کو نوکر رکھوادیا (جس کا نام گرجا گھر کی محتاجوں کی فہرست میں درج تھا)، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ وہاں آ پہنچا، زکی بک سے اپنی پہلی ملاقات پر چوہے کی طرح کمر خمیدہ کھڑا ہوا، فرش پر نظریں گاڑے، اور زکی بک اس کی ابتر حالت، کٹی ہوئی ٹانگ اور بیساکھیوں کو دیکھ کر، جو سب مل جل کر اسے ایک گداگر کا حلیہ عطا کر رہی تھیں، اتنا مایوس ہوا تھا کہ اپنی دوست سناء سے فرانسیسی میں تمسخر کے ساتھ بول اٹھا تھا، "لیکن، میری پیاری، میں ایک دفتر چلا رہا ہوں، کوئی خیراتی ادارہ نہیں!"

وہ اسے اپنی عشوہ طرازیوں سے قائل کرنے کی مسلسل کوشش کرتی رہی یہاں تک کہ زکی ابسخر ون کو نوکر رکھنے پر جیسے تیسے راضی ہو گیا، اس خیال سے کہ دو چار روز سناء کی بات رکھ لے، پھر اسے چلتا کرے گا... لیکن ایسا کہاں ہوتا ہے، یہ رہے وہ دونوں! پہلے ہی دن سے ابسخر ون نے غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا: اس میں لگاتار تھکا مارنے والا کام کرنے کی بڑی نادر صلاحیت تھی، بلکہ وہ تو اپنی معمولہ ذمے داریوں میں نئے نئے کاموں کے اضافے کے لیے زکی بک سے روز خود ہی کہا کرتا۔ وہ بڑی تیز ذہانت کا مالک، زیرک اور پھرتیلا تھا۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جن کے باعث وہ ہمیشہ صحیح مقام پر صحیح کام کیا کرتا تھا، ساتھ ہی ساتھ غایت درجے کی رازداری بھی برتنا جانتا تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے سامنے پیش آنے والی کسی چیز کو نہ سنتا تھا اور نہ دیکھتا، خواہ یہ قتل ہی کیوں نہ ہو۔

انھیں خوبیوں کے طفیل چند ہی مہینوں میں زکی بک کے لیے ابسخر ون کے بغیر ایک گھنٹہ گزارہ کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ اس نے باورچی خانے میں ایک گھنٹی لگوادی تاکہ جب بھی اس کی ضرورت پڑے اسے بلا سکے، وافر تنخواہ مقرر کر دی اور اسے دفتر ہی میں رات گزارنے کی اجازت دے دی (یہ ایسی چیز تھی جو اس نے پہلے کبھی کسی اور کے ساتھ روا نہیں رکھی تھی)۔ پہلے ہی دن سے ابسخر ون زکی بک

Scanned with CamScanner

کی طبیعت کو خوب سمجھ گیا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کا آقا اپنی اشتہاؤں کا رسیا، لذت پرست اور من موجی آدمی ہے، اور یہ کہ اس کا سر کبھی نشے کے اثر سے خالی نہیں ہوتا۔ اس قسم کا آدمی (ابسخرون کے زندگی کے وسیع تجربے کے مطابق) سریع الغضب اور گرم طبیعت تو ہوتا ہے، لیکن بمشکل ہی ضرر رساں؛ بہت ہوا تو بس گالیاں دے لے گا یا ڈانٹ ڈپٹ کر لے گا۔ ابسخرون نے خود سے عہد کیا کہ وہ اپنے آقا سے نہ کبھی بحث کرے گا نہ اس کی کسی بات پر سوال کرے گا، اور معذرت خواہی اور حصولِ خوشنودی میں خود ہی پہل کرے گا تاکہ اس کی مہر و عاطفت حاصل کر سکے۔ اسی طرح وہ اسے 'عالیجاہ' کے علاوہ کسی اور لفظ سے کبھی مخاطب نہیں کرتا تھا، جو وہ اپنے ہر جملے میں ٹانک دیتا۔ چنانچہ، مثال کے طور پر اگر بک اس سے پوچھتا، ''اب کیا وقت ہوا ہے؟'' تو ابسخرون جواب دیتا، ''پانچ بجے ہیں، عالیجاہ۔''

حقیقت میں ابسخرون کا خود کو اپنے کام کے مطابق ڈھالنا ایک حد تک کسی حیاتیاتی مظہر کی یاد دلاتا ہے۔ سو اس پُرسکوت اندھیرے کے بیچ میں جو دن کے وقت اپارٹمنٹ میں چھایا رہتا ہے اور اس قدیم اُبسی ہوئی بو میں جو پرانے فرنیچر کی مہک اور رطوبت اور دوہری طاقت والے کاربالک ایسڈ کے ملاپ سے اٹھتی ہے جس سے زکی بک کا اصرار ہوتا ہے کہ غسلخانے کی صفائی کی جائے — تو اس بیچ میں، جب ابسخرون اپنی بیساکھیاں ٹیکتا ہوا اپارٹمنٹ کے کسی گوشے سے اپنے ہمیشہ کے غلیظ جلباب، سال خوردہ، کتّے جیسے لٹکے ہوئے چہرے اور خوشنودی کی طالب مسکراہٹ کے ساتھ نمودار ہوتا ہے تو وہ مخلوق معلوم ہوتا ہے جو اپنے فطری ماحول میں بڑی مستعدی سے کام کر رہی ہو (جیسے پانی میں مچھلی، یا نالی میں کیڑے)۔ بلکہ جب کسی سبب سے اسے عمارتِ یعقوبیان سے باہر جانا پڑ جاتا ہے تو وہ دھوپ میں چمکتی ہوئی سڑک پر راہگیروں اور گاڑیوں کے شور و شغب کے بیچ گزرتا ہوا عجیب اور بالکل بے محل نظر آتا ہے (جیسے دن کی روشنی میں کوئی چمگادڑ)، اور اس کی سالمیت اسی وقت بحال ہوتی ہے جب وہ دفتر میں لوٹ آتا ہے، جہاں اس نے تاریکی اور رطوبت میں چھپے چھپے دو دہائیاں بتا دی ہیں۔

ہمیں یہ سزاوار نہیں کہ ابسخرون کو محض ایک جی حضوری کرنے والا خادم سمجھ کر بیٹھ رہیں۔ حقیقت میں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے، اور اس کے غلامانہ، کمزور ظاہر کے پیچھے بڑا مضبوط ارادہ اور ایسے ٹھوس مقاصد چھپے بیٹھے ہیں جن کے لیے وہ بہادری اور ہٹ دھرمی سے لڑ بھی سکتا ہے۔ تین بیٹیوں کی پرورش اور تعلیم کے علاوہ اس نے اپنے چھوٹے بھائی ملاک اور اس کے اہل و عیال کی ذمے داری

Scanned with CamScanner

بھی اپنے کندھوں پر لے رکھی ہے۔ اس سے ہمیں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر شام جب وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں اکیلا ہوتا ہے اور اپنے جلباب کی جیب سے ایک ایک سکّہ، پسینے میں تر ایک ایک تہہ کیا ہوا نوٹ — براہ راست بخشش کے طور پر ملا ہوا یا دفتر کی خریداری سے اچکا ہوا — نکالتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہے۔ (ابسخرون کے دلالی کے طریقوں کو تیر بہدف اور بڑی ماہرانہ جعل سازی کا نمونہ شمار کیا جاسکتا ہے۔ وہ کسی اناڑی کی طرح اپنی خرید کی قیمت بڑھا چڑھا کر نہیں بتاتا، کیونکہ قیمتیں معلوم ہی ہوتی ہیں، یا کسی بھی لمحے معلوم کی جاسکتی ہیں۔ اس کے بجائے وہ ہر روز قہوے، چائے اور شکر کی کچھ مقدار اڑا لیتا ہے جو اتنی قلیل ہوتی ہے کہ نظر میں نہیں آتی، پھر انھیں نئے لفافوں میں بھر کر زکی بک کو دوبارہ بیچ دیتا ہے، اصلی رسیدوں کے ساتھ جو اس نے ایک ذاتی معاہدے کے تحت شارع معروف کے ایک دیندار سنّی کرانہ فروش سے حاصل کی ہوتی ہیں۔)

ہر شام، سونے سے پہلے، ابسخرون اپنی نقدی دوبار بڑی احتیاط سے گنتا ہے، پھر اپنی پکّی نیلی روشنائی والی پنسل کان کے پیچھے سے نکالتا ہے جہاں وہ ہمیشہ جمی رہتی ہے، اور اپنی آمدنی کا میزان لکھتا ہے، اس میں سے وہ رقم منہا کرتا ہے جو وہ بچانے والا ہے (جسے وہ اتوار کے دن اپنے بچت کھاتے میں جمع کرا دے گا اور کبھی ہاتھ نہیں لگائے گا)، اور پھر بقیہ آمدنی میں سے اپنے بڑے سے کنبے کی ضروریات کو اپنے ذہن میں ادا کرتا ہے۔ اور اس کے بعد چاہے کچھ بچے یا نہ بچے، ابسخرون، جو ایک باایمان عیسائی ہے، اس وقت تک ہرگز نہیں سوئے گا جب تک اپنے رب کے حضور شکرانے کی دعا نہ مانگ چکا ہو، اور جب وہ باورچی خانے کی دیوار پر ٹنگی یسوع مصلوب کی شبیہ کے سامنے سچی دلسوزی سے گڑگڑاتا ہے تو اس کی آوازرات کے سناٹے میں گونجنے لگتی ہے، ”کیونکہ، اے رب، تو نے مجھے، اور میرے بچوں کو کھلایا پلایا ہے؛ سو میں تیری حمد کرتا ہوں، کہ تیرا نام آسمانوں میں عظمت والا ہے۔ آمین۔“

❋

دو باتیں، ناگزیر طور پر، ملاک کے بارے میں بھی۔

ہاتھ کی انگلیاں دیکھنے میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں، لیکن کسی عمل کی بجاآوری میں ہم آہنگی سے حرکت کرتی ہیں۔ اسی طرح، فٹ بال کے میدان میں، وسطی کھلاڑی گیند کو نہایت

Scanned with CamScanner

مہارت سے لات مارتا ہے کہ وہ ٹھیک اسٹرائیکر کے قدموں میں جا پہنچے اور وہ گول کر سکے۔ اپنے بھائی ملاک سے ابسخر ون کے تعلق میں بھی یہی غیر معمولی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

ملاک نے نوعمری ہی میں قمیصوں کی سلائی کی دکان میں درزی کا کام سیکھ لیا تھا؛ اسی لیے، اپنے بھائی کے برخلاف، گھروں کی نوکری چاکری کی ذلت کا اس پر کوئی نشان نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا کوتاہ قد، گہرے رنگ کا سستا 'عوامی' سوٹ، باہر کو نکلی ہوئی توند، خوشگواری سے عاری فربہ چہرہ، یہ سب دیکھنے والے کو پہلے پہل سراسیمگی کا تاثر دیتے ہیں۔ تاہم وہ جس کسی سے بھی ملتا ہے، اس کا استقبال اپنی کشادہ مسکراہٹ اور گرمجوش مصافحے سے کرتا ہے، اس سے پرانے دوستوں کی طرح باتیں کرتا ہے، اس کی تمام رایوں سے اتفاق کرتا ہے (اگر وہ اس کی ضروری مصلحتوں سے متعارض نہ ہوں)، اور پھر بڑی احتیاط سے اپنی جیب سے 'قلوبطرہ' مارکہ سگریٹ کا مڑا تڑا پیکٹ نکال کر بڑے اصرار کے ساتھ اسے پیش کرتا ہے، اور ہر بار پیکٹ کو یوں الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے جیسے وہ کوئی ہیرا ہو۔ اس کے باوجود، اس حد سے بڑھے ہوئے تپاک کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ اگر ضرورت آپڑے تو ملاک ایک ثانیے میں اور بڑی آسانی کے ساتھ اتنی غلیظ ترین زبان بھی استعمال کر سکتا ہے جس کی کسی ایسے شخص سے توقع کی جا سکتی ہے جس کی بیشتر تعلیم و تربیت سڑکوں کی دین ہو۔ چونکہ وہ دو متضاد باتوں کا مجموعہ ہے — خباثت اور بزدلی، اپنے مخالف کو شدید ایذا پہنچانے کی خواہش اور نتائج کا غلو آمیز خوف — وہ اپنی لڑائیوں میں جو کچھ بھی پاس ہو، اس کے ذریعے حملہ آور ہونے کا عادی ہو گیا ہے۔ اگر کسی مزاحمت کا سامنا نہ ہو تو وہ اپنی عداوت کی انتہا تک چلا جائے گا، ذرا سا بھی رحم کیے بغیر، جیسے خوف کا مطلب ہی نہ جانتا ہو۔ لیکن اگر اپنے غنیم سے سخت مقاومت کا سامنا کرنا پڑ جائے تو وہ دو لمحے تامل کیے بغیر فوراً پیچھے ہٹ جائے گا۔ ملاک کی ان اعلیٰ درجے کی مہارتوں پر ابسخر ون کی ذہانت اور چالاکی مستزاد ہے، چنانچہ یوں دونوں کامل ہم آہنگی کے ساتھ کارفرما ہوتے ہیں اور، سچ پوچھیں تو، ایسے کرتب دکھاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

دونوں بھائی چھت پر ایک کمرہ حاصل کرنا چاہتے تھے، چنانچہ مہینوں تک اس کی منصوبہ بندی اور تدبیر کرتے رہے یہاں تک کہ، ٹھیک اُس دن، عمل کی گھڑی آ پہنچی۔ رباب زکی بک سے ملنے ابھی داخل ہی ہوئی تھی کہ ابسخر ون نے، جو دروازے میں کھڑا تھا، جھک کر ایک مبہم سی مکر بھری

مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ''عالیجاہ، اجازت ہو تو جلدی سے ایک کام کر آؤں؟'' ابھی اس نے جملہ بمشکل ختم ہی کیا تھا کہ زکی بک نے (جو اپنی معشوقہ میں منہمک تھا) اسے رخصت ہونے کا اشارہ کیا۔ ابسخرون نے ہولے سے دروازہ بند کیا اور اس کا چہرہ، راہداری کے ٹائلوں پر اس کی چوبی بیساکھیوں کے پڑتے ہی، بدلتا ہوا نظر آیا۔ وہ غلامانہ، خوشامدی مسکراہٹ ہرن ہوگئی اور اس کی جگہ ایک گمبھیر اور متفکر تاثر نمودار ہوا۔ ابسخرون چھوٹے سے باورچی خانے کے پاس آیا، جو اپارٹمنٹ میں داخلے کے دروازے کے برابر واقع تھا، اور بڑے محتاط انداز میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ پھر، ایک بیساکھی کے سہارے سیدھا کھڑا ہوگیا یہاں تک کہ دیوار پر ٹنگی مریم عذرا کی تصویر بڑی احتیاط سے ہٹا دی جس کے پیچھے ایک طاق تھا۔ اس میں ہاتھ گھسیڑ کر اس نے نوٹوں کے کئی بڑے بڑے بنڈل نکال لیے اور انھیں بڑی حرص کے ساتھ اپنی صدری اور جیبوں میں ٹھونسنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے پیچھے دروازہ بڑی آہستگی اور مضبوطی کے ساتھ بند کیا اور اپارٹمنٹ سے چلتا بنا۔ عمارت کے صدر دروازے پر پہنچ کر وہ بیساکھی کی مدد سے دائیں طرف مڑا اور چوکیدار کے کمرے کے قریب آیا، جس میں سے اس کا بھائی ملاک، جو وہاں اس کا انتظار کر رہا تھا، تیزی سے باہر نمودار ہوا۔ دونوں بھائیوں نے تفہیم کی واحد نگاہ کا تبادلہ کیا اور چند منٹوں بعد وہ فکری عبدالشہید سے، جو عمارتِ یعقوبیان کے ایجنٹ کا مختار تھا، 'آٹو موبیل کلب' میں ملنے شارع سلیمان باشا پر چلے جا رہے تھے۔

انھوں نے مہینوں سے خود کو اس ملاقات کے لیے تیار کر رکھا تھا اور اس کی بابت اپنے درمیان خوب بات چیت کر لی تھی، یہاں تک کہ اس پر مزید کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ وہ خاموشی سے چلتے رہے، گو ابسخرون سرگوشیوں میں مریم عذرا اور یسوع ناجی سے اس مہم میں کامیابی عطا کرنے کی دعائیں مانگتا رہا۔ اس کے برخلاف، ملاک فکری بک سے گفتگو شروع کرنے کے لیے مناسب ترین فقرے کی تلاش میں اپنا دماغ کھنگال رہا تھا۔ اس نے پچھلے کئی ہفتے فکری کے بارے میں معلومات جمع کرنے میں لگائے تھے۔ اب اسے معلوم ہوگیا تھا کہ یہ شخص پیسے کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے اور اسے شراب اور عورتیں مرغوب ہیں۔ وہ قصر النیل پر اس کے دفتر جا کر اس سے مل چکا تھا اور 'اولڈ پار' وسکی کی ایک بوتل بھی تحفتاً دے چکا تھا، جس کے بعد ہی کہیں جا کر اس نے چھت کے داخلے کے پاس والے آہنی کمرے کا ذکر چھیڑا تھا جو اخبار فروش عطیہ کی موت کے بعد سے خالی پڑا تھا، جو

بے شادی کیے ہی وہاں زندہ رہا اور مرا، اور اب اس کا کمرہ عمارت کے مالک کو واپس مل رہا تھا۔ ملاک جب سے تیس سال کا ہوا تھا اور ملازم کے طور پر حالات کے حساب سے ایک دکان سے دوسری میں دھکے کھاتا پھرتا رہا تھا، اس کمرے میں قمیصوں کی سلائی کی دکان کھولنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے یہ موضوع چھیڑا تو فکری نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا اور ملاک اور اس کے بھائی کے بے حد دباؤ ڈالنے پر چھ ہزار پاؤنڈ کے عوض (ایک کوڑی کم نہیں) کمرہ انھیں دینے کی حامی بھر لی۔ اس نے انھیں آٹو موبیل کلب میں ملنے کا وقت دیا تھا جہاں وہ ہر اتوار کو دوپہر کا کھانا کھانے کا عادی تھا۔ جب دونوں بھائی کلب پہنچے تو ابسخرون اس جگہ کی شان وشوکت سے بری طرح رعب کھا گیا اور دیواروں اور فرش کے سچے سنگِ مرمر اور لفٹ تک پھیلے ہوے نہایت پُر آسائش سرخ قالین کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ ملاک کو اس کا احساس ہوگیا اور اسے بڑھاوا دینے کے لیے اس نے اس کا بازو دبایا، پھر کلب کے دربان سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوے فکری عبدالشہید کا پوچھا۔ اس دن کی تیاری میں ملاک نے پچھلے دو ہفتوں میں کلب میں کام کرنے والوں سے واقفیت پیدا کر لی تھی اور مہربان اور مجرّب الفاظ اور چند سفید جلابیوں کے نذرانے پیش کر کے ان سے دوستی بھی لگا لی تھی۔ چنانچہ ویٹر اور کلب کے دوسرے ملازم دونوں بھائیوں کی پذیرائی کے لیے تیزی سے بڑھے اور دوسری منزل کے ریستوران کی طرف ان کی رہنمائی کی جہاں فکری بک اپنی کسی فربہ اندام سفید فام دوست کے ساتھ بیٹھا لنچ کھا رہا تھا۔ قدرتی بات ہے، دونوں بھائی فکری بک کی بیٹھک میں مخل ہونے سے رہے، چنانچہ انھوں نے کسی کو اس کے پاس بھیجا کہ ان کی آمد کی اطلاع کر دے، اور خود ایک بغلی کمرے میں اس کا انتظار کرنے لگے۔

چند منٹ لگے ہوں گے کہ فکری عبدالشہید نمودار ہوا، اپنے موٹے جسم، بڑے سے قطعہ گنج، اور غیر ملکیوں جیسے سرخ وسفید چہرے سمیت؛ اس کی آنکھوں کی سرخی اور لفظوں کے تلفظ میں خفیف سے ادغام سے یہ وضاحت فوراً ہوگئی کہ بے حد پیے ہوے ہے۔ تسلیمات اور رسمی تحسینات کے بعد ابسخرون نے فکری بک کی لمبی مدح سرائی شروع کر دی، اس کی رحم دلی اور اس کے سارے افعال میں یسوع مخلص سے مشابہت کے گن گانے لگا۔ اس نے اپنی حکایت جاری رکھی (اس کا بھائی ملاک توجہ اور بناوٹی پسندیدگی سے سنتا رہا) کہ کس طرح فکری بک اپنے بہت سے موکلوں کے مقدموں کا محنتانہ

معاف کر دیتا تھا، اگر یہ پتا چل جاتا کہ ان کے ساتھ ظلم ہوا ہے یا وہ نادار ہیں اور اسے ادا نہیں کر سکتے۔
''ملاک، تمھیں معلوم ہے کہ اگر کوئی مفلس موکل پیسے دینے کی کوشش کرتا ہے تو فکری بک اس سے کیا کہتے ہیں؟'' سوال پوچھنے کے بعد اسحر ون نے جلدی سے خود ہی اس کا جواب بھی دے دیا۔ ''وہ کہتے ہیں، 'جاؤ، جا کر یسوع کو شکرانے کا سجدہ کرو، کیونکہ اس نے مجھے تمھارے مقدمے کی پوری پوری فیس ادا کر دی ہے!''' ملاک نے اپنے ہونٹ چوسے، نکلی ہوئی توند پر ہاتھ باندھے، نیچے فرش پر یوں دیکھا جیسے بری طرح مغلوب ہو گیا ہو، اور بولا، ''سچا مسیحی ایسا ہی ہوتا ہے!''

نشے میں ہونے کے باوجود فکری بک کو گفتگو کی روش کا اندازہ تھا اور اس میں مخفی معنی اسے اچھے نہیں لگے؛ چنانچہ معاملے کا تصفیہ کرنے کے لیے اس نے دوٹوک لہجے میں کہا، ''رقم لائے ہو، جیسا کہ طے ہوا تھا؟''

''بالکل، حضرت فکری بک،'' اسحر ون نے بلند آواز میں کہا، اور کاغذ کے دو پرزے اسے تھما دیے۔ ''یہ رہا معاہدہ جو عالیجاہ کے ساتھ طے ہوا تھا، خدا آپ پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔''

پھر اس نے پیسے نکالنے کے لیے صدری میں ہاتھ ڈالا۔ وہ طے شدہ چھ ہزار پاؤنڈ لایا تھا لیکن نوٹوں کو اپنے لباس میں مختلف جگہوں پر تقسیم کر دیا تھا تاکہ بھاؤ تاؤ کی گنجائش رکھ سکے۔ اس نے پہل چار ہزار پاؤنڈ سے کی اور انھیں فکری بک کے آگے کر دیا، جو غصے سے چلایا، ''یہ کیا ہے؟ باقی رقم؟'' اس پر دونوں بھائیوں بیک آواز، جیسے موسیقی کا کوئی پارہ الاپ رہے ہوں، منت سماجت کرنے لگے — اسحر ون اپنی خرخراتی، بلغمی اور مرتعش آواز میں اور ملاک اپنے تیز، بلند، اور اونچے سروں میں، اس طرح کہ ان کے کلمات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگے اور جلد ہی ناقابلِ فہم ہو گئے، لیکن مجموعی طور پر ان کا مقصد اپنی غربت کا ذکر کر کے فکری بک کی ہمدردیوں کو ابھارنا تھا، اور یہ جتانا تھا کہ مسیح زندہ کی قسم، انھیں رقم حاصل کرنے کے لیے قرض لینا پڑا ہے، اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس سے زیادہ دینے کی ان کی استطاعت نہیں۔ فکری بک ذرا نہ پسیجا، بلکہ اور زیادہ برہم ہو گیا اور یہ کہتے ہوئے کہ ''اس قسم کا کھیل بچے کھیلتے ہیں! یہ میرے کس کام کا!'' واپس ریستوران میں جانے کے لیے مڑا۔ اسحر ون نے، جو اس حرکت کا متوقع تھا، اتنے زور سے خود کو فکری بک کی طرف پھینکا کہ ڈگمگا گیا اور گرنے کو ہوا لیکن بجلی کی سی تیزی سے نوٹوں کا ایک اور بنڈل، ہزار پاؤنڈ کی مالیت کا، اپنے جلباب

کی جیب سے نکال کر دوسرے بنڈلوں کے ساتھ بک کی جیب میں ٹھونس دیا، جس نے کسی شدید مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس حرکت کو ہونے دیا۔ اس پر ابسخرون کو ایک بار پھر منت سماجت کرنے کی مہلت مل گئی، جس کے دوران اس نے ایک سے زائد بار فکری بک کے ہاتھ پر بوسہ دینے کی کوشش بھی کر ڈالی، اور بالآخر اپنی اصرار آمیز التجاؤں کو ایک خاص الخاص حربے کے ساتھ ختم کیا جو وہ انتہائی نازک موقعوں کے لیے سنبھالے رکھتا تھا۔ اس نے یکبارگی اپنے دھڑ کو پیچھے کی طرف خم دے کر دونوں ہاتھوں سے اپنا بوسیدہ، میلا کچیلا جلباب اوپر اٹھا دیا تاکہ اس کی کٹی ہوئی ٹانگ، جو بڑے دردناک طور پر اپنے سیاہی مائل مصنوعی چوکھٹے سے جڑی ہوئی تھی، ظاہر ہو جائے۔ بھرآئی ہوئی، اکھڑی اکھڑی آواز میں، جس کا مقصد ترحم کو ابھارنا تھا، اس نے چلّا کر کہا، "حضور بک، خدا آپ کے بچوں کو سلامت رکھے، میں اپاہج ہوں، میری ٹانگ کٹی ہوئی ہے! ایک عاجز جس کے سر پر ڈھیر سارے بچوں کی پرورش کا بوجھ ہے، اور ملاک کے اپنے چار بچے اور ان کی ماں جن کی کفالت کرنی ہے! حضور بک، اگر آپ کو سید مسیح سے محبت ہے تو مجھے دل شکستہ نہ لوٹائیں!"

یہ سب زکی بک کے تحمل سے کہیں زیادہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ تینوں بیٹھے معاہدے پر دستخط کر رہے تھے — فکری عبدالشہید اس بات پر چراغ پا جسے بعد میں، اپنی دوست سے واقعہ بیان کرتے ہوئے، اس نے 'جذباتی ڈکیتی' کا نام دیا؛ ملاک، ان اولین کاموں کی سوچ میں غلطاں جو چھت کے کمرے میں اسے انجام دینے ہوں گے؛ اور رہا ابسخرون، تو اس نے اپنے چہرے پر اپنا آخری، تصنع آمیز تاثر قائم رکھا (ایک غمزدہ، شکستہ نگاہ، جیسے اسے پسپائی نصیب ہوئی ہو، جیسے اس کی بساط سے زیادہ بوجھ اس پر لاد دیا گیا ہو)؛ لیکن اندرونی طور پر وہ دونوں باتوں پر خوش تھا، یعنی یہ کہ کوٹھری کا معاہدہ ہو گیا ہے اور اس نے اپنی مہارت سے ہزار پاؤنڈ کا بنڈل بھی بچا لیا ہے، جس کی پُرلطف حرارت وہ اپنے جلباب کی دائیں جیب میں محسوس کر سکتا ہے۔

❁

ڈاؤن ٹاؤن یا وسطِ شہر کم از کم سو سال تک قاہرہ کا تجارتی اور معاشرتی مرکز رہا، ان معنوں میں کہ یہاں بڑے بڑے بینک، غیر ملکی کمپنیاں، دکانیں، شفاخانے اور مشہور ڈاکٹروں اور وکیلوں کے دفتر، سینما گھر، اور بڑے پر تکلف طعام خانے واقع تھے۔ مصر کے سابقہ ممتاز طبقے کے لوگوں نے ڈاؤن

ٹاؤن کے علاقے کو قاہرہ کے یورپی محلے کے طور پر تعمیر کیا تھا، یہاں تک کہ اس کی سڑکیں بھی آپ کو یورپ کے بڑے بڑے شہروں کی سڑکوں سے مشابہ نظر آئیں گی، ویسا ہی طرزِ تعمیر اور ویسی ہی قابلِ تعظیم تاریخی ٹیپ ٹاپ۔ انیس سو ساٹھ کی دہائی کے شروع تک ڈاؤن ٹاؤن کی خالص یورپی فضا برقرار تھی اور شہر کے پرانے باسیوں کو یقیناً وہ رونق اب بھی یاد ہو گی۔ شہر کے دیسی باشندوں کا اپنے جلبابوں میں ڈاؤن ٹاؤن میں گھومتے پھرنا نامناسب سمجھا جاتا تھا، اور یہ محال تھا کہ اپنے اس عوامی حلیے میں انھیں کسی ریستوران، مثلاً ''گروپی''، ''الامریکن'' یا 'اودیون''، حتیٰ کہ سینماؤں ''میترو''، ''سان جیمس'' اور ''رادیو'' میں داخل ہونے کی اجازت مل جائے، یا ایسی جگہوں میں جن کا مطالبہ ہوتا کہ ان کے سرپرست مرد تھری پیس سوٹ اور عورتیں شام کے ڈریس پہنے ہوئے ہوں۔ اتوار کو ساری دکانیں بند رہتیں، اور مسیحی کیتھولک تہواروں، جیسے کرسمس اور نیو ائیر، کے موقعے پر سارے ڈاؤن ٹاؤن کو خوب سجایا جاتا، گویا یہ کوئی بڑا، غیر ملکی شہر ہو۔ عمارتوں کے کانچ کے بنے پیش رخوں میں انگریزی اور فرانسیسی تہنیتی کلمات، کرسمس ٹریز اور فادر کرسمس کی نمائندہ شبیہیں جگمگاتیں، اور ریستوران اور میخانے غیر ملکیوں اور رئیسوں سے کھچا کھچ بھرے ہوتے، جو پیتے، گاتے اور رقص کرتے ہوئے یہ تہوار مناتے۔

ڈاؤن ٹاؤن ہمیشہ چھوٹی چھوٹی باروں سے بھرا رہا ہے جہاں، فراغت کے وقتوں یا چھٹی کے دنوں میں، لوگ چند جام اور اشتہا آور لذیذ چیزیں مناسب قیمت پر حاصل کر سکتے ہیں۔ تیسری اور چوتھی دہائی میں یہ باریں مشروبات کے علاوہ یونانی یا اطالوی موسیقاروں یا غیر ملکی یہودی رقاصاؤں کے کسی طائفے کے چھوٹے موٹے تماشے بھی پیش کیا کرتیں۔ انیس سو ساٹھ کی دہائی کے آخر تک اکیلی شارع سلیمان باشا پر تقریباً دس چھوٹی موٹی باریں تو ہوں گی۔ پھر 1970 کے سال آئے اور ڈاؤن ٹاؤن رفتہ رفتہ اپنی اہمیت کھونے لگا؛ قاہرہ کا قلب رفتہ رفتہ المہندسین اور مدینۃ نصر منتقل ہو گیا جہاں نئے منتخب روزگار لوگ رہتے تھے۔ مذہبیت کی ایک موجِ تند و تیز مصری معاشرے کو بہا لے گئی اور شراب نوشی سماجی طور پر قابلِ قبول نہ رہی۔ مصری حکومت کو ایک کے بعد ایک مذہبی دباؤ کے آگے سر جھکانا پڑا اور (شاید سیاسی اعتبار سے مخالف اسلامی لہر سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جانے کی کوشش میں) اس نے شراب کی فروخت کو اہم ہوٹلوں اور ریستورانوں تک محدود کر دیا اور نئی باریں کھولنے

Scanned with CamScanner

کے اجازت نامے جاری کرنا بند کردیے۔ اگر کسی بار کا مالک (عام طور پر غیر ملکی) مرجاتا، تو حکومت اس کی بار کا اجازت نامہ منسوخ کردیتی اور ورثا سے اپنے کاروبار کی نوعیت بدل دینے کا تقاضا کرتی۔ اس پر پولیس کے مسلسل چھاپے الگ، جن کے دوران بار کے گاہکوں کی تلاشی لی جاتی، ان کے شناختی کارڈوں کا معائنہ کیا جاتا، اور بعض اوقات تفتیش کے لیے تھانے لے جایا جاتا۔

اس طرح، انیس سو اسی کی دہائی کے آتے آتے، پورے ڈاؤن ٹاؤن میں بکھری بکھری سی معدودے چند باریں ہی باقی بچ رہی تھیں جن کے مالکان، مذہبی دراز دستی اور سرکاری ظلم و تعدی کے باوصف، ڈٹے رہے۔ یہ انھوں نے دو طریقوں سے کیا: چوری چھپے یا رشوت کے ذریعے۔ سارے ڈاؤن ٹاؤن میں ایک بھی بار ایسی نہیں تھی جو اپنی موجودگی کا اعلان کرتی ہو۔ بلکہ ہوا یوں کہ تختیوں پر 'بار' کے لفظ کو 'مطعم' (ریستوران) اور 'کافی شوپ' (کافی شاپ) سے بدل دیا گیا، اور باروں اور شراب کی دکانوں کے مالکان نے اپنی جگہوں کی کھڑکیوں کے شیشیوں پر دانستہ سیاہی مائل رنگ چڑھا دیے تاکہ اندر کا ماجرا دکھائی نہ دے سکے، یا اپنی نمائشی کھڑکیوں میں کاغذی نیپکن یا ایسی ہی دوسری چیزیں رکھ دیں جن سے ان کے اصلی دھندے کی پردہ پوشی ہو جائے۔ اب گاہک کو بار کے سامنے فٹ پاتھ پر کیا، کسی کھڑکی کے سامنے بھی جو سڑک کے رخ کھلتی ہو، مے نوشی کی اجازت نہ رہی، اور جب سے اسلامی تحریک سے وابستہ نوجوانوں نے شراب کی متعدد دکانیں نذرِ آتش کردی تھیں، بڑی سخت احتیاطوں سے کام لینا پڑتا تھا۔

دوسری طرف، جو گنی چنی باریں بچ رہی تھیں، ان کے مالکان سے یہ مطالبہ کیا جاتا تھا کہ وہ سادہ لباس والے خفیہ پولیس کے افسروں کو، جن کے علاقے میں ان کی باریں آتی تھیں، اور انتظامی ادارے کے افسروں کو بھی، باقاعدگی سے رشوت دیں، تاکہ وہ انھیں اپنا دھندا جاری رکھنے کی اجازت دے سکیں۔ بعض اوقات سستی، مقامی شراب کی فروخت سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی کہ رشوت دی جا سکے، چنانچہ باروں کے مالکان آمدنی میں اضافے کے لیے 'دوسرے ذرائع' استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ ان میں سے بعضوں نے قحبگی کی سہولت کے لیے گری پڑی عورتوں کو ساقی گری کے لیے رکھنا شروع کردیا (جیسا کہ التوفیقیہ کی 'کائرو بار' اور شارع عمادالدین پر 'میدو بار' اور 'پُسی کیٹ' میں ہوا)۔ بعض نے شراب خریدنے کے بجائے بنیادی قسم کی بھٹیوں میں خود اپنی شراب بنانی شروع کر

دی تا کہ زیادہ نفع ہو سکے، جیسا کہ شارع انتکخانہ کی 'ہالجیان بار' اور شارع شریف کی 'جمائیکا' میں ہوا۔ ان رڈی اور بے تکی بھٹیوں کی کشیدہ شرابوں نے کئی دردناک حادثات کو جنم دیا، جن میں مشہور ترین وہ تھا جو ایک نوجوان فنکار کو پیش آیا جو 'ہالجیان بار' میں فاسد برانڈی پی کر اپنی بینائی کھو بیٹھا۔ اس پر سرکاری وکیل نے بار بند کرنے کا حکم صادر کر دیا، لیکن بعد میں اس کے مالک نے جانے پہچانے طریقے استعمال کر کے اسے پھر سے کھول لیا۔

چنانچہ ڈاؤن ٹاؤن کی بچی کھچی چھوٹی باریں پہلے کی طرح اب تفریح کی صاف ستھری جگہیں نہیں رہی تھیں، بلکہ اُن کم روشن اور کم ہوادار بھٹوں میں بدل گئی تھیں جہاں آنے والے زیادہ تر غنڈہ گرد اور جرائم پیشہ قسم کے لوگ ہوا کرتے تھے، گو اس قاعدے میں چند نادر استثنیات بھی تھے، جیسے شارع قصر النیل اور شارع سلیمان باشا کی درمیانی گزرگاہ پر واقع 'میکسم بار'، اور 'شے نو بار' جو عمارتِ یعقوبیان کے نیچے واقع تھی۔

❁

'شے نُو' (Chez Nous) (جو 'ہمارے ہاں'' کا ہم معنی ایک فرانسیسی لفظ ہے) سڑک کی سطح سے چند قدم نیچے ہے، اور دبیز پردوں کی بدولت دن کے وقت بھی یہاں روشنی مدھم مدھم اور موہوم سی ہی ہوتی ہے۔ بڑی سی بار بائیں طرف ہے اور میزیں قدرتی لکڑی کی بنچیں ہیں جن پر گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ قدیم فانوس وینیز طرز کے ہیں، اور دیوار پر آویزاں فنی کام لکڑی یا کانسی سے تراشے گئے ہیں، کاغذی میز پوشوں پر جو تحریر ہے وہ لاطینی رسم الخط میں لکھی گئی ہے، اور بیئر نوشی کے خوب بڑے بڑے گلاس — یہ تمام اشیا اس بار کو کسی انگلش 'پب' کا روپ سروپ عطا کرتی ہیں۔ گرمیوں میں آپ شارع سلیمان باشا کو اپنے شور و شغب، حرارت، اور بھیڑ بھاڑ کے ساتھ پیچھے چھوڑ کر، جیسے ہی 'شے نو' میں داخل ہوتے ہیں اور ٹھنڈی بیئر پینے کے لیے پُرسکوت اور قوی ایرکنڈیشننگ اور دھیمی دھیمی، راحت بخش روشنی میں آ بیٹھتے ہیں تو آپ کو اچانک یوں محسوس ہوتا ہے جیسے روزمرہ کی زندگی سے کسی طرح روپوش ہو گئے ہیں۔ تخلیے کا یہ احساس 'شے نو' کی امتیازی خصوصیت ہے، جس کی شہرت بنیادی طور پر ہم جنس پرستوں کے ملنے ملانے کی جگہ کے طور پر ہوئی تھی (اور جس وصف کا ذکر ایک سے زائد مغربی سیاحتی گائیڈوں میں ہوا ہے)۔

Scanned with CamScanner

بار کے مالک کا نام عزیز ہے اور عرفیت 'انگریز' (یہ لقب اسے اپنے گورے چٹے بشرے، زردی مائل بالوں، اور نیلگوں آنکھوں کی بنا پر ملا ہے)، اور وہ خود بھی اسی علّت کا شکار ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس بوڑھے یونانی سے جو اس بار کا مالک تھا، اس کا یارانہ تھا؛ وہ اِسے چاہتا تھا اور مرنے سے پہلے یہ جگہ اسے تحفتاً دے گیا تھا۔ لوگ سرگوشیوں میں یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ بڑی جنونی محفلیں منعقد کرتا ہے جن میں عرب سیاحوں کی ہم جنسوں سے ملاقات کرائی جاتی ہے، اور ہم جنسوں کی اس قحبہ گری سے اسے وافر منافع ہوتا ہے جو رشوتیں دینے کے کام آتا ہے۔ ان رشوتوں کے باعث اس کی بار حفاظتی پولیس کی دق کر دینے والی توجہ سے دور ایک جائے امن بن گئی ہے۔ عزیز کی پہنچ وسیع ہے اور اسے ہر قسم کے حالات سے نبٹنے کا ملکہ حاصل ہے؛ 'شے نو بار' میں کج رو لوگ اس کی نگرانی اور توجہ میں ملتے ملاتے ہیں، دوستیاں لگاتے ہیں، ان معاشرتی دباؤوں سے مامون جن کے باعث وہ اپنے جنسی رجحان کی تشہیر کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔

ہم جنسوں کے ملنے ملانے کی جگہیں حشیش کے اڈوں اور قمار خانوں کی طرح ہوتی ہیں، ان معنی میں کہ ان کے گاہک سماج کی ہر سطح کے اور مختلف عمروں کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں آپ کو منجھے ہوئے کاریگر اور پیشہ ور بھی مل جائیں گے، نوجوان بھی اور سن رسیدہ بھی، جن کی قدرِ مشترک ان کی ہم جنسی ہوتی ہے۔ اسی طرح، ہم جنس، چوراچکوں، جیب کتروں اور ہر ایسے گروہ کی طرح جو قانون کے باہر ہو، اپنے استعمال کے لیے ایک مخصوص زبان وضع کر لیتے ہیں جو اغیار کی موجودگی میں ایک دوسرے کا مدعا سمجھ لینے کے کام آتی ہے۔ چنانچہ وہ مفعول ہم جنس کے لیے 'کودیانا' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اسے زنانہ نام دیتے ہیں، جس سے وہ ان کے درمیان پہچانا جاتا ہے، جیسے 'سعاد'، 'انجی'، 'فاطمہ'، وغیرہ۔ فاعل ہم جنس کو 'برغل' کہتے ہیں، اور اگر وہ جاہل اور سیدھا سادا ہو تو 'برغل خشک'؛ دو مذکروں کی جفتی 'وصلہ' کہلاتی ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے کی پہچان میں آجاتے ہیں اور ہاتھوں کے اشاروں سے خفیہ گفتگو کرتے ہیں۔ چنانچہ جب ان میں سے ایک، دوسرے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر، مصافحہ کرتے ہوئے، انگلیوں سے اس کی کلائی تھپتھپاتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اسے اس کی خواہش ہو رہی ہے، اور جب ایک ہم جنس کسی سے دورانِ گفتگو اپنی دو انگلیاں ملا کر حرکت دیتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو جفتی کی دعوت دے رہا ہے، اور اگر وہ اپنے دل کی طرف صرف ایک

انگلی سے اشارہ کرتا ہے تو یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اس کا دل تنہا اس کے عاشق کی ملکیت ہے، وغیرہ وغیرہ۔

جس طرح عزیز انگریز 'شے نوٗ' کے سرپرستوں کی آسائش اور خوش طبعی کا خیال رکھتا ہے، اسی طرح وہ انھیں کسی قسم کی بیہودگی کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ جوں جوں رات گہری ہوتی جاتی ہے، گاہکوں کی شراب نوشی بھی بڑھنے لگتی ہے، آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں، تیز ہوجاتی ہیں، اور وہ بار بار ایک دوسرے کی بات کاٹنے لگتے ہیں، کیونکہ بولنے کی خواہش ان پر غلبہ پالیتی ہے، جیسا کہ بھی میخانوں میں ہوتا ہے۔ لیکن 'شے نوٗ' کے شراب خور شہوت کے ساتھ ساتھ نشے کی گرفت میں آجاتے ہیں، عاشقانہ کلمات اور گندے لطیفوں کا تبادلہ کرنے لگتے ہیں، اور کبھی کبھی ان میں سے کوئی اپنا ہاتھ بڑھا کر انگلیوں سے اپنے رفیق کا جسم سہلانے لگتا ہے۔ اس وقت 'انگریز' فوراً مداخلت کرتا ہے اور نظم وضبط کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے ہر طریقہ استعمال کرتا ہے؛ وہ ایک شائستہ سرگوشی سے ابتدا کرتا ہے اور آخر میں خطاکار گاہک کو بار سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتا ہے۔ بعض اوقات تو 'انگریز' اتنا مشتعل ہوجاتا ہے کہ اس کا چہرہ سرخ بھبھوکا ہوجاتا ہے اور شہوت کے ہیجان میں آئے ہوئے کج رو شخص کو یہ کہتے ہوئے خوب جھاڑتا ہے: ''سنو، جب تک میرے یہاں ہو، تمیز سے رہو۔ اگر تمھیں اپنا رفیق اتنا ہی بھا گیا ہے تو اٹھو اور اس کے ساتھ چلتے بنو، لیکن خبردار جو بار میں اس کے کندھے پر ہاتھ تک رکھا!''

بار میں 'انگریز' کی سخت گیری، ظاہر ہے، کسی اخلاقی وجہ سے نہیں بلکہ سودوزیاں کے حساب سے ہے، کیونکہ سادہ لباس والے سپاہی اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ دور ہی سے ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے پر قناعت کرتے ہیں اور گاہکوں کو بالکل تنگ نہیں کرتے (ان بھاری رشوتوں کی بدولت جو انھیں ملتی ہیں)، لیکن اگر انھیں وہاں کوئی نازیبا فعل دکھائی دے جائے تو خوب فضیحتا مچاتے ہیں کیونکہ یہ ان کے لیے 'انگریز' سے اور زیادہ رقم اینٹھ لینے کا بہترین موقع ہوتا ہے۔

❁

آدھی رات سے ذرا پہلے بار کا دروازہ کھلا اور حاتم رشید ایک سانولے رنگ کے کوئی بیس سالہ جوان کے ساتھ نمودار ہوا جو سستے سے کپڑے پہنے تھا اور جس کے بال فوجیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے تھے۔ بار میں رند نشے میں دھت تھے اور خوب لبڑ دھوں دھوں مچا رہے تھے، تاہم حاتم کے داخل ہوتے ہی ان کی ہاؤہو کم ہوگئی اور وہ اسے تجسس اور قدرے ہیبت سے دیکھنے لگے۔

Scanned with CamScanner

انھیں معلوم تھا کہ وہ 'کودیانا' ہے لیکن ایک فطری حجاب انھیں اس کے ساتھ بے تکلف ہونے سے باز رکھتا تھا، حتیٰ کہ نہایت شوخ چشم اور رکیک ترین گاہکوں کی بھی یہ مجال نہیں تھی کہ اس کے ساتھ احترام کے علاوہ کسی اور طرح سے پیش آئیں۔

اس کی متعدد وجہیں تھیں۔ حاتم رشید ایک مشہور صحافی اور قاہرہ سے نکلنے والے فرانسیسی زبان کے اخبار لوکیر (Le Caire) کا مدیرِ اعلیٰ ہے۔ اس کا تعلق قدیم اشرافی خاندان سے ہے، ماں فرانسیسی اور باپ ڈاکٹر حسن رشید، ایک مشہور ماہرِ قانون، جو پچاس کی دہائی میں کلیۂ قانون کا ڈین ہوا کرتا تھا۔ اس بنا پر، حاتم رشید ایک 'قدامت پسند ہم جنس پرست' ہے (اگر یہ اصطلاح استعمال کی جا سکتی ہو): وہ اپنے وقار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، منھ پر غازہ نہیں ملتا، اور بہت سے دوسرے 'کودیانوں' کی طرح رجھانے پر چانے کے ترغیب انگیز انداز استعمال نہیں کرتا۔ وضع قطع اور سلوک میں وہ ہمیشہ بڑی مہارت سے ایسا انداز اختیار کرتا ہے جو خوش وضعی اور نسائیت کے بین بین ہو۔ مثلاً، آج رات اس نے ایک گہرا قرمزی شراب رنگ سوٹ پہن رکھا ہے اور اپنی گردن کے گرد پیلا اسکارف ڈالا ہوا ہے، جس کا بڑا حصہ اپنی گلابی رنگ کی ریشمی قمیص کے اندر اڑس رکھا ہے جس کے بڑے سے کالر کے دونوں سرے اس کے کوٹ کے آگے پھڑپھڑا رہے ہیں۔ اپنے دیدہ زیب لباس، نازک اندام جسم، تیکھے فرانسیسی خط و خال کے باعث وہ ایک تابناک فلم اسٹار نظر آتا اگر اس کے چہرے پر وہ جھرّیاں نہ پڑی ہوتیں جو اس کی بے مہار زندگی کی دین ہیں، اور وہ حزنیہ کیفیت نہ ہوتی جو ہم جنس پرستوں کے چہروں پر ہمیشہ کسی آسیب کی طرح سوار رہتی ہے۔

عزیز 'انگریز' اس کی پذیرائی کے لیے آگے بڑھا۔ حاتم نے بڑے تپاک کے ساتھ مصافحہ کیا اور اپنے نوخیز ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''عبدِ ربہ، میرے دوست، مرکزی سکیورٹی میں اپنی فوجی خدمت انجام دے رہے ہیں۔''

''اہلاً و سہلاً،'' عزیز نے مسکراتے ہوئے کہا اور مضبوط رگ پٹھوں والے جوان پر نظر ڈالی۔ پھر وہ اپنے دونوں مہمانوں کو بار کے کونے پر ایک خاموش سی میز پر لایا اور ان کا آرڈر لیا: حاتم کے لیے جن اینڈ ٹانک، عبدربہ کے لیے ایک غیر ملکی بیئر، اور کچھ گرم چبینا۔ رفتہ رفتہ دوسرے گاہکوں کی توجہ ان سے ہٹنے لگی اور وہ دوبارہ اپنی خوش گپیوں اور اُدھم بازی میں لگ گئے۔

Scanned with CamScanner

دونوں دوست کسی لمبی اور تکان آور بحث میں الجھے نظر آ رہے تھے۔ حاتم دبی دبی آواز میں بول رہا تھا اور اپنے ساتھی کی طرف دیکھ بھی رہا تھا، جیسے اسے کسی بات کا قائل کر رہا ہو؛ عبدربہ متاثر ہوئے بغیر سن رہا تھا اور تندی سے جواب بھی دیتا جا رہا تھا۔ حاتم چند لمحے کو خاموش ہو جاتا، سر جھکا لیتا، اور ایک بار پھر کوشش کرتا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک یہ گفتگو اسی طرح جاری رہی، جس کے دوران دونوں نے بیئر کی دو بوتلیں اور جن کے تین جام پی ڈالے۔ اس کے بعد حاتم نے ایک بار پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی اور عبدہ پر ایک برماتی ہوئی نظر ڈالی۔

''تو یہ تمھارا قطعی فیصلہ ہے؟''

عبدہ نے اونچی آواز میں جواب دیا، نشہ تیزی سے اس کے سر کو چڑھ چکا تھا، ''ہاں!''

''عبدہ، آج رات میرے ساتھ چلے چلو، صبح ہو گی تو ہم مفاہمت کی کوئی صورت نکال لیں گے۔''

''نہیں۔''

''پلیز، عبدہ۔''

''نہیں۔''

''اچھا، ٹھیک ہے۔ کیا ہم دھیمی آواز میں نہیں بول سکتے؟ مزاج کو ٹھنڈا رکھو!'' حاتم نے پیار سے سرگوشی میں اور میز پر رکھے ہوئے اپنے ساتھی کے بڑے سے ہاتھ کو انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا۔ اس اصرار پر عبدہ کا دم گھٹنے لگا اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس نے تنگ آ کر کہا، ''کہہ تو دیا کہ رات تمھارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ پچھلے ہفتے صرف تمھاری خاطر مجھے تین بار دیر ہو گئی۔ افسر میری رپورٹ کر دے گا۔''

''گھبراؤ مت۔ میرے پاس افسر تک رسائی کا ذریعہ ہے۔''

''اُوف!'' عبدہ زچ ہو کر چلّایا اور ہاتھ سے بیئر کے گلاس کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دھماکے کے ساتھ الٹ گیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا، حاتم پر ایک غضبناک نظر ڈالی، اور دروازے کی طرف تیزی سے بڑھا۔ حاتم نے بٹوے سے چند نوٹ نکال کر میز پر ڈال دیے اور تیزی سے اپنے ساتھی کے پیچھے لپکا۔ کچھ دیر تک بار میں خاموشی رہی۔ پھر بدمست رائے زنی شروع ہو گئی:

''ذرا بر غل کے مزاج تو دیکھو، یا اولاد الحلال!''

Scanned with CamScanner

''قابلِ رحم ہے وہ جو چاہت میں مرا جارہا ہو اور آسودگی بھی میسر نہ آئے!''

''آہ منک یالوسی یامخلصۃ فلوسی۔''[یعنی: آہ، لوسی، تو نے میرا پیسہ نکلوالیا اور ہاتھ بھی نہ آئی۔]

لوگ ٹھٹھے مار کر ہنسنے لگے اور بڑے جوش وخروش سے اور خوب گونج دار آواز میں فحش گانے گانے لگے، حتیٰ کہ نظم وضبط برقرار رکھنے کے لیے عزیز کو مداخلت کرنی پڑی۔

❋

دیہاتی علاقوں سے آنے والے زیادہ تر مصریوں کی طرح محمد السید (آٹوموبیل کلب میں باورچی کا مددگار) 'بلہر زیا' (Bilharzia) کی بیماری کا شکار تھا جو اسے اوائل عمر ہی میں لاحق ہوگئی تھی اور پچاس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے سوزش نے اس کا جگر بیکار کر دیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی بیٹی بثینہ کو رمضان کا وہ دن بہت اچھی طرح یاد ہے جب گھر والوں نے عمارتِ یعقوبیان کی چھت پر اپنے دو کمروں اور ایک پاخانے والے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں روزہ کھولا تھا، اور اس کا باپ مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے نکلا ہی تھا کہ انھیں اچانک کسی وزنی چیز کے زمین پر گرنے کی آواز سنائی دی تھی۔ بثینہ کو اپنی ماں کی المناک چیخ بھی خوب یاد ہے، ''جاؤ، جاکر اپنے ابا کی مدد کرو!'' اور وہ سب کے سب — بثینہ، سوسن، فاتن، اور ننھا مصطفیٰ — اس طرف دوڑ پڑے تھے۔ ان کا باپ اپنے سفید جلباب میں کھاٹ پر پڑا ہوا تھا، جسم بالکل ساکت تھا اور چہرہ گدلا نیلا۔ ایمبولینس بلانے کے بعد جب نوآموز جوان ڈاکٹر نے جلدی جلدی معائنہ کر کے وہ الم انگیز خبر سنائی تو لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں اور ان کی ماں زور زور سے اپنا منھ پیٹنے لگی، یہاں تک کہ فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

اُس وقت بثینہ ایک تجارتی ڈپلوما کے حصول کے لیے تعلیم حاصل کر رہی تھی اور مستقبل کے سپنے دیکھ رہی تھی، جن کی بابت اسے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ پورے نہ ہو سکیں گے: وہ ڈپلوما حاصل کرے گی اور جب اس کا محبوب طٰہ الشاذلی پولیس اکیڈمی سے فارغ التحصیل ہو جائے گا تو اس سے شادی کرے گی، اور دونوں عمارتِ یعقوبیان سے دور، بہت دور، ایک نفیس اور کشادہ اپارٹمنٹ میں رہیں گے، بس ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا کرنے پر اکتفا کریں گے تاکہ ان کی مناسب پرورش کر سکیں۔ انھوں نے ہر چیز کا پورا حساب کتاب کر لیا تھا، لیکن اس کا باپ اچانک مر گیا اور سوگ کے ایام

Scanned with CamScanner

کے خاتمے پر گھر والوں نے خود کو نا قابلِ بیان مفلسی کی حالت میں پایا۔ پنشن برائے نام تھی اور تعلیم، کھانے پینے، کپڑے لتے اور کرائے کے مصارف کے لیے ناکافی۔ جلد ہی ماں میں بھی تبدیلی آ گئی۔ وہ ہمیشہ سیاہ کپڑے پہننے لگی، اس کا جسم کمھلا کر سوکھ گیا، اور اس کے چہرے پر غریب بیواؤں والی کرختت، مردانہ، چبھتی ہوئی سی کیفیت آ گئی۔ رفتہ رفتہ وہ بدمزاج ہوتی گئی اور بیٹیوں سے ہمہ وقت لڑنے جھگڑنے لگی، حتیٰ کہ ننھا مصطفیٰ بھی اس کی مار پیٹ اور جھڑکیوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ہر جھڑپ کے بعد وہ بیٹھی دیر تک آنسو بہایا کرتی۔ اس نے جانے والے کا اس چاہت کے ساتھ ذکر کرنا چھوڑ دیا جس کا مظاہرہ اولین دنوں میں کیا تھا، اس کے بجائے اس کا ذکر ایک طرح کی تلخی اور مایوسی سے کرنے لگی، جیسے اُس نے جان بوجھ کر اسے نراش کیا ہو اور اس کڑی مشقت میں ڈال گیا ہو۔ پھر وہ ہفتے میں دو تین روز غائب رہنے لگی: صبح کو نکلتی اور دن ڈھلے لوٹتی: نڈھال، مہر بہ لب، پراگندہ ذہن، ایک دوسرے میں ملے جلے پکوانوں کا جھولا اٹھائے (چاول اور سبزیاں اور گوشت یا مرغ کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں) اور انھیں گرم کر کے بچوں کو کھلا دیتی۔

جس دن بثینہ نے اپنا امتحان پاس کر کے ڈپلوما پایا، ماں رات بھیگنے اور سب کے سو جانے کے بعد اسے لے کر چھت پر آ گئی۔ یہ گرمیوں کی دوزخی رات تھی اور لوگ بیٹھے جوزہ [ناریل کی گڑگڑی] پی رہے تھے اور بات چیت کر رہے تھے، اور چند عورتیں اپنے تنگ آہنی کمروں کی جہنمی گرمی سے فرار پانے کے لیے باہر کھلے میں آ بیٹھی تھیں۔ ماں نے ان سے سلام علیک کی اور بثینہ کو چھت کے ایک دور افتادہ حصے میں کھینچ لائی اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ بثینہ کو آج بھی اس رات شارع سلیمان باشا پر دیکھا ہوا کاروں کا منظر اور روشنیاں یاد ہیں، ساتھ ہی اپنی ماں کا چیں بہ جبیں چہرہ، اس کی نگاہوں کی سختی اور برماہٹ، اور اس کی آواز کی درشتی اور اجنبیت جس کے ساتھ اس نے اس بوجھ کا ذکر کیا جو تن تنہا سہنے کے لیے مرحوم اس پر ڈال گیا تھا، اور بتایا کہ وہ زمالک کے علاقے میں بعض شریف دل لوگوں کے گھر میں کام کر رہی ہے لیکن اس بات کو چھپائے رکھا ہے، کیونکہ اگر لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ نوکرانی کے طور پر کام کر رہی ہے تو اس سے بثینہ اور اس کی بہنوں کی شادیوں کے امکان پر برا اثر پڑے گا۔ ماں نے بثینہ سے اگلے ہی دن نوکری ڈھونڈنے کے لیے کہا۔ بثینہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور، پیار سے مغلوب ہو کر، ماں کو تھوڑا سا دیکھا، پھر جھک کر گلے لگا لیا۔ اسے

Scanned with CamScanner

چومتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ ماں کا چہرہ خشک اور کھردرا ہو گیا ہے اور ایک عجیب سی نئی قسم کی بو اس کے جسم سے آرہی ہے — پسینے اور گرد کی ملی جلی بو، جو نوکرانیوں سے آتی ہے۔

اگلے دن سے بثینہ نے نوکری کی تلاش میں اپنا سارا زور لگا دیا۔ ایک سال کے عرصے میں اس نے متعدد کام کر ڈالے: وکیل کے دفتر میں سیکرٹری، زنانہ ہیر ڈریسر کی ماتحت، ایک دندان ساز کی زیرِ تربیت نرس۔ اور ہر جگہ ملازمت چھوڑنے کی ایک ہی وجہ نکلی اور ایک ہی جیسے واقعات کی تکرار — باس کی گرمجوش پذیرائی اور وہی شدید اظہارِ دلچسپی، پھر ملاطفت، چھوٹے موٹے تحفے تحائف اور تھوڑے بہت مالی نذرانے، اور یہ اشارہ کہ اسی طرح سے اور بھی مل سکتا ہے، اور بثینہ کی جانب سے ان سب عنایتوں کو قبول کرنے سے نہایت شائستہ انکار (تا کہ کہیں نوکری نہ جاتی رہے)۔ تاہم باس اپنا تعاقب جاری رکھتا یہاں تک کہ معاملہ اپنے انجام کو پہنچ جاتا؛ وہ آخری منظر جس سے اسے نفرت اور خوف محسوس ہوتا تھا، اس وقت رونما ہوتا جب بڑا آدمی خالی دفتر میں اس سے زبردستی بوس و کنار کرنے پر اصرار یا اس سے چمٹنے کی کوشش کرتا، یا اپنی پتلون کی زپ کھولنے لگتا تا کہ حقیقتِ حال سے اس کا سامنا کرا دے۔ تب وہ اسے دھکا دے کر دور کرتی اور چیخنے اور فضیحتا مچانے کی دھمکی دیتی، جس پر وہ ایک دم بدل کر اپنا انتقامی چہرہ دکھاتا اور تمسخر سے اسے 'خضرۃ الشریفہ' [پارسا بیگم] کا طعنہ دے کر باہر نکال دیتا۔ یا بعض اوقات وہ یہ سوانگ رچاتا کہ وہ تو اس کے کردار کا امتحان لے رہا تھا، اور اطمینان دلاتا کہ وہ تو اسے اپنی بیٹی کی طرح چاہتا ہے، اور اس صورت میں وہ مناسب موقعے کا انتظار کرتا (جب فضیحتے کا خطرہ ٹل چکا ہوتا) اور کوئی بہانہ نکال کر اسے برطرف کر دیتا۔

اس ایک سال میں بثینہ نے بہت کچھ سیکھا۔ مثلاً اسے یہ پتا چلا کہ اس کا خوبصورت اور ترغیب انگیز جسم، اس کی بڑی بڑی شہد رنگ آنکھیں اور بھرے بھرے ہونٹ، اس کی شہوت انگیز چھاتیاں، نرم و گداز کولھوں والی گول پشت، یہ سب خصوصیتیں لوگوں سے اس کے تعامل میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ بات اس پر واضح ہو گئی تھی کہ سارے مرد، خواہ وہ کتنے ہی معزز کیوں نہ ہوں، خواہ معاشرے میں ان کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، ایک خوبصورت عورت کے سامنے غایت درجے کے کمزور نکلتے ہیں۔ اس نے، شرارتاً اور تفریحاً، اسے آزمانے کی ٹھانی۔ سو اب اگر اس کا سامنا کسی عمر رسیدہ معزز آدمی سے ہوتا تو نوعمر لڑکیوں کی سی آواز میں بات کرتی، آگے کو جھک کر اپنی شہوت انگیز

چھاتیوں کی جھلک دکھلاتی، اور پھر فوراً ہی باوقار بڑے میاں کے نظارے سے لطف لیتی کہ کس طرح نرم پڑ گئے ہیں، لرزنے لگے ہیں، اور آنکھیں خواہش کے مارے کیسی دھندلا گئی ہیں۔ لوگوں کا اس کے لیے سلگنا اسے لذت سے بھر دیتا تھا، ویسی ہی لذت جو انتقام سے حاصل ہوتی ہے۔ اس سال کے دوران یہ بات بھی اس پر واضح ہوگئی کہ اس کی ماں میں تبدیلی آ گئی ہے، کیونکہ بثینہ جب بھی مردوں کی دراز دستی کے باعث نوکری چھوڑ دیتی تو ماں اس خبر کو برہمی سے ملتی جلتی خاموشی کے ساتھ سنتی اور، ایک موقعے پر تو، جب یہ واقعہ کئی بار پیش آ چکا تھا، اس نے بثینہ کے کمرے سے نکلتے وقت کہا، ''تمھارے بھائی بہنوں کو تمھاری کمائی کی ایک ایک پائی کی ضرورت ہے۔ لڑکی ہوشیار ہو تو اپنی ذات اور نوکری دونوں کو محفوظ رکھنا جانتی ہے۔'' بثینہ کو اس جملے پر ملال بھی ہوا اور حیرت بھی، اور اس نے اپنے سے پوچھا، ''ایک ایسے باس کے سامنے جو اپنی پتلون کی زپ کھول رہا ہو، میں خود کو آخر کیسے محفوظ رکھ سکتی ہوں؟''

کئی طویل ہفتوں تک وہ حیرت کی اسی کیفیت میں رہی، حتیٰ کہ فیتھی، دھوبی صابر کی بیٹی، جس کا خاندان چھت ہی پر ان کے پڑوس میں رہتا تھا، نمودار ہوئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ بثینہ ملازمت تلاش کر رہی ہے اور وہ اسے بتانے آئی تھی کہ 'شنن' نامی کپڑوں کی دکان پر ایک سیلز گرل کی جگہ خالی ہے۔ جب بثینہ نے سابقہ باسوں کے ساتھ اپنی مصیبتوں کا اس سے ذکر کیا تو فیتھی نے ایک لمبی سی آہ بھری، اس کے سینے پر چپت ماری، اور غیر یقینی پن کے ساتھ اس کے منھ در منھ چلائی، ''بے وقوف نہ بن، لڑکی!'' فیتھی نے آگاہ کیا کہ نوّے فیصد باس لوگ اپنے یہاں کام کرنے والی لڑکیوں کے ساتھ یہی سب کرتے ہیں، اور اگر کوئی لڑکی مزاحمت کرے تو اسے نوکری سے نکال دیتے ہیں؛ اس کی جگہ سو ایسی لڑکیاں مل جاتی ہیں جو مزاحمت نہیں کرتیں۔ جب بثینہ نے اس پر اعتراض کیا تو فیتھی نے تمسخر سے پوچھا، ''اچھا، تو بیگم صاحبہ امریکن یونیورسٹی کی ایم بی اے ہیں؟ جانے بھی دو، سڑک کے بھک منگوں کے پاس بھی تمھاری جیسی ہکاوڑ گریاں ہوتی ہیں!''

فیتھی نے کہا کہ 'ایک حد تک' باس کی تابعداری کرنا عیاری کا تقاضا ہے، اور یہ کہ دنیا ایک چیز ہے اور جو کچھ وہ مصری فلموں میں دیکھتی ہے وہ اور شے۔ اس نے بتایا کہ وہ ایسی بہت سی لڑکیوں سے واقف ہے جو برسوں تک 'شنن' میں کام کر چکی ہیں اور مالکِ دکان طلال صاحب جس چیز کے خواہاں

ہیں وہ، 'ایک حدتک'، انھیں دی ہے، اور اب خوش وخرم بیویاں بن چکی ہیں جن کے بچے ہیں، گھر ہیں، اور خوب محبت کرنے والے شوہر۔ ''لیکن اتنی دور جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟'' فیفی نے پوچھا، اور خود اپنی مثال دی۔ اس نے دو سال تک دکان میں کام کیا تھا اور اس کی تنخواہ اگرچہ دو سو پاؤنڈ تھی، وہ اس سے تین گنا زیادہ اپنی 'عیاری' سے کما لیتی تھی، اور تحفے تحائف اس کے علاوہ۔ ان باتوں کے باوجود وہ اپنی حفاظت بھی کرتی رہی ہے۔ وہ باکرہ ہے اور اگر کوئی اس کی عزت آبرو کے خلاف ایک لفظ بھی منھ سے نکالے تو اس کی آنکھیں نوچ لے گی۔ سو آدمی تو ہوں گے ہی جو اس سے شادی کے خواہش مند ہیں، خاص طور پر اب جبکہ وہ کما رہی ہے اور بچت کی انجمن میں آمدنی جمع کروا رہی ہے اور اپنے جہیز کے کپڑوں کے لیے پس انداز بھی کر رہی ہے۔

اگلے دن بثینہ، فیفی کے ساتھ، طلال شامی کی دکان پر گئی۔ وہ چالیس سے اوپر کی عمر کا نکلا: گورا چٹا، نیلی آنکھیں، گٹھا ہوا جسم، اور سر کے بال جھڑتے ہوئے۔ اس کی ناک چپٹی تھی اور بڑی بڑی کالی مونچھیں جو اس کے منھ کے دونوں طرف لٹکی ہوئی تھیں۔ طلال خوش شکل بالکل نہیں تھا، اور بثینہ کو پتا چلا کہ وہ الحاج شنن کی ڈھیر ساری بیٹیوں میں اکلوتا بیٹا ہے۔ الحاج شنن شامی تھا اور 'ایامِ اتحاد' میں شام سے آکر مصر میں بس گیا تھا اور یہ دکان کھول لی تھی۔ جب عمر بڑھنے لگی تو اس نے کاروبار اپنے اکیلے بیٹے کو سونپ دیا۔ بثینہ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ طلال شادی شدہ ہے، بیوی مصری ہے اور خوبصورت، اور اسے دو بیٹے دے چکی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود، دوسری عورتوں کے لیے اس کی ہوس کبھی تھم کر نہ دی۔ طلال نے بثینہ سے ہاتھ ملایا (اسے دبایا بھی) اور باتوں کے دوران اس کے سینے اور جسم سے نگاہیں ذرا بھی نہ ہٹائیں۔ چند منٹوں بعد، بثینہ نے اپنی نئی ملازمت شروع کر دی۔

چند ہی ہفتوں میں فیفی نے اسے وہ سب سکھا دیا جو اسے کرنا تھا: اپنے کو کیسے سجا سنوار کر رکھے، ہاتھوں اور پیروں کے ناخنوں پر پالش چڑھائے، قمیص کا گریبان تھوڑا سا کھلا رکھے، ڈریس کو کمر پر تھوڑا سا تنگ کر لے تاکہ پچھائے کے خطوط نمایاں ہو جائیں۔ صبح دکان کھولنا اور اپنے ہمکاروں کے ساتھ فرش کی جھاڑ پونچھ اس کی ذمے داری تھی، پھر کپڑے درست کر کے دروازے پر کھڑا ہونا (جو کپڑوں کی ساری دکانوں میں گاہکوں کو راغب کرنے کا معروف حربہ ہے)۔ کوئی گاہک آئے تو تلطّف کے ساتھ اس سے بات کرنا اس پر واجب تھا، اس کے تمام مطالبات پر لبیک کہنا اور اسے

Scanned with CamScanner

زیادہ سے زیادہ مال خریدنے پر راغب کرنا (فروخت کا آدھا فیصد اسے ملتا تھا)۔ ظاہر ہے، اسے گاہک کی دل لگی بازی برداشت کرنی پڑتی، خواہ یہ کتنی ہی بیہودہ کیوں نہ ہو۔

تو یہ تھا منصبی کام۔ باقی رہی وہ 'دوسری چیز'، تو یہ طلال نے اس کی آمد کے تیسرے دن ہی شروع کردی۔ عصر کا وقت تھا اور دکان گاہکوں سے خالی تھی۔ طلال نے اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ گودام چلے تاکہ وہ اسے مختلف تجارتی اشیا کے بارے میں بتا سکے۔ بثینہ خاموشی سے پیچھے ہولی، اور فیتی اور دوسری لڑکیوں کے چہروں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ کی پرچھائیاں سی تیر گئیں۔

گودام شارع سلیمان باشا پر 'الامریکین' کے برابر والی عمارت کی زیریں منزل پر ایک بڑا سا اپارٹمنٹ تھا۔ طلال اندر داخل ہوا اور دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ بثینہ نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ سیلی ہوئی جگہ تھی، کم روشن اور کم ہوادار، اور ایک دوسرے پر رکھے ہوئے ڈبے چھت تک جاتے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ کیا پیش آنے والا ہے، اس لیے وہ گودام کے راستے میں خود کو تیار کرتی رہی تھی، ماں کے الفاظ ذہن میں دہراتے ہوئے، ''تمھارے بھائی بہنوں کو تمھاری کمائی کی ایک ایک پائی کی ضرورت ہے۔ لڑکی ہوشیار ہو تو اپنی ذات اور نوکری دونوں کو محفوظ رکھنا جانتی ہے۔'' جب طلال اس سے قریب ہوا تو اسے اپنے اندر منہ زور اور متضاد احساسات موجزن محسوس ہوئے: موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا عزم اور وہ خوف جو تمام چیزوں کے باوجود اسے بھینچ رہا تھا، ہانپنے پر مجبور کر رہا تھا، اسے متلی سی دلا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ دبا دبا سا تجسس بھی جو اسے یہ جاننے کے لیے اکسا رہا تھا کہ دیکھیں طلال اس کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ کیا وہ اس سے لگاوٹ کی باتیں کرے گا اور، مثال کے طور پر، یہ کہے گا، ''مجھے تم سے پیار ہے،'' یا فوراً چوما چاٹی کی کوشش کرے گا؟ اسے جلد ہی اپنا جواب مل گیا۔ طلال اس پر پیچھے کی طرف سے جھپٹا، اپنے بازو اتنی سختی سے اس کے گرد ڈال دیے کہ اسے تکلیف محسوس ہونے لگی، خود کو اس سے رگڑنے لگا اور بغیر ایک لفظ کہے اس کے جسم سے کھیلنے لگا۔ وہ درشتی دکھا رہا تھا اور اپنی لذت کے حصول کی جلدی میں تھا۔ سارا معاملہ دو منٹ کے اندر اندر ختم ہو گیا۔ بثینہ کا لباس سَن گیا، اور وہ ہانپتے ہوئے بولا، ''غسلخانہ راہداری کے آخر میں دائیں ہاتھ پر ہے۔''

کپڑے دھوتے ہوئے اس نے سوچا کہ یہ سب اس سے کہیں زیادہ آسان تھا جو وہ تصور کیے بیٹھی تھی، بس ایسے ہی جیسے کوئی بس میں خود کو اس کے جسم سے رگڑ رہا ہو (جو اس کے ساتھ اکثر پیش

Scanned with CamScanner

آتا تھا) اور اسے فیقی کی بات یاد آئی کہ مڈبھیڑ کے بعد اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ لوٹ کر طلال کے پاس آئی اور حتی الوسع اپنی آواز کو نرم و گداز اور ترغیب انگیز بنا کر کہا، ''جناب، مجھے آپ سے بیس پاؤنڈ چاہییں۔'' طلال نے اسے لحظہ بھر دیکھا، پھر جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا، جیسے اسے اس مطالبے کی توقع رہی ہو، اور ایک تہہ کیا ہوا نوٹ نکالتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا، ''نہیں، دس کافی ہوں گے۔ کپڑے سوکھتے ہی میرے بعد دکان پر آجانا۔'' پھر وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

❀

ہر بار دس پاؤنڈ، اور طلال صاحب ہفتے میں اسے دو بار، بعض اوقات تین بار، طلب کرتا۔ اِدھر فیقی نے اسے یہ سبق پڑھا دیا تھا کہ گاہے بگاہے دکان میں موجود کسی لباس سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر کے طلال سے اس کا تقاضا کیا کرے، یہاں تک کہ وہ اسے بثینہ کو تحفتاً دے دے۔ اب وہ پیسے بنانے اور اچھے اچھے کپڑے پہننے لگی تھی۔ ماں اس سے خوش تھی، اس سے پیسے لے کر طمانیت محسوس کرتی، انھیں اپنے گریبان میں اڑس لیتی اور اسے پُرجوش دعائیں دیتی۔ انھیں سن کر بثینہ اس پراسرار اور خبیث خواہش سے مغلوب ہو جاتی کہ ماں کو واضح اشاروں میں طلال سے اپنے تعلق کا حال بتا دے، لیکن ماں ایسے سارے کنایوں سے تجاہل برتتی۔ اس پر بثینہ ان اشاروں کنایوں کو اتنی تفصیل سے بیان کرتی کہ ماں کا تجاہل حد سے زیادہ صریح اور نازک دکھائی دینے لگتا، اور یہاں پہنچ کر بثینہ کو تھوڑی سی تسکین محسوس ہوتی، یوں جیسے کہ اس نے اپنی ماں کے چہرے سے جھوٹی معصومیت کی نقاب کھسوٹ ڈالی ہو اور اپنے جرم میں اس کی شرکت کی تصدیق کر دی ہو۔

وقت کے ساتھ ساتھ گودام میں طلال سے ملاقاتیں اس پر اس طرح اثرانداز ہونے لگیں جس کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ فجر کی نماز ادا کرنے کے قابل نہیں رہی تھی (وہ واحد نماز جو وہ پڑھا کرتی تھی)، کیونکہ اسے باطنی طور پر 'ربنا' کا سامنا کرتے ہوئے خجالت محسوس ہوتی تھی، کیونکہ وہ چاہے کتنے ہی وضو کیوں نہ کر ڈالے، اپنے کو ناپاک محسوس کرتی تھی۔ اسے ڈراؤنے خواب نظر آنے لگے تھے اور خوف کے مارے اس کی نیند ٹوٹ جاتی۔ دنوں اس کی طبیعت دبی دبی اور افسردہ رہتی، اور ایک دن جب وہ اپنی ماں کے ساتھ زیارت کے لیے الحسین گئی، تو ابھی وہاں داخل ہی ہوئی تھی اور اپنے کو خوشبوؤں اور روشنیوں میں گھرا پایا تھا کہ یکبارگی اس پر گریہ وزاری کا ایک

Scanned with CamScanner

طویل دورہ پڑ گیا۔

دوسری طرف چونکہ پیچھے ہٹنا اس کے لیے ممکن نہ رہا تھا اور وہ اپنے احساسِ گناہ کی متحمل بھی نہ ہو سکتی تھی، چنانچہ وہ اپنے اس احساسِ گناہ کی شدت سے مزاحمت کرنے لگی۔ وہ ماں کے چہرے کے اس وقت کے تاثر کو یاد کرتی جب اس نے بتایا تھا کہ وہ لوگوں کے گھروں میں نوکرانی کے طور پر کام کر رہی ہے۔ اپنے سے وہ سب دہراتی جو فیفی نے اسے دنیا کے طور طریقوں کی بابت سمجھایا تھا، اور اکثر دکان میں آنے والی بنی ٹھنی دولت مند بیگمات کے بارے میں سوچتی، اور بڑے کمینے شغف کے ساتھ اپنے سے پوچھتی، ''جانے اتنی مال دولت حاصل کرنے کے لیے اس عورت کو اپنا جسم کتنی بار مردوں کے سپرد کرنا پڑا ہوگا؟''

احساسِ جرم کی یہ جان توڑ زور آزمائی اپنے پیچھے تلخی اور سنگدلی کا ورثہ چھوڑ گئی۔ اس نے لوگوں پر بھروسا کرنا یا ان کی خاطر عذر خواہی کرنا چھوڑ دیا۔ وہ اکثر سوچتی (اور بعد میں توبہ کرتی) کہ خدا اس کی گراوٹ ہی کا خواہاں تھا۔ اگر اس کی مرضی اس سے مختلف ہوتی تو وہ اسے ایک ثروت مند عورت کے روپ میں تخلیق کرتا، یا اس کے باپ کی وفات کو چند سالوں کے لیے ملتوی کر دیتا (اس سے زیادہ آسان بات اور کیا ہو سکتی تھی اس کے لیے؟)۔ آہستہ آہستہ اس کی برہمی نے خود اس کے حبیب، طٰہٰ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک عجیب سا احساس کہ وہ طٰہٰ کے مقابلے میں کہیں زیادہ قوی ہے، اس پر حاوی ہو جاتا — ایک احساس کہ وہ بالغ ہے اور دنیا کی سمجھ بوجھ رکھتی ہے، جبکہ طٰہٰ محض ایک خواب دیکھنے والا سادہ لوح لڑکا ہے۔ وہ مستقبل کے بارے میں اس کی رجائیت پر جھنجھلانے لگی تھی اور اس سے تند و تیز باتیں کرتی، یہ کہہ کر اس کا تمسخر اڑاتی، ''تم اپنے کو عبدالحلیم حافظ سمجھتے ہو؟ وہ مفلس اور محنتی لڑکا جو سمجھتا ہے کہ مشقت سے اپنے خواب پا لے گا؟''

شروع میں اس تلخی کی وجہ طٰہٰ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ بعد میں اس کا استہزا اور تضحیک اسے کھلنے لگی اور دونوں میں جھڑپیں ہونے لگیں۔ اور ایک بار جب اس نے بثینہ سے کہا کہ طلال کے یہاں کام کرنا بند کر دے کیونکہ وہ بری شہرت کا آدمی ہے، تو اس نے طٰہٰ کی طرف للکارنے والے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا، ''جیسے حضور کی مرضی۔ بس مجھے ڈھائی سو پاؤنڈ دے دیا کریں جو مجھے طلال سے ملتے ہیں، پھر آپ کو یہ حق مل جائے گا کہ آپ کے سوا کسی اور کو اپنی صورت نہ دکھاؤں۔'' وہ لمحہ بھر اسے یوں تکتا

Scanned with CamScanner

رہا جیسے کچھ نہ سمجھا ہو اور پھر اس کا غصہ پھٹ پڑا اور اس نے بثینہ کے شانے پر دھکا مارا۔ وہ چلا کر اسے گالیاں دینے لگی اور وہ قمیص لباس جو طٰہ نے اس کے لیے خریدا تھا، اس پر واپس دے مارا۔ اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ طٰہ سے اپنے تعلق کی دھجیاں اڑا دینا چاہتی تھی تاکہ گناہ کی اس خلش سے نجات پا سکے جو طٰہ پر نگاہ پڑتے ہی اسے اذیت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ لیکن اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ اسے چاہتی تھی۔ ان کی تاریخ بہت پیچھے تک جاتی تھی اور بڑے حسین لمحات سے لبریز تھی۔ جب بھی وہ اسے آزردہ یا متفکر دیکھتی تو سب کچھ بھول بھال کر اسے سچی محبت کے وفور میں ڈھانپ لیتی، جیسے اس کی ماں ہو۔ ان کے باہمی جھگڑے کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں، وہ اس سے صلح صفائی کر لیتی اور اس کے پاس لوٹ آتی، اور ان کی الفت نادر اور جگمگاتے لمحوں سے خالی نہیں تھی۔ لیکن جلد ہی تکدر پھر لوٹ آتا۔

طٰہ سے اس صبح اتنی بے رحمی کے ساتھ پیش آنے پر بثینہ خود کو سارا دن ملامت کرتی رہی، خاص طور پر اس لیے کہ آج وہ انٹرویو دینے جا رہا تھا جس کا وہ مہینوں سے انتظار کرتا رہا تھا اور اس سے حوصلہ افزائی کے دو کلمے سننا چاہتا تھا۔ اس نے کتنی بے رحمی سے کام لیا! اگر مسکرا کر ایک دو جملے کہہ دیے ہوتے تو اس کا کیا بگڑ جاتا؟ اس کے ساتھ کچھ وقت گزار لیا ہوتا تو کیا قیامت آ جاتی؟ کام ختم کرنے کے بعد اس کا طٰہ سے ملنے کو جی چاہا اور توفیقیہ چوک جا کر پھولوں کی کیاری کے پاس والی نیچی دیوار پر بیٹھ کر، جہاں وہ ہر شام ایک دوسرے سے ملتے تھے، اس کا انتظار کرنے لگی۔ رات ہو رہی تھی اور چوک راہگیروں اور خوانچہ فروشوں سے بھرا ہوا تھا؛ وہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے اسے لوگوں کی واہی تباہی سہنی پڑی، لیکن وہ کوئی آدھا گھنٹہ بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہی۔ جب وہ نہیں آیا تو اس نے سوچا کہ وہ اس سے ناراض ہو گیا ہے کیونکہ وہ صبح اس سے بری طرح پیش آئی تھی، چنانچہ وہ وہاں سے اٹھی اور سیڑھیاں پھلانگ کر چھت پر اس کے کمرے میں پہنچی۔ دروازہ کھلا تھا اور طٰہ کی ماں وہاں اکیلی بیٹھی تھی، پریشانی اس کے سال خوردہ چہرے سے عیاں تھی۔ ماں نے اسے گلے لگا کر چوما، پھر اپنے برابر بنچ پر بٹھایا اور بولی، ''مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے، بثینہ۔ طٰہ امتحان دینے صبح نکلا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا، خدا محفوظ رکھے، بیٹی!''

❁

اگر حاج محمد عزام کی عمر اتنی بڑھی ہوئی نہ ہوتی اور برسوں کی محنتِ شاقہ اس کے چہرے پر اپنے نقوش نہ چھوڑ گئی ہوتی تو وہ اپنی بلند قامتی اور نا قابلِ نفوذ متانت میں، اپنی نفاست اور ثروت میں، چہرے کی گلگوں سرخی میں جو اچھی صحت سے چھلکتا ہے، اور اپنے صیقل کردہ اور چمک دار بشرے میں جو المہندسین میں واقع 'لاجیتیہ' مرکزِ حسن کے ماہرین کی دین ہے جہاں وہ ہفتے میں ایک بار جاتا ہے، کوئی فلم اسٹار یا تاج پہنے ہوئے سر کی طرح نظر آتا۔ وہ سو سے زائد غایت درجہ پُرتکلف سوٹوں کا مالک ہے، اور ہر روز ایک مختلف سوٹ، بھڑکدار ٹائی، اور نفیس درآمدہ جوتے پہنتا ہے۔

ہر روز، صبح کے درمیانی وقت میں، اس کی سرخ مرسیڈیز شارع سلیمان باشا پر 'الامریکین' کی طرف سے نمودار ہوتی ہے، اور وہ اس کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا اپنی چھوٹی سی زردی مائل رنگ کی تسبیح پڑھنے میں مشغول ہوتا ہے، جو اس کی انگلیوں سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ اس کا دن اپنی املاک کے معائنے سے شروع ہوتا ہے — دو بڑی کپڑوں کی دکانیں، ایک 'الامریکین' کے مقابل، دوسری عمارتِ یعقوبیان کی پہلی منزل پر جہاں اس کا دفتر واقع ہے؛ کاروں کے دو عدد شوروم؛ اور شارع معروف پر فاضل پرزوں کی متعدد دکانیں، اس کے علاوہ ڈاؤن ٹاؤن کے علاقے میں بہت ساری غیر منقولہ جائیداد اور دوسری، بہت ساری زیرِ تعمیر جگہیں جو عنقریب 'عزام کنسٹرکٹرز' کے نام سے فلک بوس عمارتوں کی شکل میں کھڑی ہونے والی ہیں۔ کار آگے بڑھتی ہے اور ہر مقام پر آ کر ٹھہرتی ہے اور ملازم اس کے گرد جمع ہو کر حاج کو پر جوش تسلیمات پیش کرتے ہیں، جن کا جواب وہ اپنے ہاتھ کو اتنے ضبط اور بے اہمیتی سے ہلا کر دیتا ہے کہ کسی کو نظر ہی نہ آ سکے۔ ملازموں کا سربراہ یا ان میں سب سے مقدم ملازم فوراً کار کی کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے، حاج کی طرف جھکتا ہے، اور کام کی صورت حال سے اسے باخبر کرتا ہے یا کسی معاملے میں اس کا مشورہ طلب کرتا ہے۔ حاج عزام اس کی بات سر جھکائے، اپنی موٹی موٹی بھنویں سکیڑے، ہونٹ بھینچے، غور سے سنتا ہے، پھر اپنی تنگ، سرمئی، لومڑی جیسی آنکھیں (جو حشیش کے زیرِ اثر ہمیشہ ہلکی سی سرخ ہوتی ہیں) دور فاصلے پر جما دیتا ہے، جیسے افق پر کچھ دیکھ رہا ہو۔ بالآخر وہ منھ کھولتا ہے، آواز بہت اندر گہرائی سے نکلتی ہے، لہجہ فیصلہ کن ہوتا ہے اور لفظ قلیل۔ وہ بک بک اور بحثا بحثی کو برداشت نہیں کرتا۔

بعض لوگ اس کی خاموشی پسندی کی یہ تفسیر کرتے ہیں کہ وہ (کٹر متقی ہونے کے باعث) اس

Scanned with CamScanner

حدیث پر عمل کرتا ہے، ''اگر تم میں سے کوئی کچھ کہنا چاہے، تو اختصار سے کام لے، یا خاموش رہے''۔ اگرچہ اپنی بے اندازہ دولت اور غیر معمولی اثر و رسوخ کی وجہ سے اسے حقیقت میں بہت کچھ کہنے کی حاجت بھی نہیں ہے، کیونکہ عام طور پر اس کی بات قطعی ہوتی ہے اور واجبِ تعمیل۔ اس پر اس کا زندگی کا وسیع تجربہ مستزاد، جس کے باعث وہ چیزوں کو ایک نگاہ ڈالتے ہی سمجھ لیتا ہے، کیونکہ اس سن رسیدہ کروڑ پتی نے، جس کی عمر اب ساٹھ سے متجاوز ہے، تیس سال پہلے ایک نقل مکانی کرنے والے مزدور کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا، جب وہ سوہاج کے علاقے سے کام کی تلاش میں قاہرہ آیا تھا، اور شارع سلیمان باشا کے بڑے بوڑھوں کو وہ اس طرح یاد ہے کہ جلباب، صدری اور عمامہ پہنے، 'الامریکین' کے عقب کی گزرگاہ میں ایک چھوٹا سا لکڑی کا بکسا کھولے زمین پر بیٹھا ہوا ہے — کہ یہیں سے اس نے جوتے چمکانے کے کام کی ابتدا کی تھی۔ کچھ وقت تک اس نے 'بابیک' کی دفتری اشیا کی دکان میں چپراس گیری بھی کی تھی۔ پھر وہ بیس سال کے لیے غائب ہو گیا، اور بہت مال دولت کما کر اچانک نمودار ہوا۔ حاج عزام کا کہنا ہے کہ وہ خلیج میں کام کر رہا تھا، لیکن شارع کے لوگ اس پر یقین نہیں کرتے اور سرگوشیوں میں کہتے ہیں کہ اسے منشیات فروخت کرنے پر جیل ہوئی تھی، اور بعضے یہ اصرار کرتے ہیں کہ وہ ابھی تک یہی کام کر رہا ہے، اور ثبوت کے طور پر اس کی بے اندازہ دولت کا حوالہ دیتے ہیں، جو اس کی دکانوں میں فروخت ہونے والی اشیا اور اس کی کمپنیوں کے منافعے کے حجم کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تجارتی کارروائیاں کالے دھن کو سفید کرنے کے لیے محض ایک آڑ کا کام دیتی ہیں۔

اب ان افواہوں کی حقیقت جو کچھ بھی ہو، حاج عزام شارع سلیمان باشا کا غیر متنازعہ 'بڑا آدمی' بن گیا ہے اور لوگ قضائے حاجات اور اپنے جھگڑوں کے تصفیے کے لیے اس سے رجوع کرتے ہیں، اور اس کا اثر و رسوخ اس بات سے اور بھی پکا ہو گیا ہے کہ اس نے حال ہی میں حکمران پارٹی حزبِ قومی میں شمولیت اختیار کر لی ہے اور اس کا سب سے چھوٹا بیٹا حمدی وکیل سرکار کے طور پر محکمۂ قانون سے وابستہ ہو گیا ہے۔ حاج عزام کو خاص طور پر ڈاؤن ٹاؤن کے علاقے میں املاک اور دکانیں خریدنے کا بڑا شدید ہوکا ہے، گویا اس علاقے میں، جس نے کبھی اسے ایک بے آسرا مفلس کے روپ میں دیکھا تھا، اپنی نئی حیثیت کی نمائش کرنا چاہتا ہو۔

Scanned with CamScanner

لگ بھگ دو سال پہلے کی بات ہے کہ حاج عزام حسب معمول فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے اٹھا تو دیکھا کہ اس کا شب خوابی کا لباس نم آلود ہے۔ پریشانی میں اسے خیال آیا کہ شاید وہ بیمار ہو گیا ہے، لیکن جب وہ اپنا بدن دھونے کے لیے غسلخانے گیا تو اسے پکّی طرح معلوم ہو گیا کہ گیلے پن کی وجہ جنسی شہوت ہے؛ اسے ایک دور افتادہ ننگی عورت کی غیر واضح شبیہ یاد آئی جسے اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ اپنے جیسے سن رسیدہ شخص کے ساتھ یہ معاملہ ہونے پر اسے تعجب ہوا۔ دن کی مصروفیت میں وہ یہ بات بھول بھال گیا۔ لیکن اس کے بعد یہ واقعہ کئی بار پیش آیا، جس کی بنا پر اسے روز ہی فجر کی نماز سے پہلے طہارت کے لیے غسل کرنا پڑتا۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو گیا؛ اس نے کئی بار خود کو اپنی دکانوں میں کام کرنے والی عورتوں کے جسموں کو تاکتے جھانکتے دیکھا اور ان میں سے بعض عورتیں اس کی شہوت کو جبلی طور پر محسوس کر کے، اسے پرچانے کے لیے جان بوجھ کر ترغیب انگیز انداز میں چلنے اور ناز نخرے دکھانے لگیں، یہاں تک کہ اسے کئی بار انھیں ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑی۔

شہوت کی ان ناگہانی یورشوں نے حاج عزام کو بڑے اضطراب میں ڈال دیا۔ اول تو یہی کہ یہ اس کی عمر کے شایان نہیں تھیں، دوسرے یہ کہ وہ ساری عمر سیدھی راہ پر چلتا رہا تھا اور اس کے خیال میں یہ اس کی راست روی اور خدا کی ہر ناپسندیدہ چیز سے دوری ہی تھی جس کی بدولت اسے اپنی ساری کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں۔ اس نے شراب کبھی چکھی تک نہ تھی۔ (باقی رہی حشیش جو وہ استعمال کرتا تھا، تو بہت سے فقہا نے اسے بتایا تھا کہ یہ فقط 'مکروہ' ہے، 'نجس' یا 'حرام' نہیں، کیونکہ نہ یہ ہوش اڑا دیتی ہے، نہ شراب کی طرح آدمی کو فحش باتوں یا جرائم کے ارتکاب کی طرف لے جاتی ہے؛ بلکہ اس کے برعکس، یہ آدمی کے اعصاب کو آسودگی بخشتی ہے، اسے زیادہ توازن بہم پہنچاتی ہے، اور ذہن کو تیز کرتی ہے۔) اسی طرح، حاج نے زندگی میں کبھی زنا کا بھی ارتکاب نہیں کیا تھا، بلکہ بیش تر صعایدہ [بالائی مصر کے باشندوں] کی طرح، اس نے اوائل شباب ہی میں شادی کر کے خود کو محفوظ کر لیا تھا۔ پھر یہ بھی کہ اس نے اپنی طویل زندگی میں جانے کتنے ہی رئیسوں کو اپنی بے اندازہ دولت اپنی شہوت کے سپرد کر کے ضائع کرتے دیکھا تھا۔

حاج نے شہوت کی بابت اپنی مشکل کا ذکر بعض عمر رسیدہ دوستوں سے رازداری کے ساتھ کیا۔ انھوں نے اسے یقین دلایا کہ اس کے ساتھ جو پیش آ رہا ہے، عارضی سا معاملہ ہے اور جلد ہی

Scanned with CamScanner

ہمیشہ کے لیے جاتا رہے گا۔ ''بس یوں سمجھو کہ یہ زیادہ اچھی صحت کی وجہ سے ہے،'' اس کے دوست حاج کامل نے، جو سیمنٹ کا کاروبار کرتا تھا، ہنستے ہوئے کہا۔ لیکن شہوت کے بھبکے وقت گزرنے کے ساتھ جاری رہے اور کچھ اور تند و تیز ہو گئے، حتیٰ کہ اس کے اعصاب پر ایک بوجھ، بلکہ، بدتر یہ کہ اس کی زوجہ حاجہ صالحہ سے اچھی خاصی نوک جھونک کی وجہ بن گئے۔ اگرچہ وہ عمر میں اس سے چند سال چھوٹی تھی، لیکن حاج کے اس عنفوانِ شباب نے اسے ناگہانی آلیا تھا، چنانچہ وہ اسے تسکین نہ پہنچا سکنے پر کافی پریشان ہوئی۔ ایک سے زائد بار اس نے حاج کو لعن طعن کی اور کہا کہ ان کی اولاد بڑی ہو گئی ہے اور دو عمر رسیدہ زوجین کی طرح انھیں سزاوار ہے کہ مناسب وقار کے ساتھ رہیں۔

اب حاج کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ معاملہ شیخ السمّان کے آگے رکھے جو نامی گرامی فقیہ اور اسلامی خیراتی ادارے [جمعیت] کا سربراہ ہے اور جسے عزام اس دنیا اور آخرت کے تمام امور میں اپنا امام اور مرشد گردانتا ہے، یہاں تک کہ اس سے رجوع کیے بغیر کسی اہم موضوع کے بارے میں بھی، جس کا تعلق اس کے کام دھندے یا اس کی زندگی سے ہو، کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتا۔ وہ شیخ کے تصرف میں ہزاروں پاؤنڈ دے دیتا ہے کہ وہ اپنی صوابدید سے خیر کے کاموں میں خرچ کرے، اور ان بیش قیمت تحائف کا تو ذکر ہی کیا جو وہ اسے ان مبارک موقعوں پر پیش کرتا ہے جب اس کی دعاؤں اور برکات کے نتیجے میں کوئی اچھا سودا پٹ گیا ہو۔

جب شیخ السمّان جمعے کی نماز اور ہفتہ وار دینیات کے سبق سے فارغ ہو چکا، جو وہ مدینۃ نصر کی 'مسجد السلام' میں دیتا ہے، تو حاج عزام نے اس سے تنہائی میں بات کرنے کی درخواست کی اور اسے اپنی الجھن بتائی۔ شیخ توجہ سے سنتا رہا، کچھ دیر خاموش رہا، پھر اتنی سختی سے جو تقریباً غضب کو پہنچی ہوئی تھی، بولا، ''سبحان اللہ، یا حاج! میرے بھائی، جب اللہ نے آسانی رکھی ہے تو معاملے کو اپنے لیے مشکل کیوں بنا رہے ہو؟ شیطان کے لیے دروازہ کیوں کھول رہے ہو کہ گمراہی میں جا پڑو؟ اپنی حفاظت کرو، جیسا کہ اللہ کا حکم ہے۔ اللہ نے ایک سے زائد بیویوں کی اجازت دے رکھی ہے، بشرطے کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک کر سکو۔ اللہ پر بھروسا کرو اور حلال کام کی طرف سرعت کرو، قبل اس کے کہ حرام کام میں جا پڑو!''

''میں بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ شادی کروں گا تو لوگ جانے کیا کہیں۔''

Scanned with CamScanner

''اگر مجھے تمھاری نیکوکاری اور تقوے کا علم نہ ہوتا، تو تمھاری بابت سوے ظن رکھتا۔ اے شخص، تمھارے خوف کے لیے کیا زیادہ سزاوار ہے: لوگوں کی باتیں، یا اُس رحمٰن ورحیم کا غضب؟ کیا تم اس چیز کو حرام بناؤ گے جسے اللہ نے حلال قرار دیا ہے؟ تم قدرت رکھتے ہو، اچھی صحت کے مالک ہو، اور تمھیں اپنے اندر عورتوں کی شہوت محسوس ہوتی ہے۔ شادی کرو اور اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرو۔ خدا یہ پسند کرتا ہے کہ جو اس نے جائز قرار دیا ہے تم اس کا جائز استعمال کرو۔''

حاج عزام دیر تک تردد کرتا رہا (یا کم از کم ظاہر یہی کیا) لیکن شیخ السمتان اسے مسلسل سمجھاتا رہا اور قائل کر کے چھوڑا، بلکہ اس نے اس کے تینوں بیٹوں، فوزی، قدری، اور حمدی (سرکاری وکیل)، کو قائل کرنے کی ذمے داری بھی اپنے سر لے لی (جس پر اس کا شکریہ واجب ہے)۔ قدری اور حمدی باپ کی شادی سے رغبت پر بھونچکے تو ضرور ہوے لیکن، بہر حال، اسے قبول کر لیا۔ فوزی، سب سے بڑا لڑکا اور کام دھندے میں باپ کا دایاں ہاتھ، لگا کہ راضی نہیں ہے، گو اس نے اپنے اعتراض کی وجہ کھل کر نہیں بتائی۔ آخر میں، اس نے مجبوراً کہا، ''اگر حاج کو بنا شادی کیے گزارہ نہیں، تو یہ ہماری ذمے داری ہے کہ وہ بہترین انتخاب کرے، تا کہ اس کا پالا کسی بنتِ حرام سے نہ پڑ جائے جو اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دے۔''

تو یوں بات کی بنیاد پڑ گئی اور کسی مناسب بیوی کی تلاش شروع ہو گئی۔ حاج عزام نے اپنے سب سے قابلِ بھروسا دوستوں کو کوئی بنتِ حلال ڈھونڈنے کا کام سونپا اور آنے والے چند ماہ میں بہت سی امیدواروں کو دیکھا بھالا، لیکن اپنے وسیع تجربے کی بنا پر ہر اس لڑکی کو مسترد کر دیا جس کے اطوار میں کوئی بات بھی معیوب نظر آئی۔ یہ والی حسن و جمال میں بلند ہے لیکن چہرہ کھلا رکھتی ہے، زبان دراز ہے، چنانچہ وہ اپنی آبرو اسے نہیں سونپ سکتا؛ وہ دوسری کم عمر ہے اور لاڈ پیار سے بگڑی ہوئی، جو اپنے مطالبات سے اسے تھکا مارے گی؛ اور اس کے بعد والی، لالچی اور پیسے کی پجاری۔ چنانچہ حاج نے سب امیدواروں کو رد کر دیا، حتیٰ کہ اس کی ملاقات سُعاد جابر سے ہوئی، جو اسکندریہ میں 'ہانو' نامی ڈپارٹمنٹ اسٹور میں سیلز کلرک تھی۔ اسے طلاق ہو چکی تھی اور اس کا ایک بیٹا تھا۔ حاج دیکھتے ہی اس کا گرویدہ ہو گیا: گورا رنگ، بھرا بھرا جسم، خوبصورت، سر ڈھکا ہوا، چمکدار اور لہراتے ہوے کالے کالے بال، اور حجاب کے نیچے سے جھانکتی ہوئی لٹیں۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور کالی اور سحر انگیز

تھیں، ہونٹ بھرے بھرے اور شہوت خیز، صاف ستھری، اور اپنے جسم کی تفاصیل پر بڑی غیر معمولی توجہ دینے والی، جو عام طور پر اسکندریہ کی عورتوں کا خاصہ ہے۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کے ناخن ترشے ہوئے تھے اور پوریں بالکل صاف، گو ان پر رنگ و روغن نہیں چڑھا ہوا تھا (تاکہ ناخنوں اور وضو کے پانی کے درمیان حائل نہ ہو)۔ اس کے ہاتھ نرم و ملائم تھے، جلد گداز اور اس پر کریم لگی ہوئی تھی۔ اس کی ایڑیاں تک بے حد صاف ستھری، ہموار، مستحکم اور تڑخنوں سے آزاد تھیں، اور ان پر بڑی نازک سی گلگونی چھائی ہوئی تھی جیسے جھانویں سے خوب رگڑ کر صاف کی گئی ہوں۔

سُعاد نے حاج کے دل پر بڑا لطیف اور شوق انگیز اثر چھوڑا۔ غربت اور زندگی کی صعوبتوں کی بخشی ہوئی انکساری اسے خاص طور پر دلآویز لگی۔ اس نے سوچا کہ اس کی سرگزشت میں کہیں کوئی نقص نہیں ہے: اس نے ایک نقاش سے شادی کی تھی، جو اسے ایک بیٹا دے کر چھوڑ چھاڑ کر عراق چلا گیا تھا اور پھر اس کی کوئی خبر نہ ملی تھی؛ عدالت نے اسے اس خوف سے طلاق عطا کر دی تھی کہ اس کی صورت حال کہیں فتنہ سامانی کا باعث نہ ہو جائے۔

حاج نے اس کے کوائف معلوم کرنے کے لیے اپنے آدمیوں کو خفیہ طور پر اس کی روزگار کی جگہ اور گھر بھیجا، اور سبھوں نے اس کے اخلاق کی تعریف کی۔ اس کے بعد اس نے استخارے کی نماز ادا کی اور سُعاد جابر اپنے تمام تر حسن کے ساتھ اس کے خواب میں نمودار ہوئی (لیکن بڑے احتشام کے ساتھ، ان عورتوں کی طرح عریاں اور فحش حالت میں نہیں جو عام طور پر اسے اپنے خوابوں میں نظر آتی تھیں)۔ نتیجتاً، حاج عزام خدا پر بھروسا کر کے سُعاد کے گھر والوں سے ملنے سیدی بشر میں واقع اس کے گھر گیا۔ وہ اس کے سب سے بڑے بھائی رئیس حمیدو کے پاس بیٹھا (جو المنشیہ کے ایک قہوہ خانے میں ویٹر تھا)، اور دونوں نے ہر بات پر اتفاق کیا۔ حاج عزام نے، جیسا کہ لین دین کے وقت اس کی عادت تھی، بالکل صاف اور کھری بات کی اور بھاؤ تاؤ سے گریز کیا، اور سُعاد سے ان شرائط پر شادی طے کر لی:

1۔ سُعاد اپنے کمسن بیٹے تامر کو اپنی ماں کے پاس اسکندریہ میں چھوڑ کر اس کے ساتھ قاہرہ آ کر رہے گی، گو جب میسّر ہو اس سے ملنے جا سکتی ہے۔

2۔ وہ اس کے لیے دس ہزار پاؤنڈ کی مالیت کا زیور منگنی کے تحفے کے طور پر خریدے گا اور

بیس ہزار پاؤنڈ مہر کے طور پر دے گا، گوطلاق ہوئی تو واجب الادا رقم پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہوگی۔

3۔ شادی خفیہ رہے گی اور اس بات کی وضاحت ہو جانی چاہیے کہ اگر اس کی بیوی حاجّہ صالحہ کو اس شادی کی خبر ہوگئی تو اس صورت میں وہ سُعاد کو فوراً طلاق دینے پر مجبور ہو جائے گا۔

4۔ اگر چہ وہ شادی خدا اور اس کے رسول کی سنّت کے مطابق کرے گا، اسے اولاد پیدا کرنے سے مطلق رغبت نہیں ہے۔

حاج عزام نے اِس آخری شرط پر اصرار کیا اور حمید و پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ اب نہ اس کی عمر اور نہ حالات اسے باپ بننے کی اجازت دیتے ہیں اور اگر سُعاد کے حمل ٹھہر گیا تو نکاح باہمی اتفاق سے فوری طور پر منسوخ خیال کیا جائے گا۔

❁

''کیا ہوگیا؟''

دونوں بستر میں تھے، سُعاد اپنے نیلے رنگ کے شب خوابی کے لباس میں جس سے اس کی بھری بھری لرزتی چھاتیاں، رانیں، اور حیرت انگیز گوری چٹی بانہیں ظاہر ہو رہی تھیں، حاج عزام اپنے سیاہ جلباب میں اس کے برابر پسرا ہوا تھا۔ یہ ان دونوں کی گھڑی تھی۔ ہر روز اپنے دفتر میں نماز ظہر ادا کرنے کے بعد حاج دوپہر کا کھانا کھانے اوپر اس کے پاس اس پُرتعیش اپارٹمنٹ میں آتا تھا جو اس نے سُعاد کے لیے عمارت کی ساتویں منزل پر خریدا تھا، جس کے بعد وہ عشا کی نماز کے ذرا پہلے تک اس کے ساتھ سوتا، اور پھر اگلے دن تک کے لیے اسے چھوڑ کر چلا جاتا تھا۔ یہ وہ واحد انتظام تھا جس کے تحت اس کے لیے اپنی گھریلو زندگی کو ابتر کیے بغیر سُعاد کے ساتھ وقت گزارنا ممکن تھا۔

لیکن آج اس کی حالت خلافِ معمول تھی: وہ مضمحل اور متفکر تھا۔ وہ کسی معاملے کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے تمام دن اسے الجھائے رکھا تھا اور اب وہ سوچ سوچ کر تھک گیا تھا، اور جو خود بنائے ہوئے سگریٹ اس نے کھانے کے بعد پیے تھے ان سے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا اور متلی سی آ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ سُعاد اسے تھوڑا سا سو لینے کے لیے چھوڑ دے۔ لیکن سُعاد نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے سر کو اپنی گداز ہتھیلیوں کے درمیان لے لیا جن سے میٹھی میٹھی سی خوشبو آ رہی تھی، تھوڑی دیر تک اسے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے دیکھا، اور سرگوشی میں پوچھا، ''کیا بات

ہے، میرے پیارے؟''

حاج مسکرایا اور بڑبڑایا، ''کاروبار کی بہت سی مشکلات ہیں۔''

''خدا کا شکر کہ صحت اچھی ہے۔ یہی سب سے اہم چیز ہے۔''

''الحمد للہ۔''

''خدا کی قسم، دنیا اس قابل نہیں ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی اس پر پریشان ہوا جائے!''

''تم سچ کہتی ہو۔''

''حاج، مجھے بتاؤ، تمھیں کیا بات تنگ کر رہی ہے؟''

''تمھارے پاس اپنی پریشانیاں کیا کم ہیں!''

''شرم کرو! کیا میری پریشانیاں تمھاری پریشانیوں سے زیادہ اہم ہیں؟''

حاج مسکرایا اور اس کی طرف ممنونیت سے دیکھا۔ پھر وہ اس سے قریب ہوا، گال پر بوسہ دیا، اپنے سر کو تھوڑا سا پیچھے کھینچا، اور سنجیدہ آواز میں کہا، ''خدا نے چاہا تو میں اسمبلی کے انتخاب کے لیے اپنا نام تجویز کروں گا۔''

''اسمبلی؟''

''ہاں۔''

لحہ بھر کے لیے وہ بھونچکارہ گئی کیونکہ یہ اتنی غیر متوقع بات تھی، لیکن پھر جلد ہی اپنے کو سنبھال لیا، چہرہ مسکراہٹ سے گلنار ہو گیا اور شادمانی سے بولی، ''کتنا اُجلا دن ہے، یا حاج! خوشی کے نعرے لگاؤں یا کیا کروں؟''

''بس خدا آسانی کرے اور کامیابی ہو۔''

''خدا کے حکم سے۔''

''جانتی ہو، سُعاد، اگر میں اسمبلی میں داخل ہو جاؤں۔۔۔ تو کروڑوں کا کاروبار کر سکتا ہوں۔''

''ضرور داخل ہو گے۔ کیا انھیں کوئی تم سے بہتر مل سکتا ہے؟''

پھر اس نے اپنے ہونٹ سکوڑے جیسے کسی بچے کو ڈرا دھمکا رہی ہو اور اس سے (ان الفاظ میں جو کسی ننھی بچی کے لیے استعمال کیے جائیں) بولی، ''لیکن، میری گلاب جامن، میری جان نکلی جا رہی

ہے کہ جب تم ٹیلی وژن پر آؤ گی اور سب دیکھنے والوں کو اتنی پیاری لگو گی تو وہ تمھیں میرے پاس سے اُچک لیں گے!''

حاج نے قہقہہ لگایا اور سُعاد اس کے قریب آ گئی تا کہ وہ اس کے جوش میں آئے ہوئے جسم کی حرارت محسوس کر سکے۔ پھر اس نے اپنی بانہیں وا کر کے اسے کچ کچ، تجربہ کارانداز میں، بہت دیر کے لیے آغوش میں بھر لیا جو بالآخر بارآور ہوئی، اور پھر یہ دیکھ کر کہ جلد بازی کرنے میں حاج کا سر اس کے جلباب کے گریبان میں پھنس کر رہ گیا ہے، پھکوپن سے کھلکھلا کر ہنس دی۔

❁

یہ بالکل اسی طرح تھا جیسے سینما دیکھتے وقت ہوتا ہے — آپ فلم میں غرق ہو جاتے ہیں اور اس پر ردعمل ظاہر کرتے ہیں، لیکن آخر میں روشنیاں جل اٹھتی ہیں، آپ حقیقی دنیا میں لوٹ آتے ہیں، سینما سے باہر آتے ہیں، اور بھیڑ بھاڑ اور گاڑیوں سے بھری ہوئی سڑک کی خنک ہوا آپ کے منھ پر آ کر لگتی ہے۔ ہر شے اپنی معمول کی جسامت پر لوٹ آتی ہے اور اب تک جو پیش آیا تھا اسے آپ ایک فلم سمجھتے ہیں، محض ڈھیر ساری اداکاری۔

ٹھیک اسی طرح طٰہٰ الشاذلی کرداری انٹرویو والے دن کے واقعات کی بازخوانی کرتا ہے: بڑے پرتعیش سرخ قالین سے ڈھکی لمبی سی راہداری، اونچی چھت کا کشادہ کمرہ، بڑی سی ڈیسک جسے فرش سے اتنے اوپر رکھا گیا تھا کہ عدالتی کمرے کا چبوترہ دکھائی دے، بہت نیچے رکھی ہوئی چرمی نشست جس پر وہ بیٹھا تھا: کیم شحیم، فربہ جسم، سفید سوٹ پہنے ہوئے تین جرنیل، وردی پر پیتل کے چمکدار بٹن جوان کے رتبے کے غماز تھے، اور سینوں اور کندھوں پر جڑی چمچماتی سجاوٹیں، اور صدارت کرنے والا جرنیل، جس نے بڑی نپی تلی اور سدھی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اسے خوش آمدید کہا، پھر اپنے دائیں طرف کے رکن کی طرف دیکھ کر سر ہلایا، جو ڈیسک پر بازو آگے ٹکا کر، اپنا گنجا سر آگے نکال کر اس سے سوال کرنے لگا۔ اس دوران باقی دونوں اراکین بڑے غور سے اس کا مشاہدہ کرتے رہے، جیسے اس کے ہر لفظ کو تول رہے ہوں اور چہرے پر ظاہر ہونے والے ہر تاثر کا جائزہ لے رہے ہوں۔ سوال وہی تھے جن کی اسے توقع تھی، کیونکہ اس کے افسر دوستوں نے اسے پہلے ہی اطمینان دلا دیا تھا کہ کرداری انٹرویو کے سوالات ہمیشہ بندھے ٹکے اور جانے پہچانے ہوتے ہیں۔ پورا امتحان بس رسمی سا ہوتا ہے اور دکھاوے کے لیے

کیا جاتا ہے، یا اس لیے کہ (سکیورٹی ادارے کی خفیہ رپورٹوں کی بنیاد پر) انتہا پسند عناصر کو باہر رکھا جا سکے، یا اس لیے کہ ان خوش قسمتوں کی قبولیت کی تصدیق کی جائے جو بارسوخ اصحاب سے قربت رکھتے ہیں۔ طٰہ نے متوقع سوالات اور ان کے 'معیاری' جوابات حفظ کر لیے تھے اور استحکام اور اعتماد کے ساتھ کمیٹی کو جواب دیے۔ اس نے بتایا کہ گو اسے اتنے اونچے نمبر ملے تھے کہ وہ کسی بھی اچھے کالج کی شرائط پر پورا اترتا تھا، لیکن اس نے پولیس اکیڈمی میں داخلے کو ترجیح دی تاکہ ایک پولیس افسر کی حیثیت سے اپنے ملک کی خدمت کر سکے۔ اس نے اس نکتے پر خاصا زور دیا کہ پولیس کا کام، بیشتر لوگوں کے خیال کے برعکس، صرف قیامِ امن ہی نہیں، بلکہ اجتماعی اور انسانی بھی ہے (اور اپنا مدعا مثالیں دے کر واضح کیا)۔ بعد ازاں اس نے بدامنی کے انسداد کا ذکر کیا کہ اس کی کیا تعریف ہے اور اس کے کیا طریق کار ہیں، جس پر ممتحنوں کے چہروں پر قبولیت واضح طور پر ابھرنے لگی، یہاں تک کہ صدارت کرنے والے جرنیل نے تو دو بار طٰہ کی تائید میں سر بھی ہلایا۔ اب اس جرنیل نے پہلی بار منھ کھولا اور طٰہ سے سوال کیا کہ اگر وہ کسی مجرم کو گرفتار کرنے جائے اور یہ پتا چلے کہ وہ اس کا بچپن کا دوست ہے، تو اس صورت میں اس کا طرزِ عمل کیا ہوگا۔ طٰہ اس سوال کی توقع کر رہا تھا اور اس کا جواب پہلے ہی سے تیار تھا، لیکن اس نے کچھ دیر تک غور و فکر کرنے کا سوانگ رچایا تاکہ ممتحنوں پر زیادہ اثر چھوڑے۔ پھر بولا، ''جناب، فرض نہ دوستوں کو پہچانتا ہے نہ رشتے داروں کو۔ ایک سپاہی اس فوجی کی طرح ہوتا ہے جو جنگ آزمائی کر رہا ہو۔ اس پر واجب ہے کہ اپنا فرض بجا لائے اور کسی بات کو قابلِ اعتنا نہ سمجھے، خدا کی خاطر اور اپنے ملک کی خاطر۔''

صدارتی جرنیل مسکرایا اور واضح پسندیدگی سے سر ہلا دیا اور اختتام سے پہلے آنے والی خاموشی طاری ہو گئی۔ طٰہ توقع کر رہا تھا کہ اب انٹرویو ختم کرنے کا حکم دیا جائے گا لیکن معاً صدارتی جرنیل نے کاغذات پر گہری نظر ڈالی جیسے ابھی ابھی اس پر کچھ منکشف ہوا ہو۔ اس نے ورق کو تھوڑا سا اونچا کیا کہ گویا پڑھے ہوئے کو پکا کر لینا چاہتا ہو، پھر طٰہ سے نظریں کتراتے ہوئے پوچھا، ''تمھارے والد... وہ کیا کام کرتے ہیں، طٰہ؟''

''سرکاری ملازم ہیں، جناب۔''

(اور یہی اس نے عرضی کے فارم پر لکھا تھا، اور اس پر محلے کے افسرِ رابطہ سے دستخط کروا لیے تھے، جس کے لیے اسے سو پاؤنڈ کی رشوت دینی پڑی تھی۔) صدر ایک بار پھر کاغذات الٹنے پلٹنے لگا

اور بولا، ''سرکاری ملازم، یا املاک کا چوکیدار؟''

طٰہٰ نے ایک لمحہ تک کوئی جواب نہیں دیا، پھر بڑی دبی دبی سی آواز میں کہا، ''جناب، میرے والد املاک کے چوکیدار ہیں۔''

صدارتی جرنیل مسکرایا اور منفعل سا دکھائی دیا۔ پھر وہ کاغذات پر جھکا، توجہ کے ساتھ ان پر کچھ تحریر کیا، اور اسی طرح مسکراتے ہوئے سر اٹھا کر کہا، ''شکریہ، بیٹے، اب جاؤ۔''

❁

طٰہٰ کی ماں نے آہ بھر کر کہا، '''لیکن کیا عجب کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور وہ تمھارے حق میں بہتر ہو۔'''

بثینہ نے زور سے چلا کر کہا، ''پولیس افسری میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں؟ پولیس افسر ٹکے کے تین ملتے ہیں۔ پولیس کی وردی، اور جیب میں کیا؟ دمڑیاں! اس سے مجھے کتنی خوشی ہوتی!''

طٰہٰ سارا دن سڑکوں پر گھومتا پھرا تھا یہاں تک کہ تھکن سے چور ہو گیا، پھر چھت پر اپنے گھر لوٹ آیا اور بنچ پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ جو سوٹ اس نے صبح پہنا تھا، اپنی رونق کھو چکا تھا، ڈھلڈلا رہا تھا، گھٹیا اور حقیر سا لگ رہا تھا۔ ماں نے اس کا دل ہلکا کرنے کی کوشش کی۔

''بیٹے، تم چیزوں کو ضرورت سے زیادہ دشوار بنائے دے رہے ہو۔ پولیس کے علاوہ اور بھی تو بہت سے اچھے اچھے کالج ہیں۔''

طٰہٰ اسی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ ماں کو لگا کہ معاملہ اس کے کلمات کی بساط سے کچھ بڑھ کر ہے اور وہ اسے بثینہ کے ساتھ چھوڑ کر باورچی خانے میں چلی آئی۔ بثینہ آ کر بنچ پر اس کے برابر بیٹھ گئی۔ پھر اس سے قریب ہوئی اور سرگوشی کی، ''نبی کا واسطہ، پریشان مت ہو، طٰہٰ۔''

اس کی آواز سنتے ہی طٰہٰ کے صبر وضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ تلخی سے چیخنے لگا، ''میری ساری محنت اکارت گئی، اس لیے پریشان ہوں۔ اگر انھوں نے پہلے ہی سے باپ کے ایک مخصوص پیشے کی شرط رکھ دی ہوتی تو مجھے پتا چل جاتا۔ انھیں چاہیے تھا کہ کہہ دیتے 'چوکیداروں کی اولاد کو درخواست دینے کی اجازت نہیں۔' پھر جو انھوں نے کیا ہے وہ خلافِ قانون بھی ہے۔ میں نے ایک وکیل سے پوچھا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ اگر میں مقدمہ دائر کروں تو جیت جاؤں گا۔''

Scanned with CamScanner

''تم کوئی مقدمہ وقدمہ نہیں دائر کرو گے۔ اپنی رائے دوں؟ جو اعلیٰ نمبر تمھیں ملے ہیں ان کی بنیاد پر یونیورسٹی کے بہترین کالج میں داخلہ لو، اونچے نمبروں سے کامیاب ہو، کسی عرب ملک چلے جاؤ اور پیسہ کماؤ، اور یہاں لوٹ کر بادشاہوں کی طرح زندگی گزارو۔''

طٰہٰ تھوڑی دیر تک اسے تکتا رہا اور پھر سے سر جھکا لیا۔ وہ بولے گئی، ''دیکھو، طٰہٰ۔ مجھے معلوم ہے کہ تم سے ایک سال چھوٹی ہوں، لیکن مجھے کام کا عملی تجربہ ہے اور میں نے اس سے چند باتیں سیکھی ہیں۔ یہ ملک ہمارا نہیں، طٰہٰ۔ یہ پیسے والوں کا ملک ہے۔ اگر تمھارے پاس بیس ہزار پاؤنڈ ہوتے اور ان سے کسی کو رشوت دے سکتے، تو تمھارے خیال میں کسی نے تم سے تمھارے باپ کے پیشے کے بارے میں پوچھا ہوتا؟ پیسہ کماؤ، طٰہٰ، اور تمھیں سب کچھ مل جائے گا، لیکن اگر تم غریب کے غریب ہی رہے تو یہ تمھیں کچل کر رکھ دیں گے۔''

''لیکن انھوں نے جو کیا ہے اس پر میں چپ نہیں رہ سکتا۔ میں شکایت کر کے رہوں گا۔''

بثینہ تلخی سے ہنسی۔ ''کس کی شکایت کرو گے اور کس سے شکایت کرو گے؟ میری بات مانو اور فضول خیالات میں نہ پڑو۔ محنت سے کام کرو، ڈگری حاصل کرو، اور جب تک دولت مند نہ ہو جاؤ، یہاں قدم نہ دھرو۔ اور اگر سرے سے کبھی دھرو ہی نہیں تو اور بھی اچھا۔''

''تو تمھارے خیال میں مجھے کسی عرب ملک چلے جانا چاہیے؟''

''بالکل۔''

''تم میرے ساتھ چلو گی؟''

سوال نے بثینہ کو ناگہانی آ لیا اور وہ نظریں کترا کر بڑبڑائی، ''انشاء اللہ۔''

لیکن طٰہٰ افسردگی سے بولا، ''میرے ساتھ تمھارا رویہ بدل گیا ہے، بثینہ۔ میں جانتا ہوں۔''

بثینہ ایک نئے جھگڑے کو کھڑا ہوتا ہوا دیکھ سکتی تھی، سو اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا، ''اب تم بری طرح تھک گئے ہو۔ جا کر سو رہو۔ کل بات کریں گے۔''

وہ اٹھ کر چلی گئی لیکن وہ سو نہ سکا۔ بڑی دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ ہزار بار صدارتی جرنیل کا چہرہ یاد کیا کہ آہستگی سے اس سے پوچھ رہا ہے، یوں جیسے کہ اس کی تحقیر سے مزے لے رہا ہو، ''تمھارے والد املاک کے چوکیدار ہیں، بیٹے؟'' ''املاک کے چوکیدار؟'' — ایک نازیبا فقرہ، ایسا

Scanned with CamScanner

فقرہ جس کے بارے میں اس نے سوچا ہی نہ تھا اور نہ جس کی کبھی توقع کی تھی۔ ایک فقرہ جو اس کی پوری زندگی تھا۔ اس نے اس زندگی کے طویل برس جھیلے تھے، اس کے جور و ستم سہے تھے، اپنی پوری توانائی کے ساتھ اس کی مزاحمت کی تھی، اور اس سے نجات پانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس نے یہ جدوجہد کی تھی کہ پولیس اکیڈمی کی فراہم کردہ دراڑ سے ہو کر ایک باعزت اور شائستہ زندگی میں فرار کر سکے گا، لیکن وہ فقرہ — ''املاک کے چوکیدار'' — اس تھکن سے چور چور کر دینے والی دوڑ کی انتہا پر اس کا منتظر تھا، تاکہ عین موقعے پر سب کچھ ستیاناس کر کے رکھ دے۔ انھوں نے پہلے ہی کیوں نہیں بتا دیا تھا؟ جرنیل نے اسے آخر پر کیوں اٹھا رکھا تھا اور یہ کیوں ظاہر کیا تھا کہ وہ اس کے جوابات سے بہت خوش ہوا ہے، پھر اس پر اپنا آخری وار کیا تھا، یہی کہنے کے لیے نا کہ ''میری نظروں سے دور ہو جاؤ، چوکیدار کے بچے! پولیس میں بھرتی ہونا چاہتے ہو، چوکیدار کے بچے! چوکیدار کا بچہ افسر بننا چاہتا ہے؟ کیسی پر لطف بات ہے، خدا کی قسم!''

طٰہٰ اٹھ کر کمرے میں چکر لگانے لگا کیونکہ اس نے کچھ نہ کچھ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اپنے سے کہا کہ وہ ان کے اس طرح ذلیل کرنے پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ آہستہ آہستہ وہ عجیب و غریب انتقامی منظروں کا تصور کرنے لگا: مثلاً، اس نے دیکھا کہ وہ کمیٹی میں شریک جرنیلوں کے سامنے مساوی مواقع، حقوق، اور اس عدل و انصاف کی بابت جس کا خدا اور اس کے نبی نے حکم دیا ہے، تقریر کر رہا ہے۔ وہ انھیں لتاڑتا رہا یہاں تک کہ وہ اپنے کیے پر شرم سے پانی پانی ہو گئے، انھوں نے اس سے معافی مانگی اور اکیڈمی میں اس کے داخلے کا اعلان کیا۔ آخری منظر میں اس نے خود کو دیکھا کہ صدارت کرنے والے جرنیل کا گریبان پکڑ کر منھ در منھ اس سے چلّا کر کہہ رہا ہے، ''او جعل ساز، رشوت خور! میرا باپ کیا کرتا ہے، اس سے تجھے کیا غرض؟'' اس کے بعد اس نے اس پر اور بھی شدید کلمات دے مارے، جن کی تاب نہ لا کر جرنیل فرش پر ڈھیر ہو گیا، اور اپنے خون میں ڈوب گیا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ جب بھی خود کو ایسی مشکلوں میں گھرا پاتا جن پر قابو پانا اس کے بس میں نہ ہوتا تو اس قسم کے مناظر کا تصور کرتا۔ لیکن اِس بار، اپنی تمام تر شدت کے باوجود، یہ انتقامی منظر اسے تسکین پہنچانے سے قاصر رہے۔ تحقیر کا احساس اسے کچلے گیا، یہاں تک کہ اسے ایک خیال آیا جسے وہ اپنے ذہن سے نہ نکال سکا۔ اپنی چھوٹی سی ڈیسک کے سامنے بیٹھ کر اور کاغذ قلم نکال کر، اس نے صفحے کے

Scanned with CamScanner

اوپر جلی حروف میں لکھا، ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ عزت مآب صدرِ جمہوریہ کے نام شکایتی عرضداشت۔'' لمحہ بھر کے لیے رک کر اس نے سر کو پیچھے جھکایا اور اپنے الفاظ کی ضخامت اور متانت پر قدرے راحت محسوس کی۔ پھر لکھنے میں منہمک ہو گیا۔

❁

میں نے یہ جگہ خالی چھوڑ دی ہے کیونکہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا لکھوں۔

روزمرہ کے غموں اور مسرتوں کو بیان کرنے کے لیے لفظ ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں لیکن مسرت کے عظیم لمحات کا بیان قلم کی استطاعت سے باہر ہے، جیسے وہ لمحات جو زکی الدسوقی نے اپنی محبوبہ رباب کی معیت میں گزارے اور، اس بدقسمت حادثے کے باوجود، زکی بک کو پیاری رباب اپنے طلسماتی، شہاب رنگ چہرے، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں، بھرے بھرے قرمزی لبوں کے ساتھ ہمیشہ یاد رہے گی، اپنے بال کھول کر، کہ وہ اس کی پشت پر لٹک رہے تھے، اس کا سامنے بیٹھ کر وِسکی پینا اور اپنی ترغیب انگیز آواز میں اس سے اٹکھیلیاں کرنا، بہانے سے غسلخانے جانا اور ایک مختصر سا شب خوابی کا لباس پہن کر نکلنا جو اس کی ساری فتنہ سامانیوں کی نمائش کر رہا تھا؛ اور وہ اس کی اس چنچل مسکراہٹ کو بھی یاد رکھے گا جس کے ساتھ اس نے پوچھا تھا، ''ہم کہاں سوئیں گے؟'' اور وہ ناقابلِ مدافعت لذت جو اس کے گرم و گداز بدن نے اسے عطا کی تھی۔ اس رس بھری مجامعت کی ہر تفصیل زکی بک کو یاد ہے، اور پھر ذہن میں وہ تصویر یکبارگی گج مچا کر بری طرح مضطرب ہوتی ہے، پھر بالکل ہی منقطع ہو جاتی ہے، اور پیچھے ایک تاریک خالی پن، سر درد اور متلی کی کیفیت چھوڑ جاتی ہے۔ اسے کچھ یاد رہ

جاتا ہے تو بس ایک دبی دبی سی آواز، جیسے سانپ سسیا رہا ہو، جس کے بعد ایک بڑی تیز سی بو جس سے اس کے نتھنے جلنے لگتے ہیں، اور اُس لمحے رباب بڑی عجیب نظروں سے اس کا معائنہ کرنے لگتی ہے جیسے کسی چیز کی متلاشی ہو۔ اس کے بعد زکی بک کو کچھ یاد نہیں رہتا۔ . .

وہ بڑی دشواری کے ساتھ بیدار ہوا، ایک جابر درد کے ہتھوڑے اس کے سر پر برس رہے تھے، اور دیکھا کہ ابسخرون اس کے پاس کھڑا ہے، خوف کی علامتیں چہرے سے ہویدا ہیں اور مسلسل سرگوشیوں میں کہہ رہا ہے، ''عالیجاہ کی طبیعت ناساز ہے۔ ڈاکٹر کو بلالاؤں؟''

اس نے بڑی مشکل سے اپنا سر خفیف سا ہلایا، اور اپنے منتشر خیالات کو مجتمع کرنے کی ایک غیر معمولی کوشش کی۔ اسے خیال آیا کہ وہ بڑی دیر تک سوتا رہا ہے اور وقت معلوم کرنا چاہا، سو اپنی کلائی کی طلائی گھڑی پر نظر ڈالی، لیکن وہ وہاں نہیں تھی؛ نہ اس کے برابر والی میز پر اس کا بٹوا ہی تھا جہاں اس نے رکھا تھا۔ اس پر اسے یقین ہو گیا کہ اسے لوٹ لیا گیا ہے، اور تھوڑا تھوڑا کر کے اس نے غائب شدہ اشیا کی فہرست بنانی شروع کی: طلائی گھڑی اور بٹوے میں رکھے ہوئے پانچ سو پاؤنڈ کے علاوہ 'کراس' مارکہ قلموں کا سیٹ (غیر مستعمل، ہنوز اپنے ڈبے ہی میں) اور 'پرسول' مارکہ دھوپ کا چشمہ بھی چرالیا گیا تھا۔ لیکن سب سے بڑا نقصان الماس کی انگشتری کا تھا جو اس کی بڑی بہن دولت الدسوقی کی ملکیت تھی۔

''میں لٹ گیا ہوں، ابسخرون! رباب نے مجھے لوٹ لیا ہے!''

زکی بک اسی صوفے کے کنارے پر، جو کچھ دیر پہلے محبت کا جھولنا تھا، تقریباً عریاں حالت میں بیٹھا بار بار یہی دہراتا رہا۔ اُس وقت، زیر جامہ پہنے، اپنے نحیف و نزار جسم اور خالی، پچکے ہوئے منھ کے ساتھ (اس نے اپنی محبوبہ کو چومنے کی خاطر اپنے نقلی دانت نکال دیے تھے)، وہ بڑی حد تک کسی نکبت کے مارے ہوئے مزاحیہ اداکار کی طرح نظر آرہا تھا، جو دو منظروں کے درمیان سستا رہا ہو۔ لاچاری سے مغلوب ہو کر اس نے سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا، جبکہ ابسخرون، جو اس واقعے سے مضطرب اور کسی بندھے ہوئے کتے کی طرح مشتعل ہو گیا تھا، فرش پر اپنی بیساکھیاں کھٹکھٹاتا ہوا کمرے میں ہر طرف چکر کاٹنے لگا۔ پھر وہ اپنے آقا پر جھکا اور ہانپتے ہوئے بولا، ''عالیجاہ، پولیس والوں سے اس بنتِ حرام کی رپورٹ کر دیں؟''

Scanned with CamScanner

زکی نے کچھ سوچا، پھر انکار میں سر ہلا دیا اور خاموش ہو گیا۔ ابسخرون قریب آیا اور سرگوشی کی،
''عالیجاہ، کیا اس نے آپ کو کچھ پینے کے لیے دیا تھا یا آپ کے چہرے پر کچھ چھڑکا وڑکا تھا؟''
زکی الدسوقی کو اپنے غصے کو راہ دینے کے لیے اسی سوال کی ضرورت تھی، اور وہ پھٹ پڑا اور بیچارے ابسخرون کو بے نقط سنانے لگا۔ لیکن آخر میں کھڑے ہو کر کپڑے پہننے کے لیے اس کی مدد قبول کر لی، کیونکہ اس نے چل دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

نصف شب کے بعد کا عمل تھا اور شارع سلیمان باشا کی دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ زکی بک پیر گھسیٹتا چل رہا تھا، سر درد اور تھکن سے لڑکھڑا رہا تھا، اور اس کے اندر غصہ آہستہ آہستہ چڑھ رہا تھا۔ اسے اس تمام بھاگ دوڑ کا خیال آیا اور اس پیسے کا جو اس نے رباب پر خرچ کیا تھا، اور ان قیمتی اشیا کا جو رباب نے چرالی تھیں۔ یہ سب اس کے ساتھ آخر کیسے ہوا؟ زکی الدسوقی، اس قدر ممتاز شخص، عورتوں کو فریفتہ کرنے والا، بیگمات کا عاشق، اور اسے ایک گری پڑی طوائف یوں جُل دے کر لوٹ لے! شاید اس لمحے وہ اپنے عاشق کے ساتھ ہوگی، اسے 'پرسول' چشمہ اور سونے کے 'کراس' مارکہ قلم (غیر استعمال شدہ) دے رہی ہوگی اور اس کے ساتھ مل کر اس آسانی سے الّو بن جانے والے اس بڈھے پر ہنس رہی ہوگی جو یوں اس کے دام میں آ گیا تھا۔

اسے یوں اور بھی طیش آ رہا تھا کہ فضیحت کے خوف سے وہ پولیس کو اطلاع بھی نہیں دے سکتا تھا، کیونکہ لامحالہ اس کی بھنک اس کی بہن دولت کو بھی ہو جاتی۔ اسی طرح، وہ رباب کا پیچھا بھی نہیں کر سکتا تھا، نہ 'کائرو بار' والوں سے اس کی شکایت کر سکتا تھا جہاں وہ ملازم تھی، کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ بار کا مالک اور وہاں کام کرنے والے سب کے سب عادی جرائم پیشہ لوگ تھے جنھیں اس سے پہلے سزائیں ہو چکی تھیں، اور ہو سکتا ہے کہ یہ ڈکیتی بھی انھی کی ایما پر ہوئی ہو۔ کچھ بھی سہی، اس کا قطعی کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ رباب کے خلاف اس کی حمایت کریں گے، بلکہ عین قرین قیاس تھا کہ وہ خود اسی کی مزاج پرسی کر ڈالیں گے، جیسا کہ وہ انھیں دنگا کرنے والے گاہکوں کے ساتھ کرتا دیکھ چکا تھا۔

اس پورے واقعے کو بھول جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا، اور یہ کتنی مشکل اور تکلیف دہ بات تھی، اس تردد کا تو خیر ذکر ہی کیا جو بہن دولت کی انگشتری کی چوری پر ایک بوجھ کی طرح اس کے سینے پر سوار تھا۔ وہ اپنے کو لعنت ملامت کرنے لگا: جب مرمت کے بعد 'پاپازیان' جوہری کے یہاں سے

Scanned with CamScanner

انگشتری اسے واپس ملی تھی تو اس نے اسے فوراً دولت کو لوٹا دینے کے بجائے دفتر میں ہی کیوں رہنے دیا تھا؟ اب وہ کیا کرے؟ نئی انگوٹھی خریدنے کی اس کی استطاعت نہیں تھی، اور اگر ہوتی بھی تو دولت اپنے زیورات سے اتنی ہی اچھی طرح واقف تھی جتنی اپنی اولاد سے۔ اسے سب سے زیادہ خوف دولت کا سامنا کرنے سے آ رہا تھا، اتنا زیادہ کہ جب وہ گزرگاہِ بہلر میں اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچا تو داخلے کے پاس کچھ دیر متذبذب کھڑا سوچتا رہا کہ کیوں نہ جا کر اپنے کسی دوست کے یہاں رات گزار لے، اور شاید وہ یہی کرتا لیکن کافی دیر ہو گئی تھی اور اس کی تھکن اسے اوپر جانے کے لیے اکسا رہی تھی، چنانچہ وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

❁

''جنابِ بک صاحب، اب تک کہاں رہے؟''

اس کے اپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی دولت نے اسے ان الفاظ میں مخاطب کیا۔ وہ ملاقاتی کمرے کے دروازے کے رخ رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اپنے اخروٹی رنگے ہوئے بال 'بوکلوں' پر لپیٹے ہوئے تھے اور اپنے چہرے کی جھریوں پر غازے کی موٹی موٹی تہیں جما رکھی تھیں اور چھوٹے سے طلائی ہولڈر میں لگی روشن سگریٹ اس کے منھ کے ایک گوشے سے لٹکی ہوئی تھی۔ وہ ایک گھریلو لبادہ پہنے ہوئے تھی، جس نے اس کے دبلے پتلے جسم کو ڈھانپا ہوا تھا، اور اپنے پیر سفید خرگوشوں کی شکل کے 'پانتوفلس' [گداز، پشمی استر لگے سلیپروں] میں ڈالے ہوئے تھے۔ وہ کچھ بن رہی تھی، ہاتھ پھرتیلی میکانکیت سے حرکت کر رہے تھے، ذرا بھی رکے یا رفتار میں کمی لائے بغیر، یوں جیسے اس کے بقیہ جسم سے الگ ہوں۔ عادت نے اسے ایک ساتھ سگریٹ پینے، بُننے اور باتیں کرنے کی مہارت بخشی تھی۔

''شام بخیر۔''

زکی نے جلدی جلدی یہ الفاظ ادا کیے اور سیدھے اپنے کمرے کا رخ کرنے کی کوشش کی لیکن دولت نے فوراً ہی حملہ کر دیا۔ ''اپنے کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ کیا کسی ہوٹل میں قیام ہے؟ تین گھنٹے سے بیٹھی تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں، دروازے اور کھڑکی کے درمیان چکر لگا رہی ہوں۔ بس ابھی پولیس کو فون کرنے والی تھی۔ یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں تمھیں کچھ ہو نہ گیا ہو۔ تم نے بہت برا کیا! میں بیمار ہوں۔ تم

Scanned with CamScanner

مجھے مارڈالنا چاہتے ہو؟ یا خدا، مجھ پر رحم کر! یا خدا، مجھے اٹھالے تاکہ آرام مل جائے!''

یہ چار حرکی جھڑپ کا ایک نوع کا ابتدائیہ تھا جو ہو سکتا تھا کہ صبح تک جاری رہے، چنانچہ زکی نے بعجلت راہداری عبور کرتے ہوئے کہا، ''مجھے افسوس ہے، دولت۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ میں اب جا کر سوتا ہوں۔ صبح بتاؤں گا کہ کیا ہوا، انشاءاللہ۔''

لیکن دولت کو اس کی فرار کی کوشش کا اندازہ تھا؛ سلائیاں ہاتھ سے پھینک کر وہ اس کی طرف لپکی اور اپنی پوری آواز سے چیخی، ''کس چیز سے تھک گئے ہو، بیچارے؟ ان عورتوں سے جنھیں کتے کی طرح سونگھتے پھرتے ہو؟ عقل کے ناخن لو، یا شیخ! کسی دن بھی مر سکتے ہو۔ جب ہمارے رب سے سامنا ہوگا تو اس سے کیا کہو گے؟''

اس آخری چیخ کے ساتھ ہی دولت نے زکی کی پیٹھ کو زور سے دھکا دیا۔ وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا لیکن اپنی قوت سمیٹ کر اپنے کمرے میں سرک گیا، اور دولت کی شدید مزاحمت کے باوجود اس نے کسی نہ کسی طرح دروازہ مقفل کر کے چابی جیب میں ٹھونس لی۔ دولت مسلسل چیختی چلاتی اور دروازے کے قبضے کو کھڑکھڑاتی رہی کہ اسے کھولنے پر مجبور کر دے، لیکن زکی نے اطمینان کا سانس لیا کہ سلامتی میں پہنچ گیا ہے اور دولت تھک تھکا کر چلی جائے گی۔ پھر وہ پورے کپڑے پہنے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ تھکن اور آزردہ خاطری کے عالم میں وہ دن کے واقعات کا جائزہ لینے لگا، فرانسیسی میں بڑبڑاتے ہوئے: ''کیسا بھیانک دن تھا!'' پھر اسے دولت کا خیال آیا اور اپنے سے پوچھا کہ آخر یہ کیسے ہوا کہ اس کی پیاری بہن ایک بدخصلت اور نفرت انگیز بڑھیا میں بدل گئی۔

وہ اس سے صرف تین سال بڑی ہے اور اسے ابھی تک ایک حسین اور نازک اندام لڑکی کے روپ میں یاد ہے جو 'مادرِ خدا' اسکول کی نیلی پیلی یونیفارم پہنے، جانوروں کے بارے میں لافونتین کی شاعری سے قطعات حفظ کر رہی ہے۔ شام کو وہ ان کے زمالک والے پرانے مکان کے ملاقاتی کمرے میں پیانو بجاتی (جو انقلاب کے بعد باشا نے فروخت کر دیا تھا)۔ وہ اتنا اچھا بجاتی کہ استانی مادام شدید نے باشا سے پیرس میں منعقد ہونے والے شوقیہ سازندوں کے بین الاقوامی مقابلے میں اس کے بیٹھنے کے امکان کی بابت بات کی، لیکن باشا نے انکار کر دیا، جس کے بعد جلد ہی دولت کی ہوائی فوج کے کپتان حسن شوکت سے شادی ہوگئی اور دو اولادیں ہوئیں: ایک لڑکا اور ایک لڑکی (ہانی

اور دینا)۔ پھر انقلاب آیا اور شاہی خاندان سے اپنے قریبی مراسم کی بنا پر شوکت کو پنشن دے کر ملازمت سے فارغ کر دیا گیا، جس کے بعد وہ جلد ہی پینتالیس سال سے کم عمر میں مر گیا۔

دولت نے دوبار اور شادی کی لیکن مزید بچے نہیں ہوے۔ ان ناکام شادیوں نے اسے تلخ، اعصاب زدہ اور سگریٹ کا دھتی بنا دیا تھا۔ پھر اس کی بیٹی بڑی ہوگئی اور شادی کر کے کینیڈا جا بسی۔ جب لڑکا میڈیکل اسکول سے فارغ ہوا تو دولت کو اس سے بھی ترکِ وطن کرنے کے خلاف شدید معرکہ آرائی کرنی پڑی۔ وہ روئی پیٹی، چیخی چلائی، سارے رشتے داروں سے منت سماجت کی کہ لڑکے کو سمجھائیں کہ اسی کے ساتھ رہے، لیکن نوجوان ڈاکٹر، اپنی نسل کے بیشتر دوسروں ہی کی طرح، مصر کے حالات سے پیٹ بھر کر مایوس ہو چکا تھا۔ وہ ترکِ وطن کا عزم کر چکا تھا اور اس نے ماں کو ساتھ لے جانے کی پیشکش کی۔ لیکن دولت نے انکار کر دیا اور یوں اکیلی رہ گئی۔

اس نے اپنا گارڈن سٹی والا اپارٹمنٹ مع ساز و سامان کرائے پر اٹھا دیا اور وسطِ شہر میں زکی کے ساتھ قیام کرنے چلی آئی، روزِ اول ہی سے یہ دونوں بڈھا بڑھیا تکرار کرتے اور لڑتے جھگڑتے رہے تھے جیسے ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوں۔ زکی اپنی خود مختاری اور آزادہ روی کا عادی ہو چکا تھا اور اپنی زندگی میں کسی اور کی شراکت، اور یہ قبول کرنا اس کے لیے مشکل بن گیا تھا کہ وہ مقررہ وقت پر سونے اور کھانے کی پابندی کرے گا اور اگر رات دیر تک باہر رہنے کا ارادہ ہو تو دولت کو پیشگی بتایا کرے گا۔ دوست عورتوں کو گھر بلانے میں دولت کی موجودگی مانع تھی اور اپنے حد درجہ ذاتی معاملات میں اس کی کھلم کھلا مداخلت اور اس پر اپنا تسلط جمانے کی مستقل کوششوں نے اسے برداشت کرنا اور بھی دشوار کر دیا تھا۔

جہاں تک خود دولت کا تعلق ہے، وہ اپنی تنہائی اور بدنصیبی جھیلتی رہتی اور اس بات سے اسے دکھ ہوتا کہ شادی میں ناکام رہنے اور بڑھاپے میں بچوں کے چھوڑ کر چلے جانے کے بعد زندگی کچھ حاصل کیے یا کارنمایاں دکھائے بغیر ہی بیت جائے گی۔ یہ بات اسے بہت ستاتی کہ زکی کسی اعتبار سے بھی کسی ناکام بڈھے کی طرح نہیں نظر آتا تھا جو بیٹھا موت کی راہ تک رہا ہو، بلکہ اب بھی خوشبوئیں لگاتا، چھیل چھبیلا بنتا اور عورتوں کا پیچھا کرتا تھا۔ اسے آئینے کے سامنے مسکراتے اور گنگناتے ہوے کپڑے درست کرتا دیکھ کر، یا یہ دیکھ کر کہ وہ خوش و خرم اور شگفتہ خاطر ہے، دولت کو اپنے اندر ایک

Scanned with CamScanner

طیش ابھرتا ہوا محسوس ہوتا، جو اس وقت تک مدھم نہ پڑتا جب تک وہ اس سے تو تو میں میں نہ کر لیتی اور زبانی کوڑے نہ برسا لیتی۔ وہ اس کی بچکانہ حرکتوں اور نخرے بازیوں کو ہدف بناتی تھی تو یہ کسی اخلاقی اعتراض کی بنیاد پر نہیں تھا، بلکہ صرف اس لیے کہ اس کا زندگی سے یوں چمٹے رہنا خود اس کے پاس سے لگا نہیں کھاتا تھا، اور بھائی پر اس کا غیظ و غضب ان ماتم کرنے والوں کی برہمی سے مشابہ تھا جو کسی کو عین تجہیز و تکفین کے درمیان ہنسی ٹھٹھول کرتا پاتے ہیں۔

اس پر دو عمر رسیدوں کی چڑچڑاہٹ، بے صبری اور ضدی پن مستزاد جو بڑھاپے کا خاصہ ہے، اس کے علاوہ وہ مخصوص تناؤ بھی جو اس وقت رونما ہوتا ہے جب دو آدمی ایک دوسرے کے بہت قریب رہ رہے ہوں، اتنی معمولی معمولی باتوں پر کہ ایک غسلخانہ استعمال کرنا چاہتا ہے اور دوسرا وہاں دیر سے ڈیرہ ڈالے بیٹھا ہے، یا جب ایک سو کر اٹھتا ہے تو اس کا چہرہ اتنا ترش کیوں ہوتا ہے، جب ایک خاموشی چاہتا ہے تو دوسرا اٹرّائے جانے پر کیوں مصر ہے، دوسرے کی دن رات موجودگی، جو ہر وقت آپ کو گھورتا رہتا ہو، آپ کی بات کاٹتا رہتا ہو، ہر بات میں کیڑے نکالتا ہو، اور جس کی داڑھوں کی کڑکڑاہٹ آپ کو برافروختہ کر دیتی ہو، اور جب بھی وہ ساتھ کھانے بیٹھتا ہو تو اس کے برتنوں پر چمچہ چلانے کی گونج دار آواز آپ کا سکون درہم برہم کر دیتی ہو۔

زکی بک الدسوقی پڑے پڑے ان واقعات کی بازخوانی کر رہا تھا، یہاں تک کہ غنودگی طاری ہونے لگی۔ لیکن اس کا روزِ بد ابھی ختم کہاں ہوا تھا، کیونکہ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں دروازے میں فاضل چابی گھومنے کی آواز سنائی دی، جو دولت کو معلوم تھا کہ کہاں رکھی ہوتی ہے۔ اس نے دروازہ کھولا، اس کے قریب آئی، اور برہمی سے پھٹی پھٹی آنکھوں اور جذبات سے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا: ''زکی، انگوٹھی کہاں ہے؟''

❁

... تو اس طرح، عزت مآب صدر دیکھیں گے کہ آپ کے بیٹے، طٰہٰ محمد الشاذلی، کے ساتھ پولیس اکیڈمی میں انٹرویو لینے والی کمیٹی کے صدارتی جرنیل نے ناانصافی اور حق تلفی کی ہے۔ رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم، نے اپنی حدیث میں کہا ہے: ''یقیناً تم سے پہلے تمھارے لوگوں میں اگر ان کا کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے، اور اگر

کوئی غریب چوری کا مرتکب ہوتا تو اس پر حد قائم کر دیتے۔ خدا کی قسم، اگر فاطمہ، بنتِ محمد، چوری کرے تو میں اس کے ہاتھ کاٹ دوں گا۔"

رسولِ خدا نے سچ کہا ہے۔ جنابِ صدر، میں نے نواسی نمبر (ادبیات) حاصل کرنے کے لیے بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور بڑی جدوجہد کی، اور خدا کے فضل سے میں پولیس اکیڈمی میں داخلے کے تمام امتحانات میں کامیاب ہوا۔ اس صورت میں، جنابِ صدر، کیا یہ انصاف ہے کہ مجھے پولیس میں داخلہ دینے سے صرف اس لیے انکار کر دیا جائے کہ میرے والد ایک شریف لیکن غریب آدمی ہیں جو املاک کی نگہبانی کرتے ہیں؟ کیا املاک کی نگہبانی ایک شریفانہ پیشہ نہیں ہے، اور کیا ہر شریفانہ پیشے کی عزت نہیں کرنی چاہیے، جنابِ صدر؟ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں، جنابِ صدر، کہ اس شکایت پر اس مشفق باپ کی طرح نظر ڈالیں جو کبھی اس بات کو قبول نہیں کرے گا کہ اس کے لڑکوں میں سے کسی کے ساتھ ناانصافی ہو۔ میرا مستقبل، جنابِ صدر، آپ کے فیصلے کا منتظر ہے، عزت مآب، اور مجھے یقین ہے کہ، انشاءاللہ، آپ کے رحم دل ہاتھوں سے میرے ساتھ انصاف ہوگا۔

خدا آپ کو اسلام اور مسلمانوں کے اثاثے کے طور پر قائم رکھے۔

آپ کا مخلص بیٹا، طٰہٰ محمد الشاذلی

شناختی کارڈ نمبر 19578، قصر النیل

پتا: عمارتِ یعقوبیان، 34، شارع طلعت حرب، القاہرہ

❁

کسی کامران جنگی سورما کی طرح جو اس شہر میں ظفر مندی کے ساتھ داخل ہوتا ہے جو اس نے گھمسان کی معرکہ آرائی کے بعد فتح کیا ہو، ملاک خلہ شادماں اور اتراتا ہوا عمارت کی چھت پر اپنے نئے کمرے کا قبضہ لینے نمودار ہوا۔ وہ اپنا نیلے رنگ کا عوامی سوٹ پہنے ہوئے تھا، جو خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتا تھا، اور اپنی گردن میں ایک لمبا سا ناپنے کا فیتہ لٹکائے ہوئے تھا جو، کسی فوجی افسر کی وردی پر بنے ہوئے ستاروں یا ڈاکٹر کے اسٹیتھو سکوپ کی طرح، اس کے بلند مرتبہ ماہر قمیص ساز

ہونے کا امتیازی نشان تھا۔ اُس صبح کمرہ تیار کرنے کے لیے وہ اپنے ساتھ کافی کاریگر لیتا آیا تھا: ایک لوہار، بجلی کا مستری، نل ساز، اوران کی مدد کے لیے چند چھوٹی عمر کے لڑکے۔

اپنے ہنر میں ماہر ملاک نے مریم عذرا اور یسوع مخلص کے دوار شکرانے کی دعا بڑبڑا کر پڑھی، پھر ہاتھ بڑھا کر اولین بار کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر ہوا بوسیدہ تھی کیونکہ اخبار فروش عطیہ کی موت کے بعد سال بھر سے بند پڑا تھا (جس کی کچھ چیزیں ملاک کو وہاں ملیں، جو اس نے ایک لڑکے سے کہا کہ ایک کارڈ بورڈ کے ڈبے میں جمع کر دے)۔

اب کھڑکی کھولنے کے بعد، تا کہ جگہ سورج کی روشنی سے بھر جائے، ملاک کمرے کے وسط میں کھڑا ہے اور کاریگروں کو کام کی مفصل ہدایات دے رہا ہے۔ گاہے گاہے، تجسس کے مارے، چھت کا کوئی باسی ماجرا دیکھنے کے لیے ٹھہر جاتا ہے۔ بعضے بس تھوڑی دیر تک نظارہ کرنے کے بعد آگے بڑھ جاتے ہیں؛ بعض دوسرے نئے کمرے کا قبضہ لینے پر ملاک کو مبارکباد دیتے ہیں اور ہاتھ ملاتے ہیں، اوراس کام کے کامیاب ہونے کی تمنا کرتے ہیں۔

لیکن چھت کے سبھی باسی اتنے مہذب اور شائستہ نہیں۔ آدھے ہی گھنٹے میں خبر ساری چھت پر پھیل گئی ہے اور جلد ہی دو افراد، حامد حواس اور علی ڈرائیور، وہاں آ پہنچتے ہیں جو نو وارد کو خوش آمدید کہنے کے ذرا بھی مشتاق نہیں معلوم ہوتے۔

اول الذکر قومی ادارۂ حفظانِ صحت میں سرکاری ملازم ہے جس کا سربراہ اس سے ناراض ہو گیا تھا اور المنصورہ سے اٹھا کر اس کا تبادلہ قاہرہ کر دیا تھا۔ یہاں اس نے چھت پر ایک کمرہ کرائے پر لے لیا جہاں وہ تنہا رہتا ہے، اور پچھلے ایک سال سے مسلسل اس جدوجہد میں اپنی توانائی صرف کر رہا ہے کہ کسی طرح یہ من مانا تبادلہ منسوخ ہو جائے اور وہ اپنے گھر کی راہ لے۔ حامد حواس رسمی تحریری شکایات دائر کرنے کا عادی ہے اور اپنی شکایت کے موضوع چننے میں حقیقی اور ہمہ گیر لطف لیتا ہے، بڑی بلاغت سے اسے اپنے ذہن میں ڈھالتا ہے، پھر بڑی صفائی ستھرائی سے اس انداز میں لکھتا ہے جسے پڑھنے میں آسانی ہو، اوراس کے بعد اسے انجام تک پہنچاتا ہے، چاہے اس کی خاطر اسے کتنی ہی زحمت کیوں نہ اٹھانی پڑے، کیونکہ جس علاقے میں اس کا قیام ہو، یا جس سے محض اس کا گزر ہوتا ہو، وہاں کے سہولیاتی اداروں کی مناسب کارکردگی کا وہ خود کو کسی نہ کسی حد تک ذمے دار سمجھتا ہے۔ وہ ہمیشہ

Scanned with CamScanner

علاقائی انتظامیہ، گورنریٹ اور شہری پولیس کے دفتروں کا یومیہ دورہ کرنے کا وقت نکال لیتا ہے، اور اس دوران ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے ان شکایتوں کا حساب کتاب رکھتا ہے جو اس نے مثلاً سڑک کنارے کے چھابڑی والوں کے خلاف داخل کر رکھی ہوتی ہیں۔ خواہ یہ خود اس کی قیام گاہ سے دور کی جگہوں پر ہی کیوں نہ کاروبار کر رہے ہوں لیکن، ان کی قانون شکنی کے باعث، ایک کے بعد ایک شکایتی عرضداشت کے ساتھ ان کا تعاقب کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے، نہ کبھی اس سے تھکتا ہے نہ مایوس ہوتا ہے، یہاں تک کہ آخر کار شہری پولیس حرکت میں آتی ہے اور ان چھابڑی والوں کو پکڑ کر ان کا مال ضبط کر لیتی ہے۔ اور تب حامد حوّا اس دور سے اس کا نظارہ کرتا ہے، اور وہ آسودہ ضمیری محسوس کرتا ہے جو اپنے فرض کی مکمل انجام دہی سے ملتی ہے۔

باقی رہا علی ڈرائیور، تو وہ شراب کا دھتی ہے، عمر پچاس سے اوپر، غیر شادی شدہ، اور دوا سازی کی ایک ہولڈنگ کمپنی میں ملازمت کرتا ہے، اور ہر روز کام ختم کرتے ہی سیدھے التوفیقیہ میں 'عرابی بار' کا رخ کرتا ہے، جہاں وہ کھانا کھاتا ہے اور نصف شب تک بیٹھا شراب کی چسکیاں لیا کرتا ہے۔ تنہائی اور گھٹیا شراب کی اسے لت پڑ گئی ہے، اور یہ دونوں اس پر اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہ سکی ہیں، نتیجتاً اس کی طبیعت میں ناشائستگی اور تشدد آ گیا ہے اور وہ ہر وقت جھگڑے ٹنٹے کا متلاشی رہتا ہے تاکہ اس پر اپنی جارحانہ طاقت صَرف کر سکے۔

حامد حوّا اس ملاک کے قریب پہنچا اور سلام علیک کی، پھر بڑے غایت درجے کے مہذب انداز میں یہ کہتے ہوئے گفتگو کی ابتدا کی، ''برادر، کیا آپ کے پاس مالک عمارت کی جانب سے کوئی معاہدہ ہے جو آپ کو یہ کمرہ تجارتی مقام کے طور پر استعمال کرنے کا حق دیتا ہو؟''

''ظاہر ہے، معاہدہ ہے،'' ملاک نے بڑی دلاوری سے کہا اور اپنے چھوٹے سے بٹوے سے اس معاہدے کی نقل نکالی جو اس نے فکری عبدالشہید کے ساتھ کیا تھا۔ حامد نے کاغذ ہاتھ میں لے لیا، چشمہ چڑھایا، اور بڑے غور سے اس کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر ملاک کو لوٹاتے ہوئے آہستگی سے کہا، ''موجودہ شکل میں یہ معاہدہ باطل ہے۔''

''باطل؟'' ملاک نے خوف و ہراس سے دہرایا۔

''جی ہاں، باطل۔ قانون کی رو سے چھت ساکنوں کے اجتماعی فائدے کے لیے ہے، اور

ایک اجتماعی فائدے کی چیز کو تجارتی اغراض کے لیے کرائے پر نہیں چڑھایا جا سکتا۔''

ملاک کی سمجھ میں نہیں آیا اور وہ حامد حواس کو غیظ و غضب سے گھورنے لگا، جس نے اپنی بات جاری رکھی، ''عدالتِ تنسیخ نے اس سلسلے میں ایک سے زائد احکام جاری کیے ہیں اور یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے۔ یہ معاہدہ باطل ہے اور آپ کو کمرے کے استعمال کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن آپ سب لوگ چھت پر رہ رہے ہیں تو میں کیوں نہیں رہ سکتا؟''

''ہم اپنے کمروں کو رہائش کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن آپ اسے تجارتی غرض سے استعمال کرنا چاہتے ہیں، اور یہ غیر قانونی ہے اور ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔''

''ٹھیک ہے۔ تو جا کر مکان دار سے شکایت کریں؛ میرے ساتھ معاہدہ اسی نے کیا تھا۔''

''بالکل نہیں۔ خود قانون آپ کو اس کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا، اور ہم، ضرر رسیدہ کرائے دار، آپ کو اس سے باز رکھنے پر مجبور ہیں۔''

''یعنی؟''

''یعنی اپنی چیزیں بٹورو اور جہاں سینگ سمائیں، چلتے بنو!''

یہ آخری کلمات علی ڈرائیور نے ملاک کو للکارنے والے انداز میں دیکھتے ہوئے اپنی بھرائی ہوئی آواز میں منھ سے نکالے۔ بڑے واضح تہدیدی انداز میں اپنا ہاتھ ملاک کے کندھے پر رکھتے ہوئے اس نے یہ اور کہا، ''سنو، کپتان! یہ چھت عزت داروں کے لیے ہے۔ یہ قیامت تک نہیں ہو سکتا کہ جب تمھارا جی چاہے، یہاں آ کر دکان کھول لو، جہاں کارندے اور گاہک آتی جاتی عورتوں کو تاڑتے پھریں۔ آیا سمجھ میں؟''

ملاک، جسے خطرے کی بو سنگھائی دے رہی تھی، جلدی سے بولا، ''جناب، خدا کے فضل سے میرے سب کارندے پڑھے لکھے لوگ ہیں، نہایت شائستہ اور محتاط۔ اور چھت پر رہنے والوں اور ان کی مستورات کی میں تہہ دل سے عزت کرتا ہوں۔''

''سنو، زیادہ بک بک نہ کرو۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور رفو چکر ہو جاؤ!''

''یا اللہ، یہ کیا ہو رہا ہے؟ غنڈہ گردی یا کیا؟''

''بہت ہو گیا، ماں کے لاڈلے، اب دیکھ غنڈہ گردی۔''

Scanned with CamScanner

یہ کہتے ہوئے علی ڈرائیور نے ملاک کا گریبان پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور ایک تھپڑ جڑ دیا جو اس بات کی منادی تھا کہ جنگ شروع ہو گئی ہے۔ وہ بڑی سہولت اور مہارت سے لڑ رہا تھا جیسے کوئی سادہ سا روزمرہ کا عمل یا اپنے کسی پسندیدہ کھیل کی مشق کر رہا ہو۔ اس نے ابتدا ملاک کے سر پر ایک زوردار ضرب سے کی، پھر دو گھونسے پیٹ پر لگائے اور ایک تیسرا، جو کافی شدید اور گونج دار تھا، ناک پر۔ ملاک کے چہرے سے خون کی دھار بہنے لگی اور اس نے مدافعت میں ایک بیکار سے علامتی گھونسے سے اپنے حریف کا نشانہ لیا جو خطا گیا۔ پھر جب شدید ضربوں کی بوچھاڑ پڑنے لگی تو اس نے احتجاج میں چیخنا چلانا شروع کر دیا اور ہر طرف ابتری پھیل گئی، جس کے دوران کارندے، جو کسی قسم کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتے تھے، چپکے سے وہاں سے کھسک لیے، اور ہر طرف سے لوگ تماشا دیکھنے نکل آئے۔ اچانک ابسخرون چھت پر نمودار ہوا اور مدد کے لیے واویلا مچانے لگا۔ لڑائی اس وقت تک جاری رہی جب تک علی ڈرائیور ملاک کو کمرے سے بے دخل کرنے میں کامیاب نہ ہو گیا۔

حامد حواس شروع ہی میں وہاں سے کھسک گیا تھا اور سگریٹ فروش کی دکان سے، جو عمارت سے سڑک کے دوسری جانب تھی، فوری مدد پہنچانے والی پولیس کو فون کر دیا تھا۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک نوجوان پولیس افسر اور متعدد سپاہیوں اور جاسوسوں نے آ کر سارے دنگے بازوں — ملاک، اس کے مددگار، ابسخرون، اور علی ڈرائیور — کو حراست میں لے لیا۔

حامد حواس نے افسر کے قریب آ کر بڑے ادب سے اسے سلام کیا اور بولا، ''صاحب، آپ نے، ظاہر ہے، قانون پڑھا ہے۔ اور یہ بھائی صاحب (ملاک کی طرف اشارہ کر کے) چھت پر ایک تجارتی دھندا شروع کرنا چاہتے ہیں، جبکہ چھت مشترکہ منفعت کی جگہ ہے جسے تجارتی مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ صاحب، جیسا کہ آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں، یہ ایک جرم ہے، جسے قانونی اصطلاح میں 'استحصالِ ملکیت' کہتے ہیں اور جس کی سزا تین سال قید ہے۔''

''کیا تم کوئی وکیل ہو؟'' افسر نے حامد حواس سے پوچھا، جس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا، ''نہیں صاحب۔ میں تو جناب، حامد حواس ہوں، قومی ادارۂ حفظانِ صحت کی المنصورہ شاخ میں آڈٹ کا ڈپٹی ڈائرکٹر۔ میں بھی ان باشندوں میں سے ہوں جن کے چھت استعمال کرنے کے حقوق غصب ہوئے ہیں۔ حضور، مکان دار نے آخر کیسے تجارتی مقصد کے لیے چھت کو کرائے پر اٹھا دیا؟ یہ

تو باشندوں کی ایک مشترکہ منفعت کی چیز پر کھلم کھلا حملہ ہوا۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو کل لفٹ کو بھی کرائے پر چڑھا دے گا، یا عمارت کے صدر دروازے کو! ملک کا پٹرا ہو گیا ہے یا کیا؟''

حامد حواس نے آخری سوال بڑے ناٹکی انداز میں کیا، جمگھٹا لگائے باشندوں کو گھورتے ہوئے، جو اس کے الفاظ سے متاثر ہو کر احتجاجاً بڑبڑانے لگے۔ حیرت کے آثار نوجوان افسر کے چہرے پر نمودار ہونے لگے اور کچھ دیر تک سوچنے کے بعد اس نے بیزاری سے کہا، ''ٹھیک ہے، تم سب کے سب تھانے چلو!''

❄

ڈاکٹر حسن رشید مصر میں قانون کی بڑی نامی گرامی شخصیت تھا۔ طٰہٰ حسین، علی بَدَوی، زکی نجیب محمود وغیرہ کی طرح اس کا شمار بھی انیس سو چالیس کی دہائی کے عظیم دانشوروں میں ہوتا تھا جنھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم مغرب میں حاصل کی تھی اور پھر وہاں جو کچھ سیکھا تھا، سارے کا سارا اپنے ملک میں آزمانے کے لیے ساتھ اٹھائے لوٹ آئے تھے۔ اس قسم کے اشخاص کے لیے 'ترقی' اور 'مغرب'، اپنے جملہ مثبت اور منفی مفاہیم کے ساتھ، تقریباً ہم معنی لفظ تھے۔ ان سب کے دلوں میں عظیم مغربی اقدار — جیسے جمہوریت، آزادی، عدل، محنتِ شاقہ، اور مساوات — محترم تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ خود اپنی قوم کے ورثے سے اتنے ہی نابلد تھے اور اس کی روایات اور رسم و رواج کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، انھیں وہ بیڑیاں تصور کرتے تھے جو ہمیں رجعت پسندی کی طرف لے جا رہی تھیں اور جن سے خود کو آزاد کرنا ہمارا فرض تھا تاکہ 'نہضہ' [نشاۃ ثانیہ] کا قیام عمل میں آسکے۔

پیرس میں تحصیل علم کے دوران ڈاکٹر رشید کی ایک فرانسیسی عورت، جیینت، سے ملاقات ہوئی اور وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ مصر لے آیا اور اس سے شادی کر لی اور ان کا اکلوتا بیٹا، حاتم، پیدا ہوا۔ یہ خاندان وہ زندگی گزار رہا تھا جو شکل اور جوہر دونوں کے اعتبار سے یورپی تھی۔ حاتم کو یاد نہیں کہ اس نے کبھی اپنے باپ کو نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے دیکھا ہو۔ پائپ کبھی اس کے منھ سے جدا نہ ہوتا، میز پر ہمیشہ فرانسیسی شراب موجود ہوتی، سارے گھر میں جدید ترین ریکارڈوں کی آواز گونجتی رہتی، اور گھر پر گفتگو کی غالب زبان فرانسیسی تھی۔ مغربی طور طریق کے مطابق، کنبے کی ساری زندگی ایک مقررہ وقت اور نظام کے تحت واقع ہوتی، حتیٰ کہ ڈاکٹر رشید نے دوستوں اور عزیزوں

Scanned with CamScanner

سے ملنے اور ذاتی خط و کتابت کے لیے ہر ہفتے ایک خاص وقت مخصوص کر رکھا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کے علاوہ اسے مسلسل کام کرنے کا حیرت انگیز چسکا بھی پڑا ہوا تھا، اور بیس سال کے اندر اندر اس نے مصری شہری قانون کے مطالعات کو واقعی بہت آگے بڑھا دیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا ستارہ اور زیادہ جگمگانے لگا یہاں تک کہ وہ جامعہ قاہرہ کی قانون کی فیکلٹی کا ڈین بن گیا۔ پھر پیرس میں بین الاقوامی لا سوسائٹی نے اسے دنیا کے سو ممتاز وکیلوں میں سے ایک کے طور پر منتخب کیا۔

چونکہ ڈاکٹر رشید ہمیشہ اپنی تحقیق اور لیکچروں میں منہمک رہتا اور چونکہ اس کی بیوی جینٹ کا سارا وقت فرانسیسی سفارت خانے میں اپنی مترجم کی ملازمت میں کھپ جاتا، ان کے بیٹے حاتم کا بچپن اداسی اور تنہائی کے عالم میں گزرا، یہاں تک کہ دوسرے تمام بچوں کے برخلاف، وہ اسکول جانے کے دنوں کو پسند اور گرما کی طویل تعطیلات کو سخت ناپسند کرتا، جو اسے تن تنہا، دوستوں کے ساتھ کھیل کود کے بغیر گزارنی پڑتیں۔ اور اس تکلیف دہ تنہائی کے ساتھ ساتھ، الگ تھلگ ہونے اور ذہنی انتشار کا احساس الگ، جو مخلوط شادیوں کی اولاد کا مقسوم ہے۔

ننھے حاتم کا زیادہ تر وقت نوکروں کے ساتھ گزرتا۔ والدین (چونکہ وہ خود ہمیشہ مصروف ہوتے تھے) اسے اکثر کسی نوکر کے ساتھ 'الجزیرہ کلب' یا سینما بھیج دیتے۔ گھر کے ڈھیر سارے ملازموں میں ننھا حاتم خاص طور پر منتظم ادریس کا گرویدہ تھا، جو لہراتا ہوا سفید قفطان، چوڑا سا سرخ کمر بند اور اونچی سی طربوش پہنے ہوتا: بلند قامت، مضبوط، اور دبلا پتلا جسم، خوبصورت آبنوسی سیاہ چہرہ، چمکدار ذہین آنکھیں، کشادہ مسکراہٹ جس سے اس کے دمکتے ہوئے سفید، ہموار دانت جھانک رہے ہوتے۔ ادریس کی عادت تھی کہ وہ شارع سلیمان باشا کی طرف کھلنے والے کمرے میں حاتم کو لے کر بیٹھ جاتا، اس کے ساتھ اس کے کھلونوں سے کھیلتا، جانوروں کی کہانیاں سناتا، خطۂ نوبیہ کے شیریں نغمے گا کر سناتا اور ترجمہ کر کے ان کا مطلب بتاتا۔ جب ادریس اس سے اپنی ماں اور بھائی بہنوں کا، اور اپنے گاؤں کا ذکر کرتا جہاں سے اسے نوعمری میں لوگوں کے گھروں میں کام کرنے کے لیے اٹھا لایا گیا تھا، تو اس وقت اس کی آواز مرتعش ہو جاتی اور آنسو اس کی آنکھوں میں دمکنے لگتے۔ حاتم ادریس کو بہت چاہتا تھا؛ ان کا تعلق بڑھتا گیا اور وہ ہر روز کئی کئی گھنٹے ساتھ ساتھ گزارنے لگے؛ اور جب ادریس

Scanned with CamScanner

حاتم کے چہرے اور گردن پر چومنا شروع کرتا اور سرگوشی میں کہتا، ''تم بے حد خوبصورت ہو۔ مجھے تم سے محبت ہے،'' تو حاتم کو نہ کوئی کراہت محسوس ہوتی نہ خوف۔ اس کے برعکس، اپنے جسم پر دوست کی گرم گرم سانسوں سے اسے ایک مبہم سی برانگیختگی محسوس ہونے لگتی۔ وہ اسی طرح بوسوں کا تبادلہ کرتے رہے تا آنکہ ایک دن ادریس نے اس سے کپڑے اتارنے کو کہا۔ اس وقت حاتم نو برس کا تھا۔ اسے شرم محسوس ہوئی اور وہ چکرا سا گیا، لیکن آخر میں اپنے دوست کے اصرار پر سر جھکا ہی دیا۔ دوسرا حاتم کے ہموار، گورے چٹے جسم کے نظارے سے اس درجہ برانگیختہ ہو گیا کہ ملاپ کے دوران وہ لذت کے مارے سسکیاں لینے لگا اور نوبی زبان میں ناقابلِ فہم فقروں کی سرگوشیاں کرنے لگا۔ ادریس، اپنے جوش اور شہوت کے باوجود، حاتم کے جسم میں بڑی نرمی اور احتیاط کے ساتھ داخل ہوا اور اس سے کہا کہ ذرا سی بھی تکلیف ہو تو اسے بتا دے۔ یہ طریقہ اتنا کامیاب رہا کہ اب حاتم جب بھی ادریس کے ساتھ اس پہلے ملاپ پر پلٹ کر غور کرتا ہے تو وہ عجیب، چبھتا ہوا احساس جس سے وہ اُس دن پہلی بار آشنا ہوا تھا، لوٹ آتا ہے، لیکن اسے کوئی درد اور تکلیف بالکل یاد نہیں آتی۔

جب ادریس فارغ ہو گیا تو اس نے حاتم کا منھ اپنی طرف کر لیا اور بڑی گرمی سے اسے ہونٹوں پر چوما، پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ''یہ میں نے تمھارے ساتھ اس لیے کیا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ اگر تم مجھے چاہتے ہو تو جو ہوا ہے اس کا کسی سے ذکر مت کرنا۔ وہ تمھیں ماریں پیٹیں گے اور مجھے نکال باہر کریں گے، اور ہو سکتا ہے تمھارے والد مجھے جیل بھجوا دیں یا مار ڈالیں۔ پھر تم مجھے کبھی نہ دیکھ سکو گے۔''

ادریس کے ساتھ حاتم کا تعلق برسوں چلتا رہا، یہاں تک کہ ڈاکٹر رشید اچانک برین ہیمرج سے مر گیا جو مصروفیت کی زیادتی کا نتیجہ تھا، اور اس کی بیوہ اخراجات کے باعث بہت سے ملازموں کو رخصت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ادریس کے رخصت ہونے کے بعد اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ اس کی عدم موجودگی سے حاتم نفسیاتی طور پر اس درجہ متاثر ہوا کہ اس سال عام ثانوی امتحان میں اس کے بہت کم نمبر آئے۔ اس کے بعد وہ اپنی ہم جنسی کی طوفانی زندگی میں غرق ہو گیا۔ دو سال بعد ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس سے اس کی کسبِ لذت پر جو رہی سہی قیود رہ گئی تھیں وہ بھی جاتی رہیں۔ ورثے میں اسے بڑی ٹھوس آمدنی ملی تھی جو اس کی پرتعیش زندگی کی کفالت کے لیے کافی تھی؛ اس پر وہ معقول

Scanned with CamScanner

مشاہرہ مستزاد جو اسے اخبار کی ملازمت سے ملتا تھا۔ اس نے عمارتِ یعقوبیان میں اپنے کشادہ اپارٹمنٹ کو اس کی روایتی شکل سے نجات دلانے کے لیے نئے سرے سے سجایا اور کسی بجے جمائے خاندان کی رہائش سے زیادہ ایک بوہیمین فنکار کے اسٹوڈیو سے ملتی جلتی چیز میں بدل ڈالا۔ اب یہ اس کے اختیار میں تھا کہ اپنے عاشقوں کو وہاں بلائے کہ وہ اس کے بستر میں کئی کئی دنوں اور، بعض اوقات، کئی کئی مہینوں تک شرکت کریں۔ حاتم کے بہت سے مردوں سے تعلقات رہے اور وہ انھیں مختلف وجوہ کی بنا پر چھوڑتا گیا، لیکن اس کی سربستہ، گناہ آلود شہوت ہمیشہ ادریس سے ہی وابستہ رہی اور، جیسا کہ کوئی مرد مختلف عورتوں میں اپنی پہلی محبت کا پیکر تلاش کرتا رہتا ہے، اس عورت کا جس کے طفیل وہ پہلی بار لذت سے آشنا ہوا تھا، اسی طرح حاتم سارے دوسرے مردوں میں ادریس کو تلاش کرتا پھرتا تھا، اس خام اور ابتدائی مذکر کو جسے نفاست نے ابھی مہذب نہ کیا تھا، اس تمام بھدے پن، کرختگی اور جوش کے ساتھ جس کی نمائندگی اس قسم کا آدمی کرتا ہے۔ وہ ادریس کی یاد سے کبھی غافل نہ ہوتا اور اکثر، ایک لذیذ، جلتی ہوئی نزاکت کے ساتھ، اپنے اس وقت کے محسوسات کو ازسرِنو بسر کرتا جب وہ اپنے کمرے کے فرش کی طرف منھ کیے ہوے پڑا تھا (کسی ننھے سے خرگوش کی طرح جو خود کو تقدیر کے سپرد کر رہا ہو) اور اپنی نگاہوں سے ایرانی قالین کے نقش و نگار کا تعاقب کر رہا تھا، جبکہ ادریس کا کھولتا اور پھٹ پڑتا ہوا بدن اس سے چمٹا ہوا تھا، اسے نچوڑے دے رہا تھا، پگھلائے ڈال رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان کے جنسی ملاپ، اپنی کثرت کے باوجود، ہمیشہ کمرے کے فرش پر آ کر تمام ہوتے تھے، بستر پر کبھی نہیں، جو شاید ایک نوکر کے طور پر ادریس کے احساسِ فروتنی اور اپنے آقا کے بستر کو استعمال کرنے سے، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ اس کے ساتھ جنسی ملاپ کر رہا ہو، اس کی نفسیاتی لاچاری کے باعث ہو۔

چند ماہ پہلے ایک رات حاتم بری طرح نشے میں آ گیا اور جماع کی ایک ناقابلِ تسکین خواہش اس پر سوار ہو گئی۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ سے نکلا اور وسطِ شہر کے علاقے میں گشت کرنے لگا۔ دس بجے کا عمل تھا (وہ گھڑی جب پولیس والے پہرہ بدلتے ہیں اور جسے ڈاؤن ٹاؤن کا ہر ہم جنس خوب پہچانتا ہے اور پولیس والوں میں اپنے اپنے عاشق سے ملنے دوڑ پڑتا ہے) اور حاتم سیدھے سادے رنگروٹوں کا معائنہ کر رہا تھا جو اپنی شفٹ سے چھوٹ رہے تھے کہ اسے عبدربہ نظر آیا (جو ادریس سے حیرت

انگیز مشابہت رکھتا تھا)۔ حاتم نے اسے کار میں بٹھالیا، اسے پیسے دیے، اس کا بدن سہلاتا رہا، یہاں تک کہ اسے رجھا ہی لیا۔

بعد میں عبدربہ نے حاتم سے اپنا تعلق توڑنے کی متعدد کڑی کوششیں کر دیکھیں۔ حاتم کو اپنے ہم جنسی عشق کے طویل تجربے کے باعث خوب معلوم تھا کہ ایک برغل کو، جس نے یہ عمل نیا نیا شروع کیا ہو، عام طور پر شدید احساسِ گناہ دامن گیر ہوتا ہے جو جلد ہی اپنے کو رجھانے والے کو دیانا کے لیے تلخی اور تاریک نفرت میں بدل جاتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ہم جنسی تجربے کو دہرایا جائے اور اس کی لذت کو بار بار چکھا جائے، تو یہ آہستہ آہستہ برغل میں ایک خالص شہوت کو جنم دیتے ہیں، خواہ وہ اس سے کتنی ہی نفرت کرتا ہو اور شروع شروع میں اس سے رتی تڑانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے۔ نتیجتاً، حاتم اور عبدہ کا تعلق فراق اور وصال کی کوششوں کے درمیان معلق رہا۔

پچھلی رات حاتم سے فرار پانے کے لیے عبدہ 'شے نو باز' سے نکلا تھا، لیکن حاتم نے اسے راستے میں آلیا تھا اور اصرار کر کے اسے اپنے ساتھ اپارٹمنٹ میں لے آیا تھا، جہاں انھوں نے جفتی کرنے سے پہلے تیز فرانسیسی شراب کی ایک پوری بوتل پی ڈالی تھی۔ اور اب اگلی صبح حاتم نے باتھ ٹب میں لیٹ کر خود کو شاور سے نکلتی ہوئی گرم گرم پھوار کے حوالے کر دیا تھا جو اس کے جسم پر چیونٹیوں کی افواج کی مزید اریلغار کی طرح محسوس ہو رہی تھی، جبکہ وہ مسکراتے ہوئے عبدہ کے ساتھ گزاری ہوئی اپنی گرم رات کی یاد آوری کر رہا تھا، وہ عبدہ جس کے شراب کی بھڑکائی شہوت میں آئے ہوئے جسم کو متعدد پے بہ پے ارتعاشات نے نچوڑ ڈالا تھا۔ حاتم کھڑا ہوا اور آئینے کے سامنے بدن خشک کرنے اور اپنے مخصوص اعضا کو احتیاط سے صاف کرنے لگا، خوشبودار کریم لگائی، پھر ایک سرخ کشمیری اون کی عبا پہن کر غسلخانے سے خوابگاہ میں آیا، اور بیٹھ کر سوتے ہوئے عبدہ کا نظارہ کرنے لگا: اس کا آبنوسی چہرہ، موٹے ہونٹ، چپٹی، حبشیوں والی ناک، اور گنجان بھنویں جو اس کے چہرے کو ایک گمبھیر تاثر بخشتی تھیں۔ وہ اس پر جھکا اور اسے چوما؛ عبدہ بیدار ہو گیا اور آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں۔

''بوں ژور!'' (صبح بخیر۔) حاتم نے آہستہ سے سرگوشی کی اور عبدہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا، جو تھوڑا سا بلند ہوا اور پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا چوڑا، موٹے موٹے بالوں کے جنگل سے بھرا ہوا سیاہ سینہ نظر آرہا تھا۔ حاتم نے اس پر بوسوں کی بوچھار کر دی، لیکن عبدہ نے ہاتھ بڑھا کر اس

Scanned with CamScanner

کے چہرے کو دور کر دیا، پھر نیچے کی طرف دیکھا اور یوں تلخی سے کہا جیسے واویلا کر رہا ہو، ''حاتم بک، میں بڑی مشکل میں آ پھنسا ہوں۔ کوئی دن جاتا ہے کہ افسر سزا دینے کے لیے میری رپورٹ کر دے گا۔''

''عبدہ! کیا پھر سے افسر کا ذکر کرنا ضروری ہے؟ میں نے تم سے کہہ دیا نا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے افسر تک پہنچنے کا ذریعہ مل گیا ہے۔ وزارت کا ایک بہت اہم جرنیل ہے۔''

''جب تک تم اس سے بات کرو گے، میں جیل کی ہوا کھا رہا ہوں گا۔ پیچھے گاؤں میں میری بیوی اور چھوٹا سا بچہ میری تنخواہ پر گزارہ کرتے ہیں، جناب عالی۔ میرا جی کرتا ہے کہ فوراً فوج چھوڑ چھاڑ کر چلتا بنوں۔ اگر جیل بھیج دیا گیا تو میرے گھر والوں کا خدا ہی حافظ ہے۔''

حاتم نے اسے نرمی سے دیکھا اور مسکرایا۔ پھر وہ آہستہ سے اٹھا، اپنے بٹوے کے پاس آیا، اس میں سے سو پاؤنڈ کا نوٹ نکالا اور یہ کہتے ہوئے اس کے آگے کر دیا، ''یہ لے لو۔ اپنی بیوی اور بچے کو بھیج دینا؛ اگر انھیں کچھ اور چاہیے تو میں تمھارے بجائے اسے پورا کر دوں گا۔ کل میں اپنے رشتے دار جرنیل سے ملوں گا اور وہ افسر سے تمھارے بارے میں بات کریں گے۔ عبدہ، خدارا، پریشان نہ ہو، میری خاطر۔''

عبدہ نے سر جھکا لیا اور شکریے کے چند کلمات ادا کیے۔ حاتم اس سے قریب ہوا، حتیٰ کہ ان دونوں کے جسم ایک دوسرے سے بالکل مل گئے، اور اس کے دبیز ہونٹوں کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے آپ سے بولا، ''کتنا خوبصورت دن ہے!''

❁

بنام، شہری، طٰہٰ محمد الشاذلی

عمارتِ یعقوبیان، 34 شارع طلعت حرب، القاہرہ

تحیۃ طیبہ

بحوالہ صدر جمہوریہ کے نام آپ کا شکایت نامہ، بابت پولیس اکیڈمی میں قبولیت کے امتحان میں ناکامی: آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ معاملے میں پولیس اکیڈمی کے مدیر سے رجوع کیا گیا ہے اور آپ کی شکایت بے بنیاد پائی گئی ہے۔ ہم آپ کی کامیابی کے متمنی ہیں۔

Scanned with CamScanner

بے حد احترام قبول فرمائیں۔

جنرل حسن بازرعہ

ڈائرکٹر، محکمۂ عوامی شکایات، صدارتی دفترِ جمہوریہ

❁

پاس پڑوس والے زکی الدسوقی اور اس کی بہن دولت کے باہمی جھگڑوں کی چیخ وپکار سننے کے عادی ہو گئے تھے۔ یہ اکثر و بیشتر ہوتے رہتے تھے جس پر اب انھیں نہ تعجب محسوس ہوتا تھا نہ تجسس۔ لیکن اِس بار جھگڑا ذرا مختلف تھا، کسی خوفناک دھماکے سے کسی قدر ملتا جلتا۔ چیخم دھاڑ، غلیظ گالیوں اور ہاتھا پائی کی آوازیں عمارت کے باسیوں تک جا پہنچیں، جو اپنے دروازے کھول کر ٹوہ لینے باہر نکل آئے۔ بعض بیچ بچاؤ کرانے کی تیاری میں تشنج کے عالم میں بڑبڑانے لگے۔ دولت طیش بھری آواز میں چلّائی، ''میری الماس کی انگوٹھی گم کر ڈالی، غلاظت کی پوٹ!''

''تمیز سے بات کرو، دولت!''

''اپنی کسی رنڈی یار کو دے دلا دی ہوگی، کیا تعجب!''

''میں کہہ رہا ہوں کہ شرافت سے بات کرو!''

''میں اب بھی شریف ہوں، تمھارے کرتوتوں کے باوجود! تم ہی وہ مسخرے ہو جس سے سب نفرت کرتے ہیں! دفان ہو جاؤ میرے گھر سے، کتّے کے بچے، چنڈو باز!''

''یہ میرا اپارٹمنٹ ہے،'' زکی بک نڈھال نڈھال سی آواز میں چلّایا۔

''جی نہیں، جانِ من! یہ میرے باپ کا مکان ہے، معزز باشا کا، جسے تم نے اپنی غلاظت سے گندا کر دیا ہے!''

اس کے بعد طمانچوں اور جنگ وجدل کی آواز سنائی دی، اپارٹمنٹ کا دروازہ دھڑ سے کھلا، دولت نے زکی کو دھکا دے کر باہر کر دیا اور چیخی، ''باہر نکلو! میں تمھارا منحوس چہرہ اب کبھی نہیں دیکھنا چاہتی!''

زکی بک باہر آیا اور پڑوسیوں کا مجمع دیکھ کر مڑا اور بولا، ''جیسے تمھاری مرضی، دولت۔ میں جا رہا ہوں۔''

دولت نے زور سے دروازہ بند کیا اور چٹخنی چڑھانے کی آواز سنائی دی۔ پڑوسی زکی بک کے پاس آئے اور بولے کہ جو کچھ ابھی ابھی ہوا ہے، سخت نازیبا ہے۔ اختلافات اپنی جگہ پر، لیکن زکی بک اور اس کی بہن جیسے باعزت لوگوں کا اس طرح لڑنا جھگڑنا شرم کی بات ہے۔ زکی بک نے ہنستے ہوئے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ہاں میں سر ہلا دیا اور لفٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہمسایوں سے مصالحانہ اور معذرت خواہانہ لہجے میں کہا، ''مجھے افسوس ہے کہ آپ سب کو تکلیف پہنچی۔ معمولی سی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

❁

کمال الفولی کی بابت متعدد اور بار بار دہرائی جانے والی کہانیاں یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ اس کی پرورش المنوفیہ آبادی میں شبین الکوم کے ایک بے حد غریب خاندان میں ہوئی۔ غربت کے باوجود وہ بے حد ذہین اور حوصلہ مند واقع ہوا تھا۔ اس نے 1955 میں ثانوی اسکول کی سند حاصل کی تھی اور ملک بھر میں اول آیا تھا اور شعبۂ قانون میں داخل ہوتے ہی سیاست میں کود پڑا تھا۔ کمال الفولی یکے بعد دیگرے حکومت کی ہر سیاسی انتظامیہ کا رکن بنا: تنظیم آزادی اور قومی اتحاد، اس کے بعد اتحادِ اشتراکی اور ہراولی تنظیم، بعد ازاں مرکزی منبر، حزبِ مصری، اور، آخراً، حزبِ قومی۔ ان تمام منتقلیوں کے دوران وہ ہر برسرِ اقتدار پارٹی کے اصولوں کی بڑے جوش وخروش اور بلند بانگ انداز سے حمایت کرتا رہا۔ دورِ ناصر میں اس نے اشتراکی تبدیلی کی ضرورت اور تاریخی ناگزیریت کی بابت لیکچر دیے اور کتابیں تصنیف کیں۔ اور جب ریاست نے سرمایہ داری کی طرف پلٹا کھایا تو وہ نجکاری اور آزاد معیشت کا سب سے بڑا طرفدار بن گیا، اور اس نے معیشت پر براہِ راست حکومتی قبضے اور عام آمرانہ خیالات کے خلاف ایک بڑی تند و تیز اور مشہور مہم کا ٹھیک پارلیمنٹ کے گنبد کے نیچے سے آغاز کیا۔ وہ ان معدودے چند مصری سیاست دانوں میں سے تھا جو مسلسل تیس سال سے زائد عرصے تک اسمبلی کے کسی نہ کسی طرح رکن چلے آرہے تھے۔

جہاں یہ درست ہے کہ مصری انتخابات کا نتیجہ بے ایمانی سے ہمیشہ اُسی پارٹی کے حق میں نکلتا ہے جو حکومت میں ہو، وہاں یہ بھی درست ہے کہ کمال الفولی کو سیاست بازی کی جو خداداد صلاحیت ملی ہے وہ اسے کسی بھی جمہوری معاشرے میں حکومت کے بلند ترین عہدوں پر لامحالہ فائز کرادیتی۔ لیکن

Scanned with CamScanner

یہ خداداد صلاحیت، مصر میں بہت ساری دوسری صلاحیتوں ہی کی طرح، دروغ گوئی، ریاکاری اور ریشہ دوانیوں کے باعث دوسری راہوں پر چل پڑی، مسخ ہوگئی، اور اس میں کھوٹ پڑ گئی، یہاں تک کہ کمال الفولی کا نام مصریوں کے دماغوں میں اب کرپشن اور ریاکاری کے جوہر کی نمائندگی کرنے لگا ہے۔

وہ نظامِ مراتب میں بلند ہوتا ہوا حکمران پارٹی حزبِ قومی کا معتمد بن گیا ہے اور سارے مصر میں ہونے والے انتخابات کا حاکمِ اعلیٰ بھی ہے، کیونکہ وہ پارٹی میں جس کو چاہتا ہے امیدوار نامزد کرتا ہے یا نہیں کرتا، اور بہ نفسِ نفیس اسکندریہ سے لے کر اسوان تک انتخابات کے انعقاد کی نگرانی کرتا ہے۔ وہ امیدواروں سے اس بات کے لیے بڑی بھاری رشوتیں لیتا ہے کہ انتخاب کا نتیجہ ان کے حق میں نکلے اور ساتھ ہی ساتھ نت نئی چالبازیوں سے اپنے کرپشن کی پردہ پوشی بھی کرتا ہے، مثال کے طور پر رعایتوں اور مالی منفعتوں کا تبادلہ جس سے کروڑوں کی رقموں کا رخ ممتاز سیاست دانوں کی طرف ہو جاتا ہے۔

الفولی افسروں کی ہیر پھیر ثابت کرنے والی تحفظاتی رپورٹیں اور دستاویزات بھی محفوظ رکھتا ہے تاکہ انھیں بلیک میل کرنے، یا ضرورت پڑے تو تباہ و برباد کرنے کے لیے استعمال کر سکے۔ سیاسی اجتماعات میں، خواہ یہ اسمبلی میں ہوں یا حزبِ قومی میں، جب وہ بولتا ہے تو سب کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی بھی افسر کے دل میں دہشت پیدا کرنے کے لیے اس کی ایک کڑی نظر ہی کافی ہے۔ اس سیاق وسباق میں اس کے بارے میں کئی واقعے مشہور ہیں جن میں اس نے سب کے سامنے بڑے بڑے افسروں کا قیمہ کر کے رکھ دیا تھا، صرف اس لیے کہ انھوں نے کوئی ایسی بات کہہ دی تھی جو اسے ناگوار گزری، مثلاً وہ ظالمانہ مہم جو اس نے (بعض ممتاز افسروں کے حق میں) ڈاکٹر الغمر اوی، گورنر، بینکِ مصر، کے خلاف چند سال پہلے چلائی تھی جو موخر الذکر کے استعفے پر منتج ہوئی۔ ایک نسبتاً قریبی زمانے کی مثال پچھلے سال وزیرِ اوقاف کے ساتھ واقع ہوئی، جسے عوام میں اپنی کسی قدر مقبولیت سے یہ خوش گمانی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ طاقتور اور بارسوخ ہے۔ اس توہم کے زیرِ اثر وزیر حزبِ قومی کے سیاسی شعبے کے ایک جلسے کے دوران کھڑا ہو کر سیاسی کرپشن پر شدت سے حملہ آور ہوا اور یہ مطالبہ کرنے لگا کہ حزب کی اسامیوں کو کج رو اور منافع خور عناصر سے پاک کیا جائے۔ کمال الفولی نے وزیر کو اشارے سے کہا کہ اپنی تقریر ختم کرے، لیکن وزیر نے اس کی بات نظر انداز کر دی اور

Scanned with CamScanner

کلام جاری رکھا۔ٹھیک تب الفولی نے تمسخرانہ انداز میں اس کی بات کاٹی اور حاضرین کی طرف بڑے ناٹکی انداز میں رخ کر کے کہا،''یا اللہ، وزیرِ عالی مرتبت، یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ چونکہ آپ کو کرپشن کے خلاف لڑنے کی اتنی للک ہے، بہتر ہوگا کہ پہل خود اپنے آپ سے کریں بھائی صاحب۔ آپ نے ترقیاتی بینک سے ایک کروڑ پاؤنڈ کا قرضہ لیا تھا اور پچھلے پانچ سال سے اس کی قسطیں ادا کرنے سے مسلسل انکار کیے جا رہے ہیں۔ یہ بتا تا چلوں کہ بینک کے سربراہ آپ پر مقدمہ چلانے اور آپ کو طشت ازبام کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔'' اس پر وزیر صاحب زرد پڑ گئے اور حاضرین کی چوٹوں اور استہزائی ہنسی کے درمیان بولتی بند کر کے بیٹھ رہے۔

❁

حاج عزام کو یہ بات خوب معلوم تھی اور جب اس نے اسمبلی کے انتخاب میں خود کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے کمال الفولی سے ملاقات کے لیے وقت مانگا، جو پہلے تو چند ہفتوں تک اسے انتظار کراتا رہا، مگر پھر المہندسین میں شارع شہاب پر اپنے لڑکے، وکیل یاسر الفولی، کے دفتر میں ملنے کا وقت دے ہی دیا۔ جمعے کی نماز کے بعد حاج عزام اور اس کا بیٹا فوزی اس سے ملاقات کرنے پہنچے۔ دفتر میں محافظ عملے کے علاوہ صرف کمال الفولی اور اس کا بیٹا یاسر ہی موجود تھے۔ عزام اور الفولی گلے ملے اور دعاؤں، تحسینی فقروں، اور چٹکلوں کا تبادلہ کیا، اور اگر کوئی یہ سوچتا کہ دونوں پرانے دوست ہیں جو ایک دوسرے سے محبت اور ایک دوسرے کی قدر کرتے ہیں، تو اسے اس پر معاف کیا جا سکتا تھا۔

ایک لمبی تمہیدی گفتگو کے بعد، جو متعدد موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے تھی، عزام مطلب پر آیا۔ اس نے لوگوں سے اپنی محبت اور ان کی خدمت کرنے کا ذکر کیا، ایک سے زائد حدیثیں دہرائیں جن میں اس اجر کا ذکر آیا ہے جو مسلمانوں کی حاجت برآری کرنے والے کو آخرت میں ملے گا، جس پر کمال الفولی نے تائید میں گردن ہلائی۔ بالآخر عزام اصل بات پر آیا۔ بولا، ''اسی لیے میں نے خدا سے ہدایت مانگی ہے، اس پر توکل کیا ہے، اور فیصلہ کیا ہے کہ خدا نے چاہا تو اپنے علاقے یعنی قصر النیل کے آنے والے انتخابات میں خود کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کروں۔ مجھے امید ہے کہ حزبِ قومی مجھے نامزد کرنے پر راضی ہو جائے گی۔ اور میں آپ کے حکم کا تابعدار ہوں، کمال بک،

جس چیز کی ضرورت ہو، بس حکم کریں۔"

الفولی نے کچھ دیر تک سخت غور و فکر کرنے کا سوانگ رچایا، گو وہ پہلے ہی سے عزام سے یہ کہنے کی توقع کر رہا تھا۔

الفولی اپنے دیکھنے والوں پر متضاد تاثر چھوڑتا ہے۔ ایک طرف اس کی ذکاوت، حاضر دماغی، اور بڑا اغلبہ آور انداز ہے تو دوسری طرف اس کا فربہ جسم، لٹکتی ہوئی توند، اس کی ہمیشہ تھوڑی سی ڈھیلی پڑی ہوئی ٹائی، کپڑوں کے بھیانک طور پر انمل بے جوڑ رنگ، پھوہڑپن سے رنگے ہوئے بال، کثیف، گول مٹول چہرہ، دروغ گوئی، کینہ پروری، گستاخ نگاہیں، اور گنواروں جیسا بولنے کا انداز، جب وہ بات کرتے ہوئے کسی نچلے طبقے کی عورت کی طرح اپنے ہاتھ آگے رکھتا، انگلیاں نچاتا اور کندھے اور توند ہلاتا ہے۔ یہ ساری باتیں اس کے حلیے کو کسی قدر مضحکہ خیز بنا دیتی ہیں، جیسے وہ دیکھنے والوں کی تفریح کے لیے کوئی کرتب دکھا رہا ہو۔ اور یہ سب حرکتیں آدمی کو سوقیانہ پن کا ناگوار تاثر دیتی ہیں۔

الفولی نے اپنے مددگاروں سے کاغذ قلم لانے کے لیے کہا۔ پھر وہ کچھ نقش سے بنانے لگا اور چند لمحوں کے لیے اتنا منہمک ہو گیا کہ حاج عزام کو یہ شک گزرا کہ کہیں کچھ گڑبڑ نہ ہو گئی ہو۔ لیکن الفولی نے جلد ہی اس کام سے فراغت پا کر کاغذ عزام کی طرف بڑھا دیا، جسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ اس پر ایک بڑے سے خرگوش کا خاکہ کھنچا ہوا ہے۔ ایک لمحے وہ بالکل خاموش رہا، پھر بڑی دوست داری سے پوچھا، "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا، عزت مآب۔"

الفولی نے فوراً جواب دیا، "آپ انتخابات میں اپنے کامیاب ہونے کی ضمانت چاہتے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ اس کے لیے کیا درکار ہو گا۔ جو درکار ہو گا میں نے اس کی تصویر بنا دی ہے۔"

"ایک پورے کا پورا 'خرگوش'؟ دس لاکھ پاؤنڈ، کمال بک؟ یہ بڑی خطیر رقم ہے!"

عزام اس قسم کی رقم کے مطالبے کی توقع کر رہا تھا لیکن اس نے، پیش بندی کے طور پر، بھاؤ تاؤ کو ترجیح دی۔ الفولی نے کہا، "سنیے، یا حاج، خدا گواہ ہے..."

(اس پر تمام حاضرین نے دہرایا: "لا الہ الا اللہ")

"... قصر النیل سے کہیں زیادہ چھوٹی آبادیوں سے پندرہ لاکھ لیتا ہوں، اور یہاں یہ میرا بیٹا یاسر آپ کے سامنے کھڑا ہے، یہ آپ کو بتا دے گا۔ لیکن آپ مجھے عزیز ہیں، خدا کی قسم، حاج، اور

Scanned with CamScanner

میں واقعی اسمبلی میں آپ کی شرکت چاہتا ہوں۔ اور پھر یہ سب میں اپنے لیے نہیں لیتا۔ میں تو صرف ڈاکیا ہوں . . . آپ سے لیتا ہوں اور دوسروں کو پہنچا دیتا ہوں، اور آپ جیسے سید العارفین کو تو اشارہ ہی کافی ہے۔''

حاج عزام نے تھوڑی سی بے چینی ظاہر کی، پھر پوچھا،'' تو آپ کا یہی مطلب ہے نا، کمال بک، کہ یہ رقم ادا کروں تو انشاء اللہ انتخاب میں کامیابی پر یقین کر سکتا ہوں؟''

'' یہ بری بات ہے، حاج! آپ کمال الفولی سے بات کر رہے ہیں! اسمبلی میں تیس سال کا تجربہ رکھنے والے سے۔ ہماری ہاں نہ ہو تو پورے مصر میں کوئی امیدوار نہیں جو جیت سکے، انشاء اللہ!''

'' سننے میں آ رہا ہے، بعض بڑے اونچے لوگ قصر النیل کے لیے خود کو نامزد کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔''

'' پریشان نہ ہوں۔ اگر ہمارا اتفاق ہو جائے تو انشاء اللہ قصر النیل میں آپ ہی کامیاب ہوں گے، چاہے خود شیطان ہی کیوں نہ آپ کے مقابلے پر آ جائے۔ یہ مجھ پر چھوڑ دیں، حاج۔''

اب الفولی مسکرایا اور پیچھے ہو کر اپنا بڑا سا پیٹ سہلاتے ہوئے آسودہ خاطری سے بولا،'' اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انتخابات میں دھاندلی کرتے ہیں تو وہ بہت سادہ لوح ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ بس اتنی سی بات ہے کہ ہم نے مصریوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ہمارے رب نے مصری کی سرشت میں یہ رکھ دیا ہے کہ حکومت کا حکم مانے۔ کوئی مصری اپنی حکومت کے خلاف نہیں جا سکتا۔ بعض لوگ طبعاً زود خیز اور سرکش ہوتے ہیں، لیکن مصری ساری عمر سر جھکائے رہتا ہے تاکہ روٹی کھا سکے۔ ہماری تاریخ کی کتابیں یہی بتاتی ہیں۔ ساری دنیا میں صرف مصری ہی ایسے ہوتے ہیں جن پر بہ آسانی حکومت کی جا سکتی ہے۔ جس لمحے آپ کے ہاتھ میں طاقت آ جاتی ہے، یہ آپ کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں، فروتن ہو جاتے ہیں، اور آپ جو چاہیں ان کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ہر مصری پارٹی جو حکومت کر رہی ہو اور انتخاب لڑے تو اس کا جیت جانا ناگزیر ہے، کیونکہ حکومت کی حمایت کرنا مصری کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ بس، خدا نے اسے اسی طرح بنایا ہے۔''

عزام نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے وہ الفولی کی باتوں سے سرگرداں ہو گیا ہے اور قائل نہیں ہوا۔ پھر اس نے رقم کی ادائیگی کے بارے میں سوال کیا اور الفولی نے صرف اتنا کہا،'' غور سے سنو، حاج۔ اگر

نقد رقم ہوگی تو میں خود لوں گا۔ اگر چیک ہوگا تو اسے 'یاسر الفولی، وکیل' کے نام سے بنانا اور اس سے کسی مقدمے کا معاہدہ وغیرہ کر لینا، گویا اسے تم نے اس مقدمے کے لیے وکیل کیا ہے۔ ظاہر ہے، بات سمجھ گئے ہو گے۔ بس، رسمیات ہیں۔"

حاج عزام ایک لحظہ خاموش رہا۔ پھر اس نے چیک بک نکالی اور قلم کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا، "ٹھیک ہے۔ اللہ کی برکت سے۔ میں نصف رقم کا چیک لکھے دیتا ہوں۔ پھر جب، انشاء اللہ، جیت جاؤں گا، تو بقیہ بھی ادا کر دوں گا۔"

"بالکل نہیں، قلاقند۔ اسکول کے بچوں کے ساتھ والی حرکت مجھ سے کی تو میں جھنجھلا جاؤں گا۔ میرا طریقۂ کار ہے: پہلے دام بعد میں کام۔ پوری رقم ادا کرو اور میں تمھیں اسمبلی میں داخل ہونے پر مبارکباد دوں گا اور بالکل ابھی ابھی تمھارے ساتھ مل کر 'سورۂ فاتحہ' پڑھوں گا!"

یہ عزام کا آخری حربہ تھا اور جب یہ بھی ناکام رہا تو وہ بالکل سپر انداز ہو گیا۔ اس نے دس لاکھ پاؤنڈ کا چیک لکھا، اپنی عادت کے مطابق احتیاط سے اس پر نظر ڈالی، پھر الفولی کی طرف بڑھا دیا، جس نے اسے لے کر اپنے لڑکے کو تھما دیا۔ الفولی کی باچھیں کھل گئیں اور وہ فرحت سے بولا، "مبارکباد، حاج! چلو اب مل کر 'الفاتحہ' پڑھیں۔ خدا ہم پر اپنا کرم کرے اور کامیابی بخشے! تمھیں معاہدہ یاسر کے پاس تیار ملے گا۔"

الفولی، عزام اور ان دونوں کے بیٹے، چاروں نے آنکھیں بند کیں، دعا کے لیے سامنے ہاتھ باندھے، اور منھ ہی منھ میں 'الفاتحہ' پڑھنے لگے۔

❄

حاج عزام نے الفولی کو رقم دینے کے بعد تصور کیا کہ انتخابات کا فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں تھا۔ قصر النیل کی آبادی میں متعدد تاجروں کے درمیان بڑا سخت مقابلہ ہوا، جن میں سے ہر ایک اسمبلی میں مزدور طبقے کے لیے مخصوص نشست جیتنا چاہتا تھا۔ حاج عزام کا قوی ترین حریف حاج ابوحمیدہ تھا جو مشہور 'رضا و نور' نامی کپڑوں کی دکانوں کے سلسلے کا مالک تھا۔ جس طرح فطرت میں دو یکساں قطب دھکا دے کر ایک دوسرے کو دور کرتے ہیں، اسی طرح دونوں حاجیوں کی باہمی نفرت کی بنیاد اصلاً ان کی بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے مشابہت تھی۔ چنانچہ، عزام کی طرح، ابوحمیدہ

Scanned with CamScanner

بور سعید [پورٹ سعید] کی بندرگاہ میں ایک معمولی سا مزدور ہوا کرتا تھا۔ پھر بیس سال سے کم عرصے میں اس کی دولت میں اتنی تیزی سے اضافہ ہوا کہ اس کا مصر کے کروڑ پتیوں میں شمار ہونے لگا۔

لوگوں کو ابو حمیدہ کا علم پہلی بار چند سال پہلے ہوا تھا جب اس نے قاہرہ اور اسکندریہ میں بڑی بڑی دکانوں کے ایک پورے سلسلے کا افتتاح کیا تھا۔ اس نے اخبار اور ٹیلی وژن اشتہاروں سے بھر دیے تھے جن میں کہا گیا تھا کہ وہ ہر ایسی خاتون کو متعدد نئے 'حیادار' لباس اور رنگین حجاب پیش کرے گا جو شرعی لباس پہننے کا فیصلہ کرے اور اپنے پرانے، جسم کی نمائش کرنے والے کپڑے اپنی سنجیدگی کے ثبوت کے طور پر دکان کے منتظمین کے حوالے کر دے۔ اُس وقت لوگ اس عجیب و غریب پیشکش پر متعجب ہوئے تھے اور ان کا تعجب یہ دیکھ کر اور بھی بڑھ گیا تھا کہ 'رضا و نور' دکانوں کو واقعی درجنوں عورتوں کے پرانے کپڑے وصول ہونے لگے، اور ان عورتوں کو ان کے بدلے گراں قیمت نئے شرعی لباس مفت دیے جانے لگے۔ منصوبے کے شریفانہ مقاصد نے بعض ایسی مستورات کو چوری چھپے در آنے سے باز نہ رکھا جو پہلے ہی سے 'حیادار' لباس پہنتی تھیں تاہم مفت کے کپڑوں سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں۔ وہ یہ سوانگ رچاتیں کہ انھوں نے پہلے کبھی 'حیادار' کپڑے نہیں پہنے تھے، اور دکانوں کو ایسے بے شرم لباس پیش کر دیتیں جو ان کے نہیں ہوتے تھے، تاکہ ان کے بدلے میں نئے لباس حاصل کر سکیں۔ 'رضا و نور' والوں کو اس مکاری کی سن گن ہو گئی اور انھوں نے ہر جگہ ان شاطراؤں کو علانیہ متنبہ کر دیا کہ انھیں قانونی طور پر سزا کا سامنا کرنا ہو گا، کیونکہ وہ معاہدہ جس پر عورتوں نے دستخط کیے ہوتے تھے اس میں جھوٹ بولنے پر جرمانے کی شق بھی شامل تھی۔

ان رکاوٹوں کے باوجود، یہ منصوبہ بڑی زبردست کامیابی سے ہم کنار ہوا اور اس نے ہزاروں مسلمان عورتوں کو 'حیادار' لباس اختیار کرنے میں مدد پہنچائی۔ منصوبے سے متعلق صحافیانہ رپورٹوں کی شکل میں پیسے دے کر چھپوائے ہوئے اشتہار پریس میں نکلنے لگے، جن میں ابو حمیدہ نے صراحت کی کہ اس نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک خطیر رقم مخصوص کرنے کا عہد کیا ہے جو کارہائے خیر پر صرف کی جائے گی، اور علمائے دین کے مشورے کے مطابق خدمت کا افضل ترین طریقہ یہ ہے کہ شرم و حیا کے قیام میں مسلمان خواتین کی مدد کی جائے، جو شریعت کے مکمل التزام کی جانب پہلا قدم ہے۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ ان ہزاروں نئے 'حیادار' لباسوں کی مفت تقسیم پر

Scanned with CamScanner

کیا خرچ آیا ہے، تو ابوحمیدہ بتانے سے انکار کر دیتا اور زور دے کر کہتا کہ اس کی توقع ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ رقم کا عوضانہ خود ہی دے دے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ 'حیادار' کپڑوں کے منصوبے نے ابوحمیدہ کے نام کو عالم شہرت میں بہت بلندی پر پہنچا دیا اور مصری معاشرے کی بڑی نامی گرامی شخصیت بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود، یہ افواہیں مسلسل گردش کرتی رہیں کہ ابوحمیدہ مصر کا سب سے بڑا ہیروئن کا تاجر تھا، اور اس کا اسلامی منصوبہ دراصل کالے دھن کو سفید کرنے کی حکمت عملی سے زیادہ نہ تھا، اور یہ کہ وہ رشوتیں جو وہ اونچے اونچے افسروں کو دیتا تھا، اسے گرفتار ہونے سے محفوظ رکھے ہوئے تھیں۔

قصر النیل آبادی کے انتخابی حلقے میں حزب قومی کی نامزدگی کے حصول کے لیے ابوحمیدہ نے کیا کیا دوڑ دھوپ نہ کی تھی، لیکن جب حزب نے حاج عزام کو نامزد کر دیا تو اس کے طیش کی انتہا نہ رہی، اور اس نے بڑے بڑوں سے جا کر گفت و شنید کی، لیکن عبث۔ الفولی کا کہا اٹل تھا۔ درحقیقت، ایک بے حد اہم افسر نے، جو ابوحمیدہ کا گہرا دوست تھا، جب اسے الفولی کی شکایت کرتے سنا تو مسکرا کر بولا، ''سنو، ابوحمیدہ۔ تم جانتے ہو کہ میں تمھیں عزیز رکھتا ہوں اور تمھاری بھلائی کا خیال رکھتا ہوں۔ کچھ بھی ہو جائے، الفولی سے اپنے اختلافات کو بڑھنے نہ دو۔ اگر اسمبلی میں اس بار نہیں داخل ہوتے تو انشاء اللہ آئندہ ہو جاؤ گے۔ لیکن الفولی کو کبھی ہاتھ سے نہ نکلنے دینا کیونکہ اس کو جو پشت پناہی اور اثر و رسوخ حاصل ہے، تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ چالاک ہے، اور اگر تم سے ناراض ہو گیا تو تمھارے لیے ایسی مصیبتیں کھڑی کر دے گا جو تمھارے تصور میں بھی نہ آ سکیں گی۔''

لیکن ابوحمیدہ بھلا کہاں پیچھے ہٹنے والا تھا۔ اس کے برعکس، اس نے خود کو باضابطہ طور پر آزاد امیدوار کی حیثیت سے پیش کیا اور قصر النیل کے حلقے کو سینکڑوں الیکشن پوسٹروں سے بھر دیا، جن پر اس کا نام، تصویر، اور انتخابی نشان (کرسی) بنا تھا۔ یہی نہیں، وہ ہر رات ڈاؤن ٹاؤن کے علاقے میں بڑے بڑے انتخابی شامیانے بھی نصب کرتا جہاں اس کے حمایتی آ کر جمع ہوتے۔ وہ ان کے سامنے تقریریں کرتا جن میں حاج عزام پر حملے کیے جاتے اور اس کی حرام کی کمائی کے ذرائع اور اس کی شہوت میں ڈوبی ہوئی زندگی (نئی جورو) کی طرف دبے دبے اشارے ہوتے۔ عزام اپنی کردار کشی کی اس مہم پر تاؤ میں آ گیا، الفولی کے پاس گیا اور بے ٹوک کہہ دیا، ''اگر ہر رات میری کھلم کھلا آبروریزی سے حزب مجھے محفوظ نہیں رکھ سکتی تو اس کا امیدوار بننے کا آخر فائدہ ہی کیا ہے؟''

Scanned with CamScanner

الفولی نے سر ہلایا اور وعدہ کیا کہ سب کچھ درست ہو جائے گا۔ پھر اگلے ہی دن ایک بیان دیا جو تمام اخباروں کے پہلے صفحے پر بڑے نمایاں طریقے پر چھپا جس میں اس نے کہا، ''ہر حلقے میں حزبِ قومی کا صرف ایک ہی امیدوار ہے اور حزب کے تمام اراکین کا یہ فرض ہے کہ اپنے سارے زور و شور کے ساتھ اس امیدوار کی پشت پناہی کریں۔ اسی طرح، اگر حزب کا کوئی رکن حزب کے امیدوار کے خلاف انتخاب لڑے گا تو حزب اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرے گی اور انتخابات ہوتے ہی اسے رکنیت سے خارج کر دے گی۔''

یہ بیان واضح طور پر ابو حمیدہ پر منطبق ہوتا تھا، لیکن وہ اس دھمکی سے ذرا بھی پریشان نہ ہوا اور عزام کے خلاف اپنی تشدد آمیز مہم جاری رکھی۔ اب شامیانے باقاعدگی سے ہر شام لگائے جانے لگے اور سینکڑوں تحفے تحائف حلقے کے لوگوں میں تقسیم ہونے لگے۔ دونوں حریفوں نے اپنے پیروکار اور حمایتی جمع کرنے میں اپنا سارا زور لگا دیا اور روز شدید ہاتھا پائیاں ہونے لگیں، جن میں کافی لوگ لہولہان بھی ہوے۔ چونکہ دونوں ہی حریف اچھے خاصے صاحبِ رسوخ تھے، پولیس والے ہمیشہ غیر جانبداری دکھاتے؛ جھگڑا ختم ہونے کے بعد ہی موقع واردات پر پہنچتے، یا بہت ہوا تو چند جھگڑنے والوں کو بس خانہ پری کے لیے پکڑ لے جاتے اور تھانے پہنچتے ہی بغیر تفتیش کیے چھوڑ دیتے۔

❁

کسی وجہ سے جامعۂ قاہرہ کی اقتصادیات اور سیاسیات کی فیکلٹی کا لوگوں کے ذہن میں یہ تاثر بیٹھ گیا ہے کہ یہ بڑے تمول اور ٹیپ ٹاپ کی جگہ ہے۔ اس کے طلبا سے اگر پوچھا جائے کہ کس فیکلٹی سے تعلق رکھتے ہیں، تو عموماً بڑے اعتماد سے، اتراہٹ کے ساتھ اور لاپروائی سے جواب دیتے ہیں، ''معاشیات و سیاسیات؛'' (جیسے کہہ رہے ہوں، ''ہاں، بالکل۔ جیسا کہ تم دیکھ سکتے ہو، ہم سب سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔'')۔ فیکلٹی جس پراسراریت میں ڈوبی ہوئی ہے اس کا راز کوئی نہیں جانتا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے امتیاز کی یہ وجہ رہی ہو کہ یہ سب سے بعد میں قائم کی گئی تھی، دوسری فیکلٹیوں کے کئی سال بعد، یا یہ کہ حکومت نے اسے بطورِ خاص اس لیے قائم کیا تھا کہ قائد جمال عبدالناصر کی دختر وہاں تعلیم حاصل کر سکے، یا ممکن ہے یہ بات ہو کہ سیاسی علوم اپنے طلبا کا عالمی واقعات سے قریبی یومیہ رابطہ قائم کر دیتے ہیں، جس سے ان کی فکر اور طرزِ عمل ایک مخصوص نہج اختیار کر لیتے ہیں، یا پھر، آخراً، شاید یہ کہ بڑے

Scanned with CamScanner

زمانے سے یہ فیکلٹی وزارتِ امورِ خارجہ میں ملازمت کے واسطے شاہی گزرگاہ کا کام دیتی رہی ہے اور بڑے لوگوں کی اولاد اس سے الحاق کو ڈپلومیٹک پیشے سے وابستہ ہونے کا حتمی پہلا قدم تصور کرتی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود، داخلے کی عرضی پر 'اقتصادیات کی فیکلٹی' کی پرچی اپنی اولین ترجیح کے طور پر چسپاں کرتے وقت اس قسم کا کوئی خیال طٰہ الشاذلی کے ذہن میں نہیں تھا۔ پولیس اکیڈمی میں داخل ہونے کی امید پر ہمیشہ کے لیے پانی پھر چکا تھا اور وہ اپنے اونچے نمبروں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا؛ بس، بات صرف اتنی سی تھی۔

پڑھائی کے پہلے دن، جب وہ جامعہ کے گھڑیال کے نیچے سے اس کی مشہور و معروف جھنکار کو سنتے ہوئے گزرا تو ایک مخصوص ہیبت اور جلال کے احساس سے مغلوب ہو گیا، اور جب وہ لیکچر کے کمرے میں داخل ہوا، جو لگاتار بولتے اور ہنستے ہنساتے سینکڑوں طلبا کی گونج دار بھنبھناہٹ سے بھرا ہوا تھا جو ایک دوسرے سے متعارف ہو رہے تھے اور اپنی چھوٹی موٹی بے بضاعت باتوں کا تبادلہ کر رہے تھے، تو طٰہ کو یوں محسوس ہوا کہ اس جمِ غفیر میں، جو کسی ہزار سروں والے اساطیری جانور کی طرح ہے جس کی ہر آنکھ اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہی ہے، وہ کوئی بے حد غیر اہم سی چیز ہے۔ وہ چڑھتا ہوا لیکچر گاہ کے سب سے اونچے مقام پر جا پہنچا تاکہ سب سے دور بیٹھ سکے، جیسے خود کو کسی محفوظ مقام پر چھپانا چاہتا ہو، جہاں سے وہ تو سب کو دیکھ سکے، لیکن اسے کوئی نہیں۔

وہ نیلی جینز اور ایک سفید ٹی شرٹ پہنے تھا اور گھر سے نکلنے کے وقت سے یہی سوچتا رہا تھا کہ بڑا زوردار لگ رہا ہے۔ لیکن جب اس نے ہم جماعتوں کو دیکھا تو پتا چلا کہ اس کا لباس ویسا نہیں تھا جو یہاں پہننے کے لائق ہو، خاص طور پر اس کی جینز، اصلی جینز کی سستی اور ردی سی نقل تھی۔ اس نے فیصلہ کر ڈالا کہ باپ کو قائل کرنے کی کوشش کرے گا کہ اور نہیں تو کم از کم لباس کا ایک جوڑا ہی 'رضا و نور' کے بجائے، جہاں سے وہ اپنے سستے سے کپڑے خرید اکرتا تھا، المہندسین یا زمالک سے دلوا دے۔

طٰہ نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی سے جان پہچان پیدا نہیں کرے گا، کیونکہ جان پہچان پیدا کرنے کا مطلب ہے اپنی نجی باتوں کا تبادلہ۔ اگر وہ اپنے ہم جماعتوں کے گروہ میں کھڑا ہوا ہو (جس میں، ہو سکتا ہے، لڑکیاں بھی شامل ہوں) اور کوئی پوچھ بیٹھے کہ اس کا باپ کیا کام کرتا ہے، تو وہ کیا جواب دے گا؟ بعد میں، ایک اور عجیب احساس نے اسے گرفت میں لے لیا کہ کمرے میں بیٹھے ہوئے طلبا

Scanned with CamScanner

میں ایک عمارتِ یعقوبیان کے کسی مکین کا لڑکا ہے، جس کے لیے طٰہٰ شاید کبھی سگریٹ کا پیکٹ خرید کر لایا تھا یا شاید اس کی کار دھوئی تھی۔ اب طٰہٰ یہ سوچنے لگا کہ اگر اس نامعلوم مکین کے لڑکے کو پتا چل گیا کہ عمارت کے چوکیدار کا لڑکا اسی فیکلٹی میں اس کا ہم سبق ہے تو کیا ہوگا۔

وہ اسی قسم کی سوچوں میں لگا رہا اور یکے بعد دیگرے لیکچر ہوتے رہے یہاں تک کہ ظہر کی اذان بلند ہوئی اور بعض طالب علم نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ طٰہٰ ان کے پیچھے پیچھے فیکلٹی کی مسجد میں آیا اور یہ دیکھ کر جان میں جان آئی کہ یہ سب اسی کی طرح غریب تھے اور ان میں سے بیشتر اصلاً دیہی علاقوں کے تھے۔ اس سے اس کو نماز کے ختم ہونے پر ایک طالب علم سے یہ پوچھنے کا حوصلہ ہوا، ''پہلے سال میں ہو؟''

لڑکے نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ''انشاء اللہ۔''

''کیا نام ہے؟''

''خالد عبدالرحیم، اسیوط کا ہوں۔ اور تم؟''

''طٰہٰ الشاذلی، یہیں قاہرہ کا۔''

یہ پہلی شناسائی تھی جو طٰہٰ نے پیدا کی اور حقیقت میں، جس طرح تیل پانی سے جدا ہو جاتا ہے، امیر لڑکے غریب لڑکوں سے الگ ہو گئے اور اپنی بہت سی ٹولیاں بنالیں جن میں غیر ملکی زبانوں والے اسکولوں کے فارغ التحصیل شامل تھے، جن کی اپنی ذاتی کاریں تھیں، درآمدہ کپڑے، اور درآمدہ سگریٹیں۔ یہی وہ لڑکے تھے جن کے گرد حسین اور خوش لباس لڑکیاں منڈلاتی رہتی تھیں۔ دوسری طرف غریب لڑکے خوفزدہ چوہوں کی طرح ایک دوسرے سے چپکے رہتے اور سہمے سہمے انداز میں ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں بات کیا کرتے۔

ایک ماہ سے کم مدت میں طٰہٰ نے مسجد جانے والے گروہ کے سبھی لڑکوں سے دوستی کر لی تھی۔ لیکن اگر اسے کسی سے قلبی لگاؤ تھا تو یہ بلاشبہ خالد عبدالرحیم ہی تھا، کوتاہ قامت، جسم گنے کی طرح خشک اور دبلا پتلا، گہرا سانولا رنگ، سیاہ فریم چڑھی عینک جو اس کے چہرے کو ایک گمبھیر اور پرسکون تاثر دیتی تھی، اتنا کہ وہ اپنے روایتی، موٹے جھوٹے کپڑوں میں کسی سرکاری اسکول کے نئے نئے فارغ التحصیل استاد سے زیادہ مشابہ نظر آتا تھا۔ اس سے طٰہٰ کی قربت شاید اس وجہ سے ہو کہ وہ طٰہٰ جتنا،

Scanned with CamScanner

یا بلکہ اس سے بھی زیادہ نادار تھا (جس کی شہادت اس کے موزوں کی پیوندکاری سے مل جاتی تھی جو نماز کے وقت ہمیشہ نظر آتے تھے)۔ وہ اسے اس لیے بھی پسند تھا کہ اس میں مذہبیت بڑی گہری تھی اور جب بھی نماز پڑھتا تو کھڑے ہو کر خدا کو اس طرح یاد کرتا کہ اس کلمے کا حق ادا ہو جاتا، ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے اور سر پورے خشوع و خضوع سے یوں جھکا ہوا کہ اگر کوئی اس حال میں اسے دیکھتا تو یہ ورکرتا کہ اگر آگ لگ جائے یا اس کے بالکل پاس بندوق بھی چل جائے، تو یہ ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی نماز سے غافل نہیں کر سکے گی۔ طٰہ کی کتنی تمنا تھی کہ کاش اسے بھی خالد کا سا ایمان اور حب اسلام حاصل ہو جائے! ان کی دوستی مضبوط تر ہوتی گئی۔ دونوں بلا روک ٹوک ایک دوسرے سے باتیں اور اپنے رازوں کا تبادلہ کیا کرتے۔ دونوں اس نفرت میں ایک دوسرے کے شریک تھے جو انھیں اپنے بعض متمول ہم جماعت لڑکوں کی بیکار حرکتوں کے یومیہ مظاہروں اور ان کے دینِ حقیقی سے انحراف پر محسوس ہوتی تھی، اور اس بے حیائی پر بھی جو ان کی زنانہ ہم جماعتوں میں نظر آتی تھی، جو ایسے کپڑوں میں جامعہ آتی تھیں جیسے کسی محفلِ رقص میں آئی ہوں۔

خالد نے جامعہ کے ہوسٹلوں میں اپنے دوسرے دوستوں سے طٰہ کو متعارف کرایا۔ یہ سب کے سب دیہی علاقوں کے باشندے تھے، اچھی طبیعت کے مالک، دیندار، اور نادار۔ طٰہ ہر جمعرات کی شام عشا کی نماز پڑھنے اور ان سے ملنے جاتا اور پھر سب دیر تک بیٹھے باتیں اور بحثیں کرتے رہتے۔ ان بحثوں سے اسے حقیقت میں بہت فائدہ پہنچا۔ اسے پہلی بار علم ہوا کہ اس وقت مصری معاشرہ دورِ جاہلیت کا معاشرہ ہے، اسلامی معاشرہ نہیں، کیونکہ حکمران نے خدا کی شریعت کو معطل کر رکھا ہے، تحریماتِ خدا کی کھلم کھلا توہین کی جا رہی ہے، اور ملکی قانون نے شراب نوشی، زناکاری، اور سودخوری کی اجازت دے رکھی ہے۔ اسے اشتراکیت کے معنی بھی یہیں آ کر معلوم ہوئے، جو خلافِ دین تھی، اور ان جرائم کا بھی پتا چلا جو عبدالناصر کی حکومت نے اخوان المسلمین کے ساتھ کیے تھے، اور وہ ان کے ساتھ ابو الاعلیٰ المودودی، سید قطب، یوسف القرضاوی، اور ابو حامد الغزالی کی کتابیں پڑھتا۔ چند ہفتوں بعد وہ دن آیا جب ایک پرلطف شام گزارنے کے بعد اس کے دوست حسبِ معمول دروازے کے پاس اسے خدا حافظ کہنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے کہ اچانک خالد عبدالرحیم نے کہا، "طٰہ، تم جمعے کی نماز کہاں پڑھتے ہو؟"

''گھر کے پاس، ایک چھوٹی سی مسجد میں۔''

خالد اور اس کے بھائی بندوں نے ایک نگاہ کا تبادلہ کیا، پھر خالد نے زندہ دلی سے کہا، ''سنو، طٰہٰ، میں نے تم سے ثواب کمانے کا فیصلہ کیا ہے۔ کل دس بجے تحریر چوک میں 'علی بابا' قہوہ خانے کے سامنے میرا انتظار کرنا۔ ہم مسجد انس بن مالک چل کر نماز پڑھیں گے اور، انشاء اللہ، میں تمھیں شیخ شاکر سے ملواؤں گا۔''

❁

جمعے کی اذان سے دو گھنٹے پہلے ہی مسجد انس بن مالک نمازیوں سے کھچا کھچ بھر گئی تھی۔ یہ سب کے سب اسلامی طلبا تھے، جن میں سے بعضے مغربی لباس پہنے ہوئے تھے لیکن بیشتر نے پاکستانی لباس پہن رکھا تھا۔ سفید یا نیلی قمیص جو گھٹنوں سے نیچے آتی تھی، نیچے اسی رنگ کی شلوار، اور سر پر سفید پگڑی جس کا پلو گردن کے پیچھے جھول رہا تھا۔ یہ سب شیخ محمد شاکر کے معتقدین اور متبعین تھے اور جمعے کو سویرے ہی مسجد آ جاتے تھے تاکہ بھیڑ لگنے سے پہلے جگہ مل جائے، اور تعارفات، قران کی تلاوت یا دینی گفتگو میں وقت گزارتے۔ ان کی تعداد بڑھتی جاتی یہاں تک کہ ان کے تناسب سے جگہ تنگ پڑنے لگتی اور مسجد کے کار پرداز درجنوں چٹائیاں لاکر مسجد کے مقابل چوک میں بچھانا شروع کر دیتے۔ یہ چٹائیاں بھی تیزی سے نمازیوں سے بھرنے لگتیں، یہاں تک کہ ٹریفک کی آمد و رفت معطل ہو جاتی؛ مسجد کا دیواروں سے گھرا ہوا بالائی مقصورہ بھی، جو طالبات کے لیے مخصوص تھا، نگاہوں سے مخفی ہونے کے باوجود، اونچی بھنبھناہٹ سے بھر جاتا جو اس بات کی علامت تھا کہ یہ بھی پوری طرح بھر گیا ہے۔

مسجد کا لاؤڈ اسپیکر چل پڑا، ایک کان پھاڑ کڑکڑاہٹ سی اٹھی؛ پھر آواز صاف ہوئی اور کوئی طالب علم ترتیل سے شیریں آواز میں اور خشوع کے ساتھ قرآن پڑھنے لگا، اور باقی طلبا اسے غور سے سننے لگے۔ بڑی اسطوری فضا تھی، مستند اور پاک و صاف، اور قرونِ اولیٰ کا یہ بے ملمع اور زاہدانہ منظر اسلام کے اولین دنوں کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ اچانک تہلیل اور تکبیر بلند ہوئی اور طلبا ایک دوسرے سے مزاحم ہوتے ہوئے شیخ شاکر سے مصافحہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، جو آ پہنچا تھا۔ وہ پچاس کے لگ بھگ عمر کا ہو گا، درمیانہ قامت، ہلکی سی ڈاڑھی، جس پر حنا کا خضاب لگا ہوا تھا، چہرہ، جسے خوش شکل کہا جا سکتا ہے، اور شہد کے رنگ کی بڑی بڑی موثر آنکھیں۔ طلبا ہی کی طرح وہ بھی اسلامی لباس پہنے تھا

Scanned with CamScanner

اور اوپر کالے رنگ کی شال ڈال رکھی تھی۔ وہ اپنے گرد بھیڑ لگائے ہوئے تقریباً سبھی طلبا سے واقف تھا۔ وہ ان سے گلے ملا، مصافحہ کیا اور ان کا حال پوچھا۔ منبر پر پہنچتے پہنچتے اسے کافی وقت لگ گیا۔ پھر شیخ نے جیب سے ایک مسواک نکالی، دانتوں پر پھرائی اور بسم اللہ پڑھی۔ تکبیر کی آوازیں اتنی تیزی سے بلند ہوئیں کہ مسجد کے پہلو مرتعش ہو گئے۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور فوراً ہی مکمل خاموشی چھا گئی۔

شیخ نے خطبے کی ابتدا خدا کی حمد وثنا سے کی، پھر کہا: ''عزیز بیٹو اور بیٹیو، میں چاہتا ہوں کہ تم میں سے ہر ایک اپنے سے یہ سوال کرے: 'انسان اس دنیا میں کتنے سال جیتا ہے؟' بہترین مفروضوں کے مطابق انسان کا اوسط عرصۂ حیات ستر سال سے تجاوز نہیں کرتا۔ اور اگر ہم غور کریں تو یہ مدت ہمیں بہت مختصر معلوم ہوگی۔ اس کے علاوہ، آدمی کسی وقت بھی بیماری یا حادثے سے ہلاک ہو سکتا ہے۔ اگر تم اپنے واقفوں اور رفیقوں میں سے کسی سے بھی پوچھو تو معلوم ہوگا، ان کے جاننے والوں میں ایک سے زائد لوگ جوانی میں اچانک فوت ہو گئے اور ان جواں مرگوں میں کسی کو بھولے سے بھی یہ خیال نہ ہوا ہوگا کہ وہ عنقریب جاں بحق ہونے والا ہے۔ اگر ہم اس نہج پر سوچیں تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں انسان کے پاس صرف دو باتوں کا اختیار ہے: اپنی ساری جدوجہد اپنی دنیوی زندگی پر صرف کر ڈالے جو مختصر اور آنی جانی ہے اور کسی لمحے بھی ناگہانی ختم ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے لیے بڑا نفیس اور ٹھاٹ باٹ کا مکان بناتا ہے، لیکن وہ اس نے سمندر کے کنارے پر ریت سے بنایا ہوتا ہے، جسے کسی لمحے سمندری موج کا کوئی زوردار تھپیڑا منہدم کر سکتا ہے۔ اور یہ وہ اختیار ہے جس کی قسمت میں ناکامی لکھی ہے۔ رہا دوسرا اختیار، وہ جس کی ہمارا رب، سبحانہ وتعالیٰ، ہمیں دعوت دیتا ہے، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مسلمان اس دنیا میں اس طرح رہے کہ یہ روح کی حیاتِ جاوداں کا ایک مختصر اور زودگزر مرحلہ ہے۔ اس طرح زندہ رہنے والے کو دنیا اور آخرت دونوں ہی ملیں گی اور وہ ہمیشہ خوش رہے گا، آسودہ ذہن اور مطمئن ضمیر۔ اسے ہمارے رب سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کسی اور کا خوف نہیں ہوگا۔ ایک سچے مومن کو موت کا خوف نہیں ہوتا کیونکہ وہ اسے وجود کی انتہا نہیں گردانتا، جیسا کہ مادہ پرست گردانتے ہیں۔ ایک مومن کے لیے موت محض جسدِ فانی سے ابدی زندگی کی طرف روح کا انتقال ہے۔ یہی وہ ایمانِ صادق تھا جس نے چند ہزار اوائلی مسلمانوں کو اس زمانے کی فارس وروم جیسی بڑی بڑی سلطنتوں کی افواج پر فتح دلائی۔ وہ سیدھے سادے مسلمان اپنے ایمان کی طاقت پر، راہِ خدا میں جان دینے

Scanned with CamScanner

کی اپنی سچی لگن، اور اس دنیا کی سریع الزوال لذتوں سے اپنے گہری حقارت کے بل بو۔ تے پر دنیا کے چپے چپے پر پرچم اسلام بلند کرنے میں کامیاب ہوے۔ اعلاے کلمۃ اللہ کے واسطے خدا نے ہم پر جہاد فرض کیا ہے۔ جہاد ایک اسلامی فریضہ ہے، نماز روزے کی طرح، بلکہ جہاد تو ان سب سے زیادہ اہم فرض ہے، لیکن مال دولت اور لذتوں کے حریص، ضمیر فروش حکام نے، جنھوں نے انحطاط کے دور میں عالمِ اسلام پر فرمانروائی کی ہے، اپنے ریاکار فقیہوں کی ملی بھگت سے، جہاد کو ارکانِ دین سے خارج کر دیا ہے، کیونکہ وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ اگر لوگوں نے جہاد کو اپنا لیا تو آخر میں اس کا رخ خود ان کے خلاف ہو جائے گا اور ان کا تاج و تخت جاتا رہے گا۔ سو اس طرح، جہاد کو خارج کر کے، اسلام کو اس کے حقیقی معنی سے عاری کر دیا گیا اور ہمارا اعظیم مذہب مہمل رسوم کے مجموعے میں بدل کر رہ گیا جنھیں مسلمان کھیل کود کی مشقوں کی طرح ادا کرتے ہیں، محض جسمانی حرکات جن کی کوئی روحانی معنویت نہیں۔ جب مسلمانوں نے جہاد سے روگردانی کی تو اس دنیا کے غلام بن گئے، حریص، موت سے خوفزدہ، بزدل۔ چنانچہ ان کے دشمن ان پر غالب آ گئے، اور خدا نے انھیں ذلیل کیا، ان کی قسمت میں ہزیمت، پسماندگی، اور غربت لکھ دی کیونکہ انھوں نے اللہ سبحانہ وتعالی سے اپنا عہد توڑ ڈالا تھا۔

"پیارے بیٹو اور بیٹیو، ہمارے حکام کہتے ہیں کہ وہ شریعتِ اسلام کا نفاذ کر رہے ہیں، ساتھ ہی ساتھ یہ تاکید بھی کرتے ہیں کہ ہم پر جمہوری طریقے سے حکومت کر رہے ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ وہ دونوں ہدوں میں جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہمارے نکبت زدہ ملک میں اسلامی شریعت معطل پڑی ہے اور ہم پر فرانسیسی سیکولر قانون کے مطابق حکومت کی جا رہی ہے، جس کی رو سے شراب نوشی، زناکاری اور جنسی کجروی، اگر یہ باہمی رضامندی سے عمل میں آئے، مباح ہے، بلکہ حقیقت میں خود حکومت قمار بازی اور شراب کی فروخت ۔ سے منافع کما رہی ہے، پھر اسی مالِ حرام سے مسلمانوں کو تنخواہیں دیتی ہے، جس سے حرام مال کی لعنت ان کو بھی آلودہ کر دیتی ہے اور خدا ان کی زندگی سے اپنی برکتیں اٹھا لیتا ہے۔ یہ مفروضہ جمہوری ملک انتخابی دھاندلیوں، بے گناہوں کی قید اور اذیت دہی پر قائم ہے تا کہ حکمرانوں کا ٹولہ تا ابد راج کرتا رہے۔ وہ کاذب ہیں، کاذب ہیں، کاذب ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ہم ان کے نفرت انگیز دروغ کو عین صداقت باور کر لیں۔ ہم ان سے کہتے ہیں، بہ آوازِ بلند اور صاف صاف: 'ہم اپنی امت کے لیے نہ اشتراکیت کے خواہاں ہیں نہ جمہوریت کے۔ ہم اسلامیت اور

Scanned with CamScanner

صرف اسلامیت چاہتے ہیں۔ ہم جدوجہد کریں گے اور اپنی جانوں اور ہر عزیز چیز کو قربان کر دیں گے، یہاں تک کہ مصر دوبارہ اسلامی ہو جائے گا۔ اسلام اور جمہوریت ایک دوسرے کی ضد ہیں اور کبھی بغلگیر نہیں ہو سکتے۔ پانی آگ سے یا نور ظلمت سے آخر کیسے مل سکتا ہے؟ جمہوریت کا مطلب ہے لوگوں کی خود اپنی ذات پر حکومت، جبکہ اسلام صرف خدا کی حکومت جانتا ہے۔ وہ خدا کی شریعت کو اسمبلی کے اختیار میں دینا چاہتے ہیں تا کہ اس کے معزز نمائندے یہ فیصلہ کریں کہ قانونِ خدا لائق نفاذ ہے یا نہیں! 'بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، یہ لوگ بالکل ہی جھوٹ بکتے ہیں'۔ شریعتِ حق جل وعلا پر نہ مناقشہ ہو سکتا ہے نہ مناظرہ؛ اس کی تو بس اطاعت اور فی الفور نفاذ ہی کیا جا سکتا ہے، طاقت کے ساتھ، چاہے کراہت کرنے والے کراہت ہی کیوں نہ کریں۔ میرے بچو، آؤ، خدا کو اپنے دلوں میں حاضر کریں اور اس مبارک اجتماع میں موجود ہوتے ہوئے رب عزّوجل سے عہد کریں کہ اپنے دین میں اس سے اخلاص برتیں گے، اپنے وجود کے ہر ذرے کے ساتھ اس کی راہ میں جہاد کریں گے، بخوشی اپنی جانیں دے دیں گے یہاں تک کہ اس کے کلمے کا بول بالا ہو۔۔۔"

تکبیر کی آوازیں بلند ہونے لگیں جنھوں نے پوری عمارت کو گویا اپنی بنیادوں سے ہلا کر رکھ دیا۔ شیخ نے اپنی تقریر کے دوران توقف کیا اور سر جھکا لیا یہاں تک کہ سکون لوٹ آیا، جس کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا، "میرے بچو، آج مسلمان جوانوں کے سامنے جو کام ہے وہ تصورِ جہاد کو بازیاب کرنے اور اسے مسلمانوں کے ذہنوں اور دلوں میں پھر سے قائم کرنے کا ہے۔ ٹھیک یہی وہ چیز ہے جس کا امریکہ اور اسرائیل کو دھڑکا لگا ہوا ہے، اور ان کے ساتھ ساتھ ہمارے دغاباز حکام کو بھی۔ وہ اسلامی بیداری کے خوف سے کانپتے ہیں جو دن بدن ہمارے ملک میں بڑھتی جا رہی ہے، جس کی طاقت میں شدت آتی جا رہی ہے۔ حزب اللہ اور تحریکِ حماس کے مٹھی بھر مجاہدین قادرِ مطلق امریکہ اور ناقابلِ تسخیر اسرائیل کو ہرانے میں کامیاب ہوئے، جبکہ عبدالناصر کے لشکرِ جرّار کا قلع قمع ہو گیا، کیونکہ وہ اس دنیا کی خاطر لڑ رہے تھے اور اپنے دین کو فراموش کر چکے تھے۔"

اب شیخ کا جوش اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا، اور وہ چلّایا، "جہاد! جہاد! جہاد! اے ابوبکر اور عمر، خالد اور سعد کی اولادو! آج اسلام کی امیدیں صرف تم سے وابستہ ہیں، جیسے کبھی تمھارے عظیم اجداد سے وابستہ تھیں! سو راہِ خدا میں جہاد کرو اور اس دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تین بار طلاق سنا دو جیسا کہ

امام علی بن ابی طالب نے کیا تھا! خدا اپنے عہد کے نفاذ کے لیے تمھارا منتظر ہے، سو ثابت قدمی دکھاؤ، پیچھے نہ ہٹو کہ کہیں تمھارا شمار بھی خاسرین میں نہ ہو! لاکھوں مسلمان جنھیں صیہونی قبضے کے باعث ہزیمت اور ذلت اٹھانی پڑی ہے تم سے التجا کرتے ہیں کہ ان کی لٹی ہوئی عزت و آبرو بحال کردو۔ جوانانِ اسلام، صیہونی شراب پی کر تمھاری مسجد اقصیٰ کے بیچ صحن میں رنڈیوں کے ساتھ اپنا منھ کالا کرتے ہیں! سو تم اس کے خلاف کیا کر رہے ہو؟''

طلبا کا جوش بھڑک اٹھا اور ان میں سے ایک سامنے کی صف سے کھڑا ہو کر اور مجمعے کی طرف رخ کر کے جذبات سے ٹوٹتی ہوئی آواز میں چلّایا، ''اسلامی! اسلامی! نہ اشتراکی، نہ جمہوری!'' اور اس کے عقب میں ہزاروں گلوں نے اس نعرے کو دہرایا اور تمام طلبا واحد گرجدار آواز میں جہاد کا نغمہ الاپنے لگے، اور طالبات کے مقصورے سے پرمسرت شور شرابے کی بیسیوں آوازیں گونجنے لگیں۔ شیخ شاکر کی آواز پھر بلند ہوئی، اس کا جوش انتہا کو پہنچ گیا تھا: ''خدا کی قسم، میں دیکھتا ہوں کہ یہ مقام مطہر اور مبارک ہے، اسے ملائک گھیرے ہوئے ہیں! خدا کی قسم، میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلامی حکومت کا قیام تمھارے ہاتھ میں ہے اور یہ دوبارہ وجود میں آ رہی ہے، قوی اور مفتخر! ہمارے ابن الوقت، غدار حکام، صلیبی مغرب کے خدام، تمھارے پاک اور باوضو ہاتھوں سے اپنے کیفرِ کردار کو پہنچیں گے، انشاءاللہ!''

اب نماز شروع ہوئی اور پیچھے سینکڑوں طلبا کو لیے ہوئے اس نے 'سورۂ آل عمران' کی یہ آیتیں اپنی شیریں، اثر انگیز آواز میں پڑھنی شروع کیں:

> بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ''اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کہا مانتے تو نہ مارے جاتے، آپ کہہ دیجیے کہ [اچھا تو] اگر تم سچے ہو تو اپنے کو موت سے بچا لینا۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں انھیں مردہ مت خیال کرو بلکہ وہ لوگ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں، رزق پاتے رہتے ہیں۔ ان نعمتوں سے مسرور ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے عطا کی ہیں اور جو لوگ ان کے بعد والوں سے ابھی ان سے نہیں جا ملے ہیں ان کی بھی اس حالت سے خوش ہیں کہ ان پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ لوگ خوش ہو رہے ہیں اللہ کے انعام اور فضل پر اور اس پر کہ اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے کہنے کو مان لیا بعد اس کے کہ انھیں زخم لگ چکا

Scanned with CamScanner

تھا ان میں سے جو نیک اور متقی ہیں ان کے لیے اجرِ عظیم ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان سے کہنے والوں نے کہا کہ لوگوں نے تمھارے خلاف بڑا سامان اکٹھا کیا ہے ان سے ڈرو لیکن اس نے ان کا [جوشِ] ایمان اور بڑھا دیا اور یہ لوگ بولے کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ سو یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ واپس آئے کہ انھیں کوئی ناگواری [ذرا] نہ پیش آئی اور یہ لوگ رضائے الٰہی کے تابع رہے اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔" صدق اللہ العظیم۔

❄

نماز ختم ہوتے ہی طلبا شیخ سے مصافحہ کرنے کے لیے دھکم پیل کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ پھر مسجد کے صحن میں چار چار کی ٹولیوں میں منتشر ہو گئے، ایک دوسرے سے اپنا تعارف کرانے لگے اور قرآن کی تلاوت کرنے اور سبق لینے میں ایک دوسرے کی مدد کرنے لگے۔ شیخ شاکر منبر کے پیچھے ایک تنگ اور پستہ قد دروازے سے ہوتا ہوا اپنے دفتر میں آیا، جو ان طلبا سے ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا جو مختلف اسباب کی بنا پر اس سے ملنا چاہتے تھے۔ حاضرین اس کی طرف بڑھے، معانقہ کیا، اور بعضوں نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دینا چاہا جسے اس نے سختی سے پیچھے کھینچ لیا۔ وہ بیٹھ گیا اور ایک ایک کر کے ہر طالب علم کے مسئلے کو دلچسپی کے ساتھ سننے لگا۔ اس کے بعد ان کے درمیان سرگوشیوں میں مکالمہ ہوتا اور طالب علم رخصت ہو جاتا۔

آخر میں کمرے میں صرف چند طلبا ہی باقی رہ گئے، جن میں خالد عبدالرحیم اور طٰہٰ الشاذلی بھی شامل تھے۔ باقی رہ جانے والے وہ طالب علم تھے جو شیخ سے بہت قریب تھے، اور ان کا اشارہ پاتے ہی ایک طالب علم اٹھا اور دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ ایک لحیم شحیم اور بہت لمبی ڈاڑھی والے طالب علم نے گفتگو کا آغاز کیا، اور اونچی اور پرجوش آواز میں شیخ سے بولا، "یا مولانا، یہ حفاظتی پولیس کو بھڑکانے کا معاملہ نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ زیادتی انھوں نے کی تھی۔ ہمارے ساتھیوں کو گھر جا کر پکڑ لیا اور بند کر دیا، جبکہ انھوں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہمیں کچھ نہ کچھ احتجاج ضرور کرنا چاہیے۔ اپنے بھائیوں کو چھڑانے کے لیے کوئی دھرنا یا مظاہرہ۔"

خالد نے دیو ہیکل طالب علم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طٰہ سے سرگوشی کی، ''بھائی طاہر، جامعہ قاہرہ میں جماعت کے امیر۔ طب کے آخری سال کے طالب علم۔''

شیخ نے نوجوان کی بات سنی، کچھ دیر سوچا، اور آہستگی سے کہا (اس تمام عرصے میں اس کی مسکراہٹ لبوں سے جدا نہ ہوئی)، ''اس وقت حفاظتی پولیس کو بھڑکا کر ہمیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ کویت کو آزاد کرانے کے نام پر حکومت امریکیوں اور صیہونیوں کے اتحاد میں ملوث ہوگئی ہے۔ چند دنوں میں ایک ظالم اور کافرانہ جنگ شروع ہوجائے گی جس میں مصری مسلمان امریکہ کی قیادت میں اپنے عراقی بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتاریں گے۔ اور جب یہ ہوگا تو عوام مصری حکومت کے خلاف ہو جائیں گے جس میں تحریک اسلامی انشاء اللہ ان کی قیادت کرے گی۔ میرا خیال ہے اب تم بات سمجھ گئے ہوگے، میرے بیٹے۔ حفاظتی پولیس ہمیں جان بوجھ کر چھیڑ رہی ہے کہ ہم پلٹ کر جواب دیں اور یوں انھیں اسلامیوں کا پوری طرح سے سر کچلنے کا موقع مل جائے۔ تم نے نہیں دیکھا کہ آج کے خطبے میں میں نے صرف ایک عمومی سے مباحثے پر قناعت کی اور صاف طور پر آنے والی جنگ کا ذکر نہیں کیا؟ اگر میں نے مصر کی اتحاد میں شمولیت پر نکتہ چینی کی ہوتی تو وہ کل ہی مسجد کے دروازے بند کر دیتے، جبکہ جنگ شروع ہونے پر مجھے نوجوانوں کو مجتمع کرنے کے لیے مسجد کی ضرورت ہے۔ نہیں، میرے لڑکے، خود کو اس وقت ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا دانشمندی نہیں۔ انھیں اپنی سی کرنے دو، یہاں تک کہ یہ ہمارے عراقی مسلمان بھائیوں کو مارنا شروع کردیں۔ پھر دیکھنا کہ ہم اُس دن کیا کرتے ہیں، انشاء اللہ۔''

''اور یہ آپ سے کس نے کہا ہے کہ وہ جنگ شروع ہونے تک ہمیں گزند نہیں پہنچائیں گے؟ یہ یقین آپ کو کس بات سے ہے؟ آج انھوں نے اسلامی تحریک کے درجنوں افراد کو بند کردیا ہے اور اگر ہم ان کی مزاحمت نہیں کرتے تو کل باقیوں کو بھی بند کردیں گے،'' نوجوان نے بڑی تیزی سے جواب دیا۔

خاموشی چھا گئی اور فضا میں تناؤ کی کیفیت آ گئی۔ شیخ نے نوجوان پر ملامت آمیز نظر ڈالی اور اسی پرسکون آواز میں کہا، ''میرے لڑکے، میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ایک دن وہ تمھیں تمھاری اشتعال پذیر فطرت سے نجات دلائے۔ قوی مسلمان وہ ہوتا ہے جو غصے میں اپنے پر ضبط کرتا ہے، جیسا کہ ہمارے پیارے نبی نے ہمیں تلقین کی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ اپنے بھائیوں سے محبت اور

غیرتِ دینی ہے جو تمھیں غصہ دلا رہی ہے۔ لیکن میں تمھیں یقین دلاتا ہوں، میرے بچے، اور تم سے علی وقدیر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہم میدانِ جنگ میں اس کافر حکومت سے ضرور متصادم ہوں گے، لیکن مناسب وقت پر، انشاءاللہ۔''

شیخ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا، پھر کچھ دیر تک نوجوان کو دیکھتا رہا اور ایسے اٹل لہجے میں کہا جسے جواب کی حاجت نہیں تھی، ''یہ میرے قطعی الفاظ ہیں۔ میں اسیروں کو چھڑوانے کے لیے اپنی پوری کوشش کروں گا، انشاءاللہ؛ ہمارے دوست ہیں، الحمدللہ، ہر جگہ۔ لیکن میں اس مرحلے پر کسی دھرنے ورنے کے حق میں نہیں ہوں۔''

نوجوان نے اپنا سر جھکا لیا اور یہ تاثر دیا کہ اس نے بات مان تو لی ہے لیکن بس مجبوراً، اور تھوڑی ہی دیر بعد اس نے رخصت کی اجازت مانگ لی۔ اس نے حاضرین سے مصافحہ کیا اور جب شیخ کے پاس پہنچا تو ان پر جھکا اور دو بار ان کے ماتھے کا بوسہ لیا، گویا چپقلش کا ہر نقش محو کر دینا چاہتا ہو۔ اس کا جواب شیخ نے بڑی شیریں مسکراہٹ سے دیا اور شفقت سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ اس کے بعد لڑکے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے یہاں تک کہ بس طٰہ اور خالد ہی باقی رہ گئے۔ خالد شیخ کے قریب آیا اور بولا، ''یا مولانا، یہ بھائی طٰہ الشاذلی ہیں، اقتصادیات کی فیکلٹی میں میرے ہم سبق جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔''

شیخ طٰہ کی طرف ملتفت ہوا اور اور مہربانی سے بولا، ''اہلاً، اہلاً۔ بیٹے، کیا حال ہے؟ تمھارے دوست کی زبانی تمھارے بارے میں بہت سنا ہے۔''

❁

پولیس تھانے میں گھمسان کا رن پڑ گیا۔

حامد حواس نے ملاک خلہ کو ایک رسمی رپورٹ میں کمرے پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا مرتکب قرار دیا اور عدالتی کارروائی کا مطالبہ کیا۔ ملاک نے اپنی حد تک رپورٹ کے ساتھ کرائے کے معاہدے کی نقل نتھی کر دی تھی اور ایک دوسری رپورٹ جمع کرنے پر اصرار کیا، جس میں اس نے حامد حواس اور علی ڈرائیور پر اپنے زدوکوب کرنے کا الزام رکھا اور اپنی چوٹوں کے سرکاری طور پر نوٹ کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ نتیجے میں انھوں نے اسے ایک سپاہی کے ساتھ 'احمد ماہر اسپتال' بھیج دیا جہاں سے وہ ایک

Scanned with CamScanner

طبی رپورٹ لے کر لوٹا۔ یہ بھی رپورٹ کے ساتھ نتھی کر دی گئی۔ علی ڈرائیور ملاک پر دراز دستی کرنے سے مکمل انکار کرتا رہا اور اسے جھوٹ موٹ کی چوٹیں دکھانے کا الزام دیا۔

یہ سب تو قانونی حجت بازی تھی۔ باقی رہی نفسیاتی جنگ، تو اس میں سب اپنے اپنے انداز میں کود پڑے۔ مثلاً حامد حو اس نے ایک لمحے کے لیے بھی چھت کے سبھی مکینوں کی اجتماعی منفعت کی چیز ہونے کی بابت قانونی دلائل دینا بند نہیں کیا، اور منجملہ دیگر باتوں کے مختلف عدالتی تنسیخی فیصلوں کے حوالے دیے؛ جبکہ ابسخر ون افسر سے عاجزی کے ساتھ (نازک وقتوں میں حسبِ معمول اپنا جلباب اٹھا کر اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کی نمائش کرتے ہوئے)، اونچی واویلا مچاتی ہوئی آواز میں تکرار کرتا رہا، ''رحم، عالیجاہ، رحم! ہم تو بس روزی کمانا چاہتے ہیں، اور وہ ہمیں باہر نکال دیتے ہیں اور زدوکوب کرتے ہیں!''

پولیس تھانوں میں ملاک کی اپنی کارکردگی ایک طرح سے بے حد انوکھی تھی۔ اس نے بہت پہلے ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ پولیس کے افسر کسی شہری کا اندازہ تین باتوں کی بنیاد پر کرتے ہیں: اس کا حلیہ، پیشہ، اور بات کرنے کا انداز؛ اس تشخیص کے مطابق، تھانے میں کسی شہری کے ساتھ یا تو عزت کا برتاؤ کیا جائے گا یا اہانت آمیز اور مار پٹائی کا۔ ظاہر ہے، ملاک کے معمولی سے سوٹ سے تو افسران پر کوئی گہرا اثر پڑنے والا نہیں تھا، اور اسی طرح، اس کا قمیص سازی کا پیشہ عزت آبرو کی خاطر خواہ مقدار کی ضمانت نہیں دے سکتا تھا، تو اب لے دے کر سارا دارومدار اندازِ تکلم پر تھا۔ چنانچہ، وہ اس کا عادی ہو گیا تھا کہ کسی وجہ سے بھی تھانے جانا پڑ جائے تو کسی تاجر کا انداز اختیار کرے، جو اپنی توجہ اشد ضروری اور سنجیدہ معاملات میں لگی ہوئی ہونے کے باعث اس طرح روکے جانے پر بے حد پراگندہ خاطر ہو، اور افسران سے ایسی فصیح و بلیغ زبان میں بات کرتا کہ وہ اسے حقیر جاننے سے پہلے ہی گڑبڑا جاتے۔ وہ کوئی بھی کلام کرتا، افسروں کے سامنے تاکید کرنے کے لیے چلّا کر کہتا، ''جناب والا، جیسے آپ کو بھی معلوم ہے اور مجھے بھی معلوم ہے! تھانے کے سربراہِ اعلیٰ کو بھی علم ہے! علاقے کے پولیس افسر صاحب کو بھی علم ہے!''

فصیح و بلیغ زبان کا استعمال، اس پر علاقے کے پولیس افسر کا حوالہ (جیسے وہ اس کا کوئی قریبی واقف کار ہو جس سے رابطہ قائم کرنے کی وہ پوری نیت رکھتا ہو) — یہ وہ موثر طریقے تھے جن کے باعث وہ ملاک کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کرنے سے کترا جاتے۔

Scanned with CamScanner

تو یہاں یہ سب — ابسخرون اور ملاک اور حامد حواس — افسر کے سامنے کھڑے ہوئے تھے اور بغیر سانس لیے چلا رہے تھے، جبکہ ان کے عقب میں نشے باز علی ڈرائیور، کسی آزمودہ کار کھرج سُرے کی طرح جسے موسیقی میں اپنی باری کا علم ہو، اپنی بھاری اور بھرائی ہوئی آواز میں بار بار یہی لفظ دہراتا رہا: ''جنابِ عالی، چھت پر عورتیں اور خاندان آباد ہیں! ہم کاریگر عملے کو ان کی بے حرمتی نہیں کرنے دیں گے، جنابِ عالی!''

افسر اُن سے بالکل عاجز آچکا تھا اور اگر اسے عواقب کا خوف نہ ہوتا تو اپنے گرگوں سے کہتا کہ سب کو باندھ کر خوب بیدزنی کریں۔ لیکن آخر میں اس نے توثیق کردی کہ رپورٹ سرکاری وکیل کو پیش کی جائے، اور سارے جھگڑیوں کو وہ رات حوالات میں گزارنی پڑی، اور اگلے دن سرکاری وکیل نے ایک حکم جاری کیا جس کی رو سے ملاک کو کمرہ استعمال کرنے کا اختیار مل گیا اور 'متاثرین کو عدالتی چارہ جوئی کرنے کا حق'۔ چنانچہ ملاک چھت پر فتح مند لوٹا، جس کے بعد خیر خواہوں نے بیچ میں پڑ کر اس کے اور اس کے مخالفین علی ڈرائیور اور حامد حواس کے درمیان مصالحت کرادی (جنھوں نے دکھانے کو مصالحت قبول کرلی لیکن ملاک کے خلاف شکایتیں تحریر کرنے اور پھر ثابت قدمی سے ان کی پیروی کرنے سے باز نہ آئے)۔

لیکن سرکاری وکیل کا حکم ملاک کے لیے ایک نقطۂ آغاز ثابت ہوا اور ہفتے کے اندر اندر اس نے کمرے کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔ چھت پر کھلنے والا دروازہ بند کرادیا اور ایک بڑا سا دروازہ زینے کے پاس کھلوالیا، جہاں ایک بڑا سا پلاسٹک کا بورڈ ٹانگ دیا اور اس پر عربی اور انگریزی دونوں میں 'ملاک قمیصیں' لکھ دیا۔ اندر کپڑے کاٹنے کے واسطے ایک کشادہ میز اور منتظر گاہکوں کے واسطے چند کرسیاں بچھادیں اور دیوار پر مریم عذرا کی شبیہ لٹکادی اور اس کے برابر اخبار نیویارک ٹائمز سے ایک انگریزی مضمون کی نقل، جس کی سرخی ''ملاک خلہ، عظیم مصری درزی'' تھی اور جس میں امریکی صحافی نے ایک پورے صفحے پر ماہر استاد ملاک خلہ کی مہارت کے گن گائے تھے؛ صفحے کے درمیان میں ملاک کی تصویر تھی جس میں اس کی پیمائشی پٹی اس کی گردن کے گرد پڑی تھی اور وہ خود کپڑا قطع کرنے میں مکمل غرق تھا اور بظاہر اس سے قطعی بے خبر کہ اس کی تصویر اتاری جارہی ہے۔

اگر کوئی اس سے مضمون کے بارے میں پوچھتا ہے تو ملاک بتاتا ہے کہ ایک غیر ملکی (جو بعد میں

نیویارک ٹائمز کا قاہرہ کا نامہ نگار نکلا) ایک دن چند قمیصیں سلوانے آیا۔ اگلے دن ملاک کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ کئی غیر ملکی فوٹو گرافروں کو لے کر آیا ہے۔ انھوں نے یہ پارہ اس کے بارے میں اس لیے لکھا تھا کہ وہ اس کی سلائی کی صلاحیتوں پر مارے حیرت کے عش عش کر اٹھے تھے۔ ملاک یہ کہانی بالکل عام سے انداز میں سناتا ہے، پھر ایک دزدیدہ نگاہ سامعین پر ڈالتا ہے۔ اگر وہ انھیں کسمساتے اور شک کرتے نظر آتے ہیں تو وہ کسی دوسری چیز کی بات کرنے لگتا ہے، جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔ اگر وہ اس یقین کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں تو ملاک اپنی بات جاری رکھتا ہے اور زور دے کر کہتا ہے کہ غیر ملکی نے بڑا سخت اصرار کیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ امریکہ چلے اور وہاں قمیصیں بنائے اور جو بھی تنخواہ چاہے خود ہی بتا دے، لیکن ظاہر ہے اس نے پیشکش ٹھکرا دی کیونکہ اسے مصر کے باہر رہنے کے خیال ہی سے نفرت ہے۔ ملاک اس پارے کو آسودہ خاطری اور اعتماد کے ساتھ یہ کہہ کر انجام تک پہنچاتا ہے، ''سب جانتے ہیں کہ یہ سارے باہر کے ملک ماہر قمیص سازوں کے مشتاق ہیں۔''

معاملے کی ساری حقیقت بس اتنی ہے کہ بسیونی، عتبہ چوک کا فوٹو گرافر، کسی کو بھی کسی بھی اخبار میں صحافتی مضمون کا موضوع بنانے کی قدرت رکھتا ہے جس میں اس کی مہارت کا ذکر ہو، بس فرمائش کرنے کی دیر ہے۔ اس کا نرخ عربی اخبار کے لیے دس پاؤنڈ اور غیر ملکی اخبار کے لیے بیس پاؤنڈ ہے۔ بسیونی کو صرف اخبار کا نام، گاہک کی تصویر، اور خبر کا مضمون درکار ہوتا ہے، جو اس کے پاس پہلے سے تیار موجود ہے، جس میں لکھنے والا قاہرہ کی سڑکوں پر ایک بے حد ذہین درزی، وغیرہ وغیرہ کی کارگاہ، یا کسی عظیم کباب بنانے والے، وغیرہ وغیرہ کی دکان پر اچانک جا نکلنے پر اپنے زبردست تعجب کا ذکر کرتا ہے۔ بسیونی ان تمام چیزوں کو اپنے فوٹو کا پیپر میں ایک خاص طرح سے چڑھاتا ہے کہ برآمد ہونے والی نقل یوں نظر آتی ہے جیسے کسی اخبار سے تراشی گئی ہو۔

لیکن اپنی نئی جگہ پر ملاک خلہ آخر کرتا کیا ہے؟ قمیصیں بناتا ہے، ظاہر ہے؛ لیکن درزی کا کام اس کی یومیہ کارگزاریوں کے ادنیٰ سے حصے سے زیادہ نہیں، کیونکہ، مختصراً، وہ ہر وہ کام کرتا ہے جس سے آمدنی کا امکان ہو، چاہے یہ نقدی اور اسمگل شدہ شرابوں کی تجارت ہو یا جائیداد، اراضی اور ساز و سامان سے آراستہ اپارٹمنٹس کی دلالی، سن رسیدہ عربوں کی چھوٹی عمر کی فلاح [دہقان] لڑکیوں سے شادیوں کا انتظام ہو جنھیں وہ جیزہ اور فیوم کے متعینہ گاؤں سے لاتا ہے، یا مزدوروں کو دو ماہ کی اجرت کے عوض

خلیج کے ملکوں میں بھجوانے کا کام۔

اس متنوع الجہات کام کاج نے اسے لوگوں کے بارے میں ہر قسم کی معلومات اور ان کے ذرا ذرا سے راز جمع کرنے کا حریص بنا دیا ہے، کیونکہ کسی بھی شخص کا کسی لمحے بھی اس سے معاملہ ہو سکتا ہے، اور یہ معلومات کسی وقت بھی ان معاملات پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہو سکتی ہیں اور وہ معاملے کا رخ اپنے حسبِ منشا پھیر سکتا ہے۔ ہر روز وسطِ صبح سے رات کے دس بجے تک بھانت بھانت کے لوگ ملاک کی کارگاہ میں آتے ہیں — غریب اور امیر گاہک، سالخوردہ عرب، دلال، اور ساز و سامان سے آراستہ اپارٹمنٹوں میں کام کرنے والی نوکرانیاں اور لڑکیاں، چھوٹے موٹے بیوپاری اور کمیشن ایجنٹ؛ اور ملاک ان سب کے درمیان آتا جاتا رہتا ہے، باتیں کرتا ہے اور چلاتا ہے، ہنستا ہے اور بہلاتا پھسلاتا ہے، لال پیلا ہوتا ہے اور جھگڑتا ہے، سینکڑوں جھوٹی قسمیں کھاتا ہے اور سودے طے کرتا ہے، کسی مشہور اور ممتاز آدمی کی طرح جو کسی کھیل میں اپنا کردار مزے لے لے کر ادا کر رہا ہو جسے طویل مشق و ریاضت سے اس نے درجۂ تکمیل کو پہنچا دیا ہو۔

❋

ملاک کو بثینہ السیّد دن میں دو بار نظر آتی تھی، کام پر جاتے اور واپس آتے وقت۔ شروع ہی سے وہ اس پر لہلوٹ ہو گیا تھا کیونکہ وہ خوبصورت تھی اور اس کا جسم شہوت انگیز تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے ایک احساس اور بھی ہوتا تھا، جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے، کہ یہ سنجیدگی جو اس نے اپنے چہرے پر طاری کر رکھی ہے، شکستنی اور ملمع کار ہے، اور یہ کہ وہ اتنی پاکباز ہے نہیں جتنی خود کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جب اس نے بثینہ کی بابت معلومات فراہم کر لیں اور حقیقتِ حال سے واقف ہو گیا تو اس سے سلام علیک کرنا اور اس کی ماں حاجہ کی صحت کا حال پوچھنا شروع کر دیا، اور یہ کہ 'شنن' کو، جہاں وہ کام کرتی تھی، قمیصوں کی کھیپ کی ضرورت تو نہیں (جس پر، ظاہر ہے، بثینہ کو اپنا کمیشن ملے گا)۔ آہستہ آہستہ وہ اس سے مختلف موضوعات پر باتیں کرنے لگا — موسم، پڑوسی، شادی۔ حقیقت میں بثینہ کو ملاک سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ بے آرامی محسوس ہوتی تھی لیکن وہ اسے اپنے سے دور بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اسے روز اس کے پاس سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا اور وہ ان کا پڑوسی تھا اور ادب کے ساتھ بات کرتا تھا، جس کی وجہ سے بثینہ کو بے رخی دکھانے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

Scanned with CamScanner

بہرحال، اس نے بات کرنا قبول کرلیا لیکن بنیادی طور پر اس لیے کہ ملاک کے رویے میں اس سے متعلق جو تجسس اور کھوج تھی اس نے اسے مجبور کردیا تھا۔ وہ خواہ کسی موضوع پر بثینہ سے بات کر رہا ہو، اس کا لہجہ اور نگاہیں اس تک پہنچ ہی جاتیں، جیسے کہہ رہا ہو، ''اتنی پارسانہ بنو، مجھے سب معلوم ہے۔'' یہ ان کہی بات اتنی واضح اور قوی ہوگئی کہ وہ اپنے سے پوچھنے لگی کہ کہیں طلال نے اس سے ان کے تعلق کا بھانڈا تو نہیں پھوڑ دیا ہے۔

ملاک اس سے اور زیادہ بے تکلف ہوتا گیا، حتیٰ کہ ایک دن اس نے اچانک اپنی آہستہ رو اور ٹٹولتی ہوئی نظر اس کی بھری بھری چھاتیوں اور گداز جسم پر ثبت کر کے بے حیائی سے پوچھا، ''طلال شنن تمھیں ماہوار کیا دیتا ہے؟''

بثینہ طیش میں آگئی اور فیصلہ کر ڈالا کہ اس بار سختی سے اس کا دماغ درست کر دے گی، لیکن آخر میں اس سے نظریں کتراتے ہوئے خود کو جواب دیتے ہوئے پایا، ''دو سو پچاس پاؤنڈ۔''

اس کی آواز عجیب سنائی دے رہی تھی، کھڑکھڑاتی ہوئی، جیسے کوئی دوسرا بول رہا ہو، اور ملاک ہنس پڑا، اس سے قریب ہوا، اور، حملہ کرتے ہوئے، بولا، ''بے وقوف لڑکی۔ یہ تو دمڑیاں ہیں۔ سنو، میں تمھیں چھ سو پاؤنڈ ماہانہ کا کام دلوا سکتا ہوں۔ ابھی فوراً جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ سوچنے کے لیے جتنا وقت درکار ہو لے لو — ایک دن، دو دن، پھر آ کر مجھ سے ملنا۔''

Scanned with CamScanner

2

'میکسم بار' میں زکی الدسوقی کو بڑی راحت محسوس ہوتی ہے۔

جیسے ہی وہ سلیمان باشا چوک پار کر کے آٹوموبیل کلب کے مقابل چھوٹی سی گزرگاہ میں آتا ہے اور شیشوں والے چھوٹے سے چوبی دروازے کو دھکا دے کر داخلے سے گزر لیا ہوتا ہے، تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وقت کی کوئی جادوئی مشین اسے انیس سو پچاس کی دہائی کے طلسمی دنوں میں واپس لے آئی ہے۔ سفید رنگ چڑھی چمکدار دیواریں جن پر عظیم فنکاروں کی اصلی الواح آویزاں ہیں، پرسکون روشنی جو دیواروں کے نازک اندام لیمپوں سے مترشح ہو رہی ہے، جگمگاتے سفید میز پوشوں سے ڈھکی ہوئی میزیں جن پر پلیٹیں، تہہ کیے ہوئے نیپکن، چمچے، چھریاں اور مختلف قامت کے کانچ کے گلاس فرانسیسی انداز میں سجے ہوئے ہیں، غسلخانے کا راستہ جسے بڑے سے نیلے رنگ کی تہہ دار چلمن (paravent) نے چھپا رکھا ہے، اور چھوٹی سی خوشنما بار جس کے انتہائی بائیں سرے پر ایک قدیم پیانو کھڑا ہے جسے ریستوران کی مالکہ کرستین اپنے دوستوں کے لیے بجاتی ہے ۔ 'میکسم' کی ہر شے پر بڑے شاندار ماضی کی چھاپ پڑی ہے، جس طرح پرانی رولز رائس کاروں، خواتین کے لمبے سفید دستانوں، پروں سے مزین ہیٹوں، بھونپو اور طلائی سوئیوں والے گراموفونوں، اور چوبی چوکھٹوں میں آویزاں پرانی سفید اور سیاہ تصویروں پر پڑی ہوتی ہے، جنھیں ہم اپنے بیٹھنے کے کمروں میں لٹکا کر بھول جاتے ہیں اور جو گاہے بگاہے دیکھنے پر ہمیں گدازی اور افسردگی کا احساس دلاتی ہیں۔

'میکسم' کی مالکہ، مادام کرستین نیکولاس، یونانی الاصل ہے، مصر میں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی۔ وہ تصویریں بناتی ہے، پیانو اور وائلن بڑی عمدگی سے بجاتی ہے، اور بڑا اچھا گاتی ہے۔ اس نے کئی بار شادی کی ہے اور بڑی شادماں اور تند و تیز زندگی گزاری ہے۔ زکی سے اس کے تعلق کا آغاز انیس سو پچاس کی دہائی میں بڑے دھواں دھار عشق سے ہوا، پھر یہ ماند پڑ گیا اور اپنے پیچھے بڑی گہری اور پائیدار دوستی چھوڑ گیا۔ زکی مصروف رہتا ہے اور مہینوں اس سے ملے بغیر گزار دیتا ہے لیکن جیسے ہی اس کا

Scanned with CamScanner

دل بوجھل یا حالات خراب ہونے لگتے ہیں، کرستین کی طرف چل پڑتا ہے اور ہمیشہ اس کو اپنا منتظر پاتا ہے۔وہ توجہ سے اس کی بات سنتی ہے، بے لوث مشورہ دیتی ہے، اور کسی ماں کی سی دردمندی دکھاتی ہے۔

آج اسے بار کے دروازے سے داخل ہوتا دیکھتے ہی اس نے مسرت کا نعرہ لگایا، اسے چمٹا لیا اور دونوں گالوں پر چوما۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور سر پیچھے ڈال کر کچھ دیر تک اپنی نیلگوں آنکھوں سے اس کا معائنہ کرتی رہی، اور کہنے لگی، ''پریشان نظر آ رہے ہو، میرے دوست۔''

زکی اداسی سے مسکرایا اور کچھ کہنے والا ہی تھا کہ خاموش ہو رہا۔ کرستین نے اپنا سر یوں ہلایا جیسے بجھ گئی ہو، پھر اسے پیانو کے برابر اپنی مرغوب میز پر بیٹھنے کی دعوت دی اور سرخ شراب کی ایک بوتل اور کچھ ٹھنڈی مزیدار چیزیں منگوائیں۔ جیسے خشک پھولوں میں اپنی پرانی مہک کا شائبہ باقی رہتا ہے، کرستین میں اب بھی اپنے جمالِ رفتہ کے آثار باقی تھے۔ اس کا جسم صاف ستھرا اور خوشنما تھا، بال رنگے ہوئے اور پیچھے کی طرف کڑھے ہوئے تھے، اور دھیمے دھیمے سے بناؤ سنگار نے اس کے جھریوں زدہ چہرے کو ایک شائستہ اور پروقار تاثر بخش دیا تھا۔ جب وہ ہنستی تو اس کا چہرہ کسی رحمدل دادی کی شفقت اور وضعداری اور اس پرانی عشوہ طرازی کے درمیان ڈولتا رہتا جو ایک کوندے کی طرح لوٹ آتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ میز کے قواعد کے مطابق کرستین نے شراب کو چکھا، پھر نوبیہ کے رہنے والے قدیم ویٹر کو اشارہ کیا اور اس نے دو گلاس اوپر تک بھر دیے۔ شراب کی چسکی لیتے ہوئے زکی نے اسے بتایا کہ کیا ماجرا ہوا ہے۔ وہ توجہ سے سنتی رہی، پھر سرسری انداز میں کہا، ''تم بات کا بتنگڑ بنا رہے ہو۔ بالکل معمولی سی چپقلش ہے۔''

''دولت نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔''

''ہیجانی عمل ہے، غصے کی زیادتی کی پیداوار۔ ایک دو دن بعد جا کر معافی مانگ لینا۔ دولت جلدی گرم ہو جاتی ہے لیکن دل کی اچھی ہے۔ اور یہ مت بھولو کہ تم نے واقعی اس کی بیش قیمت انگوٹھی کھو دی ہے اور کوئی بھی عورت اپنا زیور کھو دینے پر تمھیں نکال باہر کرے گی۔''

یہ سب کرستین نے خوش دلی کے ساتھ کہا، لیکن زکی افسردہ ہی رہا اور رنجیدگی سے بولا، ''دولت بڑے زمانے سے مجھے اپارٹمنٹ سے نکال دینے کا منصوبہ بنا رہی ہے اور انگوٹھی کے نقصان نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا ہے۔ میں نے اسے نئی انگوٹھی خرید کر دینے کی پیشکش بھی کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔''

Scanned with CamScanner

''میں نہیں سمجھی۔''

''دولت چاہتی ہے کہ اپارٹمنٹ صرف اسی کا ہو جائے۔''

''کیوں؟''

''پیاری دوست، میں مذہبی نہیں ہوں، جیسا کہ تم جانتی ہو، اور بعض چیزیں ہیں جن کی میں نے کبھی پروا نہیں کی ہے، جیسے جائیداد اور ورثے کی تقسیم۔''

کرستین نے اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھا تو زکی نے شراب کا ایک اور گلاس انڈیلتے ہوئے وضاحت کی، ''میں نے کبھی شادی نہیں کی اور نہ میرے بچے ہیں۔ جب میں مرجاؤں گا تو میرا سب کچھ دولت اور اس کی اولاد ہی کو ملے گا۔ لیکن وہ چاہتی ہے کہ اپنے بچوں کے واسطے سب کچھ آج ہی پکا کر لے۔ کل، جھگڑے کے دوران، اس نے مجھ سے کہا، 'میں تمھیں ہمارے حقوق کو فضول اڑانے نہیں دوں گی۔' ذرا تصور تو کرو! اس طرح، اتنے صاف صاف لفظوں میں! میری ساری ملکیت کو وہ اپنے بچوں کا حق سمجھتی ہے، یوں جیسے میں تو بس اپنی ملکیت کے نگہبان سے زیادہ نہیں۔ وہ میرے مرنے سے پہلے ہی میرا ورثہ وصول کر لینا چاہتی ہے۔ اب آیا تمھاری سمجھ میں؟''

''نہیں، زکی۔''

کرستین نے، جو تھوڑی سی خمار میں آ گئی تھی، آخری لفظ چلّا کر کہے، اور جب زکی نے بولنے کی کوشش کی، تو اس نے خاصی گرمی سے اس کی قطع کلامی کی، ''دولت کبھی اس طرح نہیں سوچ سکتی۔''

''اتنی عمر ہو جانے کے بعد بھی تم ویسی ہی سادہ لوح ہو۔ تمھیں بدی کے خیال پر حیرت کیوں ہوتی ہے؟ تم ایک بچے کی طرح سوچتی ہو۔ تم تصور کرتی ہو کہ اچھے لوگوں کو مسکرانا اور شادماں ہونا چاہیے، اور برے لوگوں کے چہرے قبیح ہوتے ہیں اور ان کی بھنویں گھنی اور الجھی ہوئی۔ زندگی اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ بدی بہترین لوگوں میں بھی ہوتی ہے اور ان میں بھی جو ہم سے بے حد قریب ہوتے ہیں۔''

''میرے پیارے فلسفی، تم مبالغے سے کام لے رہے ہو۔ سنو۔ چلو 'بلیک لیبل' کی ایک بڑی بوتل کی شرط لگائیں۔ میں آج رات دولت کو فون کر کے تم دونوں میں صلح کرا دوں گی۔ پھر میں تم سے بوتل خریدواؤں گی، اور خبردار جو اپنے وعدے سے پھرنے کی کوشش کی!''

Scanned with CamScanner

زکی 'میکسم' سے اٹھا اور ڈاؤن ٹاؤن میں فضول منڈگشت کرنے لگا۔ پھر وہ اپنی دفتر کی طرف چل دیا، جہاں اسٹروون نے، (جسے پورے واقعے کا علم تھا) چہرے پر مناسب افسردگی طاری کر کے اس کا استقبال کیا اور تیزی اور گرمجوشی سے اس کے لیے شراب اور کھانے کی ہلکی پھلکی چیزیں تیار کرنے لگا، جیسے اس سے تعزیت کر رہا ہو۔ زکی اپنی شراب اٹھا کر بالکنی میں آ گیا۔ وہ ابھی تک دولت سے صلح صفائی کرنے کی امید پالے ہوئے تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ کچھ بھی سہی، آخر کو وہ ہے تو اس کی بہن ہی اور اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا، پھر فون کی گھنٹی بجی۔ اسے کرستین کی خجالت میں ڈوبی ہوئی آواز یہ کہتی سنائی دی، ''زکی، میں نے دولت کو فون کیا تھا۔ مجھے افسوس ہے۔ لگتا ہے وہ سچ مچ باؤلی ہو گئی ہے اور تمھیں اپارٹمنٹ سے نکال دینے پر ادھار کھائے بیٹھی ہے۔ بولی کہ اس نے تالا بدل دیا ہے اور وہ کل تمھیں تمھارے کپڑے بھجوا رہی ہے۔ جو ہوا ہے اس پر مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم باور کر سکتے ہو، وہ تمھارے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کا کہہ رہی تھی؟''

''کیا قانونی چارہ جوئی؟''

''اس نے یہ نہیں بتایا، لیکن بہتر ہوگا کہ ہوشیار رہو، زکی۔ اس سے کچھ بعید نہیں۔''

❁

اگلے دن اسٹروون سڑک کے کسی لونڈے کو لیے نمودار ہوا جو ایک بڑا سا صندوق اٹھائے ہوئے تھا جس میں دولت نے زکی کے تمام کپڑے بھیج دیے تھے۔ اس کے بعد پولیس تھانے سے متعدد طلبی کے پروانے آئے، کیونکہ دولت نے اس نیت سے کئی رپورٹیں داخل کر دی تھیں کہ اپارٹمنٹ کے قبضے پر اپنا قانونی حق ثابت کر سکے اور زکی کی جانب سے عدم تعرض کا حلف نامہ بھی لے لیا تھا۔ دوستوں نے بیچ میں پڑ کر دونوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی لیکن دولت نے انکار کر دیا۔ زکی نے اسے کئی بار فون کیا لیکن وہ لائن کاٹ دیتی۔ آخر میں اسے ایک وکیل سے مشورہ لینا پڑا، جس نے بتایا کہ اس کا معاملہ اگرچہ بالکل ہی مایوس کن نہیں ہے، لیکن کوئی خاص اچھا بھی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اپارٹمنٹ اس کے باپ کے نام سے کرائے پر دیا گیا تھا اور اس میں رہنے کا حق دولت کو بھی پہنچتا ہے۔ اس نے تاکید کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ قانونی کارروائی میں بڑا وقت لگتا ہے اور اس قسم کے معاملے میں مناسب طریقہ یہ ہے کہ سختی سے کام لیا جائے۔ (افسوس کے ساتھ) اسے چاہیے کہ چند غنڈوں کی خدمات

Scanned with CamScanner

حاصل کرے، ان کی مدد سے دولت کو اپارٹمنٹ سے نکال دے، واپس اندر داخل نہ ہونے دے، اور اگر وہ عدالت جاتی ہے تو جایا کرے؛ اس قسم کے قضیوں کو حل کرنے کا یہی واحد موثر طریقہ ہے۔

زکی نے وکیل کے خیال سے اتفاق کیا اور تجویز کیا کہ اتوار کی صبح، جب دولت حسبِ عادت بینک جاتی ہے، دروازہ توڑ کر تالا بدل دیا جائے۔ اس نے وکیل سے زور دے کر کہا کہ نہ دربان اور نہ ہمسایوں میں سے کوئی اس منصوبے پر عمل کرنے سے اسے باز رکھ سکے گا۔ اس نے بڑے جوش وخروش اور سنجیدگی سے یہ سب کہا، لیکن اپنے دل میں خوب جانتا تھا کہ وہ ان میں سے کسی بات پر عمل نہیں کرے گا۔ وہ کبھی غنڈے نہیں رکھے گا، کبھی دولت کو گھر کے باہر نہیں نکالے گا، اور وہ کبھی اسے عدالت میں نہیں گھسیٹتا پھرے گا۔ وہ یہ سب کر ہی نہیں سکتا تھا۔

کیا اسے دولت سے خوف آتا ہے؟ شاید۔ وہ اس سے کبھی متصادم نہیں ہوتا۔ اس کا سامنا ہونے پر ہمیشہ پیچھے ہٹ جاتا ہے، اور فطرتاً لڑنے والا آدمی نہیں ہے؛ بچپن ہی سے اسے جھگڑوں ٹنٹوں اور مشکلوں سے نفرت رہی ہے اور وہ جس طرح بھی ہو، ان سے دامن بچانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ اسے اس لیے گھر سے نہیں نکال سکتا کہ وہ اس کی بہن ہے۔ اگر وہ اپارٹمنٹ کو دولت کے پنجے سے نکال کر اسے سڑک پر ڈال دے تو اس سے اسے خوشی نہیں ہوگی۔ دولت سے پنجہ کشی اسے اداس کر دیتی ہے کیونکہ وہ اسے بد باطن اور کینہ جو نہیں سمجھتا، چاہے وہ کچھ بھی کیا کرے۔ وہ اس کی پرانی شکل کو نہیں بھول سکتا جو اسے پسند تھی۔ وہ کتنی نازک اور شرمیلی ہوا کرتی تھی، اور اب کتنی بدل گئی ہے! وہ اداس ہے تو یوں کہ بہن سے اس کا تعلق اس درجہ خراب ہو گیا ہے۔ جو کچھ دولت نے کیا ہے وہ اس کی بابت سوچتا ہے اور اپنے سے پوچھتا ہے کہ اتنی بے رحمی آخر دولت میں کہاں سے آ گئی۔ پڑوسیوں کے سامنے اسے اپارٹمنٹ سے نکال دینے کا یارا اسے کیسے ہوا؟ اور تھانے میں پولیس افسر کے سامنے بیٹھ کر اپنے بھائی کے خلاف رپورٹ داخل کرنے کا حوصلہ اس میں کہاں سے آیا؟ کیا اسے ایک مرتبہ بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اس کا بھائی ہے، جس نے اس کے ساتھ کبھی کوئی برائی نہیں کی ہے؟ کیا وہ اس جزا کا مستحق ہے؟ اور کیا ایک ذرا سی جائیداد کی خاطر اپنے خاندان کو قربان کیا جا سکتا ہے؟ یہ درست ہے کہ جو زمین اس نے زرعی اصلاحات سے حاصل کی تھی وہ اپنی قدر و قیمت میں کئی گنا بڑھ گئی ہے، لیکن اس کی موت پر یہ سب بہر حال دولت اور اس کے بچوں ہی کو ملنے والا ہے، تو

پھر یہ سارے کھڑاگ کھڑے کرنے اور اسے بے عزت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

زکی کو محسوس ہوا کہ اداسی آہستہ آہستہ پھیل رہی ہے اور اپنے تاریک سائے اس کی زندگی پر ڈال رہی ہے۔ اس نے پوری پوری راتیں جگ کر گزاریں، جن کے دوران وہ صبح تک بالکنی پر بیٹھا شراب اور سگریٹ پیتا رہتا، اور ماضی کے واقعات کو ذہن میں دہرایا کرتا، کبھی سوچتا کہ وہ اپنی پیدائش سے ہی بدقسمت رہا ہے۔ اس کا سنہ پیدائش تک بدشگون تھا؛ اگر وہ پچاس سال پہلے پیدا ہوا ہوتا تو اس کی پوری زندگی کا رنگ ہی مختلف ہوتا۔ اگر انقلاب ناکام رہا ہوتا، اگر شاہ فاروق نے 'احرار' افسروں کو گرفتار کرنے میں مستعدی دکھائی ہوتی جن کے ناموں تک سے وہ واقف تھا، تو انقلاب کبھی برپا نہ ہوا ہوتا اور زکی اپنی زندگی اسی طرح گزارتا جو اس کے شایان تھی — زکی بک، ولد عبدالعال باشا الدسوقی۔ وہ یقیناً وزیر تو بن ہی گیا ہوتا، بلکہ شاید وزیرِ اعظم — ایک شاندار زندگی، نہ کہ یہ بے معنی اور اہانت آمیز زندگی۔ ایک طوائف اسے نشہ پلا کر لوٹ لیتی ہے، پھر بہن پڑوسیوں کے سامنے اسے گھر سے نکال دیتی ہے اور فضیحت کرتی ہے، حتیٰ کہ اسے دفتر میں اسٹر ون کے ساتھ سونا پڑتا ہے۔ کیا یہ بدقسمتی ہے یا کردار کی کوئی خامی جو اسے ہمیشہ غلط فیصلے کی طرف لے جاتی ہے؟ وہ انقلاب کے بعد مصر ہی میں کیوں پڑا رہا؟ وہ فرانس جا کر نئی زندگی بھی تو شروع کر سکتا تھا، جیسا کہ بڑے خاندانوں کی بہت سی اولادوں نے کیا تھا۔ وہاں اس نے یقیناً کوئی اہم مقام حاصل کر لیا ہوتا، جیسے بعض دوستوں نے کیا تھا، جو اس سے ہر لحاظ سے کمتر تھے۔ لیکن وہ مصر ہی میں رہا اور آہستہ آہستہ اپنی گرتی ہوئی صورت حال کا عادی ہوتا گیا، یہاں تک کہ ان پستیوں میں جا پڑا۔ اور پھر . . . اس نے شادی کیوں نہیں کی؟ جب وہ جوان تھا، بہت سی امیر اور حسین عورتیں اسے چاہتی تھیں، لیکن وہ شادی سے انکار کیے جاتا، یہاں تک کہ موقع نکل جاتا۔ اگر اس نے شادی کر لی ہوتی تو آج اس کی خبر گیری کے واسطے جوان بچے ہوتے اور ان بچوں کے بچے، جن کے ساتھ وہ کھیلا کرتا، ان سے لاڈ پیار کرتا۔ اگر اس کا صرف ایک بچہ ہی ہوتا تب بھی دولت اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتی، اور اگر اس نے شادی کی ہوتی تو اس قاتل، المناک تنہائی کا سامنا نہ کرنا پڑتا، اور قریب المرگی کے اس تیرہ و تاریک احساس کا جو اس پر ہمیشہ اپنے کسی دوست کے مرنے کی خبر سننے پر طاری ہو جاتا ہے۔ وہ ناقابلِ جواب سوال جو بستر میں پناہ لیتے ہوئے ہر رات لوٹ آتا ہے، یہ ہے: ''موت کب آئے گی، اور کیسے؟'' اب اسے اپنے ایک دوست

Scanned with CamScanner

کا خیال آتا ہے جس نے خود اپنی موت کی پیش گوئی کی تھی۔ وہ اس کے ساتھ دفتر کی بالکنی میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے اس پر ایک عجیب سی نظر ڈالی، بالکل اچانک، جیسے اسے دور افق پر کچھ نظر آیا ہو۔ پھر آہستگی سے کہا، ''زکی، میری موت قریب آ گئی ہے۔ میں اسے سونگھ سکتا ہوں۔''

عجیب بات یہ تھی کہ اس کا دوست چند دن بعد واقعی مر گیا، حالانکہ اسے کوئی بیماری وغیرہ نہیں تھی۔ اس واقعے پر وہ خود سے سوال کرتا (جب طبیعت گری گری اور پژمردہ ہوتی)، کیا موت کی کوئی خاص بُو ہوتی ہے جو زندگی کے خاتمے پر مرنے والے کے اردگرد امڈنے لگتی ہے، اس طرح کہ وہ اس کے قرب سے واقف ہو جاتا ہے؟ اور خاتمہ کیسا ہوگا؟ کیا موت ایک طویل نیند کی طرح ہوگی جس سے وہ کبھی بیدار نہیں ہوگا؟ یا قیامت اور جزا سزا کا وجود ہے، جیسا کہ دیندار لوگ اعتقاد رکھتے ہیں؟ کیا خدا اسے موت کے بعد عذاب دے گا؟ وہ مذہبی نہیں ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ نماز روزے کا کبھی پابند نہیں رہا۔ لیکن اس نے اپنی ساری زندگی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی، کسی کو فریب نہیں دیا، چوری نہیں کی، دوسروں کا حق نہیں مارا، اور غریب غربا کی مدد کرنے میں کبھی سستی نہیں کی۔ شراب اور عورتوں کو چھوڑ کر، اسے یقین نہیں کہ اس نے صحیح معنوں میں کوئی گناہ کیے ہوں۔

یہ یاس انگیز خیالات زکی پر بہت دنوں تک حاوی رہے، اس طرح کہ اس نے کوئی تین ہفتوں تک دفتر ہی میں بود و باش رکھی — فکروں اور کرب سے لبریز تین ہفتے، جو ایک صبح خوشگوار تعجب کے ساتھ ختم ہوئے، جس نے اس کے سارے رنج و محن کو اس طرح دور کر دیا جس طرح طویل رات ایک پُرفسوں لمحے میں زائل ہو جاتی ہے۔ زکی اس دلآویز منظر کو ہمیشہ یاد رکھے گا، ہزاروں بار، فرحت انگیز موسیقی کی سنگت پر، اسے اپنی یاد میں دہرائے گا، کہ کیسے وہ بالکنی میں بیٹھا ہوا اپنے صبح کے قہوے کی چسکیاں لے رہا تھا، تمباکو پی رہا تھا، اور سڑک کی بھیڑ بھاڑ کا نظارہ کر رہا تھا کہ ابسخرون اپنی بیساکھی پر جھولتا ہوا، چہرے پر اپنے مخصوص خوشامدانہ تاثر کے بجائے ایک پُراسرار اور خبیث مسکراہٹ کے ساتھ نمودار ہوا۔

''کیا چاہیے؟'' زکی بک نے اسے ناگواری سے مخاطب کیا جس میں تہدیدی غراہٹ بھی شامل تھی۔ لیکن کسی استثنائی اور قطعی یقینی چیز نے ابسخرون کو ایک غیر معمولی اعتماد سے بھر دیا تھا اور وہ اپنے آقا کے پاس آیا، جھکا اور سرگوشی میں کہا، ''عالیجاہ، میں اور میرا بھائی ملاک ایک چیز کے بارے

میں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"کس چیز کے بارے میں؟"

"یوں کہہ لیں، آپ کے بارے میں، عالیجاہ۔"

"تو بولو، گدھے آدمی! میں تمھاری حماقتیں سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ کیا ہے؟"

اس پر ابسخرون اس کی طرف جھکا اور بھنبھنایا، "ہم نے عالیجاہ کے لیے ایک سیکرٹری ڈھونڈ نکالی ہے۔ اچھی سی جوان لڑکی۔ میری بے ادبی معاف کریں، لیکن ان برے وقتوں میں عالیجاہ کو ایک ایسی سیکرٹری کی ضرورت ہے، جو حضور کا خیال رکھ سکے۔"

زکی ہمہ تن گوش ہو گیا اور ابسخرون پر ایک گہری استفہامی نظر ڈالی، جیسے اسے کوئی خاص رمزیہ پیغام ملا ہو، یا کسی مخفی زبان میں، جس سے وہ واقف ہو، کوئی جملہ سنا ہو۔ پھر اس نے تیزی سے جواب دیا، "کیوں نہیں؟ دیکھ سکتا ہوں؟"

آقا کو تھوڑی سی اذیت پہنچانے کی خواہش کے زیرِ اثر، ابسخرون پہلے تو خاموش رہا، پھر آہستگی سے کہا، "یعنی عالیجاہ اسے دیکھنا چاہتے ہیں؟"

بک نے تیزی سے ہاں میں سر ہلا دیا اور اپنے اشتیاق کو چھپانے کے لیے سڑک کو دیکھنے لگا۔ ابسخرون کسی شعبدہ باز کی طرح جو اپنا کرتب دکھا کر تعجب کا اظہار کرتا ہے، مڑا، بیساکھی فرش پر کھنکھناتا دور ہوا، اور کوئی دس منٹ کے لیے غائب ہو گیا۔ پھر وہ لڑکی کو ساتھ لے کر لوٹا۔

اور یہ وہ لمحہ ہے جسے زکی کبھی نہیں بھولے گا — وہ لمحہ جب اس نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ ایک بڑے بڑے سبز رنگ کے پھولوں والا سفید لباس پہنے ہوئے تھی جو اس کے جسم سے یوں چپکا ہوا تھا کہ اس کے سارے نشیب و فراز نظر آ رہے تھے، اس کے فربہ، نرم و گداز بازو جو مختصر آستینوں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ ابسخرون نے اسے ہاتھ پکڑ کر آگے کیا اور بولا، "آنسہ بثینہ السید۔ ان کے والد مرحوم بڑے نیک آدمی تھے اور یہیں چھت پر ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ خدا ان پر اپنی رحمت کرے۔ وہ میرے اور ملاک کے لیے ایک بھائی کی طرح تھے۔"

بثینہ اپنے چھوٹے چھوٹے، ہلکورے کھاتے ہوئے قدموں کے ساتھ آگے آئی۔ پھر مسکرائی، اور اس کا چہرہ کچھ اس طرح دمک اٹھا کہ اس نے زکی کا دل موہ لیا، اور بولی، "صبح بخیر، حضور۔"

Scanned with CamScanner

❁

جو لوگ طٰہ الشاذلی سے ماضی میں واقف تھے وہ اب اسے مشکل ہی سے پہچان سکیں گے۔ اس کی تو کایا ہی پلٹ گئی ہے، جیسے پرانا آدمی ایک بالکل ہی نئے آدمی میں بدل گیا ہو۔ معاملہ صرف اتنا ہی نہیں کہ اس نے اپنی سابقہ مغربی پوشاک کی جگہ اسلامی لباس اختیار کرلیا ہے، اور نہ یہ کہ اس نے ڈاڑھی چھوڑ دی ہے جس کے باعث وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ باوقار اور بارعب دکھائی دینے لگا ہے، اور نہ یہ کہ اس نے عمارت کے پیش ایوان میں لفٹ کے برابر ایک چھوٹی سی جگہ اپنے لیے مقرر کرلی ہے، جہاں وہ ایک اور باریش برادر کے ساتھ، جو انجینئرنگ کا طالب علم ہے اور پانچویں منزل پر رہتا ہے، باری باری سے اذان دیتا ہے۔ یہ سب تو ظاہری تبدیلیاں ہیں۔ لیکن جہاں تک اس کے باطن کا تعلق ہے تو گویا ایک نئی، طاقتور، اور طرار روح اس میں حلول کرگئی ہے۔ وہ اب ایک بالکل ہی نئے سبھاؤ سے عمارت میں چلنے پھرنے، بیٹھنے، اور لوگوں کے ساتھ گفتگو کرنے لگا ہے۔ عمارت کے مکینوں کے ساتھ اس کی وہ پہلے والی لجاجت، منمناہٹ اور انکساری اب ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی ہے۔ اب وہ ان کا سامنا خود اعتمادی سے کرتا ہے۔ اسے اس کی ذرہ برابر بھی پروانہیں رہی کہ وہ کیا خیال کرتے ہیں، اور وہ ان کی جانب سے ادنیٰ سی ملامت یا اہانت برداشت نہیں کرسکتا۔ اسے اب ان چھوٹی موٹی مالیت کے نوٹوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی جو وہ اسے دیا کرتے تھے اور جنھیں وہ نئی چیزیں خریدنے کے لیے پس انداز کیا کرتا تھا، اول تو اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ خدا اس کی کفالت کرے گا، اور دوسرے یہ کہ شیخ شاکر نے مذہبی کتابوں کی فروخت میں اسے شریک کرلیا ہے -- چھوٹے چھوٹے کاروباری کام جو وہ اپنے فالتو وقت میں کرتا ہے اور جن سے اسے اچھی خاصی فاضل آمدنی ہوجاتی ہے۔

اب وہ اس بات کی مشق کر رہا ہے کہ لوگوں سے صرف اللہ کی خاطر محبت یا نفرت کرے۔ اس نے شیخ سے سیکھا ہے کہ لوگ اتنے حقیر اور پست ہیں کہ ان سے ان کی دنیوی صفات کی بنیاد پر نہ محبت کی جاسکتی ہے نہ نفرت۔ اس کے برعکس، ان کی بابت ہمارے جذبات کا تعین اس سے ہونا چاہیے کہ وہ خدائی شریعت کی پاسداری کس درجہ کرتے ہیں۔ اس طرح اس کا بہت سی چیزوں کو دیکھنے کا انداز بدل گیا۔ وہ بہت سے کرایہ داروں کو پہلے اس لیے پسند کرتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے

تھے اور دینے دلانے میں فیاضی سے کام لیتے تھے۔ اب وہ ان سے اللہ کی خاطر نفرت کرنے لگا ہے، کیونکہ وہ نماز نہیں پڑھتے اور ان میں سے بعضے شراب پیتے ہیں۔ وہ 'جماعت اسلامیہ' میں اپنے بھائیوں سے اتنی محبت کرنے لگا ہے کہ ان پر اپنی جان قربان کرسکتا ہے۔ اس کے سارے پرانے دنیوی معیار کسی قدیم اور نازک عمارت کی طرح منہدم ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ لوگوں اور اشیا کو جانچنے کے سچے اسلامی معیار نے لے لی ہے۔ ایمان کی قوت نے اس کے دل میں سما کر اسے ایک بالکل ہی نیا وجود بنا دیا ہے، جو خوف اور بدی دونوں سے آزاد ہے۔ اسے اب موت کا خوف نہیں رہا اور نہ وہ کسی مخلوق سے خوفزدہ ہوتا ہے، چاہے وہ کتنی ہی قوی یا بارسوخ کیوں نہ ہو۔ اب وہ زندگی میں خدا کی نافرمانی اور اس کے غضب کے علاوہ کسی اور چیز سے نہیں ڈرتا۔

اور اس تبدیلی میں ہاتھ ہے تو رب عز وجل کے فضل کا، اور اس کے بعد شیخ شاکر کا، جو ہر ملاقات کے دوران اس کے ایمان باللہ اور اسلام کے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ طٰہٰ شیخ سے محبت کرنے لگا ہے اور اس سے چپکا رہتا ہے۔ وہ اس کے ان مقربین میں شمار ہونے لگا ہے جو کسی وقت بھی جا کر شیخ سے گھر پر مل سکتے ہیں — یہ وہ مرتبہ ہے جو شیخ صرف اپنے وفاداروں ہی کو عطا کرتا ہے۔

پرانے زمانے کی بس ایک ہی چیز ابھی تک طٰہٰ کی ذات میں باقی رہ گئی ہے — بثینہ سے اس کی محبت۔ اس نے بثینہ کے ذہن کو اپنی نئی فکر کی طرف لگانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اسے اس پابندی کا قائل کرنے کی جدوجہد کی۔ اسے الحجاب قبل الحساب نامی کتاب لا کر دی اور اسے پڑھنے کے لیے دباؤ ڈالتا رہا، مسلسل اس کا پیچھا کرتا رہا یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ مسجد انس بن مالک چلنے اور وہاں اس کے ساتھ شیخ شاکر کا خطبہ سننے پر تیار ہو گئی، لیکن طٰہٰ کو یہ دیکھ کر تعجب اور مایوسی ہوئی کہ وہ اس سے متاثر نہیں ہوئی۔ بلکہ اس نے تو صاف صاف یہ تک کہہ دیا کہ خطبہ بڑا بیزار کن تھا، جس پر دونوں میں جھڑپ ہو گئی۔ اب انھوں نے اپنی ملاقاتوں کے دوران کافی لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا ہے، جس پر اکساتی بثینہ ہی ہے۔ اس پر وہ تاؤ میں آ جاتا ہے اور ہر مرتبہ اسے چھوڑ کر چل دیتا ہے اور اس سے قطعی طور پر تعلق توڑ لینے کا عزم کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں شیخ شاکر کی اس وقت کی پرسکون اور کشادہ مسکراہٹ جھلک اٹھتی ہے جب وہ اس سے بثینہ کا ذکر کر رہا ہوتا ہے، اور اس کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں، ''میرے لڑکے، تم کبھی بھی ان کی ہدایت نہیں کرسکو گے جن سے محبت کرتے ہو،

Scanned with CamScanner

لیکن خدا جس کی چاہے گا ہدایت کرے گا۔'' شیخ کے کلمات اس کے ذہن میں گونجتے ہیں اور وہ بثینہ سے کبھی نہ ملنے کا عہد کرتا ہے، لیکن چند ہی دن بعد عہد شکنی کر ڈالتا ہے، مایوسی کے عالم میں اسے دوبارہ دیکھنے کے لیے تڑپنے لگتا ہے۔ لیکن ہر جھگڑے کے بعد جب وہ اس سے مصالحت کرنے آتا ہے، بثینہ کی سرد مہری کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔

لیکن آج خاص اس سے ملنے کی خاطر وہ جامعہ نہیں گیا اور صبح عمارت کے داخلے کے پاس انتظار کرتا رہا۔ جب وہ آئی تو یہ کہہ کر اس سے مخاطب ہوا، ''صبح بخیر، بثینہ۔ اگر مہربانی کرو تو میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں مصروف ہوں۔''

اس نے طٰہ کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے رکھائی سے جواب دیا اور چند قدم آگے بڑھ گئی۔ طٰہ ضبط نہ کر سکا اور ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ بثینہ نے تھوڑی سی کھینچا تانی کی، پھر مزاحمت چھوڑ دی اور بوکھلا کر سرگوشی کی، ''میرا ہاتھ چھوڑو! فضیحتا کرنے کی ضرورت نہیں۔'' دونوں سڑک پر لوگوں کے درمیان خاموش اور چوکنے چلتے رہے یہاں تک کہ توفیقیہ چوک میں اپنی مرغوب جگہ پر پہنچ گئے۔ ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ وہ پھٹ پڑی، ''آخر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟ ہر روز میرے لیے مشکل کھڑی کرنا کیا ضروری ہے؟''

عجیب بات ہے، خود اس کا غصہ دم بھر میں ہرن ہو گیا، جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ ایک لمحہ انتظار کرنے کے بعد اس نے ایسی آواز میں کہا جسے پُرسکون رکھنے کے لیے اسے باقاعدہ کوشش کرنی پڑی، جیسے اسے اطمینان دلانا چاہتا ہو، ''بثینہ، میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ مجھ سے غصے مت ہو!''

''میں پوچھ رہی ہوں کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں نے کچھ سنا ہے اور اس کی تصدیق کرانا چاہتا ہوں۔''

''تصدیق کر دی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ جو کچھ بھی تم نے سنا ہے، سچ ہے۔''

وہ اسے للکار رہی تھی اور گفتگو کو انتہا کی طرف دھکیل رہی تھی۔

''تم نے طلال کی دکان چھوڑ دی ہے؟''

Scanned with CamScanner

''میں نے طلال کی نوکری چھوڑ دی ہے اور اب زکی الدسوقی کے یہاں کام کر رہی ہوں۔ کیا یہ کوئی عیب ہے، یا گناہ، جنابِ شیخ؟''

اس نے کمزور آواز میں کہا، ''زکی الدسوقی بری شہرت کا مالک ہے۔''

''ہاں، اس کی بری شہرت ہے اور وہ عورت بازی کرتا ہے، لیکن مجھے مہینے کے چھ سو پاؤنڈ دیتا ہے۔ اور یہ دیکھتے ہوے کہ مجھ پر خاندان بھر کی کفالت کی ذمے داری ہے، اور حضور مجھے اسکول اور کھانے پینے کے مصارف دینے سے عاجز ہیں، حضور کو دخل اندازی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا!''

''بثینہ، اللہ سے ڈرو! تم اچھی انسان ہو۔ خدا کو ناراض کرنے سے بچو! صالح عمل کرو اور خدا رازق ہے!''

''یہ صحیح ہے کہ خدا رازق ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں پیٹ بھر روٹی نہیں مل رہی۔''

''میں تمھیں باعزت ملازمت دلوا سکتا ہوں۔''

''پیارے، ملازمت اپنے آپ کو دلواؤ! میں اپنی ملازمت سے بالکل مطمئن ہوں۔''

''تو تم یہی چاہتی ہو؟''

''ہاں، یہی چاہتی ہوں۔ کچھ اور بھی کہنا ہے؟''

اس نے یہ استہزا کے ساتھ کہا، پھر اس پر دوبارہ جھنجلاہٹ طاری ہو گئی، سو وہ اٹھی، اس کے سامنے کھڑی ہو گئی، اور رخصت ہونے کے لیے بال سنوارتے ہوے بولی، ''سنو، طٰہ۔ میں پکی بات کہہ رہی ہوں۔ ہمارے تعلق کو ختم سمجھو۔ اب ہم اپنی اپنی راہ چلیں گے۔ اور اب دوبارہ ملنے کی کوئی ضرورت نہیں، اگر برا نہ مانو تو۔''

پھر وہ ابہام سے مسکرائی اور آگے بڑھتے ہوے بولی، ''تم نے تو اپنی ڈاڑھی بھی بڑھا لی ہے اور دین کے پابند ہو گئے ہو، اور میں چھوٹے اور عریاں اسکرٹس پہنتی ہوں۔ میرا تمھارا کیا میل!''

❁

شیخ شاکر کا مکان تنگ اور حقیر سا ہے۔ دارالسلام کی ایک تنگ سی گلی میں لال اینٹوں کا دو منزلہ گھر۔ دو سونے کے کمروں اور بیٹھک میں شیخ شاکر، اس کی دو بیویوں، اور ان کے سات عدد بیٹے بیٹیوں کی رہائش ہے جو اپنی پڑھائی کے مختلف درجوں میں ہیں۔ شیخ اور اس کے ملاقاتی طلبا نے ایک علامت

Scanned with CamScanner

چن لی ہے — وقفے وقفے سے تین بار دستک — جس سے وہ آنے والوں کو پہچان جاتا ہے۔
اور یہی دستک طٰہٰ الشاذلی نے بھی استعمال کی۔ اندر سے شیخ کی آواز آئی، ''حاضر ہوا!'' پھر اسے ایک اور آواز سنائی دی جس سے اندازہ ہوا کہ عورتیں دوسرے کمرے میں چلی گئی ہیں، اور شیخ کے آہستہ، بھاری قدموں اور گلا صاف کرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد شیخ نے بسم اللہ کہتے ہوئے دروازہ کھولا۔

''طٰہٰ، اہلاً یا ولدی!''

''افسوس کہ آپ کو تکلیف دے رہا ہوں، لیکن آپ سے تھوڑی سی بات کرنی ہے۔''

''آؤ آؤ، اندر آ جاؤ۔ آج جامعہ نہیں گئے؟''

طٰہٰ کھڑکی کے پاس والے صوفے پر بیٹھ گیا اور بشینہ کے ساتھ اپنا ماجرا سنا دیا۔ اس نے شیخ کو سب کچھ بتایا اور اپنے جذبات کا ذکر کیا۔ شیخ اپنی تسبیح کے دانوں کو انگلیوں سے پھراتے ہوئے توجہ سے سنتا رہا۔ بات کا سلسلہ شیخ کے اٹھ کر چائے کی سینی لانے سے کچھ دیر کے لیے منقطع ہو گیا، جس کے بعد وہ پھر توجہ سے سننے لگا یہاں تک کہ طٰہٰ نے اپنی بات ختم کی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا، ''میرے لڑکے، دین حنیف محبت کے خلاف نہیں، اگر یہ شریعت کے مطابق ہو اور معصیت کی طرف نہ لے جاتی ہو، بلکہ یہ تو خدا کی شریف ترین تخلیق ہے، نبی مصطفیٰ خود بی بی عائشہ سے محبت کرتے تھے اور اس کا صحیح روایتوں میں ذکر بھی آیا ہے جن کے مستند ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ ساری مشکل اس عورت کے انتخاب میں ہے جو آدمی کے جذبات کی مستحق ہو۔ اس عورت کی صفات کیا ہونی چاہییں؟ رسول اللہ نے کہا ہے: 'کسی عورت سے اس کے حسن، دولت اور دین کی خاطر نکاح کیا جا سکتا ہے۔ سو دین والی کا انتخاب کرو، اور، خدا نے چاہا تو، دولت پیچھے پیچھے خود چلی آئے گی۔' (صدق رسول اللہ) ۔ اگر تمھیں مناسب دینی تربیت ملی ہوتی تو تم اس آزار میں پڑنے سے باز رہتے جس کی تکلیف تم اب سہہ رہے ہو۔ تمھیں اور تمھاری نسل کے تمام بچوں کو اسلامی تربیت میسر نہیں آئی ہے، کیونکہ تمھاری نشو و نما ایک بے دین حکومت کے دور میں ہوئی اور تمھیں سیکولر تعلیم دی گئی۔ سو تم لوگ ایسے طریقۂ فکر کے عادی ہو گئے ہو جس سے دین منہا کر دیا گیا ہے۔ اب تم لوگ اسلام کی طرف لوٹ تو آئے ہو لیکن اپنے دماغ سے سیکولرازم کے دلدّر کو دور کرنے اور اسلام کے لیے پاک کرنے میں

Scanned with CamScanner

تمھیں وقت لگے گا۔ جیسا کہ میں نے بار بار کہا ہے، خدا کے واسطے محبت اور نفرت کرنا سیکھو، ورنہ تمھارا اسلام کبھی بھی کامل نہیں ہوگا۔ یہ تکلیف جو تمھیں پہنچ رہی ہے، یہ خدا سے تمھاری دوری کا طبعی اور ناگزیر نتیجہ ہے، چاہے یہ دوری تمھاری زندگی کے صرف ایک ہی پہلو میں کیوں نہ ہو۔ اگر تم نے اپنی اس رفیقہ سے تعلق کے شروع ہی میں خود سے پوچھا ہوتا کہ وہ کتنی پابندِ شعائر ہے، اگر تم نے اس کے اسلام سے تمسک کو اپنے تعلق کی شرط بنایا ہوتا، تو آج تمھاری یہ حالت نہ ہوتی۔''

شیخ نے دو گلاسوں میں چائے انڈیلی اور ایک طٰہ کو پیش کیا۔ پھر اس نے چائے دانی ٹین کی سینی پر رکھ دی، جس کا رنگ اپنی کہنگی کے باعث اڑ چکا تھا، اور چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا، ''خدا جانتا ہے کہ میں تمھیں کتنا عزیز رکھتا ہوں، میرے لڑکے، اور مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ تم اپنے شیخ کے پاس غمزدہ حالت میں آؤ اور وہ تمھیں تسلی دینے کے بجائے وعظ کرے۔ لیکن، خدا گواہ ہے، میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے: اس نوجوان عورت کو بھول جاؤ، طٰہ، کیونکہ وہ گمراہ ہو چکی ہے۔ تم ایک پابندِ شریعت نوجوان ہو، ایک مومن، اور تمھارے لیے وہی لڑکی بہتر رہے گی جو تمھاری ہی طرح مسلمان ہو۔ اسے بھلا دینے کے لیے خود پر جبر کرو اور نماز اور تلاوتِ قرآن سے مدد لو۔ شروع میں مشکل ضرور لگے گا لیکن بعد میں یہ تمھارے لیے، انشاء اللہ، آسان ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی ہے، طٰہ، کیا تم اپنے مذہب کو بھول گئے ہو؟ جہاد کا کیا ہوا، طٰہ؟ اسلام اور مسلمانوں کی جو ذمے داری تم پر ہے اس کا کیا بنا؟ کل ایک غلیظ جنگ شروع ہو چکی ہے اور ہمارے حکمرانوں نے خود کو کفار کی قیادت میں جدال پر تیار کر لیا ہے۔ مصر کے سارے جوانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کافر حکومت کے خلاف کھڑے ہو جائیں۔ طٰہ، کیا تم مسلمانوں کی مدد کرنے سے پیچھے ہٹ جاؤ گے جو ہزاروں کی تعداد میں ہر روز مارے جا رہے ہیں؟ اور ایک گمراہ عورت کے پیچھے پڑے رہو گے جس نے تمھیں فسق و فجور کی خاطر چھوڑ دیا ہے؟ قیامت کے دن ربِ عزوجل تم سے بثینہ کے بارے میں نہیں پوچھے گا، لیکن وہ تم سے یہ حساب ضرور لے گا کہ اسلام کی کامیابی کے لیے تم نے کیا کیا ہے۔ اُس حشرِ عظیم کے دن تم اسے کیا جواب دو گے؟''

طٰہ نے سر جھکا لیا۔ وہ متاثر نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے دکھ اور خجالت سے کہا، ''میں نے کتنی ہی بار خود سے اسے بھلا دینے کا عہد کیا ہے، لیکن بدقسمتی سے وہ مجھے پھر یاد آنے لگتی ہے۔''

''شیطان اتنی آسانی سے تمھاری روح کو چھوڑنے والا نہیں، اور تم تقوے تک ایک ہی جست

Scanned with CamScanner

میں نہیں پہنچ جاؤ گے۔ جہادِ نفس، طٰہ، جہادِ اکبر ہے، جیسا کہ رسول اللہ کا فرمان ہے۔"

"میں کیا کروں، مولانا؟"

"نماز اور قرآن پڑھا کرو۔ اور ہمیشہ ان کی روشنی میں عمل کیا کرو، میرے بیٹے، یہاں تک کہ اللہ تمھیں راحت بخش دے، اور مجھ سے وعدہ کرو، طٰہ، کہ تم اس لڑکی سے اب دوبارہ نہیں ملو گے، چاہے حالات کچھ بھی ہوں۔"

طٰہ نے شیخ کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہا۔

"یہ ہمارے درمیان عہد ہے، طٰہ، اور مجھے یقین ہے کہ تم اس پر قائم رہو گے، انشاء اللہ۔"

پھر شیخ اٹھا، پرانی ڈیسک کی دراز کھولی، اس میں سے غیر ملکی اخباروں سے کاٹی ہوئی چند تصویریں نکالیں اور انھیں طٰہ کی گود میں ڈال دیا، اور کہا، "انھیں دیکھو۔ اچھی طرح معائنہ کرو۔ یہ تمھارے مسلمان عراقی بھائی ہیں، اتحادیوں کے بموں نے جن کے جسموں کے پرخچے اڑا دیے ہیں۔ دیکھو ان کے جسم کس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں، اور ان میں عورتیں بھی شامل ہیں اور بچے بھی۔ یہ وہ سلوک ہے جو مسلمانوں اور ان کے بچوں سے کیا جاتا ہے، اور ہمارے غدار حکمران کفار کے ساتھ ان کے جرائم میں شرکت کرتے ہیں۔"

پھر شیخ نے ایک تصویر چنی اور اسے طٰہ کے آنکھوں کے سامنے لا کر کہا، "اس عراقی بچے کا چہرہ دیکھو، امریکی بم نے کس طرح اس کے ٹکڑے اڑا دیے ہیں۔ کیا اپنی بہن اور ماں کے مقابلے میں اس بچے کی ذمے داری تم پر نہیں آتی؟ اس کی مدد کے لیے تم کیا کر رہے ہو؟ کیا اب بھی اپنی گمراہ دوست کے لیے تمھارے دل میں کوئی جگہ باقی ہے؟"

مسخ شدہ بچے کی صورت غایت درجہ ہولناک تھی اور طٰہ نے بڑی تلخی سے کہا، "مسلمانوں کے بچوں کو اس بیدردی سے ذبح کیا جا رہا ہے، اور مصری ٹیلی وژن الازہر کے بڑے بڑے علما سے بجا رہا ہے جو کہتے ہیں کہ مصری حکومت کا موقف شرعی اعتبار سے بالکل درست ہے، اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام عراق پر ضرب لگانے کے لیے امریکہ سے اتحاد کرنے کے حق میں ہے۔"

شیخ پہلی بار جذبات کے بہاؤ میں آ گیا اور اس کی آواز اونچی ہو گئی۔ "یہ علما منافق اور فاسق ہیں۔ یہ سلطان کے پالتو فقہا ہیں اور خدا کی نظروں میں ان کا گناہ بہت بڑا ہے۔ اسباب چاہے کچھ

بھی ہوں، اسلام ہمیں مطلقاً اس کی ممانعت کرتا ہے کہ مسلمانوں کو قتل کرنے میں کفار کا ساتھ دیا جائے۔ فقہ کے کسی پہلے سال کے طالب علم کو بھی اس معاملے سے متعلق شرعی اسناد کا علم ہے۔"

طٰہٰ نے تائید میں سر ہلا دیا، شیخ نے اچانک کہا، جیسے اسے ابھی ابھی خیال آیا ہو، "سنو، انشاءاللہ کل ہمارے بھائی جامعہ میں ایک احتجاجی مظاہرہ کرنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ تم شرکت کرنے سے پیچھے نہیں ہٹو گے۔"

وہ لمحہ بھر خاموش رہا، پھر کہا، "میں خود تو مظاہرے کی قیادت نہیں کر سکوں گا، لیکن تمھارا بھائی طاہر کل تم لوگوں کا قائد ہوگا، انشاءاللہ۔ آڈیٹوریم کے سامنے اجتماع ہوگا، بعد نمازِ ظہر۔"

طٰہٰ نے سر ہلا دیا اور رخصت چاہی، لیکن شیخ نے اسے انتظار کرنے کے لیے کہا اور تھوڑی دیر کے لیے اندر غائب ہو گیا۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے لوٹا اور اسے ایک کتابچہ دیتے ہوئے بولا، "یہ میثاقِ عملِ اسلامی ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم اسے پڑھ ڈالو، بعد میں ہم اس کی بابت بات کریں گے۔ طٰہٰ، یہ کتاب انشاءاللہ تمھیں وہ سارے خیالات بھلا دینے میں مدد پہنچائے گی جو تمھیں پریشان کرتے رہتے ہیں۔"

❉

جمعے کی صبح جانور ذبح ہوئے، تین بڑے بڑے بیل جنھوں نے رات عمارتِ یعقوبیان کے پیش ایوان میں لفٹ کے برابر گزاری تھی۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی پانچ قصائی ان پر ٹوٹ پڑے، انھیں باندھا اور ذبح کر ڈالا۔ پھر گھنٹوں تک انھیں ادھیڑتے، ٹکڑے کرتے، اور تقسیم کے لیے گوشت کے تھیلوں میں بھرتے رہے۔ ظہر کی نماز ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ شارع سلیمان باشا پر لوگوں کے لشکر نکل آئے جو عزام اسٹور کی طرف رواں تھے۔ یہ بے حد غریب لوگ تھے: فقیر، پولیس کے عام سپاہی، پیروں سے ننگے لڑکے، اور سیاہ پوش عورتیں جو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اٹھائے ہوئے تھیں یا اپنے پیچھے گھسیٹے لا رہی تھیں۔ سب قربانی کا گوشت لینے آ رہے تھے جو حاج عزام انتخابات میں اپنی کامیابی پر تقسیم کر رہا تھا۔ دکان کے صدر دروازے پر حاج عزام کا سب سے بڑا لڑکا فوزی، چمچماتا ہوا سفید جلباب پہنے، کھڑا تھا۔ وہ گوشت کے تھیلے اٹھاتا اور لوگوں کی طرف اچھال دیتا، جو گوشت تک پہنچنے کی جستجو میں ایک دوسرے کے ساتھ دھکم پیل کر رہے تھے، حتیٰ کہ ہاتھاپائی ہونے لگی اور لوگوں کو

چوٹیں لگیں، اور دکان کے کارندے حلقہ بنانے اور جوتے مار مار کر لوگوں کو پیچھے دھکیلنے پر مجبور ہو گئے کہ کہیں شیشے کی نمائشی کھڑکیاں ان کے ریلے سے ٹوٹ نہ جائیں۔ اندر حاج عزام سامنے کی طرف رخ کیے بیٹھا تھا، سفید قمیص اور سرخ مسلی ہوئی ٹائی پر پُرتکلف نیلے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے، چہرہ مسرت سے کِھلا ہوا۔

انتخابات کے نتیجے کا اعلان سرکاری طور پر جمعرات کی شام کو ہوا تھا، اور حاج عزام قصر النیل کے علاقے سے پارلیمنٹ کی مزدوروں کے لیے مخصوص نشست جیت گیا تھا۔ اس نے اپنے حریف ابوحمیدہ پر بڑی زبردست کامیابی حاصل کی تھی، جسے بس معدودے چند ووٹ ہی ملے تھے (الفولی نے تہیہ کیا تھا کہ اس کی شکست اتنی فاش اور گونج دار ہو گی کہ آئندہ کبھی کوئی اس کی ہدایات کی نافرمانی کرنے کی جرأت نہ کر سکے گا)۔ حاج عزام نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے سچا اور گہرا تشکر محسوس کیا، جس نے اپنے فضل اور مدد سے اسے بڑی واضح کامیابی عطا کی تھی۔ اس نے خبر سنتے ہی شکرانے کی بیس رکعتیں ادا کیں اور بیلوں کے ذبیحے کی بابت ہدایات دیں۔ اس نے خفیہ طور پر قریباً بیس ہزار پاؤنڈ نادار خاندانوں میں تقسیم کیے اور بہ نفسِ نفیس ان کی حاجات کا بندوبست کیا اور مزید بیس ہزار پاؤنڈ شیخ السمّان کو دیے کہ وہ اپنی نگرانی میں خیر کے کاموں میں خرچ کرے، اور ان بیس اشرفیوں کا تو ذکر ہی کیا جو اس موقعے پر اس نے شیخ السمّان کو ہدیتاً پیش کیں۔

لیکن سُعاد کا خیال آتے ہی ایک بالکل مختلف احساس حاج عزام کے دل سے کھیلنے لگا: وہ سُعاد کے ساتھ اپنی اس عظیم کامیابی کا جشن اس رات کیسے منائے گا؟ اس نے اپنی چشمِ خیال میں اس کے گداز، گرم جسم کی تفصیلوں کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ وہ واقعی اسے چاہتا ہے۔ اس نے اپنے سے کہا کہ رسول اللہ نے جب عورتوں کے بارے میں کہا تھا کہ یہ اچھی قسمت لاتی ہیں، تو برحق کہا تھا۔ واقعی بعض عورتیں ایسی مبارک ہوتی ہیں کہ آدمی کو ان میں سے بس کسی ایک کو شریکِ حیات بنانے کی دیر ہوتی ہے اور وہ اچھی قسمت سے مالا مال ہو جاتا ہے، اور سُعاد انھیں میں سے ایک اس کے لیے ظفرمندی اور برکتیں لائی تھی، اور یہ دیکھو، وہ کامیاب ہو گیا اور عنقریب اسمبلی میں داخل ہونے والا ہے۔ حق ہے کہ مشیتِ ایزدی سے زیادہ حیرت انگیز کوئی اور چیز نہیں! آج وہ قصر النیل کے باشندوں کے واسطے ان کے حلقۂ انتخاب سے اسمبلی کا رکن ہے، اور کبھی وہ وقت تھا کہ یہی لوگ اس سے اپنے جوتے

چمکواتے تھے، اسے پیچ سمجھتے تھے، اور پیسے دھیلے دے کر اس پر احسان دھرتے تھے۔ اب وہ 'حضرت نائب محترم' تھا، جسے قانونی ماموئیت حاصل تھی، جس کی رو سے کوئی بھی اسمبلی کی اجازت کے بغیر اس کے خلاف قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اب اس کی تصویر اخباروں اور ٹیلی وژن پر آیا کرے گی اور وہ ہر روز وزیروں سے ان کے ہمسر کی طرح ملا کرے گا اور ان سے مصافحہ کیا کرے گا۔ وہ محض ایک مالدار بیوپاری ہی نہیں، ایک سیاست کار بھی ہے اور سب کو اس سے اسی اعتبار سے معاملہ کرنا پڑے گا۔ وہ ابھی سے وہ بڑا کام شروع کر دے گا جو اسے زعما کی سطح پر پہنچا دے گا، اور اگلا قدم چوٹی پر۔ عنقریب اس کا شمار ملک کے پانچ سات بڑے سے بڑے اہم آدمیوں میں ہونے لگے گا، بشرطے کہ وہ سودے کامیاب ہو جائیں جن کے منصوبے وہ کروڑپتی سے ارب پتی بننے کے لیے باندھ رہا تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مصر کا متمول ترین آدمی بن جائے اور وزارت حاصل کر لے، ہاں بالکل، وزارت! کیوں نہیں؟ جب خدا کی مرضی شاملِ حال ہو تو کچھ بھی ناممکن نہیں؛ کیا اس نے اسمبلی کا رکن بننے کا خواب نہیں دیکھا تھا؟ پیسہ ہو تو مشکلات زائل ہو جاتی ہیں، اور دور افتادہ مقصد قریب آ جاتا ہے۔ ایک دن اسے وزارت مل سکتی ہے، جس طرح آج رکنیت مل گئی ہے۔

وہ اپنے خیالات میں اسی طرح غرق رہا یہاں تک کہ عصر کی اذان بلند ہوئی اور اس نے حسب معمول دکان میں کام کرنے والوں کی نماز میں امامت کی، اگرچہ دورانِ نماز اس کا ذہن ایک سے زائد بار سُعاد کے جسم کی طرف بھٹکنے لگا (جس پر اس نے خدا سے توبہ کی)۔ نماز ختم اور تسبیح پڑھتے ہی وہ بہ عجلت وہاں سے چل دیا، عمارتِ یعقوبیان میں داخل ہوا، اور لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل پر پہنچا۔ چابی گھماتے ہوئے اور بعد میں سُعاد کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے بھڑکتے ہوئے شوق کی شدید لذت محسوس ہوئی۔ وہ بالکل ویسی ہی نظر آ رہی تھی جیسا اس نے تصور کیا تھا، سرخ عبا میں، جو اس کی ہوشربا رعنائیوں کی جھلک دکھا رہی تھی، اس کی منتظر، اور وہ عطر بیز مہک جو اس کے مشام سے ٹکرائی اور اس کے حواس کو گدگدانے لگی! وہ بڑی تمکنت سے اس کی طرف بڑھی اور حاج عزام اس کے قدموں کی آہٹ اور فرش پر اس کی عبا کی سرسراہٹ کی آواز سن کر خواہش سے بالکل مغلوب ہو گیا۔ پھر سُعاد نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا اور اپنے ہونٹوں سے اس کے کان کو چھوتے ہوئے سرگوشی میں کہا، ''مبارک ہو، میرے پیارے! ہزار بار مبارک!''

Scanned with CamScanner

❁

سُعاد جابر بڑے استثنائی لمحوں میں اپنی حقیقت میں اس طرح ظاہر ہوتی ہے۔ایک نگاہ چنگاری کی طرح اس کی آنکھوں میں کوند جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ اپنی اصلی حالت پر پلٹ آتا ہے، ٹھیک جس طرح ایک اداکار کردار ادا کر کے اپنا حقیقی روپ اختیار کر لیتا ہے، اپنے کھیل کے کپڑے جدا کر دیتا ہے اور چہرے سے میک اپ اتارنے لگتا ہے۔ایسے موقعوں پر ایک گمبھیر، ایک مخصوص درجے کی سختی اور عزم کا حامل، آہستہ آہستہ بیدار ہوتا ہوا تاثر اس کے چہرے پر نمودار ہوتا ہے اور اس کی اصلی فطرت کو منکشف کرتا ہے۔ایسا کسی وقت بھی ہو سکتا ہے — جب وہ حاج کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی ہو، یا رات کو باتیں کر رہی ہو، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب بستر میں اس کے ساتھ لیٹی ہو، اس کی کمزور مردمی کو انگیخت کرنے کے لیے اس کی آغوش میں تڑپ رہی ہو — کہ وہ چنگاری اس کی آنکھوں میں کوند جاتی ہے اور یہ تصدیق کرتی ہے کہ اس کا ذہن کبھی سوچنے سے باز نہیں رہتا، حتیٰ کہ شہوت کے ہیجان میں بھی۔

کبھی کبھی تو جھوٹے کردار اپنانے کی اس تازہ یافتہ صلاحیت پر وہ خود اپنے پر بھونچکی رہ جاتی ہے۔وہ پہلے کبھی دروغ گو نہیں رہی تھی۔جو ذہن میں آتا وہی کہہ دینے کی ساری زندگی عادی رہی تھی — تو پھر یہ سب روپ دھارن کہاں سے چلا آیا تھا؟ وہ محبت کرنے والی، مشتاق، مشفق، اور رقابت میں مبتلا بیوی کا کردار بڑی مہارت سے انجام دیتی ہے، اس پیشہ ور اداکار کی طرح جس نے اپنے جذبات پر پوری طرح قابو رکھنا سیکھ لیا ہو: وہ جب چاہے آنسو بہاتی ہے، ہنستی ہے، طیش میں آ جاتی ہے۔اِس وقت، بستر میں حاج عزام کے ساتھ، وہ ایک تمثیلی منظر میں اداکاری کر رہی ہے — اُس عورت کی جو اپنے مرد کی قوتِ مردمی سے دہشت میں آ کر اسے اپنے جسم کے ساتھ وہ سب کرنے دیتی ہے جو اس کے غیر معمولی دم خم کا تقاضا ہے، آنکھیں بند ہیں، ہانپے اور لرزے جا رہی ہے، آہیں بھر رہی ہے — جبکہ حقیقت میں اسے کچھ بھی تو محسوس نہیں ہو رہا، سوائے رگڑ کے، دو ننگے جسموں کی سرد اور بیزار کن رگڑ۔وہ اپنے تکیے، گھات لگائے بیٹھے شعور کے ساتھ حاج کے نڈھال جسم کا سوچتی ہے جس کا وفور لمحہ بھر میں ہی ختم ہو گیا اور جس کا ضعف شادی کے پہلے ایک ماہ ہی میں ظاہر ہو گیا تھا، اور وہ اس کے بوڑھے، جھرّیوں زدہ جسم کی سفیدی، اس کے سینے کے بچے کھچے دو چار بالوں اور اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ

چوچیوں سے اپنی نظریں ہٹا لیتی ہے۔ وہ جب بھی اس کے جسم کو چھوتی ہے تو اسے متلی سی ہونے لگتی ہے، جیسے وہ اپنا ہاتھ کسی چھپکلی یا کسی کراہت انگیز لجلجے مینڈک پر ڈال رہی ہو، اور ہر بار اسے اپنے پہلے شوہر مسعود کا گٹھا ہوا مضبوط بدن یاد آ جاتا ہے، جس کے طفیل وہ پہلی بار جسمانی محبت سے واقف ہوئی تھی۔

وہ بڑے پیارے دن تھے۔ وہ یہ سوچ کر مسکرا دیتی ہے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی تھی اور اسے دیکھنے کی کتنی مشتاق رہتی تھی۔ اس کا بدن اس کے لمس سے، اپنی گردن اور چھاتیوں پر اس کی گرم گرم سانسوں کو محسوس کر کے جلنے لگتا۔ وہ اس کے ساتھ بڑی گرم مباشرت کرتی اور لذت کی لائی ہوئی مدہوشی میں پگھل جاتی، اور جب ہوش میں آتی تو لجانے لگتی۔ اس سے اپنا رخ پھیر لیتی اور کچھ دیر تک اسے دیکھنے سے کتراتی، جبکہ وہ ٹھٹھے مار کر ہنستے ہوئے اپنی مضبوط اور گہری آواز میں کہتا، ''ارے رے رے! لڑکی، تجھے کیا ہوا؟ اتنی شرم کی وجہ؟ کیا ہم نے کوئی برائی کی ہے؟ یہ تو شریعت اللہ ہے، بے وقوف لڑکی!''

وہ کتنا حسین زمانہ تھا اور اب کتنا دور معلوم ہوتا ہے! اس نے اپنے شوہر سے محبت کی تھی اور دنیا سے اگر کچھ چاہتی تھی تو بس اتنا کہ دونوں ساتھ ساتھ رہیں اور ایک لڑکے کو پال پوس لیں۔ خدا گواہ ہے، اسے مال دولت نہیں چاہیے تھی اور نہ اس کے کچھ مطالبات تھے۔ وہ جنوبی العصافرہ میں ریلوے اسٹیشن کے پاس اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں گھر گرہستی کرنے اور تامر کے لیے کھانا تیار کرنے میں خوش تھی۔ پھر وہ شاور سے نہاتی، بناؤ سنگھار کرتی، اور دن کے ختم پر مسعود کی واپسی کی راہ دیکھتی۔ اسے اپنا گھر اتنا ہی کشادہ، صاف ستھرا اور روشن معلوم ہوتا جتنا کہ کوئی محل، اور جب مسعود نے بتایا کہ اسے عراق میں کام کرنے کا معاہدہ مل رہا ہے تو سُعاد نے اسے مسترد کر دیا تھا، بھڑک اٹھی تھی، اس سے لڑ پڑی تھی، اور اسے کئی دنوں تک اپنے بستر سے باہر کر دیا تھا تاکہ اسے سفر پر جانے سے باز رکھ سکے۔ وہ اس کے روبرو چلائی، ''تم ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر پردیس چلے جاؤ گے؟''

''ایک یا دو سال، اور وہاں سے بہت سارے پیسے کما کر لوٹوں گا۔''

''سب یہی کہتے ہیں اور کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔''

''تو تمھیں غربت پسند ہے؟ ایک دن سے زیادہ کی روٹی کا ہمارے پاس انتظام نہیں۔ کیا ساری زندگی قرض پر گزر اوقات کرنی ہوگی؟''

Scanned with CamScanner

"رفتہ رفتہ ننھا بڑا ہو جائے گا۔"

"اس ملک میں الٹی گنگا بہتی ہے! یہاں بڑھے جیے جاتے ہیں اور جوان چل دیتے ہیں۔ پیسے سے پیسہ بنتا ہے اور غربت غربت کو جنم دیتی ہے۔"

وہ ایسے شخص کے سکون کے ساتھ بولا جس نے قطعی فیصلہ کرلیا ہو۔ آج وہ اس کی بات مان لینے پر کس قدر پچھتاتی ہے! کاش اس نے آخر تک مزاحمت کی ہوتی، غصے میں آکر گھر سے نکل جاتی تو وہ ہتھیار ڈال دیتا اور ملک سے باہر جانے کا خیال ترک کر دیتا — وہ اس سے پیار کرتا تھا اور اس سے دور رہنا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے اتنی آسانی سے اس کی بات تسلیم کرلی تھی اور اسے جانے دیا تھا۔ ہر چیز پہلے ہی سے تقدیر میں لکھی ہوتی ہے، طے شدہ ہوتی ہے۔ مسعود چلا گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جنگ میں مر گیا ہے اور انھوں نے لاوارث سمجھ کر اسے وہیں دفن کر دیا ہوگا۔ ایسا ان بہت سے خاندانوں کے ساتھ ہوا تھا جن سے اسکندریہ میں اس کی جان پہچان تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ مسعود انھیں چھوڑ دے، اپنے بیٹے کو چھوڑ دے۔ یہ نہیں ہو سکتا! ممکن یہی ہے کہ وہ مر گیا تھا، خدا کے پاس چلا گیا تھا، اور اسے قسمت کے کڑے کوس تن تنہا برداشت کرنے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔

محبت اور گرم و گداز جذبات اور شرماہٹ اور خوبصورتی کے دن لد گئے تھے۔ بچے کی پرورش کے لیے اس نے صعوبتیں برداشت کی تھیں اور بھوکی بھی رہی تھی، اور اگرچہ مردوں کے چہرے، جسم، اور لباس مختلف ہوتے ہیں، ان کی نگاہیں ہمیشہ ایک جیسی ہی ہوتی ہیں — بے حرمتی کرتی ہوئی، اسے عریاں کرتی ہوئی، اور اس کی ہاں کے بدلے سب کچھ دینے کا بہلاوا دیتی ہوئی۔ اس نے بڑی تندی اور مشکل کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا تھا، لیکن ڈرتی تھی کہ ایک دن کہیں تھک کر سپر انداز نہ ہونا پڑ جائے۔ 'بانو' کے یہاں اس کا کام بڑا مشقت طلب تھا۔ اجرت بھی کم ملتی تھی، بچے کے اخراجات بڑھتے جا رہے تھے، اور بوجھ پہاڑ کی طرح بھاری تھا۔ سارے رشتے دار — حتیٰ کہ اس کا بھائی حمید و بھی — غریب لوگ تھے، جن کے پاس اسی کی طرح ایک دن سے زیادہ کے دال دلیے کا بندوبست نہیں تھا، یا پھر گھناؤنے لوگ جو میٹھی میٹھی باتوں سے تو اس کی مدد کرتے لیکن اسے قرض نہ دینے کے لیے ہزار بہانے نکال لیتے۔

اس نے اتنی سخت صعوبتوں کے سال گزارے کہ اس کا خدا پر سے یقین جاتا رہا۔ وہ کئی بار

Scanned with CamScanner

کمزور پڑی اور فرط یاس اور ضرورت کے باعث گناہ میں جا پڑنے کے قریب پہنچ گئی۔ جب حاج عزام نے خدا اور رسول کی سنت کے مطابق اس سے شادی کرنی چاہی تو اس نے ہر بات کا ٹھونک بجا کر حساب کر لیا۔ وہ اپنے بیٹے کے اخراجات کے عوض حاج کو اپنا جسم بخش دے گی۔ حاج نے جو مہر دیا تھا اسے اس نے چھوا تک نہیں اور تامر کے نام سے بینک میں جمع کرا دیا تاکہ دس سال میں تین گنا ہو جائے۔ یہاں جذبات کی کارفرمائی نہیں تھی، بلکہ ہر چیز کا حساب کتاب کر لیا گیا تھا، ایک چیز کے بدلے دوسری چیز، اتفاق اور باہمی رضامندی سے۔ وہ ہر روز اس پیر فرتوت کے ساتھ دو گھنٹے سوئے گی، اپنے بیٹے کو اسکندریہ میں رکھے گی، اور اپنا محنتانہ وصول کرے گی۔

یہ صحیح ہے کہ اس کا دل تامر کے لیے تڑپتا ہے اور اکثر رات کو وہ اپنے پہلو میں اس کی خالی جگہ ٹٹولتی ہے اور جلتے ہوئے آنسو روتی ہے۔ اُس صبح جب ایک پرائمری اسکول کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے بچوں کو اپنے اسکول کی یونیفارم میں دیکھا تو اسے تامر کا خیال آ گیا۔ وہ رونے لگی اور کئی دن تک غم اور اشتیاق کے ہاتھوں بدحال رہی۔ وہ دیکھتی کہ اس کے ننھے سے گرم گرم وجود کو بستر سے اٹھا کر لے جا رہی ہے، غسلخانے میں اس کا منھ دھلا رہی ہے، اسے اسکول کے کپڑے پہنا رہی ہے، اس کا ناشتہ تیار کر رہی ہے اور اسے کن کن حیلوں سے دودھ ختم کروا رہی ہے۔ پھر وہ ساتھ گھر سے نکلتے اور ٹرام میں بیٹھ کر اسکول پہنچتے۔

خدا جانے اس وقت وہ کہاں ہوگا؟ وہ اس کے بارے میں کیسے کیسے وسوسے محسوس کرتی ہے! وہ اکیلا اور دور ہے اور وہ خود اس وسیع وعریض، بے مہر اور کراہت انگیز شہر میں پڑی ہے جہاں اس کا کوئی واقف نہیں، ایک ہوحق اپارٹمنٹ میں تنہا زندگی گزار رہی ہے جہاں کوئی چیز بھی تو اس کی اپنی نہیں، لوگوں سے خود کو یوں چھپائے ہوئے ہے گویا کوئی چور یا زانیہ ہو۔ اس کا واحد کام اس بڈھے کھوسٹ کے ساتھ ہمبستری کرنا ہے جو ہر روز اس پر سوار ہو جاتا ہے اور اپنی نڈھال، ڈھیلی ڈھالی مردمی اور اپنے جسم کے سپاٹ، نفرت انگیز لمس سے اس کا سانس لینا دوبھر کر دیتا ہے۔ اسے پسند نہیں کہ وہ تامر سے ملے اور وہ جب بھی اس کا ذکر کرتی ہے، اس کا چہرہ مکدر ہو جاتا ہے اور اسے حسد محسوس ہونے لگتا ہے، جبکہ وہ ہر لحہ اپنے بچے کی مشتاق ہے، چاہتی ہے کہ اسے ابھی ابھی دیکھے، زور سے اپنے سینے سے لگا لے، اس کی بو باس سونگھے اور اس کے چمکدار کالے بالوں پر ہاتھ پھیرے۔ کاش وہ اسے اپنے ساتھ

Scanned with CamScanner

رہنے قاہرہ لا سکتی! لیکن حاج عزام کبھی بھی اس پر راضی نہ ہوگا، اس نے تو شروع ہی میں یہ شرط رکھی تھی کہ وہ بچے کو پیچھے چھوڑ کر ہی آئے۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا، ''میں تم سے تمھاری اولاد کے بغیر شادی کر رہا ہوں۔ متفق ہو؟'' اسے حاج کا اس وقت کا سرد مہر، بے رحم چہرہ یاد آ جاتا ہے اور وہ اپنے قلب کی گہرائیوں میں اس سے نفرت کرنے لگتی ہے، لیکن ایک بار پھر اس پر قناعت کرتی ہے کہ وہ یہ سب جو کر رہی ہے، صرف تامر کی بھلائی اور مستقبل کی خاطر ہے۔ تامر کو اس سے کیا فائدہ پہنچے گا کہ ماں کی گود میں رہے اور ماں بیٹا نان نفقے کے لیے رشتے داروں اور اجنبیوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔

اس پر واجب ہے کہ عزام کا شکریہ بجالائے اور اس کی ممنون ہو، نہ کہ اس سے نفرت کرے۔ کم از کم اس نے جائز طریقے پر اس سے شادی کی ہے اور اس کے اخراجات کا کفیل ہوا ہے۔ یہ عملی اور براہ راست خیال حاج سے اس کے تعلق میں کار فرما ہے۔ شرعی اعتبار سے اسے اس کے جسم پر اختیار حاصل ہے۔ اسے حق پہنچتا ہے کہ جب بھی اور جس طرح بھی چاہے، اس کے پاس آئے، اور اس پر فرض ہے کہ وہ ہمیشہ اس کے لیے تیار رہے، ہر روز بن ٹھن کر اور خوشبو لگا کر اس کی منتظر رہے۔ یہ اس کا حق ہے کہ اسے سعاد کی سرد مہری کا علم نہ ہو، اسے چاہیے کہ حاج کو بستر میں اس کی نارسائی اور معذوری یا کوتاہیوں کا احساس کبھی نہ دلائے۔

چنانچہ حاج کو ندامت سے بچانے کے لیے اس نے ایک ترکیب میں اپنا مداوا ڈھونڈ نکالا جو خود اس کی جبلت نے اسے سکھا دی تھی: اس نے اکھڑی اکھڑی سانسیں لیں اور ناخنوں سے اس کی پشت کھرچتے ہوئے اپنے اوجِ لذت پر پہنچنے کا سوانگ رچایا، اس کے تاراج جسم کو شدت سے چمٹا لیا اور اس کی چھاتی پر یوں پڑ گئی جیسے لذت کی انتہا نے اسے مدہوش کر دیا ہو۔ پھر آنکھیں کھولیں، اس کی ڈاڑھی اور گردن پر بوسے دیے اور اس کے سینے کو انگلیوں سے سہلانے لگی اور نرم و گداز آواز میں سرگوشی کی، ''ارے ہاں، انتخابات میں کامیابی پر میری مٹھائی کیا ہوئی؟''

''بسر و چشم۔ ایک اعلیٰ اور خطیر تحفہ دوں گا۔''

''خدا تمھیں میری خاطر محفوظ رکھے، میرے پیارے! دیکھو، میں تم سے ایک سوال کرتی ہوں، اور تم صاف صاف جواب دینا۔''

حاج نے پلنگ کے تختے سے پیٹھ ٹکا کر خود کو بلند کیا اور توجہ سے اس کی طرف دیکھا۔ دریں اثنا

اپنا ہاتھ اس کے برہنہ شانے پر رہنے دیا۔ سعاد نے کہا، ''کیا تم مجھے چاہتے ہو؟''

''بہت زیادہ، سعاد۔ خدا جانتا ہے۔''

''اتنا کہ اگر میں دنیا میں کسی چیز کے لیے بھی کہوں تو میرے لیے کر دو گے؟''

''بالکل۔''

''ٹھیک ہے۔ دیکھو، اپنے وعدے پر قائم رہنا۔''

اس نے تذبذب سے اس کی طرف دیکھا، لیکن سعاد نے طے کر لیا تھا کہ آج رات وہ بات اس کے روبرو نہیں لائے گی۔ سو بولی، ''میں تم سے ایک اہم بات کروں گی۔ انشاء اللہ، اگلے ہفتے۔''

''نہیں۔ آج رات ہی بتاؤ۔''

''نہیں، میرے پیارے۔ پہلے مجھے یقین کر لینے دو۔''

حاج ہنس دیا اور بولا، ''اچھا خاصا معما ہے۔''

سعاد نے حاج کو چوما اور بڑی ترغیب انگیز آواز میں سرگوشی کی، ''ہاں ... معما ہی سمجھو۔''

❊

ہم جنس پرست عموماً ایسے پیشوں میں فضیلت پاتے ہیں جن کا انحصار لوگوں سے میل جول پر ہو، جیسے تعلقاتِ عامہ، اداکاری، دلاّلی، اور قانون۔ ان میدانوں میں ان کی کامیابی کو ان میں خجالت کے فقدان سے منسوب کیا جا سکتا ہے، جس کی وجہ سے مختلف لوگ بہت سے موقعے ضائع کر دیتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان کی جنسی زندگی، چونکہ یہ گوناگوں اور غیر معمولی صحبتوں سے مملو ہوتی ہے، انھیں انسانی فطرت کی گہری بصیرت اور انھیں دوسروں پر زیادہ اثر انداز ہونے کی صلاحیت بخشتی ہے۔ یہ لوگ ایسے پیشوں میں بھی ممتاز مقام حاصل کرتے ہیں جن کا تعلق ذوق اور تخیل سے ہو، جیسے گھر کی آرائش اور زیبائش اور لباس کی نئی طرزوں کی ایجاد۔ یہ معروف بات ہے کہ دنیا کے مشہور ترین لباس ساز ہم جنس پرست رہے ہیں؛ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی مخلوط جنسی فطرت انھیں ایسے زنانہ اور مردانہ لباس اختراع کرنے کا ملکہ بخشتی ہے جو مخالف جنسوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

جو لوگ حاتم رشید سے واقف ہیں ان کی آرا اس کے بارے میں مختلف سہی، لیکن وہ اس کے اعلیٰ ذوق اور رنگوں اور کپڑوں کے انتخاب میں اس کی خداداد صلاحیت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ

Scanned with CamScanner

سکتے۔ حتیٰ کہ خوابگاہ میں اپنے عشاق کی رفاقت میں بھی وہ خود کو سوقیانہ، زنانہ مذاق سے بلند تصور کرتا ہے جو ہم جنسوں کی اکثریت روا رکھتی ہے: وہ نہ چہرے پر غازہ تھوپتا ہے نہ شب خوابی کی زنانہ، ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنتا ہے نہ سینے پر نقلی چھاتیاں لگاتا ہے۔ اس کے برخلاف، وہ اس بات کی جستجو کرتا ہے کہ استادانہ مہارت سے اپنے حسن و جمال کے نسائی رخ کو اجاگر کرے۔ اپنے برہنہ جسم پر خوشنما رنگوں کی کشیدہ کاری کے شفاف جلباب پہنتا ہے، بڑی صفائی سے ڈاڑھی مونڈتا ہے، بھنووں پر نپی تلی مقدار میں رنگ کی لکیر کھینچتا ہے اور آنکھوں کو خفیف سے کحل سے آراستہ کرتا ہے۔ پھر وہ اپنے چمکدار بالوں کو پیچھے کی طرف کاڑھتا ہے یا لٹوں کو پیشانی پر پریشاں چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے بناؤ سنگار میں ہمیشہ عصرِ قدیم کے کسی حسین و جمیل نوخیز لڑکے کی مانند نظر آنے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ اسی نفیس ذوق کا مظاہرہ اپنے رفیق عبدہ کے لیے نئے لباس خریدتے وقت بھی کرتا: تنگ سی پتلونیں جو اس کے گٹھے ہوئے رگ پٹھوں کو اجاگر کرتیں، ہلکے رنگ کی قمیصیں اور بنیانیں تاکہ اس کے چہرے کی آبنوسی رنگت نمایاں ہو سکے، اور گریبان جو ہمیشہ کھلے ہوتے تاکہ اس کی گردن کے عضلات اور سینے کے دبیز بال نظر آ سکیں۔ حاتم عبدہ کے ساتھ بڑی فیاضی سے کام لیتا تھا: اسے خوب پیسے دیتا، جو عبدہ اپنے گھر والوں کو بھیج دیتا، کیمپ کے کمانڈر سے اس کے لیے سفارش کروائی، جس سے اس کے ساتھ برتاؤ بہتر ہو گیا اور وہ اسے ایک کے بعد ایک چھٹی دینے لگے، جو وہ ساری کی ساری حاتم کے ساتھ گزارتا، گویا وہ ماہِ عسل منانے والے نوبیاہتا ہوں۔ دونوں نصف صبح گزرنے پر سو کر اٹھتے اور فراغت اور کاہلی سے لطف اندوز ہوتے، اول درجے کے ریستورانوں میں کھانا کھاتے، واپسی پر سینما دیکھتے، اور خریداری کرتے۔ رات گئے بستر پر ایک ساتھ آتے اور اپنے جسموں کو تسکین پہنچا کر لیمپ کی مدھم روشنی میں ایک دوسرے کی بانہوں میں پیوست ہو کر سو جاتے، کبھی کبھار منھ اندھیرے تک باتیں کرتے رہتے — گدازی کے وہ لمحات جو حاتم کی یاد سے کبھی محو نہ ہوں گے۔ اپنے جسم کی پیاس بجھا لینے کے بعد وہ خوفزدہ بچے کی طرح عبدہ کے مضبوط جسم سے چمٹ جاتا، اس کی ناہموار آبنوسی جلد سے بلّی کی طرح اپنی ناک رگڑنے لگتا اور اس سے سب کچھ بیان کرتا: اپنا بچپن، باپ، فرانسیسی ماں، اپنا اولین محبوب ادریس۔ اور عجیب بات تو یہ ہے کہ عبدہ اپنی نوخیزی اور کم علمی کے باوجود، حاتم کے جذبات سے ہمدردی کرنے کی اہلیت رکھتا تھا، اور رفتہ رفتہ دونوں کے

تعلق کو اور زیادہ قبول کرنے لگا۔ اس کا اولین تنفر جاتا رہا، اور ایک لذیذ سے گناہ آلود اشتیاق نے اس کی جگہ لے لی۔ اس پر مستزاد روپیہ پیسہ، احترام، نئے نئے لباس اور پر تکلف کھانے، درجہ اول کے مقامات جن میں کبھی قدم رکھنے کا خواب بھی عبدہ نے نہیں دیکھا تھا، اور رات کے وقت سڑک پر جب وہ حاتم کی رفاقت میں لوٹ رہا ہوتا تو سکیورٹی کی نفری کے پاس سے اپنی پوری آب و تاب سے گزرنا اور فاصلے سے انھیں صاحب سلامت کرنا اسے بہت بھاتا تھا، جیسے خود کو یقین دلا رہا ہو کہ کچھ دیر کے لیے وہ ان بے چارے مسکینوں سے مختلف ہو گیا ہے جو، تمازت آفتاب ہو یا کڑاکے کا جاڑا، پہروں بے مقصد کھڑے رہتے ہیں۔

دونوں دوست کامل فرحت کے دن گزار رہے تھے۔ پھر عبدہ کا یوم پیدائش آیا جس کی بابت عبدہ نے حاتم کو یقین دلایا کہ اس کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ بالائی مصر میں صرف شادی بیاہ اور ختنے کے تہوار منانے کا رواج ہے، لیکن حاتم نے اس کی سالگرہ منانے پر اصرار کیا۔ وہ اسے کار میں بٹھا کر چل پڑا اور مسکرا کر بولا، ''آج رات میں تمھیں حیرت میں ڈال دوں گا۔''

''حیرت؟ بتاؤ تو سہی۔''

''اتاولے نہ بنو۔ جلد ہی پتا چل جائے گا،'' حاتم بڑبڑایا۔ کار کو ایک اجنبی سمت میں ڈالتے ہوئے اس کے چہرے پر بچکانہ کھلنڈرے پن کا تاثر تھا۔ وہ شارع صلاح سالم سے ہوتا ہوا مدینتہ نصر میں داخل ہوا، پھر ایک چھوٹی سی بغلی سڑک پر مڑ گیا۔ دکانیں بند ہو چکی تھیں اور سڑک تقریباً اندھیری پڑی تھی لیکن ایک ٹین کا کیوشک [1] جس پر حال ہی میں روغن کیا گیا تھا اور جو اندھیرے میں چمک رہا تھا، ظاہر ہوا۔ دونوں کار سے نکل کر کیوشک کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ پھر عبدہ کو ایک جھنکار سی سنائی دی اور حاتم کو کنجیوں کا گچھا نکالتے دیکھا۔ یہ اس نے عبدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے پیار سے کہا، ''یہ لو۔ سالگرہ مبارک! تمھارے لیے میرا تحفہ۔ خدا کرے تمھیں پسند آ جائے۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

حاتم بڑے زور کا قہقہہ لگا کر بولا، ''آہ، تم صعیدی لوگ! تم کچھ نہیں سمجھتے۔ موٹی عقل والے جو ٹھہرے! یہ کیوشک تمھارے لیے ہے۔ بڑی دوڑ بھاگ اور اثر و رسوخ استعمال کر کے گورنریٹ

1۔ کیوشک: kiosk، یہ اصلاً ترکی زبان کا لفظ ہے۔

سے تمھارے لیے حاصل کیا ہے۔ جیسے ہی تم اپنی فوجی خدمت سے فارغ ہو گے، کچھ مال وال خرید دوں گا اور تم اس میں کھڑے ہو کر بیچا کرنا۔"

پھر وہ اس سے کچھ اور قریب ہوا اور سرگوشی میں کہا،" اس طرح، میرے پیارے، دھندا کرنا، پیسے بنانا، اور اپنے بچوں کی پرورش پر خرچ کرنا، اور میں بھی اپنے لیے پکا کرلوں گا کہ تم ابد تک میرے ساتھ رہو۔"

عبدہ بڑے زور سے چلا کر ہنسنے اور حاتم کو چمٹاتے ہوئے شکریے کے کلمات بڑبڑانے لگا۔ وہ ایک شاندار رات تھی۔ انھوں نے المہندسین کے ایک مچھلی ریستوران میں ساتھ کھانا کھایا۔ عبدہ اکیلا ہی کوئی ایک کلو جھینگے اور چاول کھا گیا ہوگا، اور دوران طعام دونوں نے سوئس شراب کی ایک پوری بوتل ختم کر ڈالی۔ سات سو پاؤنڈ سے زیادہ کا بل آیا، جو حاتم نے خاص اپنے ویزا کریڈٹ کارڈ سے ادا کیا۔ اس رات جب دونوں بستر میں تھے، حاتم لذتِ درد سے تقریباً کراہ اٹھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے بادلوں میں منڈلاتا پھر رہا ہے اور یہ آرزو کی کہ وقت یہیں ٹھہر جائے۔ بھوگ بلاس سے نپٹ کر وہ حسب معمول بستر میں ایک دوسرے سے لپٹے رہے، اور لمبی سی موم بتی کی مدھم روشنی رقص کرتی اور سامنے آرائشی وال پیپر چڑھی دیوار پر اپنے سائے ڈالتی رہی۔

حاتم دیر تک عبدہ کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کرتا رہا جو خاموشی سے اپنے سامنے دیکھتا رہا۔ اچانک اس کے چہرے پر گمبھیرتا چھا گئی۔ حاتم نے پریشان ہو کر پوچھا،" کیا بات ہے، عبدہ؟ بتاؤ تو سہی۔"

"میں خوفزدہ ہوں، حاتم بک،" عبدہ نے بڑی گہری آواز میں ہولے سے کہا۔

"کس بات سے خوفزدہ ہو؟"

"ہمارے خدا سبحانہ وتعالیٰ سے۔"

"کیا کہا؟"

"ربنا سبحانہ وتعالیٰ سے۔ میں اس سے خوفزدہ ہوں کہ وہ جو ہم کر رہے ہیں اس کی سزا دے گا۔"

حاتم خاموشی سے اندھیرے میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ بات اسے عجیب لگی۔ دین کی بابت بات وہ آخری چیز تھی جس کو سننے کی اسے اپنے عاشق سے توقع ہو۔

Scanned with CamScanner

''یہ کیا بات کر رہے ہو، عبدہ؟''

''اے بک، میں اپنی ساری زندگی ہمارے رب کی اطاعت کرتا رہا ہوں۔ ہمارے گاؤں میں لوگ مجھے 'شیخ عبدہ' کہتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ مسجد میں مقررہ وقت پر نماز ادا کی ہے اور رمضان اور دوسرے مہینوں کے روزے رکھے ہیں۔۔۔ پھر تم سے ملاقات ہوئی اور میں بدل کر رہ گیا۔''

''نماز پڑھنا چاہتے ہو، عبدہ؟ شوق سے پڑھو۔''

''کیسے پڑھ سکتا ہوں جبکہ ہر رات شراب پیتا ہوں اور تمھارے ساتھ ہمبستری کرتا ہوں؟ مجھے یوں لگتا ہے کہ ہمارا رب مجھ سے ناراض ہے اور مجھے سزا دے گا۔''

''تمھارے خیال میں ہمارا رب ہمیں ایک دوسرے سے محبت کرنے کی سزا دے گا؟''

''ہمارے خدا نے اس قسم کی محبت ہم پر حرام کی ہے۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ہمارے گاؤں کی مسجد میں شیخ دراوی نام کا ایک امام ہوا کرتا تھا، خدا اس پر اپنی رحمت کرے۔ بڑا صالح اور اطاعت گذار تھا۔ وہ جمعے کے خطبے میں ہم سے کہا کرتا تھا: 'لواطت [اغلام بازی] سے بچو، کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے اور جس سے عرش رحمٰن غضب کے مارے ہلنے لگتا ہے۔'''

حاتم کا خود پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا اور وہ بستر سے نکل آیا، روشنی جلائی، سگریٹ سلگائی اور اپنے خوبصورت چہرے اور ننگے بدن پر شفاف سے نائٹ گاؤن میں غضب میں آئی ہوئی کسی حسین عورت کی طرح نظر آنے لگا۔ دھواں منہ سے خارج کر کے اچانک چلّایا: ''سچ، عبدہ، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھارا کیا کروں۔ اس سے زیادہ تمھارے لیے اور کیا کر سکتا ہوں؟ تم سے محبت کرتا ہوں، تمھارے لیے فکرمند رہتا ہوں اور تمھیں خوش رکھنے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہوں۔ اور تم ہو کہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس طرح میری زندگی اجیرن کیے دے رہے ہو۔''

عبدہ اسی طرح پشت کے بل بانہہ پر سر رکھے سکوت کے عالم میں پڑا چھت کو گھورتا رہا۔ حاتم نے اپنی سگریٹ ختم کی اور اپنے لیے جام میں وہسکی انڈیلی اور اسے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اتار لیا۔ پھر وہ لوٹ کر عبدہ کے برابر آ بیٹھا اور آہستگی سے کہا: ''سنو، میرے پیارے۔ تمھارے گاؤں کے جاہل مولانا جو کہتے ہیں ہمارا رب اس سے کہیں زیادہ عظیم اور حقیقی رحم کرنے والا ہے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، پھر چوری چکاری بھی کرتے ہیں اور دکھ پہنچاتے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ ہمارا رب سزا دے گا تو انھیں دے گا۔ رہے ہم، تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ہمیں بخش دے گا، کیونکہ ہم کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے۔ ہم تو صرف ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ عبدہ، خدارا چیزوں کو بگاڑو مت۔ آج کی شب تمھاری سالگرہ ہے اور ہمیں خوش ہونا چاہیے۔"

❋

اِس اتوار کی شام بثینہ کی نئی ملازمت کے پورے دو ہفتے ہو گئے تھے جن کے دوران زکی الدسوقی نے بھی تمہیدی اقدام کر لیے تھے: پہلے پہل اس نے بعض کاموں کی ذمے داری بثینہ کو سونپی — ٹیلی فون نمبروں کی تازہ فہرست تیار کرنا، بجلی کے بل ادا کرنا، پرانے کاغذات کو ترتیب وار رکھنا — اس کے بعد اس نے اسے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا: وہ خود کو کس قدر تنہا محسوس کرتا تھا، بعض اوقات شادی نہ کرنے پر کتنا پچھتاتا تھا، اپنی بہن دولت کی اس سے شکایت کی اور کہا کہ وہ اپنے ساتھ اس کے برتاؤ پر رنجیدہ ہے۔ وہ اب بثینہ سے اس کے گھر والوں کی بابت، اور اس کے چھوٹے بھائی بہنوں کے بارے میں پوچھنے لگا تھا؛ وہ گاہے بگاہے اس سے دکھاوے کی عشق بازی کرتا، اس کے خوش وضع لباس اور بالوں کی قطع کی تعریف کرتا، جس سے اس کے چہرے کی خوبصورتی اور بھی نکھر آتی، اور دیر تک اس کے جسم کو دیکھتا رہتا، بلیرڈ کے کسی مشاق کھلاڑی کی طرح جو گیندوں پر اعتماد سے اور خوب سوچ سمجھ کر ضرب لگاتا ہو۔ وہ اس کے ان شاروں کنایوں پر فہمیدگی سے مسکرا دیتی (خطیر تنخواہ کے مقابلے میں واجبی سے کام کے پیشِ نظر اس کے متوقعہ کارِ منصبی کی صراحت ہو جاتی تھی)۔ چند دن تک یہ اشارے کنائے دونوں کے درمیان ہوتے رہے، حتیٰ کہ ایک روز جب وہ گھر لوٹنے کے لیے تیار ہو رہی تھی، وہ بولا، "بثینہ، مجھے تم سے بہت راحت ملتی ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔"

"جیسے آپ کا حکم،" بثینہ نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہا تاکہ اس کے لیے راستہ صاف کر دے۔ تب اس نے بثینہ کا ہاتھ تھام کر کہا، "اگر تم سے کسی چیز کی خواہش کروں تو دے سکو گی؟"

"اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور۔"

وہ بثینہ کے ہاتھ اٹھا کر اپنے لبوں تک لایا اور چوم لیے تاکہ اپنے مدعا کی تصدیق کر دے اور پھر سرگوشی میں کہا، "کل ظہر کے بعد آنا... تاکہ کوئی مخل نہ ہو سکے۔"

Scanned with CamScanner

اگلے روز جب بثینہ غسلخانے میں اپنے جسم سے غیر ضروری بال صاف کر رہی تھی، پتھر کے جھانویں سے اپنی ایڑیاں چمکا رہی تھی، ہاتھوں اور چہرے پر کریم مل رہی تھی، تو اس نے جو کچھ پیش آیا تھا اس کی بابت غور کیا۔ اسے خیال آیا کہ زکی الدسوقی جیسے سن رسیدہ آدمی کے ساتھ جسمانی تعلق بڑا عجیب سا ہوگا۔ اسے یاد آیا کہ جب کبھی کبھار وہ اس کے قریب آتی تو اس کے کپڑوں سے سگریٹ کی تیز بو کے علاوہ ایک اور قسم کی بو بھی آتی تھی، بھدی اور پرانے زمانوں کی مہک، جو اسے اُس بو کی یاد دلاتی جس سے، جب وہ بچی تھی اور اپنی ماں کے کپڑوں کے پرانے چوبی صندوق میں چھپ جایا کرتی تھی، اس کے نتھنے بھر جاتے تھے۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ وہ اس کے لیے کسی قدر انس بھی محسوس کرتی تھی کیونکہ وہ اس کے ساتھ ایک مہذب آدمی کی طرح پیش آتا تھا اور ایک مخصوص شائستگی سے برتاؤ کرتا تھا۔ وہ یقیناً اس قابل تھا کہ اس پر ترس کھایا جائے کہ اس عمر میں بغیر بیوی بچوں کے، تن تنہا زندگی گزار رہا تھا۔

شام کو وہ اس کے دفتر پہنچی تو دیکھا کہ اس نے ابسخرون کو سویرے ہی وہاں سے باہر بھیج دیا ہے اور اکیلا بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کے سامنے وسکی کی بوتل، ایک گلاس، اور برف کی ڈونگی رکھی ہے۔ اس کی آنکھیں کچھ سرخ سی تھیں اور کمرے میں الکحل کی تیز بو بسی ہوئی تھی۔ وہ اسے خوش آمدید کہنے کے لیے کھڑا ہوا، پھر بیٹھ کر گلاس میں باقی مشروب حلق سے اتار لیا اور بڑی غمزدگی سے کہا،

"تم نے سنا کہ کیا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ خیر تو ہے؟"

"دولت اپارٹمنٹ میں میرے داخلے پر پابندی کا مقدمہ دائر کر رہی ہے۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ اس نے عدالت سے مطالبہ کیا ہے کہ مجھ پر میری املاک کا استعمال ممنوع قرار دے دے۔"

"یا خدا... وہ کیوں؟"

"تاکہ میری زندگی ہی میں اسے میرا ورثہ مل جائے۔"

زکی نے ایک اور گلاس بھرتے ہوئے تلخی سے کہا۔ بثینہ کو اس پر ترس محسوس ہوا۔ بولی، "بھائی

Scanned with CamScanner

بہن ایک دوسرے سے غصے ضرور ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے کا خیال رکھنا کبھی نہیں چھوڑتے۔''

''یہ تمھاری سوچ ہے۔ دولت صرف پیسے کی پجاری ہے۔''

''شاید اگر حضور خود ان سے بات کریں...''

زکی نے سر ہلایا، جس کا مفہوم تھا،'' بے فائدہ ہوگا'' اور موضوع بدلتے ہوئے پوچھا،'' کیا پیوگی؟''

''شکریہ۔ کچھ نہیں۔''

''کبھی نہیں پی؟''

''کبھی نہیں۔''

''ایک گلاس پی کر تو دیکھو۔ شروع میں تلخ معلوم ہوگی لیکن جلد ہی فرحت محسوس کرنے لگوگی۔''

''نہیں، شکریہ۔''

''افسوس! شراب پینا اچھی چیز ہے۔ ہمارے مقابلے میں غیر ملکی لوگ پینے کی اہمیت سمجھتے ہیں۔''

''میں دیکھتی ہوں کہ حضور کا رہن سہن بالکل غیر ملکیوں جیسا ہی ہے۔''

وہ مسکرا دیا اور بڑی محبت اور گداز ی سے بثینہ کی طرف دیکھا، گویا وہ کوئی چھوٹی سی تیز فہم بچی ہو۔

''مہربانی سے مجھے 'حضور' وغیرہ نہ کہا کرو۔ ٹھیک ہے کہ میں عمر رسیدہ ہوں، لیکن تمھیں ہمیشہ اس کی یاد دہانی کرانے کی ضرورت نہیں۔ ٹھیک ہے، میں نے اپنی ساری زندگی غیر ملکیوں کے ساتھ گزاری ہے۔ میں نے فرانسیسی اسکولوں میں پڑھا تھا اور میرے زیادہ تر دوست غیر ملکی تھے۔ میں نے فرانس میں تعلیم حاصل کی اور برسوں وہاں رہا۔ میں پیرس سے بھی بالکل اسی طرح واقف ہوں جس طرح قاہرہ سے۔''

'' کہتے ہیں، پیرس بہت خوبصورت ہے۔''

''خوبصورت؟ ساری دنیا ہی وہیں ہے۔''

''تو آپ وہیں کیوں نہیں رہے؟''

''لمبی کہانی ہے۔''

''مجھے سنائیں۔ ہمیں کوئی ضروری کام تو ہے نہیں۔''

وہ اس کی دلگیری کو کم کرنے کی خاطر ہنسی اور وہ بھی پہلی بار ہنس دیا۔ پھر وہ اس سے کچھ اور قریب ہوئی اور نرمی سے پوچھا،'' ہاں تو بتائیں، آپ فرانس ہی میں کیوں نہیں رہے؟''

Scanned with CamScanner

''زندگی میں بہت سی چیزیں ہیں جو مجھے کرنی چاہیے تھیں اور جو نہیں کیں۔''

''کیوں نہیں کیں؟''

''نہیں جانتا کہ کیوں۔ میں جب تمھاری سی عمر کا تھا تو سوچتا تھا کہ جو چاہوں کرسکتا ہوں۔ میں اپنی زندگی کے لیے منصوبے بناتا تھا اور مجھے ہر چیز کے بارے میں یقین تھا۔ جب عمر بڑھی تو یہ حقیقت کھلی کہ آدمی کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ ہر شے تقدیر کے ہاتھوں میں ہے۔''

اسے احساس ہوا کہ وہ اداس ہو رہا ہے، سو اس نے ایک آہ بھری اور مسکرا کر اس سے پوچھا،

''تم سفر کرنا چاہتی ہو؟''

''بالکل۔''

''کہاں جانا پسند کرو گی؟''

''اس خرابے سے بہت دور، کسی بھی جگہ۔''

''مصر سے نفرت ہے؟''

''ظاہر ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کوئی اپنے ملک سے کہیں نفرت کرتا ہے؟''

''یہاں کبھی کوئی اچھی چیز نہیں ملی کہ اس سے محبت کروں۔''

یہ جملہ کہتے ہوئے اس نے اپنا رخ پھیر لیا۔ زکی نے جوش میں آتے ہوئے کہا، ''آدمی کو اپنے ملک سے اس لیے محبت کرنی چاہیے کہ وہ اس کی ماں ہے۔ کوئی اپنی ماں سے بھی نفرت کرتا ہے؟''

''یہ سب فلموں اور گانوں کی باتیں ہیں۔ زکی بک، لوگ بڑی مصیبتیں جھیل رہے ہیں۔''

''غربت وطن پرستی سے نہیں روکتی۔ مصر کے بیشتر وطن پرست رہنما غریب ہی تھے۔''

''یہ آپ کے زمانے کی بات ہے۔ اب لوگ واقعی بیزار ہو گئے ہیں۔''

''کون لوگ؟''

''سب لوگ۔ مثلاً وہ تمام لڑکیاں جو میرے ساتھ بزنس اسکول میں پڑھتی تھیں، سب کی سب، جس طرح بھی بن پڑے، اس ملک سے نکل جانا چاہتی تھیں۔''

''تو کیا حالت اتنی خراب ہے؟''

Scanned with CamScanner

''ظاہر ہے۔''

''اگر تمھیں اپنے ملک میں اطمینان میسر نہیں تو یہ کہیں اور بھی نہیں ملے گا۔''

یہ لفظ بس زکی بک کے منھ سے بے ساختہ نکل پڑے اور اسے ان میں لطف و کرم کی کمی کا احساس ہوا، جس کی شدت کو کم کرنے کی خاطر وہ مسکرایا۔ بثینہ اس اثنا میں کھڑی ہو چکی تھی اور بڑی تلخی سے کہہ رہی تھی، ''آپ نہیں سمجھتے کیونکہ آپ صاحبِ ثروت ہیں۔ اگر آپ کو بس اسٹاپ پر دو گھنٹے کھڑا ہونا پڑے یا تین مختلف بسیں بدلنی پڑیں اور ہر روز گھر پہنچنے کے لیے جہنم سے گزرنا پڑے؛ جب آپ کا گھر ڈھا دیا گیا ہو اور حکومت آپ کو اپنے بچوں کے ساتھ سڑک پر خیمے میں بیٹھنے کے لیے چھوڑ گئی ہو؛ جب پولیس والے نے آپ کو صرف اس لیے گالیاں دی ہوں اور مارا پیٹا ہو کہ رات کے وقت منی بس میں سفر کر رہے ہیں؛ جب آپ دن بھر نوکری کی تلاش میں دکان دکان مارے مارے پھرتے رہے ہوں اور ملازمت کہیں نہ ملے؛ جب آپ ایک توانا اور ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہوں اور آپ کی جیب میں صرف ایک پونڈ ہو، اور کبھی تو کچھ بھی نہیں؛ تب آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم مصر سے کیوں نفرت کرتے ہیں۔''

ایک بوجھل سکوت دونوں کے درمیان چھا گیا۔ زکی موضوع بدلنے کا فیصلہ کر کے اپنی کرسی سے اٹھا، ٹیپ ریکارڈر کی طرف بڑھا اور بشاشت سے بولا، ''میں تمھیں دنیا کی سب سے خوبصورت آواز سنواتا ہوں۔ ایک فرانسیسی مغنیہ ایڈتھ پیاف، فرانس کی تاریخ میں اہم ترین مغنیہ۔ تم نے اس کے بارے میں سنا ہے؟''

''پہلی بات تو یہ کہ مجھے فرانسیسی نہیں آتی۔''

زکی نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اور ریکارڈر کا بٹن دبا دیا۔ پیانو کی جھومتی، رقص کرتی ہوئی موسیقی ابھری اور ساتھ ہی پیاف کی گرم و گداز، قوی، اور شفاف آواز بلند ہوئی جس کے آہنگ پر زکی اپنا سر ہلانے لگا اور بولا، ''یہ نغمہ مجھے خوبصورت دنوں کی یاد دلا دیتا ہے۔''

''اس کے بول کیا کہتے ہیں؟''

''اس لڑکی کا ذکر کرتے ہیں جو لوگوں کے ہجوم کے بیچ کھڑی ہے، لوگ اسے اس کی مرضی کے خلاف ایک ایسے آدمی کی سمت میں دھکیل رہے ہیں جس سے وہ ناواقف ہے، اور اسے دیکھتے ہی وہ

اس کے لیے ایک لطیف جذبہ اپنے اندر امڈتا ہوا محسوس کرتی ہے، اور تمنا کرتی ہے کہ ساری زندگی اسی کے ساتھ بتادے، لیکن لوگ اچانک اسے اس آدمی سے پرے دھکیل دیتے ہیں۔ آخر میں وہ خود کو بالکل تن تنہا پاتی ہے، اور وہ شخص جسے اس نے چاہا تھا، ہمیشہ کے لیے کھو جاتا ہے۔''

''کیسی افسوس کی بات ہے!''

''لیکن گانے میں ایک رمز ہے، یہی کہ کوئی کسی مناسب آدمی کی تلاش میں اپنی پوری زندگی بتادے اور جب وہ بالآخر ملے تو اسے کھو بیٹھے۔'' دونوں لکھنے کی میز کے پاس کھڑے تھے اور بولتے میں وہ بثینہ کی طرف بڑھا اور اپنے ہاتھ اس کے دونوں رخساروں پر رکھ دیے۔ بثینہ کے مشام اس کی بھدی، پرانے وقتوں کی بو باس سے بھر گئے، اور زکی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، ''تمھیں گانا پسند آیا؟''

''بہت پیارا گانا ہے۔''

''تم جانو بثینہ، میں حقیقت میں تم جیسی کسی ہستی سے ملاقات کا محتاج تھا۔''

وہ کچھ نہ بولی۔

''تمھاری آنکھیں بے حد خوبصورت ہیں۔''

''شکریہ۔''

اس نے یہ سرگوشی میں کہا۔ اس کا چہرہ جلنے لگا تھا اور اس نے زکی کو اپنے اتنے قریب آنے دیا کہ اس کے ہونٹ اپنے چہرے پر محسوس ہوئے۔ پھر زکی نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا اور جلد ہی اسے وسکی کا تیز و تلخ ذائقہ اپنے منھ میں گھلتا محسوس ہوا۔

❁

''کہاں بھاگی جا رہی ہو، گڑیا؟'' اگلی صبح لفٹ کے قریب اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ملاک نے بڑی گستاخی سے پوچھا۔ بثینہ نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا، ''کام پر جا رہی ہوں۔''

ملاک نے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کیا اور بولا، ''لگتا ہے کام تمھارے حسبِ حال ہے۔''

''زکی بک اچھا آدمی ہے۔''

''سبھی لوگ اچھے ہوتے ہیں۔ ویسے اس دوسری بات کے معاملے میں تم نے کیا کیا ہے؟''

"ابھی تک تو کچھ نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھے موقع نہیں ملا۔"

ملاک نے بھنویں چڑھائیں، اس کی طرف کچھ غصے سے دیکھا، سختی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا، "سنو، چلتی پرزہ، یہ کھیل نہیں ہے۔ اسے اسی ہفتے معاہدے پر دستخط کرنے ہوں گے۔ آیا سمجھ میں؟"

"ٹھیک ہے۔"

اس کی گرفت سے ہاتھ چھڑا کر وہ لفٹ میں داخل ہو گئی۔

❄

جامعہ کے زیادہ تر شعبوں میں طلبا کے احتجاجی مظاہرے صبح سے جاری تھے۔ انھوں نے سبق چھوڑ چھاڑ کر لیکچر ہال بند کر دیے تھے اور اب خلیج کی جنگ کے خلاف جھنڈے اٹھائے ہر طرف بھاری تعداد میں حرکت کر رہے تھے۔ جب ظہر کی اذان سنائی دی تو کوئی پانچ ہزار طلبا، جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے، آڈیٹوریم کے سامنے صحن میں برادر طاہر کی قیادت میں، جو جماعتِ اسلامیہ کا سربراہ تھا، نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے (لڑکے آگے اور لڑکیاں پیچھے)۔ بعدازاں مجمعے نے عراق میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی ارواح کے لیے غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی۔ تھوڑی دیر بعد طاہر زینہ چڑھ کر اوپر آڈیٹوریم کے عین مقابل کی سیڑھیوں پر آیا اور اپنے سفید جلباب اور بارعب سیاہ ڈاڑھی کے ساتھ وہاں کھڑا ہو گیا اور اس کی آواز مائیکروفون سے بلند ہوئی۔

"بھائیو اور بہنو، ہم آج اپنے برادر ملک عراق میں مسلمانوں کے قتال کو روکنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ دشمنوں کی تمنا کے برخلاف، ہماری اسلامی قوم ابھی مر نہیں گئی ہے۔ رسولِ خدا نے اپنی صحیح حدیث میں فرمایا ہے، 'میری امت میں خیر قیامت کے دن تک سلامت رہے گی۔' تو بھائیو اور بہنو، چلو ہم اپنے الفاظ بہ بانگ دہل کہیں، تاکہ وہ لوگ صاف صاف سن لیں جنھوں نے اپنے ہاتھ ہمارے دشمنوں کے نجس ہاتھوں میں دے دیے ہیں، جو مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ اے جوانانِ اسلام، اس وقت جب ہم یہاں بات کر رہے ہیں، کفار کے راکٹ ہمارے برادر ملک عراق پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ وہ اس پر فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے بغداد کو تباہ کر کے مسمار کر دیا ہے،

Scanned with CamScanner

کہتے ہیں کہ انھوں نے بغداد کے بجلی اور پانی کے نظام کو تہس نہس کر کے اسے واپس پتھر کے زمانے میں پہنچا دیا ہے۔ بھائیو اور بہنو، ٹھیک اسی لمحے ہزار ہا عراقی مسلمانوں کو شہید کیا جارہا ہے، امریکی بموں سے ان کی جلد کے پرخچے اڑائے جارہے ہیں۔ اس المیے کی انتہا تو اس وقت ہوئی جب ہمارے حکام نے امریکہ اور اسرائیل کے احکامات پر سرِ تسلیم خم کر دیا، اس کے بجائے کہ مسلمانوں کی افواج اپنے ہتھیاروں کا رخ صہیونیوں کی طرف کرتے، جنھوں نے فلسطین کو غصب کرلیا ہے اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کررہے ہیں، ہمارے حکام نے مصری افواج کو یہ احکام صادر کیے ہیں کہ عراق میں اپنے مسلمان بھائی بہنوں کو تہہ تیغ کریں۔ میرے اسلامی بھائی بہنو، کلمۂ حق کو بلند آواز سے اٹھاؤ۔ اسے خوب اونچی اور صاف صاف آواز میں ادا کرو تاکہ وہ، جنھوں نے مسلمانوں کا خون بیچ دیا ہے اور سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں اپنے لیے لوٹی ہوئی دولت کے انبار لگا لیے ہیں، سن لیں۔"

ہر طرف سے نعرے بلند ہوئے جو اپنے رفیقوں کے شانوں پر چڑھے ہوئے طالب علم لگا رہے تھے اور جنھیں ہزاروں دوسرے فرطِ جوش سے اوراوپر اٹھا رہے تھے:

"اسلامی، اسلامی — ہاں، ہاں! مشرقی، مغربی — نا، نا!"

"خیبر، خیبر اے یہود — محمد کا لشکر لوٹے گا!"

"حکمرانو، کمینو، یہ تو بتاؤ — مسلم کا لہو کتنے میں بیچا؟"

طاہر نے اشارہ کیا اور سب خاموش ہو گئے۔ وہ بلند اور غصے سے چنگھاڑتی آواز میں بولا، "کل ساری دنیا میں ٹیلی وژن پر ایک امریکی فوجی دکھایا گیا تھا جو عراق میں ہمارے لوگوں کا قلع قمع کرنے کے لیے راکٹ مارنے کی تیاری کررہا تھا۔ تمھیں کچھ پتا ہے کہ اس امریکی خنزیر نے چھوڑنے سے پہلے راکٹ پر کیا پیغام لکھا تھا؟ لکھا تھا 'اللہ کو سلام'! مسلمانو، یہ تمھارے خدا کا مذاق اڑاتے ہیں۔ سوتم کیا کرو گے؟ یہ تمھیں قتل اور تمھاری عورتوں کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ یہ تمھارے خدا سبحانہ و تعالیٰ کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ کیا تمھاری عزتِ نفس اور مردانگی اس حد تک گر گئی ہے؟ جہاد! جہاد! جہاد! ہم جو کہتے ہیں، سب کان کھول کر سن لیں! ہم اس ناپاک جنگ سے انکار کرتے ہیں! مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کے قتل کی نفی کرتے ہیں! خدا کی قسم، اس سے قبل کہ ہم امتِ اسلامی کو دشمن کے منھ کا ترلقمہ بن جانے دیں، ہم اپنی جانیں قربان کردیں گے! ہم امریکہ کی پاپوش نہیں بنیں گے کہ جب

چاہے پہن لے اور جب چاہے اتار دے!''

پھر طاہر نے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں اعلان کیا، ''اللہ اکبر! اللہ اکبر! صیہونیت، غارت ہو! امریکہ، مردہ باد! قوم فروش، مردہ باد! اسلامی! اسلامی!''

لڑکوں نے طاہر کو اپنے کندھے چڑھالیا اور یہ جم غفیر جامعہ کے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ مظاہرین کا ارادہ تھا کہ باہر سڑک پر نکل جائیں تا کہ دوسرے لوگ بھی مظاہرے میں آشامل ہوں لیکن سکیورٹی والے پہلے ہی سے جامعہ کے سامنے ان کے منتظر تھے۔ بس ان کے باہر چوک میں نکلنے کی دیر تھی کہ موٹے موٹے ڈنڈوں، خودوں، اور آہنی زرہ بکتر سے مسلح سپاہی ان پر پل پڑے اور بے حد سفاکی سے انھیں مارنے لگے۔ طالبات کی چیخیں بلند ہوئیں اور بہت سے طالب علم گر پڑے اور مضروب ہوئے، ان کا خون سڑک کے تارکول پر بہنے لگا، اس کے باوجود بڑی تعداد میں طلبا کا جتھا پھاٹک سے باہر ابلے گیا، ان میں سے بہت سے سپاہیوں کے نرغے سے نکل کر ان کی پہنچ سے دور بھاگ نکلے اور سپاہی ان کا پیچھا کرتے رہے۔ یہ طلبا کسی نہ کسی طرح جامعہ کے سامنے کے چوک کے آگے نکل آئے اور پل پر پہنچ کر از سرنو اپنے کو مجتمع کیا۔ سکیورٹی کا اضافی دستہ ان پر ٹوٹ پڑا لیکن انھوں نے سینکڑوں کی تعداد میں اسرائیلی سفارت خانے کی طرف یلغار کر دی، جس پر سفارت خانے سے اسپیشل فورسز کے سپاہیوں کی بھاری تعداد نکلی اور ان پر اشک آور گیس کے بم پھینکنے شروع کر دیے۔ دھواں اوپر اٹھنا شروع ہوا یہاں تک کہ اس نے پورے منظر کو ڈھانپ لیا۔ اس کے بعد دنا دن گولیاں چلنے کی آواز گونجی۔

❄

طٰہٰ الشاذلی تمام دن مظاہروں میں شامل رہا اور جب اسرائیلی سفارت خانے کے سامنے سکیورٹی دستے طلبا کو گرفتار کرنے لگے تو عین موقعے پر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق چوک سیدہ زینب میں 'اوبرگ' قہوہ خانے میں پہنچا اور وہاں دوسرے اخوان سے آملا جن میں سربراہ طاہر بھی تھا، جس نے دن کے واقعات کا جائزہ لیا اور ان کی اہمیت کا تعین کیا۔ اس کے بعد اس نے بڑی دلگیر آواز میں کہا، ''مجرموں نے اشک آور بم پردہ پوشی کے لیے چھوڑے اور ان کی آڑ

Scanned with CamScanner

میں طلبا پر بچ بچ کی گولیاں چلائیں۔ تمھارے شعبۂ قانون والے بھائی خالد حربی کو شہادت نصیب ہوئی۔ ہمیں اسے خدا کا امر سمجھتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ وہ اس کے سارے گناہ معاف کرے، اپنی رحمت سے اسے ڈھانپ لے، اور اپنے کرم سے اسے جنت کا اجر بخشے، انشاءاللہ۔"

حاضرین نے شہید کی روح کے لیے فاتحہ پڑھی۔ سب اپنے کو ہراساں اور بوجھل محسوس کر رہے تھے۔ پھر برادر طاہر نے انھیں اگلے دن کے مطلوبہ اہم کاموں کی بابت بتایا: غیر ملکی صحافتی ایجنسیوں سے خالد حربی کی شہادت کی تصدیق کے لیے رابطہ، گرفتار ہونے والوں کے گھر والوں کا اتا پتا لگانا، تازہ مظاہروں کی تیاری، جنھیں اس جگہ سے نکالا جائے جو سکیورٹی والوں کے لیے غیر متوقع ہو۔ طٰہٰ کو دیواروں پر لگائے جانے والے پوسٹروں کی تحریر اور علی الصباح انھیں شعبے کی دیواروں پر چسپاں کرنے کا کام سپرد ہوا۔ اس مقصد کے لیے اس نے متعدد رنگوں کے قلم اور خوب مضبوط کاغذ کے دستے خرید رکھے تھے اور چھت پر اپنے کمرے میں بند ہو کر خود کو اپنے کام میں غرق کر دیا، حتیٰ کہ مغرب اور عشا کی نماز پڑھنے کے لیے بھی نیچے نہیں آیا اور اکیلے ہی ادا کی۔ اس نے کوئی دس پوسٹر تیار کیے، ان پر مطلوبہ عبارتیں لکھیں اور تصویریں بھی بنائیں۔ آدھی رات گزرنے کے بعد کہیں جا کر وہ کام سے فارغ ہوا اور اس نے خود کو کافی تھکا ہوا محسوس کیا۔ بس سونے کے لیے چند گھنٹے ہی رہ گئے ہیں، اس نے خود سے کہا، کیونکہ اسے صبح سات بجے سے پہلے ہی جامعہ پہنچنا ہے۔ اس نے عشا کی دو سنتیں پڑھیں، بتی گل کی، اور دائیں جانب کروٹ لے کر لیٹ گیا اور سونے سے پہلے کی معمولہ دعا مانگی: "اے اللہ، میرا چہرہ تیری طرف اٹھا ہے، اپنی پشت تیری امان میں دی ہے، اور اپنا معاملہ تجھے سونپ دیا ہے، تیری رغبت میں اور تیرے خوف سے۔ تیرے سوا نہ کوئی جائے پناہ ہے نہ جائے نجات۔ اے خدا، میں تیری نازل کی ہوئی کتاب اور تیرے بھیجے ہوئے رسول پر ایمان رکھتا ہوں۔" پھر وہ گہری نیند میں غرق ہو گیا۔

کچھ دیر بعد یہ سوچتے ہوئے کہ خواب دیکھ رہا ہے، وہ ملی جلی آوازوں کے شور سے جگ پڑا اور جب آنکھیں کھولیں تو اسے کمرے کی تاریکی میں چند سائے متحرک نظر آئے۔ اچانک روشنی ہوئی اور اسے تین لحیم شحیم آدمی اپنے پلنگ کے سامنے کھڑے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک آگے بڑھا اور پوری قوت سے اس کے چہرے پر ضرب لگائی۔ پھر سر پکڑ کر بڑی درشتی سے دائیں طرف موڑ دیا۔

Scanned with CamScanner

اب پہلی بار طٰہٰ نے دیکھا کہ یہ ایک نوجوان افسر ہے جو اس سے تمسخر آمیز لہجے میں پوچھ رہا ہے، ''کیا تم طٰہٰ الشاذلی ہو؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔ اس پر ان غنڈوں نے اس کے چہرے اور سر پر زور زور سے مارنا شروع کر دیا اور افسر نے اپنا سوال دہرایا۔

''ہاں''، طٰہٰ نے بڑی دبی آواز میں جواب دیا۔

افسر للکارتے ہوئے مسکرایا اور بولا، ''لیڈر بنے پھرتے ہو، حرامزادے۔''

یہ ایک اشارہ تھا جس کے بعد طٰہٰ پر ضربوں کی یورش شروع ہو گئی۔ لیکن عجیب بات تھی کہ نہ اس نے احتجاج کیا نہ چلایا، حتیٰ کہ اس نے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو بچانے کی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ ان ناگہانی واقعے کے باعث اس کا چہرہ بالکل بے حس ہو گیا تھا اور اس نے خود کو پوری طرح ان غنڈوں کی زدوکوب کے سپرد کر دیا جو اسے مضبوطی سے پکڑ کر کمرے کے باہر کھینچ لے گئے۔

❁

چند درجن گاہکوں سے بھرے الجزیرہ کے 'ہوٹل شیریٹن' کے مشرقی طعام خانے میں آپ کو بس چند ہی لوگ ایسے ملیں گے جو عام شہری ہوں اور تعطیل کے دن اپنی منگیتروں یا بیوی بچوں کے ساتھ وہاں اشتہا انگیز شیش کباب کھانے آئے ہوں۔ یہاں اکثر دکھائی دینے والے چہروں میں زیادہ تر بڑے آدمی ہوتے ہیں: ممتاز تاجر، وزرا، حاضرہ اور سابقہ حکام اعلیٰ جو صحافیوں اور فضول لوگوں کی نظروں سے دور ریستوران میں طعام وکلام کے لیے آتے ہیں۔ اس لیے پوری جگہ سکیورٹی پولیس سے بھری ہوتی ہے، اس پر ذاتی محافظ مستزاد جو کسی بھی اہم شخصیت کے ہمراہ ہوتے ہیں۔

اس دور میں 'شیریٹن' کا کباب گھر مصری سیاست میں وہی کردار انجام دے رہا ہے جو انقلاب سے پہلے 'شاہی آٹوموبیل کلب' انجام دیتا تھا۔ کتنی ہی ایسی سیاستیں، سودے، اور قوانین جن سے لاکھوں کروڑوں مصریوں کی زندگی متاثر ہوئی، یہیں بھنے گوشت کے انبار سے کراہتی میزوں کے گرد تیار اور طے ہوئے۔ 'آٹوموبیل کلب' اور 'شیریٹن' کے کباب خانے کا فرق اس تغیر کی ٹھیک غمازی کرتا ہے جس سے مصری حکمراں اشراف کا طبقہ انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد دوچار ہوا۔ چنانچہ 'آٹوموبیل کلب' عہدِ گزشتہ کے امرا و وزرا کے عین شایانِ شان تھا جن کی تعلیم اور

طور طریق خالص مغربی تھے۔ یہ اپنی شامیں یہیں اپنی بیویوں کی رفاقت میں گزارتے جو شام کے بڑے واشگاف لباس پہنے ہوتیں؛ وسکی کی چسکیاں بھرتے، پوکر یا برج کھیلتے۔ لیکن دور حاضر کے بڑے لوگ، جو غالب طور پر عامیوں کی اولاد ہیں، جو بڑی سختی سے مذہب کے ظواہر کی پابندی کرتے ہیں، اور مزیدار کھانوں کے معاملے بڑے خوش خور ہیں، 'شیریٹن' کا یہ کباب گھر انھیں خوب راس آتا ہے، کیونکہ وہ یہاں بہترین انواع کے کباب، کوفتے، بھری ہوئی سبزیاں اور بعد ازاں چائے کی پیالیوں اور شیرے والے تمباکو کے حقے سے، جو ریستوران نے ان کی فرمائش پر مہیا کیا ہوتا ہے، لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کھانے پینے کے دوران مالی اور کاروباری گفتگو جاری رہتی ہے۔

کمال الفولی نے حاج عزام سے 'شیریٹن' کے کباب گھر میں ملاقات کے لیے کہا تھا۔ موخر الذکر اپنے بیٹے فوزی کے ہمراہ وقت سے ذرا پہلے پہنچا۔ وہ بیٹھا حقہ اور چائے پی رہا تھا کہ اتنے میں کمال الفولی اپنے بیٹے یاسر اور تین محافظوں کو لیے آ گیا جنھوں نے پوری جگہ کی اچھی طرح چھان بین کر ڈالی۔ ان میں سے ایک نے الفولی سے کوئی بات کہی اور اس نے موافقت میں سر ہلا دیا اور پھر حاج عزام سے بڑے گرمجوش معانقے کے بعد کہا، ''معاف کرنا حاج، ہمیں جگہ تبدیل کرنی ہوگی۔ محافظ کے خیال میں یہ بہت کھلی ہوئی ہے۔''

حاج عزام نے اس کی تائید کی اور وہ اور اس کا بیٹا دونوں الفولی کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور سب کے سب ایک دور کی میز کی طرف چل دیے جس کا انتخاب محافظ نے ایک دور افتادہ جگہ پر فوارے کے پاس کیا تھا۔ سبھوں نے اپنی نشست سنبھالی اور محافظ قریب کی ایک میز کے گرد بیٹھ گئے، جہاں سے وہ اس دوسری میز کی نگرانی کر سکتے تھے، لیکن وہ گفتگو نہیں سن سکتے تھے جو وہاں ہو رہی تھی۔ گفتگو عام باتوں سے شروع ہوئی: وہی ایک دوسرے کی صحت اور بچوں کا حال، اور زیادتی کار اور روز افزوں ذمے داریوں کے باعث اپنے نڈھال ہونے کے شکوے شکایات۔ پھر الفولی نے حاج عزام سے دوستانہ لہجے میں کہا، ''بر سبیل تذکرہ، عوامی اسمبلی میں ٹیلی وژن کے فحش اشتہارات کے خلاف آپ کی مہم بہت زبردست رہی اور اس کا لوگوں پر کافی اثر ہوا ہے۔''

''سب آپ کا کرم ہے، کمال بک۔ آپ ہی نے راہ سجھائی تھی۔''

''میرا مقصد تھا کہ لوگ اسمبلی کے تازہ رکن کی حیثیت سے آپ سے واقف ہو جائیں۔

الحمدللہ، سبھی اخباروں نے آپ کی بابت لکھا ہے۔''

''خدا ہمیں آپ کی عنایات کا بدلہ دینے کی اہلیت دے۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں، حاج۔ آپ ہمارے عزیز بھائی ہیں۔ خدا گواہ ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے، کمال بک، ٹیلی وژن والے اس مہم کے جواب میں فحش اشتہاروں پر پابندی عائد کردیں گے؟''

الفولی نے 'پارلیمانی' جوش وخروش سے چلا کر کہا، ''چاہیں یا نہ چاہیں، انھیں جواب دینا ہی پڑے گا۔ سیاسی شعبے کے اجلاس میں مَیں نے وزیر اطلاعات سے کہہ دیا ہے، 'یہ ذلیل حرکت جاری نہیں رہ سکتی۔ خاندانی اقدار کی پاسبانی ہمارا فرض ہے۔ کون یہ برداشت کرسکتا ہے کہ اس کی بیٹیاں اور بہنیں ٹیلی وژن پر رقص اور بے شرمی کے مظاہرے دیکھیں؟ اور وہ بھی مصر، سرزمین الازہر میں؟'''

''مجھے تو اس پر تعجب ہے کہ یہ لڑکیاں جو نیم عریاں حالت میں ٹیلی وژن پر آتی ہیں تو ان کے گھر والے ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟ ایسی لڑکیوں کے باپ اور بھائی کہاں ڈوب مرے ہیں کہ انھیں اس اخلاق سوز حالت میں ظاہر ہونے دیتے ہیں؟''

''خدا جانے ان لوگوں کی غیرت کہاں چلی گئی ہے۔ جو کوئی بھی اپنی عورت کو برہنہ گھومنے پھرنے دیتا ہے، دیّوث ہے اور خدا کے رسول نے دیوث پر لعنت بھیجی ہے۔''

حاج عزام نے زہد واِتقا سے سر ہلاتے ہوئے کہا، ''دیوث کی عاقبت جہنم ہے۔ بڑی بری عاقبت۔ نعوذ باللہ!''

یہ سارا مکالمہ محض تمہیدی تھا، نبض شناسی اور ایک دوسرے کی قوتوں کا اندازہ لگانے کے لیے، ان ورزشوں کی طرح جو فٹ بال کے کھلاڑی میچ شروع ہونے سے پہلے اپنے جسم کو گرم کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ اب جبکہ ساری جھجک دور ہو چکی تھی اور نشست پر سکون ہو گئی تھی، کمال الفولی نے سر آگے کو جھکایا، مسکرایا، اور حقے کی مہنال کو اپنی فربہ انگلیوں میں گول گول گھماتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا، ''خوب یاد آیا، میں تو آپ کو مبارکباد دینا بھول ہی گیا تھا۔''

''شکریہ۔ کاہے پر؟''

''جاپانی کار 'تاسو' کی ایجنسی ملنے پر۔''

''اچھا، وہ۔''

عزام نے بڑی دھیمی آواز میں جواب دیا، اس کی آنکھیں ایک اچانک انتہائی اندیشے سے چمکنے لگیں۔ پھر اس نے سر جھکا کر حقے کا ایک ست خرام کش لیا تا کہ کچھ سوچنے کی فرصت مل جائے۔ اس کے بعد ہر ہر لفظ کو خوب ناپ تول کر کہنا شروع کیا، ''لیکن معاملہ ابھی پکا نہیں ہوا ہے، کمال بک۔ میں نے حال ہی میں ایجنسی ملنے کی درخواست دی ہے اور جاپانی میرے بارے میں پوچھ تاچھ کر رہے ہیں۔ وہ ایجنسی دینے پر راضی ہو بھی سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ منع کر دیں۔ بس خدا کا نام لے کر ہمارے حق میں دعا فرمائیں، نبی کی خاطر۔''

الفولی نے زور کا قہقہہ مارا اور عزام کا گھٹنا تھپتھپاتے ہوئے گرمجوشی سے بولا، ''واہ بڑے میاں، یہ بھی خوب رہی! کیا خیال ہے، اس طرح تمھاری باتوں میں آ جاؤں گا؟ جناب، ایجنسی آپ کو اسی ہفتے مل چکی ہے اور معاہدے والا فیکس جمعرات کو موصول ہو چکا ہے۔ ہاں، تو اب کیا فرماتے ہیں؟''

وہ خاموشی سے عزام کی طرف دیکھتا رہا پھر گمبھیر لہجے میں بولا، ''دیکھو حاج عزام، میرا نام کمال الفولی ہے اور میں تلوار کی دھار کی طرح سیدھا ہوں (اور اس نے ہاتھ کی حرکت سے اس استقامت کا مظاہرہ کیا)۔ میں اپنے قول سے نہیں پھرتا۔ میرے خیال میں تم اس کا تجربہ کر چکے ہو۔''

''خدا آپ کے الطاف و کرم کو قائم رکھے!''

''آخری بات بتاؤں؟ حاج، اس ایجنسی سے سالانہ تین سو ملین سے زائد کا منافع ہو گا۔ ظاہر ہے، خدا جانتا ہے میں آپ کی بہتری ہی چاہتا ہوں، لیکن یہ اکیلے آپ کے لیے بہت بڑا لقمہ ہے۔''

''یعنی؟'' عزام نے لہجے میں کسی قدر تیزی کے شائبے کے ساتھ کہا۔

الفولی نے اسے نظر گاڑ کر دیکھا اور بولا، ''اس کا مطلب ہے یہ سارا اکیلے آپ سے ہضم نہیں ہو سکے گا، حاج۔ ہمیں اس کا چوتھائی چاہیے۔''

''کس کا چوتھائی؟''

''منافعے کا چوتھائی۔''

''اس 'ہمیں' میں اور کون شامل ہے؟''

الفولی خوب زور سے ہنسا اور بولا، ''یہ کس قسم کا سوال ہے، حاج؟ تم اسی شہر میں پیدا ہوئے

Scanned with CamScanner

اور پلے بڑھے ہو اور تمھیں سب معلوم ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ میں ایک 'بڑے صاحب' کے نائب کے طور پر بول رہا ہوں۔ وہ 'بڑا صاحب' ایجنسی میں تمھارا شریک اور ایک چوتھائی منافعے کا حقدار بننا چاہتا ہے۔ اور یہ تم خوب جانتے ہو کہ 'بڑا صاحب' جو چاہتا ہے، اسے مل کر رہتا ہے۔''

❁

''مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی!'' حاج عزام کو جب کبھی وہ دن یاد آتا ہے، وہ یہ فقرہ دہراتا ہے۔

کمال الفولی کا مطالبہ قبول کر کے وہ اس شام کوئی دس بجے 'شیریٹن' سے رخصت ہوا۔ ہاں کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ اسے 'بڑے صاحب' کی طاقت کا اندازہ تھا، اگرچہ اسے ایک چوتھائی آمدنی میں شریک کرنے کے خیال ہی سے اس کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ مشقت کرے، تھکن سے چور ہو جائے، اپنی طرف سے لاکھوں خرچ کرے، اور جناب 'بڑے صاحب' بغیر کچھ کیے آ کر ایک چوتھائی منافع ہتھیا لیں! یہ نری دھاندلی اور ٹھگی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس نے نہایت طیش کے عالم میں خود سے کہا اور مصمم فیصلہ کیا کہ وہ کوئی نہ کوئی حل نکال کر اس ظلم کا خاتمہ کرے گا۔

جب گاڑی المہندسین میں اس کی قیام گاہ کی طرف جا رہی تھی، حاج عزام اپنے لڑکے فوزی کی طرف متوجہ ہوا اور کہا، ''اوپر جا کر اپنی والدہ سے کہنا کہ میں آج رات باہر رہوں گا۔ مجھے خاص طور پر الفولی کے معاملے میں کچھ لوگوں سے بات کرنی ہے۔''

فوزی نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا اور جب گاڑی ان کے اپارٹمنٹ پہنچی تو اپنے والد کے ہاتھ پر بوسہ دے کر اتر گیا۔ عزام نے لڑکے کا شانہ تھپتھپایا اور بولا، ''کل صبح سویرے دفتر میں ملیں گے، انشاءاللہ۔''

حاج عزام نے گاڑی کی سیٹ سے پشت ٹیکی اور راحت محسوس کی اور ڈرائیور سے کہا کہ اسے عمارتِ یعقوبیان لے چلے۔ جاپانی ایجنسی میں مشغولیت کے باعث اس نے کئی روز سے سعاد کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ اچانک اسے دیکھ کر متعجب ہوگی، وہ مسکرا دیا۔ وہ اسے کس حال میں پائے گا؟ اکیلی کیا کرتی ہوگی؟ وہ ایک رات اس کے ساتھ گزارنے کا کتنا مشتاق تھا، ایسی رات

Scanned with CamScanner

جو فکروں سے آزاد ہو اور جس کے بعد وہ صبح تازہ دم بیدار ہو! خیال آیا کہ کیوں نہ اس سے کار کے فون پر بات کی جائے تا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے تیار ہو جائے، لیکن پھر اس خیال کو رہنے دیا اور اچانک وارد ہونے کا فیصلہ کیا کہ دیکھے تو سہی، وہ اس کا استقبال کس طرح کرتی ہے۔

ڈرائیور نے گاڑی کا رخ موڑ دیا۔ حاج عزام اوپر اپارٹمنٹ پہنچا، آہستہ سے چابی گھمائی اور ہال کمرے میں داخل ہوا، جہاں اسے ڈرائنگ روم کی جانب سے ایک آواز آتی سنائی دی۔ وہ آہستہ قدم آگے بڑھا اور دیکھا کہ سعاد اپنے سرخ شب خوابی کے لباس میں صوفے پر پسری ہوئی ہے، بال گھنگرڈالنے کے بکلوں پر چڑھے ہوئے ہیں اور چہرے پر کریم تھپی ہے۔ وہ ٹیلی وژن دیکھ رہی تھی؛ اسے دیکھتے ہی زور سے خوش آمدید کہا، اپنی جگہ سے اچھل کر اٹھی، اور اسے چمٹاتے ہوئے بڑی خفگی سے بولی، ''میرے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہو، یا حاج؟ کم سے کم مجھے فون ہی کر دیا ہوتا تا کہ تیار ہو جاتی، یا تم مجھے اس وحشی حالت میں دیکھنے کے مشتاق ہو؟''

''بڑی زبردست نظر آ رہی ہو،'' حاج نے کہا، اس سے بھڑ گیا اور خوب کس کے اسے بھینچا۔ سعاد نے اس کی شہوت کی چبھن کو محسوس کیا، سر پیچھے ڈالا، اور اس کی گرفت سے پھسل کر نکلتے ہوئے بڑی مستی سے کہا، ''یا خدا، حاج، یہ کیا لونڈوں کی سی بے صبری دکھا رہے ہو! ٹھہرو تو سہی، ذرا غسلخانے تو ہو آؤں۔ میں نے تمھارے کھانے کے لیے کچھ پکایا ہے۔''

انھوں نے اپنی رات حسب معمول گزاری۔ سعاد نے کوئلے ڈال کر حقہ تیار کیا اور حاج نے حشیش کی کئی چلمیں پی ڈالیں۔ اس درمیان میں سعاد خود کو غسلخانے میں تیار کرتی رہی۔ حاج نے کپڑے اتارے، غسل کیا، اپنے برہنہ جسم پر سفید جلباب پہنا، اور اس کے ساتھ سویا۔ وہ اس قسم کے لوگوں میں سے تھا جو جنسی فعل کے ذریعے اپنی فکروں سے نجات پاتے ہیں، اور اس شب تو اس کی جنسی کارکردگی غیر معمولی طور پر گرم اور بڑھ چڑھ کر تھی، اتنی کہ فراغت کے بعد سعاد نے اسے چوما اور اس کی ناک سے ناک رگڑتے ہوئے سرگوشی میں کہا، ''**الدهن فی العتاقی!**'' [سارا تیل تو بس بڈھوں کے پاس ہوتا ہے!]

پھر اس نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا، پلنگ کی پشت سے پیٹھ ٹکائی اور تفریح لیتے ہوئے کہا، ''تمھارے لیے ایک بشارت ہے۔''

Scanned with CamScanner

''کیسی بجھارت؟''

''ارے، اتنی جلدی بھول بھی گئے! بجھارت، یا حاج۔ وہی جو تم نے کہا تھا کہ مجھ سے اپنی محبت کے ثبوت میں جو کچھ کہوں گی، کرو گے۔''

''ہاں، ٹھیک ہے۔ معاف کرنا۔ آج رات میرا دماغ اور باتوں میں لگا ہوا ہے۔ ہاں تو کہو، کیا بجھارت ہے؟''

سعاد نے چہرہ اس کے رخ کیا، اسے دیکھتی رہی لیکن خاموش ہی رہی، جیسے اس کے ردعمل کا اندازہ لگا رہی ہو۔ پھر ایک بڑی کشادہ سے مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری اور بولی، ''میں جمعے کو ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔''

''ڈاکٹر؟ خیر تو ہے؟''

''طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔''

''خدا سلامت رکھے۔''

وہ بڑے زور سے ہنسی اور بولی، ''نہیں، یہ بڑی اچھی بیماری نکلی۔''

''میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

''مبارک ہو، میری جان۔ دو ماہ کے حمل سے ہوں۔''

❄

ایک بہت بڑی گاڑی عمارتِ یعقوبیان کے سامنے آ کر رکی۔ یہ چاروں طرف سے بند تھی، سوائے چند چھوٹے سے سلاخ دار روزنوں کے۔ سپاہی طٰہ کو زدوکوب کرتے اور اپنے بھاری بوٹوں سے لاتیں مارتے ہوئے عمارت سے باہر لائے اور بند گاڑی میں دھکیلنے سے پہلے اس کی آنکھوں پر مضبوطی سے پٹی باندھ دی اور ہاتھ پیچھے کھینچ کر ہتھکڑیاں چڑھا دیں۔ طٰہ کو یوں لگا جیسے لوہے کے دباؤ سے اس کی جلد ادھڑنے لگی ہو۔ گاڑی اسیروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، جو سارا راستہ خوب زور زور سے ''لا الٰہ الا اللہ... اسلامی... اسلامی...'' کا ورد کرتے رہے، گویا اپنی چیخ و پکار سے اپنے خوف و ہراس اور اپنے تشنج پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

سپاہیوں نے انھیں چلانے دیا لیکن گاڑی اتنی تیز رفتاری سے جا رہی تھی کہ اسیر طلبا متعدد بار

Scanned with CamScanner

ایک دوسرے پر ڈھیر ہو جاتے رہے۔ پھر گاڑی اچانک ہی رک گئی اور انھیں کسی قدیم آہنی پھاٹک کے کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ گاڑی تھوڑی دور تک بڑی آہستہ رفتار سے آگے بڑھی اور دوبارہ رک گئی، پچھلا دروازہ کھلا اور سپاہیوں کا ایک جتھا، انھیں صلواتیں سناتا اور سب وشتم کرتا، ان پر حملہ آور ہو گیا۔ انھوں نے اپنے فوجی بوٹ اتار کر ان سے طلبا کی ٹھکائی شروع کر دی جو گاڑی سے باہر چیختے چلاتے ہوئے باہر آ گرے۔ پھر انھیں پولیس کے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں، جو فوراً ہی ان پر ٹوٹ پڑے۔ طٰہٰ نے ان سے دور بھاگ نکلنے کی کوشش کی لیکن ایک بھاری بھرکم کتے نے اسے آ دبوچا، زمین پر کھینچ لیا اور دانتوں سے اس کا سینہ اور گردن بھنبھوڑنے لگا۔ طٰہٰ زمین پر اوندھا ہو گیا تاکہ کتے کی کچلیوں سے اپنے چہرے کو بچا سکے۔ اسے خیال سا گزرا کہ یہ لوگ کتوں کو انھیں قتل تو نہیں کرنے دیں گے، لیکن اگر وہ مر بھی گیا تو سیدھا جنت میں جائے گا۔ وہ اسی حالت میں پڑا رہا اور دل ہی دل میں قرآنی آیتوں کا ورد کرتا رہا اور شیخ شاکر کے خطبوں کے بعض بعض حصوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس پر منکشف ہوا کہ اس کی جسمانی تکلیف جب اپنی معینہ حد کو پہنچ جائے گی، جو بڑی ہولناک بات تھی، تو اس کے بعد اس کا احساس بھی رفتہ رفتہ کم ہو جائے گا۔

پھر جیسے اشارہ پا کر کتے اچانک وہاں سے چل دیے اور وہ لوگ کچھ دیر تک وہیں صحن میں پڑے رہے۔ اب پھر سپاہیوں نے شدید مار پٹائی کا تازہ دور شروع کیا اور بعد میں ایک ایک کر کے ان کی قیادت کرتے ہوئے چلے۔ طٰہٰ کو محسوس ہوا کہ اسے ایک طویل سی راہداری میں آگے کی جانب دھکیلا جا رہا ہے۔ پھر ایک دروازہ کھلا اور وہ وسیع و عریض کمرے میں داخل ہوا جس کی فضا سگریٹوں کے دھوئیں سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے وہاں بیٹھے ہوئے افسروں کی آوازیں پہچان لیں جو آپس میں روزمرہ کی باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ ان میں سے ایک اس کے پاس آیا، اس کی گدی پر بڑی شدید ضرب لگائی، اور ٹھیک اس کے چہرے کے سامنے چلا کر پوچھا: ''جانِ مادر، کیا نام ہے؟''

''طٰہٰ محمد الشاذلی۔''

''کیا؟ مجھے سنائی نہیں دیا۔''

''طٰہٰ محمد الشاذلی۔''

''اور زور سے، رنڈی کی اولاد!''

Scanned with CamScanner

طٰہ نے چلا کر نام بتایا لیکن افسر نے اسے چانٹا مار کر دوبارہ پوچھا۔ یہ عمل تین بار دہرایا گیا۔ پھر ضربوں اور لاتوں کی بارش ہوئی حتیٰ کہ وہ زمین پر آ رہا۔ انھوں نے اسے کھینچ کر کھڑا کیا۔ اب پہلی بار ایک نرم سی بھاری آواز بلند ہوئی جو بڑے اعتماد اور ٹھہراؤ سے کہہ رہی تھی، ایسی آواز میں جو طٰہ ساری زندگی نہیں بھولنے والا تھا:

''بس بس، اتنی مار پیٹ کافی ہے، لوگو۔ لڑکا دیکھنے میں معقول اور ذہین معلوم ہوتا ہے۔ یہاں آؤ، لڑکے۔ قریب آؤ۔''

انھوں نے اسے آواز کے مصدر کی سمت میں دھکیل دیا، جس نے طٰہ کو یقین دلا دیا کہ یہ ان کا سربراہ ہے اور کمرے کے وسط میں ڈیسک کے پیچھے بیٹھا ہوا ہے۔

''میرے عزیز، تمھارا کیا نام ہے؟''

''طٰہ محمد الشاذلی۔''

وہ بڑی دشواری کے ساتھ بول رہا تھا اور منھ میں خون کا ترش و تیز ذائقہ محسوس کر سکتا تھا۔ سربراہ بولا، ''یا طٰہ، تم کسی شریف خاندان کے اچھے لڑکے نظر آتے ہو۔ بیٹے، تم یہ اپنے ساتھ کیا کر رہے ہو؟ دیکھو تو سہی، تمھاری کیسی درگت بنی ہے۔ اور یہ تو کچھ بھی نہیں۔ تم نے ابھی کچھ دیکھا ہی نہیں۔ تم ان سپاہیوں کو دیکھ رہے ہو؟ یہ رات پڑنے تک تمھارا کچومر نکالتے رہیں گے، پھر گھر جا کر کھانا کھائیں گے اور سو رہیں گے۔ اس درمیان دوسرے سپاہی آ کر صبح تک یہی وظیفہ ادا کریں گے۔ پھر صبح، پہلے والے واپس آ کر دوبارہ رات آنے تک ٹھکائی کریں گے۔ یہی سب تمھارے ساتھ جاری رہے گا۔ اور اگر تم مر گئے تو ہم تمھیں یہیں پر دفن کر دیں گے، ٹھیک یہیں جہاں تم اس وقت کھڑے ہو۔ ہمارے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ تم ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے، یا طٰہ۔ ہم حکومت ہیں! تم حکومت کا مقابلہ کر سکتے ہو، یا طٰہ؟ دیکھو تو سہی تم نے خود کو کس آفت میں ڈال دیا ہے! لڑکے، سنو۔ تم چاہتے ہو کہ میں تمھیں ٹھیک اسی لمحے چھوڑ دوں؟ تم گھر والوں کے پاس واپس جانا چاہتے ہو؟ تمھارا باپ اور ماں دیر سے تمھارے لیے فکرمند ہوں گے۔''

اس نے آخری جملہ کچھ اس طرح ادا کیا جیسے سچ مچ فکرمند ہو۔ طٰہ کو ایک شدید جھرجھری اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی، جسے دبانے کی اس نے بہت کوشش کی، لیکن جیسے وہ شل ہو کر رہ گیا ہو،

Scanned with CamScanner

اور اس کے منھ سے کسی جانور جیسی عوعو کی تیز آواز نکل گئی۔ اس کے بعد اس نے خود کو ایک گرم اور لگاتار آہ و بکا کے سپرد کر دیا۔ افسر اس کے قریب آیا اور شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا، ''نہیں، طٰہ۔ میرے عزیز، رووٗ نہیں۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے تم پر افسوس ہوتا ہے۔ سنو، ذہین لڑکے، ہمیں اپنی تنظیم کے بارے میں معلومات بہم پہنچا دو اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں فوراً چھوڑ دوں گا۔ کیا کہتے ہو؟''

طٰہ نے چلّا کر کہا، ''میری کوئی تنظیم نہیں۔''

''تو پھر اپنے ساتھ 'اسلامی عمل کا عہد نامہ' کیوں رکھے ہو؟''

''میں اسے پڑھ رہا تھا۔''

''یا عزیز، یہ تنظیم کی کتاب ہے۔ یا طٰہ، ہمارا رب تمھاری ہدایت کرے۔ بتاؤ، اس تنظیم میں تمھارے ذمے کیا کام ہیں؟''

''مجھے کسی تنظیم و نظیم کا علم نہیں۔''

بس پھر کیا تھا، زدوکوب از سرِ نو شروع ہو گئی، اور طٰہ کو محسوس ہوا کہ اس کی تکلیف ایک بار پھر اپنی ہولناک حد سے متجاوز ہو چکی ہے اور کسی ایسے خیال میں بدل رہی ہے جس کا ادراک گویا وہ اپنے باہر سے کر رہا ہو۔ افسر کی آواز آئی، ہمیشہ کی طرح پُرسکون، ''لڑکے، تم اپنا کیا حشر کر رہے ہو؟ جو جانتے ہو بتا دو اور اپنی جان چھڑاؤ۔''

''خدا کی قسم، باشا صاحب، مجھے کسی چیز کا علم نہیں۔''

''جیسی مرضی تمھاری۔ تمھاری نجات تمھارے ہاتھوں ہے۔ بس اتنا خیال رہے کہ یہاں اگر کوئی اچھا آدمی ہے تو صرف میں۔ دوسرے افسر سب کے سب یا کافر ہیں یا مجرم، اور وہ صرف زدوکوب پر بس نہیں کرتے، اس سے بھی زیادہ قبیح حرکتیں کرنے پر قادر ہیں۔ سو تم بتاتے ہو یا نہیں؟''

''خدا کی قسم، مجھے کچھ پتا نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تمھاری مرضی۔''

یہ کلمہ گویا خفیہ اشارہ تھا۔ اس کے ختم ہونے کی دیر تھی کہ طٰہ پر پھر ہر طرف سے ضربیں پڑنے لگیں۔ پھر اسے منھ کے بل زمین پر ڈال دیا گیا اور کئی ہاتھ اس کا جلباب الگ کر کے اس کے زیریں کپڑے کھینچ کر اتارنے لگے۔ وہ بھرپور طاقت سے ان کی مزاحمت کرنے لگا، لیکن انھوں نے مل کر

Scanned with CamScanner

ہاتھوں اور پیروں سے اس کے جسم کو جھکا دیا۔ دو موٹے موٹے ہاتھوں نے آگے بڑھ کر اس کے کولھے پکڑے اور انھیں جدا کیا۔ اسے کوئی ٹھوس، سخت سی چیز پیچھے سے اپنے اندر داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی، جس نے اس کی اندرونی نسیج کو پھاڑ ڈالا اور وہ درد کی شدت سے چلّانے لگا۔ وہ اس وقت تک چلاتا رہا جب تک اسے محسوس نہ ہو گیا کہ نرخرہ پھٹنے کو ہے۔

❁

جاڑوں کے آتے آتے عبدہ نے اپنی نئی زندگی شروع کر دی۔

مرکزی سکیورٹی کے محکمے میں اس کی قومی خدمت کی میعاد ختم ہوئی اور اس نے اپنی فوجی وردی ہمیشہ کے لیے اتار کر مغربی لباس اختیار کر لیا اور نئے کیوشک میں کام شروع کر دیا۔ زیادہ دن نہیں گزرنے پائے تھے کہ اس نے اپنی بیوی ہدیہ اور بیٹے وائل کو، جو ابھی تک دودھ پیتا بچہ ہی تھا، صعید سے اپنے پاس بلا لیا۔ یہ سب عمارتِ یعقوبیان کی چھت پر ہی ایک کمرے میں رہنے لگے جو حاتم رشید نے انھیں کرائے پر لے دیا تھا۔ عبدہ کی صحت بہتر ہو گئی، وزن بھی کچھ بڑھ گیا، اور وہ اپنی جگہ پر جم جما گیا۔ بھرتی کے سپاہیوں کی کم خوراک یافتہ اور قابلِ رحم حالت سے نجات ملی تو اب وہ قاہرہ کے کسی جوان، کامیاب دکاندار کی طرح نظر آنے لگا، خود اعتمادی اور توانائی سے بھرپور (اگرچہ اس کا صعیدی، ثقیل لب و لہجہ، لمبے لمبے گندے ناخن، تمبا کو نوشی سے زرد اور غذا کی باقیات کے ریشوں سے بھرے دانت، جنھیں وہ کبھی صاف نہیں کرتا تھا، جوں کے توں رہے)۔ سگریٹوں، چوسنے والی مٹھائیوں اور لطیف مشروبات کی فروخت سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی، اور چھت والوں نے عبدہ اور اس کے چھوٹے سے کنبے کو اسی لیے دیے پن اور مجسسانہ خوش آمدید کے ساتھ قبول کر لیا جس طرح وہ ہر نئے ہمسائے کو کر لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ اس کی بیوی ہدیہ کو اس کی نازک اندامی، اس کے سیاہ جلباب، اس کی گہری رنگت، ٹھوڑی کے نیچے گودے ہوئے تاریک سے نقش، اس کے صعیدی پکوان (باجرے کی روٹی اور بھنڈی) کے ساتھ پسند کرنے لگے، اور اس کا اسوانی لب و لہجہ جس کی ہنس ہنس کے نقل اتارنا انھیں بہت بھاتا تھا۔

عبدہ نے اپنے ہمسایوں کو بتایا کہ وہ حاتم رشید کی باورچی گیری کرتا ہے، لیکن انھوں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا کیونکہ وہ حاتم رشید کی ہم جنس پرستی سے باخبر تھے، اور اس لیے کہ وہ ہفتے میں کم

Scanned with CamScanner

از کم دو راتیں اس کے یہاں ضرور گزارتا تھا۔ وہ آپس میں مزے لے لے کر ان 'شبانہ ضیافتوں' کا ذکر کرتے جو عبدہ اپنے آقا کے لیے تیار کرتا ہوگا۔ وہ حقیقت سے واقف بھی تھے اور اسے قبول بھی کرتے تھے۔ عام طور پر کسی کجرو کے ساتھ ان کے برتاؤ کا دارومدار اس پر تھا کہ وہ انھیں کتنا پسند آتا ہے۔ اگر اس سے نفرت کرتے تو نیک چلنی کی مدافعت میں اس کے خلاف کھڑے ہو جاتے، اس کے ساتھ سخت جھگڑا ٹنٹا کرتے اور اپنے بچوں کو اس کے پاس پھٹکنے نہ دیتے۔ اس کے برخلاف، اگر وہ شخص پسند آجاتا، جس طرح عبدہ پسند آ گیا تھا، تو وہ اس سے درگزر کرتے، اور اس طرح برتاؤ کرتے گویا وہ راہِ راست سے بھٹک گیا ہو اور قابلِ رحم ہو، اور ایک دوسرے کو اطمینان دلاتے کہ آخرکار قسمت ہی سب کچھ ہے اور کیا بعید کہ ربنا سبحانہ وتعالیٰ کسی دن اسے راہ ہدایت پر لے آئے، اور یہ بھی کہ 'کتنے دوسرے اس سے بھی زیادہ خراب تھے لیکن ہمارے رب نے ان کی ہدایت فرمائی اور تحریک دلائی اور وہ ولیوں کے رتبے کو پہنچے۔' وہ ہونٹ چٹخارتے اور اس کی ہمدردی میں سر ہلاتے ہوئے یہ سب کہتے۔

عبد ربہ کی زندگی تقریباً کسی مشکل کے بغیر گزر رہی تھی لیکن اپنی بیوی ہدیہ سے اس کے تعلق میں تناؤ کی کیفیت آ گئی تھی۔ وہ اپنی آرام دہ نئی زندگی سے خوش تھی، لیکن دونوں کے درمیان کوئی گہری اور نکیلی چیز شعلے کی طرح اندر ہی اندر سلگتی رہی، کبھی بھڑک اٹھتی، کبھی ماند پڑ جاتی، کبھی بالکل ہی نظر سے چھپ جاتی، لیکن دائم موجود رہتی۔ جب وہ حاتم کے ساتھ شب باشی کے بعد صبح اس کے پاس آتا تو شرمندہ اور برہم برہم سا ہوتا، اس سے نظریں چراتا اور اس کی معمولی سے معمولی غلطی پر بڑی شدید سرزنش کرتا۔ وہ بڑی حزنیہ مسکراہٹ سے اس کے غیظ وغضب کا مقابلہ کرتی جو اسے اور بھی آگ لگا دیتا، حتیٰ کہ وہ چلّا کر کہتا: ''کچھ کہہ بھی، گونگی گائے!''

''خدا تمھیں معاف کرے،'' ہدیہ نرمی سے جواب دیتی اور اس کے سامنے سے ہٹ جاتی، حتیٰ کہ اس کا غصہ فرو ہو جاتا۔ جب وہ بستر میں ہوتے تو ٹھیک جولانی کے لمحے میں اکثر عبدہ کو اپنے یار حاتم کا خیال آ جاتا اور اسے یوں لگتا جیسے ہدیہ اس کے خیالات کو پڑھ رہی ہو، پھر وہ اپنے سارے اضطراب اور قلق کو اس کے جسم میں دفن کر دیتا، بڑے تشدد کے ساتھ اس سے جفتی کرتا، گویا کسی نہ کسی طرح اسے سوچنے سے باز رکھ سکے، یا اس بات کی سزا دینے کے لیے اس پر حملہ آور ہو کہ وہ کیوں اس

کی ہم جنس پرستی سے آگاہ ہے۔ جب فارغ ہوتا تو پشت کے بل لیٹ کر سگریٹ سلگا لیتا اور کمرے کی چھت کو گھورنے لگتا، اور ہدیہ اس کے پہلو میں پڑی رہتی، اور وہ نکیلی شے دونوں کے درمیان اسی طرح انکی رہتی، جو نہ بھلائی جاسکتی تھی نہ جس کی طرف اشارہ ہی کیا جاسکتا تھا۔

فقط ایک بار عبدہ نے اپنی کسی پراسرار اندرونی تحریک کا کہا مانا۔ وہ اس تجاہل سے اتنا تھک گیا تھا اور بات اس کے دل پر ایسا بوجھ بن گئی تھی کہ اس نے اس اذیت ناک مجہولیت میں پڑے رہنے کے بجائے اپنے دل کی گہرائیوں سے ہدیہ سے دوبدو ہونا چاہا۔ کاش وہ پھٹ پڑے اور اس پر لوطی ہونے کا الزام دھرے، اور وہ اس بوجھ سے آزاد ہو جائے، سب کچھ اس کے سامنے کھول کر رکھ دے، کہہ دے کہ حاتم سے استغنا اس کی بساط سے باہر ہے، کیونکہ وہ اس کے پیسے کا محتاج ہے۔ چنانچہ اس نے اچانک کہا، ''ہدیہ، جانتی ہو، حاتم بک بڑا اچھا انسان ہے۔''

...

''کاش تم جانتیں کہ اس کے دل میں ہمارا کتنا درد ہے!''

...

''خاموش کیوں ہو؟''

''اس لیے کہ نہ وہ اچھا ہے نہ برا ہے۔ قصہ بس اتنا ہے کہ تم ایماندار ہو اور وہ تم پر اعتماد کرتا ہے۔''

یہی حجت وہ ہمسایوں کے ساتھ استعمال کرتی تھی، اور یہی اس وقت اس نے بڑی تندی سے استعمال کی، کیونکہ عبدہ نے اس کے اس تجاہل عارفانہ کو مجروح کر دیا تھا جو اسے شرمساری سے بچائے ہوئے تھا۔ عبدہ اپنے یوں پھٹ پڑنے پر قدرے نادم ہوا اور نرمی سے بولا، ''خیر کچھ بھی سہی، محترمہ، ہمیں اس کی عنایات کا شکر بجا لانا چاہیے۔''

''عنایات ونایات کچھ نہیں۔ آدمی جو کرتا ہے اپنے فائدے کے خیال سے کرتا ہے۔ یہ تمھیں بھی معلوم ہے اور مجھے بھی۔ خدا حاتم اور اس کی ملازمت اور ہر وہ دن جو ہم نے اس کے ساتھ گزارا ہے، اس کے لیے ہمیں معاف فرمائے۔''

بیوی کے الفاظ اسے گراں گزرے اور اس نے خاموشی میں پناہ ڈھونڈی۔ منھ دیوار کی طرف کر لیا، جس پر ہدیہ کو اس پر رحم آ گیا۔ وہ اس سے قریب ہوئی، اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا،

Scanned with CamScanner

اسے چوما، اور بڑی نرمی سے سرگوشی میں کہا، ''وائل کے باپ، خدا تمھیں ہمارے سروں پر سلامت رکھے اور ہمیں حلال کی روٹی دے۔ کاش تم نے کچھ پیسہ بچا لیا ہوتا جس سے اپنا کیوسک خود خرید لیتے اور تمھیں کسی کی حاجت نہ رہتی، نہ حاتم کی اور نہ کسی دوسرے کی۔''

❁

کسی بڑی استعماری طاقت کی طرح ملاک خلہ کا ہدف زیادہ سے زیادہ توسیع اور قبضہ ہے۔ کوئی مسلسل اندرونی طاقت اسے ہر اس چیز پر قبضہ جما لینے کے لیے اکساتی ہے جس پر اس کا ہاتھ پڑ جائے، اس سے غرض نہیں کہ اس کی کیا قدر و قیمت ہے اور اس کے حصول کے لیے کیا ذرائع استعمال کرنے پڑتے ہیں۔

چھت پر وارد ہونے کے بعد سے اس نے ہر سمت میں پر پھیلانا نہیں چھوڑا ہے۔ معاملہ ایک چھوٹے سے غسلخانے سے شروع ہوا جو رقبے میں ایک مربع میٹر جتنا تھا اور داخلے کے دائیں جانب تھا۔ اس کو دیکھنے کی دیر تھی کہ ملاک نے اس پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ گتے کے خالی ڈبے اس کے سامنے رکھنے شروع کر دیے، پھر ان میں سے چند خود غسلخانے کے اندر، اور رفتہ رفتہ اس پر ایک بھاری تالا ڈال کر اس کی کنجی اس بہانے اپنی جیب میں رکھنے لگا کہ اگر غسلخانہ کھلا رہا تو اندر رکھی ہوئی اشیا کے چوری ہونے کا امکان تھا۔

غسلخانے کے بعد اس نے چھت کے ایک بڑے حصے پر قبضہ جمایا اور اسے سلائی کی پرانی، ٹوٹی پھوٹی مشینوں سے بھر دیا اور چھت کے مکینوں سے (جو یہ معاملہ دیکھ کر کافی جز بز تھے) کہا کہ یہ مشینیں کسی کے انتظار میں رکھی ہیں جو اولین فرصت میں آ کر انھیں درست کرنے کے لیے لے جائے گا۔ لیکن یہ شخص وقتِ موعود پر کبھی نہ پہنچتا اور عین موقعے پر ملاک کو فون کر دیتا کہ اچانک کوئی کام نکل آیا ہے اور تاکید سے کہتا کہ ایک ہفتے یا زیادہ سے زیادہ دو ہفتے بعد مشینیں لینے ضرور آ رہا ہے۔ اس طرح ملاک معاملے کو ٹالتا گیا یہاں تک کہ امرِ واقع کے طور پر اس پر قابض ہو گیا۔ لیکن جہاں تک چھت کی دیوار کے جوف کا تعلق ہے، تو وہ اس نے ایک ہی جھپٹے میں ہتھیا لیا۔ وہ تین بڑھئی بلا لایا، جنھوں نے گھنٹے بھر میں ایک چوبی دروازہ بنا کر پورے جوف کا منھ ڈھانپ دیا۔ ملاک نے اس پر تالا لگا کر چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔ سو یوں اس نے اپنا مال کی ذخیرہ اندوزی کے لیے ایک اضافی الماری دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں سے برآمد کر لی۔

Scanned with CamScanner

ان معرکوں کے دوران وہ کسی منجھے ہوئے سیاستداں کی طرح چھت پر بسنے والوں کی برہمی اور اعتراضات کو جس طرح بھی ہو اپنے میں جذب کر لیتا تھا، معاملے کی اہمیت کو گھٹا کر انھیں دب کر ٹھنڈا کر لینے سے لے کر، اگر ضرورت آ پڑے (گو ایسا کم ہی ہوتا)، شدید جھگڑے بازی تک۔ اس میں اچھی قسمت نے اس کا ساتھ دیا۔ حامد حواس، حکومت کے قریب قریب ہر افسر سے شکوہ شکایت کرنے کے بعد، اپنے زبردستی کے قاہرہ تبادلے کو منسوخ کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اپنے اصلی وطن المنصورہ جا چکا تھا۔ یوں ملاک کو ایک اڑیل حریف کی جانب سے اطمینان ہو گیا جو چھت پر اس کے توسیعی منصوبوں میں واقعی کھنڈت ڈال سکنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

لیکن غسلخانے اور الماری جیسی چھوٹی موٹی فتوحات سے ملاک کی زمینی املاک کے حصول کی ہوس کی تسکین کسی اعلیٰ فوجی افسر کی شطرنج میں کامیابی سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ تو کوئی بہت بڑا ہاتھ مارنے کے خواب دیکھ رہا تھا جس سے بہت بڑی رقم ہاتھ آئے۔ مثلاً زمین کا کوئی بہت نفیس قطعہ قبضے سے ملکیت میں آ جائے، یا کوئی بہت بڑا اپارٹمنٹ جس کا مکین مر چکا ہو اور وہ خود اس کا مالک بن جائے۔ یہ آخری صورت حال وسطِ شہر کے علاقے میں کافی عام تھی۔ اکثر کوئی غیر ملکی بڈھا، تن تنہا اور بغیر کنبے کنبے کے، مر جاتا اور مصریوں میں سے جو فرد اس سے قریب ترین ہوتا — جیسے اس کا دھوبی، باورچی، یا اس کی نوکرانی کا شوہر — وہ اپارٹمنٹ کو اپنے قبضے میں لے لیتا۔ وہ فوراً اس میں آ بستا، پھر عرضی لکھتا کہ وہ اس کا باسی ہے۔ جگہ کے تالے بدلوا دیتا، اور شہادت کے طور پر وہاں کے پتے پر اپنے نام رجسٹری ڈاک سے خط بھیجتا، جھوٹے گواہ جوڑ کر ان سے عدالت کے سامنے گواہی دلواتا کہ وہ مرحوم غیر ملکی کے ساتھ ہمیشہ سے اسی جگہ رہ رہا ہے۔ پھر وہ عمارت کے مالک کے خلاف کارروائی کے لیے وکیل رکھ کر اس سے طویل اور آہستہ خرام مقدمے کی پیروی کراتا، یہاں تک کہ آخر میں مالک ایسے تصفیے پر بہ جبر و اکراہ تیار ہو جاتا جو اپارٹمنٹ کی اصلی قیمت سے کہیں کم ہوتا۔

کوئی ایسا ہی بڑا داؤ مارنے کی امید ملاک کے خوابوں سے اسی طرح کھیلتی جس طرح بادِ نسیم درخت کی شاخوں سے۔ اس نے عمارتِ یعقوبیان کے اپارٹمنٹوں کا قبضے کی نیت سے جائزہ لیا تو لگا کہ اگر کوئی اپارٹمنٹ ہاتھ آ سکتا ہے تو وہ زکی الدسوقی ہی کا ہے۔ اس کے چھ کمرے تھے، ایک بڑی بیٹھک، دو غسلخانے، اور ایک کشادہ بالکنی جو سلیمان باشا کی طرف کھلتی تھی۔ زکی غیر شادی شدہ اور

Scanned with CamScanner

بوڑھا آدمی تھا اور کسی لمحے بھی مر سکتا تھا۔ اپارٹمنٹ کرائے کا تھا اور کرائے کی رہائش ورثا کو نہیں ملتی۔ پھر یہ بھی کہ اس میں اس کے بھائی اسٹروون کی موجودگی کے باعث نازک لمحہ آنے پر ملاک کے لیے اس پر قبضہ کرنا آسان ہو جائے گا۔

کافی غور و فکر اور وسیع قانونی مشوروں کے بعد ملاک نے اپنا منصوبہ پکا کر لیا: زکی الدسوقی کے ساتھ ایک معدوم کمپنی کے نام سے معاہدہ کرے گا، اور اسے دفترِ املاک میں رجسٹر کرا کے چھپا دے گا اور زکی کی وفات کے بعد نکالے گا۔ اُس وقت اسے فوت شدہ زکی کے تجارتی شریک کی حیثیت سے اپارٹمنٹ سے بے دخل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ معاہدے پر زکی سے دستخط کیسے کرائے جائیں۔ یہاں اسے بثینہ السید کا خیال آیا۔ عورتیں زکی الدسوقی کی کمزوری تھیں، اور ایک شاطرہ اسے غافل کر کے اس سے یوں دستخط کروا سکتی تھی کہ اسے پتا بھی نہ چلے۔ ملاک نے بثینہ کو زکی الدسوقی سے دستخط کروانے کے لیے پانچ ہزار پاؤنڈ کی پیشکش کی اور دو دن اس پر غور کرنے کی مہلت دی۔ اگرچہ اسے پورا یقین تھا کہ بثینہ ہاں کر دے گی، پھر بھی اس نے خود کو اس کی قبولیت کا بہت زیادہ مشتاق ظاہر نہ ہونے دیا۔ جیسا کہ اس کی توقع تھی، بثینہ راضی تھی، تاہم اس سے براہ راست اور صاف صاف پوچھا، ''اگر میں معاہدے پر زکی الدسوقی کے دستخط کروالاؤں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم رقم ادا کر دو گے؟''

ملاک پہلے سے ہی جواب تیار کیے ہوئے تھا، جلدی سے بولا، ''اِس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے۔ جب تک تمھاری پوری رقم نہ مل جائے، معاہدے کو اپنے پاس رکھنا۔''

بثینہ مسکرائی اور بولی، ''بالکل۔''

❋

بثینہ کیوں رضامند ہو گئی؟

لیکن انکار بھی کیوں کرتی؟ پانچ ہزار پاؤنڈ اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔ اس سے وہ اپنے بہن بھائیوں کی ضرورتیں پوری کر سکتی ہے اور اپنی شادی کے لیے کپڑے اور تمام ضروری اشیا تیار کر سکتی ہے۔ اسی طرح زکی الدسوقی کے مرنے پر اپارٹمنٹ ملاک کو مل جائے گا اور مرے ہوئے کو کچھ پتا نہیں چلے گا کہ اس کے ساتھ کیا کیا گیا ہے، پھر یہ کہ وہ اسے کوئی اذیت بھی نہیں پہنچا رہی ہوگی کیونکہ وہ

Scanned with CamScanner

تو مر چکا ہو گا۔ اور اگر پہنچا بھی رہی ہو تو اس پر رحم کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ بالآخر وہ ایک غیر شادی شدہ، فارغ البال بوڑھا آدمی ہے اور اِدھر اُدھر آنکھیں سینکتا پھرتا ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو وہ اس کا مستحق ہے۔

لوگوں سے ہمدردی اب بثینہ میں مفقود ہو چکی تھی اور اس کے احساسات پر لاتعلقی کی دبیز پرت جم گئی تھی، اور اس برہمی کی جو تھکے ماندوں، نامرادوں اور کجرو لوگوں کو آلیتی ہے اور انھیں دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے سے باز رکھتی ہے۔ مسلسل کوشش سے وہ ضمیر کے کچوکوں سے اپنے احساس کا دامن چھڑانے میں کامیاب ہو گئی تھی، اور اپنے اس احساس جرم کو ہمیشہ کے لیے دفن کر چکی تھی جو اسے طلال کے سامنے اپنے کپڑے اتارتے اور بعد میں ان پر سے اس کی نجاست کو دھو کر صاف کرتے اور ہاتھ آگے بڑھا کر دس پاؤنڈ وصول کرتے وقت محسوس ہوا تھا۔ وہ زیادہ بے رحم، تلخ اور دلیر ہو گئی تھی، یہاں تک کہ اسے اس کی بھی بالکل پروا نہیں رہی تھی کہ چھت کے مکین اس کی عزت آبرو کی بابت کیا چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ وہ ان کی شرمناک حرکتوں اور فضیحتوں سے اتنی زیادہ واقف تھی کہ ان کے ہوتے ہوئے ان کی پاکبازی کی نمائش ایک مضحکہ خیز چیز بن جاتی تھی۔ اگر اس نے پیسوں کی خاطر طلال سے تعلق کیا تھا، تو اسے چھت کی ایسی عورتوں کا بھی علم تھا جو صرف لذت کوشی کی خاطر اپنے شوہروں سے جنسی بے وفائی کرتی تھیں۔ اور ہزار باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ وہ ہنوز باکرہ ہے اور کسی بھی باعزت مرد سے شادی کر سکتی ہے اور اپنی برائی کرنے والے کی زبان کاٹ دینے کی اہل ہے۔

بثینہ نے زکی الدسوقی کے یہاں کام کرنا شروع کر دیا تھا اور اسے دھوکا دے کر معاہدے پر دستخط کروانے کے لیے مناسب موقعے کی تاک میں تھی، لیکن یہ اتنا آسان کام نہیں تھا، کیونکہ وہ اتنا قابلِ نفرت بڈھا آدمی نہیں تھا جتنا وہ تصور کیے بیٹھی تھی۔ اس کے برعکس، وہ ایک مہربان اور مہذب آدمی تھا اور اس کے ساتھ احترام سے پیش آتا تھا۔ اس کے ساتھ ہوتے ہوئے اسے کبھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اجرت کے عوض کام کر رہی ہے، جیسا کہ طلال کے ساتھ ہوتا تھا، جو اسے برہنہ کر کے اس سے ایک لفظ بھی کہے بغیر اس کے جسم پر دست درازی کرتا تھا۔ زکی اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتا تھا۔ وہ اس کے گھر والوں سے واقف ہو گیا تھا، اس کے چھوٹے بہن بھائیوں سے محبت کرتا اور انھیں بہت سے قیمتی تحائف خرید کر دیتا۔ وہ بثینہ کے جذبات کا احترام کرتا، جو وہ کہتی اسے دلچسپی سے

سنتا اور گزرے وقتوں کے مزیدار قصے اسے سناتا۔

حتیٰ کہ بستر میں بھی اسے زکی سے تنفر کا وہ احساس نہیں ہوتا تھا جو طلال سے ہوتا تھا۔ وہ بڑی نرمی اور گدازی سے اسے چھوتا، اس خوف سے کہ کہیں اس کی انگلیاں بثینہ کو کوئی تکلیف نہ پہنچا دیں، جیسے وہ کسی گلاب کے پھول سے کھیل رہا ہو اور ذرا سے دباؤ سے اس کی پنکھڑیاں بکھر جانے کا اندیشہ ہو۔ وہ اس کے ہاتھوں کو بار بار چومتا (بثینہ کو کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ کوئی مرد اس کے ہاتھ چومے گا)، اور جب پہلی رات ان کے جسم ایک دوسرے کے قریب آئے تو اس نے آہستہ سے سرگوشی کی تھی، ''خیال رکھنا، میں کنواری ہوں۔'' اور اس نے ہنس کر بڑے دھیرے سے کہا تھا، ''مجھے معلوم ہے۔''

پھر زکی نے اسے چوما تھا اور بثینہ کو اپنا پورا جسم اس کی آغوش میں پگھلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اپنی عشقیہ گرمجوشی کے اظہار کا اس کا اپنا ہی سحر انگیز انداز تھا۔ وہ جولانی اور وفور کی جگہ تجربے سے کام لیتا، جیسے کہ وہ کوئی پرانا کھلاڑی ہو جو ضعفِ اہلیت کا ازالہ اعلیٰ مہارتوں سے کر رہا ہو۔ بثینہ تمنا کرتی کہ وہ شخص جس سے کسی دن وہ بندھنے والی ہے، اتنا ہی شائستہ و نرم ہو۔ لیکن اس کے ساتھ اپنی روز افزوں شیفتگی پر وہ کچھ برہم بھی ہو جاتی کیونکہ وہ اس کے وجود کی گہرائیوں میں احساسِ جرم کو ابھارتی تھی: اس کی عنایتوں کے عوض وہ اس سے خیانت کر رہی تھی اور اسے تکلیف پہنچا رہی تھی۔ یہ کریم آدمی، جو اس کے ساتھ مہر و عنایت اور التفات کا سلوک کر رہا تھا، جس نے اس پر اپنی زندگی کے راز منکشف کر دیے تھے، کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس کے مرنے کے بعد اپارٹمنٹ پر قبضہ جمانے کی تیاری کر رہی ہے۔ وہ یہ سوچ کر اپنے سے نفرت اور کراہت محسوس کرنے لگتی، اور اس کو دھوکا دینے کے خیال سے اسے اتنی ہی ناگواری محسوس ہوتی جتنی اس سرجن کو ہوتی ہوگی جسے خود اپنی بیوی اور بچوں کا آپریشن کرنا پڑ جائے۔ اس نے کئی بار، جب وہ مخمور ہو گیا تھا، اس سے معاہدے پر دستخط کروانے کا ارادہ باندھا، لیکن پھر عین موقعے پر ہچکچا کر رہ گئی۔ وہ یہ کام انجام نہیں دے سکے گی اور بعد میں تعجب سے خود کو ملامت کرے گی اور اپنے بودے پن پر جھنجھلائے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک طرف بوڑھے زکی سے اس کی شفقت اور اس کا احساسِ گناہ اور دوسری طرف اس کی حصولِ زر کی واضح طمع اس کے اندر مساوی طاقت سے ایک دوسرے سے مسلسل

Scanned with CamScanner

برسرِ پیکار رہے، یہاں تک کہ آخر کار اس نے اپنے ارادے کی ساری قوت کو مجتمع کر کے معاملے کو یکسو کرنے اور زکی سے پہلی فرصت میں دھوکا دہی کے ساتھ معاہدے پر دستخط کروا لینے کا فیصلہ کر ڈالا۔

❁

''تم نے دیکھا، میرے سارے سوٹ سردیوں کے ہیں۔ میں سردیوں میں دعوتوں میں شریک ہوتا تھا اور گرمیوں میں یورپ کا سفر کرتا تھا۔''

وہ 'میکسم' کے طعام خانے میں رات کا کھانا کھا چکنے کے بعد بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کا نصف حصہ گزر چکا تھا اور جگہ وہاں آنے والوں سے خالی ہو گئی تھی۔ بثینہ نیلے رنگ کا نیا نیا لباس پہنے تھی جس میں سے اس کا دمکتا ہوا گلا اور چھاتیوں کے درمیان کی وادی نظر آ رہی تھی، اور زکی اس کے برابر بیٹھا وِسکی کی چسکیاں لے رہا تھا اور اسے پرانی تصویروں کا مجموعہ دکھا رہا تھا۔ تصویروں میں وہ ایک چاق و چوبند، حسین و جمیل نوجوان نظر آ رہا تھا، ہاتھ میں گلاس تھامے ایسے جمگھٹے میں کھڑا مسکرا رہا تھا جس میں مرد مکمل لباس میں تھے اور حسین عورتیں شام کے ایسے گاؤن پہنے تھیں جو سب کچھ عیاں کیے دے رہے تھے۔ ان کے سامنے میزیں مختلف کھانوں اور بڑی نفیس شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بثینہ بڑے اشتیاق سے تصویریں دیکھ رہی تھی، پھر ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے زور سے ہنسی اور کہا، ''یہ کیا ہے؟ یہ بڑا عجیب و غریب سوٹ ہے!''

''یہ شام کا سوٹ ہے۔ پہلے ہر موقعے کی مناسبت سے خاص سوٹ ہوا کرتا تھا۔ صبح کا سوٹ دوپہر کے سوٹ سے مختلف ہوتا تھا، اور دوپہر کا سوٹ شام کے سوٹ سے۔''

''جانتے ہو، تم بڑی اچھی شکل و صورت کے تھے۔ انور وجدی سے مشابہ۔''

زکی نے قہقہہ مارا۔ ایک لمحے خاموش رہا، پھر بولا، ''بثینہ، میں نے بڑے اچھے دن گزارے ہیں۔ وہ زمانہ مختلف تھا۔ قاہرہ بالکل یورپ کی طرح تھا۔ بہت صاف ستھرا اور حسین و جمیل۔ لوگ مودب اور مہذب تھے، اور کبھی کوئی حد سے تجاوز نہیں کرتا تھا۔ خود میں بھی بہت مختلف ہوا کرتا تھا۔ زندگی میں میرا ایک مقام تھا، میرے پاس پیسہ تھا، اور میرے سارے احباب ایک مخصوص اور متعین سطح کے لوگ تھے۔ شامیں گزارنے کی میری مخصوص جگہیں تھیں: 'آٹوموبیل کلب'، 'محمد علی کلب'، 'جزیرہ کلب'۔ کیا زمانہ تھا! ہر رات ہنسی قہقہوں، دعوتوں، پینے پلانے اور موسیقی سے لبریز ہوا کرتی

تھی۔ قاہرہ غیر ملکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مرکز شہر میں رہنے والے زیادہ تر یہی غیر ملکی تھے، یہاں تک کہ 1956 میں عبدالناصر نے انھیں نکال باہر کیا۔''

''کیوں نکال باہر کیا؟''

''پہلے یہودیوں کو نکالا۔ بقیہ غیر ملکی خوف کے مارے خود ہی چلے گئے۔ ارے ہاں، ناصر کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟''

''کیا رائے ہو سکتی ہے؟ میں اس کے مرنے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ عظیم آدمی تھا۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ وہ مجرم تھا۔''

''مصر کی ساری تاریخ میں ناصر بدترین حکمران تھا۔ اس نے ملک کو تباہ کر دیا اور ہمیں شکست اور غربت سے دوچار کیا۔ اس نے مصری کردار کو جس طرح پامال کیا ہے، اسے درست ہونے کے لیے برسہابرس درکار ہوں گے۔ ناصر نے مصریوں کو بزدلی، ابن الوقتی، اور منافقت کا سبق پڑھایا۔''

''تو پھر لوگ اسے اتنا کیوں چاہتے ہیں؟''

''کون کہتا ہے کہ لوگ اسے چاہتے ہیں؟''

''میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتی ہوں جو اسے چاہتے ہیں۔''

''ناصر کو وہی چاہ سکتا ہے جو یا جاہل ہے یا جس نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ 'احرار' افسر معاشرے کی تلچھٹ سے آنے والے لونڈوں کا جتھا تھے، قلاش اور قلاشوں کی اولاد۔ نحاس باشا اچھا آدمی تھا اور دل سے غریبوں کی فکر کرتا تھا۔ اس نے انھیں عسکری کالج میں داخل ہونے کی اجازت دے دی: نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے وہاں جا کر 1952 کا انقلاب برپا کر دیا۔ مصر پر حکمرانی کی، اس پر ڈاکا ڈالا، اسے لوٹا اور لاکھوں بنائے۔ ظاہر ہے، یہ ناصر سے محبت ہی کریں گے، ان کا گروگھنٹال جو تھا۔''

وہ بڑی تلخی سے بول رہا تھا اور اشتعال سے اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ اس کا احساس کرتے ہوئے اس نے ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ لا کر کہا، ''اب تم نے کیا گناہ کیا ہے جو میں سیاست پر لیکچر دے کر تمھارا دماغ چاٹ رہا ہوں؟ کیا خیال ہے، کوئی شیریں سا نغمہ سنو گی؟ کرستین، براہ کرم یہاں آؤ! پلیز!''

کرستین بار کے قریب ہی اپنے چھوٹے سے ڈیسک کے پاس آنکھوں پر چشمہ چڑھائے

اپنے حساب کتاب میں منہمک تھی۔ یہ اس نے جان بوجھ کر کیا تھا تا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ تنہا چھوڑ دے۔ اب وہ چہرے پر بڑی کشادہ مسکراہٹ لیے ہوئے ان کے پاس آئی۔ اسے زکی سے اس درجہ محبت تھی کہ جب بھی اسے مسرور دیکھتی تو واقعی خوشی سے کھل اٹھتی، اور اسے بثینہ بھی بہت بھانے لگی تھی۔ زکی نے سرمستی کے عالم میں اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر فرانسیسی میں کہا، ''کرستین، ہم پرانے دوست ہیں، ہیں نا؟''

''بالکل۔''

''اچھا، تو جو کچھ مانگوں، فوراً مجھے دو گی، دو گی نا؟''

کرستین ہنس دی اور بولی، ''یہ فرمائش کی نوعیت پر منحصر ہے۔''

''فرمائش کچھ بھی ہو، تمھیں پوری کرنی ہو گی۔''

''جب تم وِسکی کی آدھی بوتل چڑھا چکے ہو، جیسا کہ اِس وقت، تو مجھے تمھاری فرمائشوں سے محتاط رہنا ہوگا۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم ہمارے لیے گاؤ، ابھی ابھی۔''

''گاؤں؟ اِس وقت؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

دونوں کے درمیان گفتگو کی یہ روش ہمیشہ کی بات تھی، یوں جیسے یہ کوئی لازمی رسم ہو۔ یہ اس سے گانے کی فرمائش کرتا، وہ انکار کرتی؛ یہ اصرار کرتا، وہ احتجاج اور بہانے بازی، لیکن آخر میں مان جاتی۔

چند لمحوں بعد کرستین پیانو کے سامنے آ بیٹھی اور انگلیوں سے اس کی کلیدوں سے کھیلنے لگی، جس سے یکبارگی متفرق آہنگ پھوٹ پڑے۔ ایک معینہ لمحہ آنے پر اس نے سر اٹھایا جیسے وہ سروش جس کی وہ منتظر تھی، آ پہنچا ہو، اور آنکھیں موند لیں۔ اس کے چہرے پر تناؤ آ گیا اور اس نے اتنی تندی سے پیانو بجانا شروع کیا کہ پوری جگہ گونج اٹھی اور اس کی بلند اور شفاف آواز اٹھی جو ایڈتھ پیاف کا نغمہ نہایت اثرانگیزی سے گا رہی تھی:

نہیں، میں کسی چیز پر نادم نہیں، کسی بھی چیز پر
نہ خیر پر جو مجھے پہنچا ہو، نہ شر پر
میرے نزدیک ہر چیز برابر ہے

Scanned with CamScanner

تم نے میری یادوں میں ایک آگ سی بھڑکا دی ہے
میرے غم، میری فرحتیں
ان کی اب مجھے کوئی حاجت نہیں رہی
ماضی سے تہی، میں نقطۂ صفر سے ابتدا کروں گی
کہ تمھاری چاہت سے ابتدا کروں[1]

❁

شام کے اختتام پر دفتر جاتے ہوئے انھوں نے سلیمان باشا چوک پار کیا۔ زکی پوری طرح مدہوش ہو چکا تھا، چنانچہ بثینہ اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالے اسے سنبھالے ہوئے تھی۔ اس اثنا میں وہ اسے اپنی سڑپتی ہوئی آواز میں بیتے دنوں میں چوک کی کیفیت بیان کرتا رہا۔ وہ مقفل دکانوں کے سامنے رک کر بولا، ''یہاں ایک بڑی دلکش بار ہوا کرتی تھی جس کا مالک ایک یونانی تھا۔ اس کے برابر بالوں کی آرائش گاہ تھی اور ایک ریستوران۔ یہاں، 'لابورصا نووا' نامی چرمی چیزوں کی دکان۔ سبھی دکانیں حد درجہ صاف ستھری، اور ان میں لندن اور پیرس کی اشیا کو سجا کر رکھا جاتا تھا۔''

بثینہ سنتی رہی لیکن ساتھ ساتھ بڑی تشویش سے اس کے قدموں کو دیکھتی رہی کہ کہیں ڈگمگا کر سڑک پر نہ گر پڑے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے عمارتِ یعقوبیان پہنچے۔ زکی اس کے سامنے ٹھہر گیا اور چلّا کر بولا، ''اس کے شاندار طرزِ تعمیر کو دیکھو! یہ ہر تفصیل میں اس عمارت کے ہو بہو مماثل ہے جو میں نے پیرس کے 'دلیتن کوارٹر' میں دیکھی تھی۔''

بثینہ اسے ہولے ہولے آگے بڑھاتی رہی تا کہ سڑک پار کر جائیں، لیکن وہ اپنی ترنگ میں بولے گیا، ''جانتی ہو، بثینہ، مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں عمارتِ یعقوبیان کا مالک ہوں۔ میں اس کا سب سے پرانا باسی ہوں۔ میں اس کے ہر فرد کی زندگی اور اس کے ہر مربع میٹر سے واقف ہوں۔ میں نے اپنی بیشتر زندگی اسی عمارت میں گزاری ہے۔ میں نے اپنے بہترین دن یہاں گزارے

---

[1] نوٹ: آخری چار سطریں اصل فرانسیسی گانے میں ذرا مختلف ہیں: ''میں صفر سے ابتدا کروں گی / کیونکہ میری زندگی، میری خوشی / آج / تم سے شروع ہو گی۔''

Scanned with CamScanner

ہیں اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ میری ذات ہی کا ایک حصہ ہے۔ جس دن یہ منہدم ہوئی یا اسے کچھ ہوگیا، اُسی دن میں بھی مرجاؤں گا۔''

آہستہ آہستہ اور کسی قدر دشواری سے انھوں نے سڑک پار کی، اوپر آئے، اور بالآخر اپارٹمنٹ پہنچ گئے۔

''صوفے پر لیٹ جاؤ،'' بثینہ نے کہا۔ زکی نے اسے دیکھا، مسکرایا، اور ہولے سے بیٹھ گیا۔ وہ اتنی زور سے سانسیں لے رہا تھا کہ آواز سنائی دیتی تھی اور لگتا تھا اسے ارتکاز کرنے میں خاصی جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے۔ بثینہ نے اپنی ہچکچاہٹ کو روکنے کی کوشش کی اور اس کے جسم سے اپنا جسم بھڑا کر بڑے ترغیب انگیز انداز میں کہا، ''تم سے ایک کام کروانا چاہتی ہوں۔ کرسکو گے؟''

اس نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن اتنا مدہوش تھا کہ کچھ بول نہیں پایا۔ بس سامنے گھورنے لگا اور آہ سی بھری۔ بثینہ کو خیال گزرا کہ کہیں ابھی ابھی نہ مرجائے، لیکن اس نے حواس مجتمع کیے اور کہا، ''میں 'اہلی بینک' میں چھوٹے سے قرضے کے لیے درخواست دے رہی ہوں۔ بس یہی کوئی دس ہزار پاؤنڈ۔ پانچ سال میں رقم مع سود کے لوٹا دینی ہوگی۔ بینک والے ضامن چاہتے ہیں۔ براہ کرم تم میرے ضامن بن جاؤ۔''

اس نے اپنا ہاتھ اس کی پنڈلی پر رکھ دیا تھا اور بڑے ہی ترغیب انگیز اور دلکش لہجے میں بولی تھی کہ اس نے، جو پہلے ہی مدہوش تھا، اپنا منھ اس کے رخسار سے چپکا دیا اور بوسہ لے لیا۔ بثینہ نے اسے اس کی رضامندی سے تعبیر کیا اور خوشی سے چلّائی، ''شکریہ! ہمارا رب تمھیں سلامت رکھے!''

پھر وہ اٹھی اور سرعت سے اپنے بیگ سے کاغذات نکالے اور اسے قلم پکڑا دیا۔

''مہربانی سے یہاں دستخط کردو۔''

اس نے واقعی قرضے کے فارم بھرے تھے اور بیچ میں ملاک کا معاہدہ بھی ٹھونس دیا تھا۔ زکی نے ایک ایک صفحے پر دستخط کرنے شروع کیے اور بثینہ اس کے ہاتھ کو ہلنے سے باز رکھنے کے لیے اسے سہارے رہی۔ یکبارگی اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور سڑپتے ہوئے بڑبڑایا، چہرے پر مردنی سی چھانے لگی تھی، ''غسلخانہ...''

لمحہ بھر کے لیے وہ بالکل خاموش رہی، جیسے اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ زکی نے ہاتھ کو حرکت دی

Scanned with CamScanner

اور بڑی دقت سے کہا، ''غسلخانے جانے کی ضرورت ہے۔''

بثینہ نے کاغذات ایک طرف رکھ دیے اور بمشکل اسے کھڑا کیا اور اپنی بانہوں کا سہارا دے کر لے چلی، یہاں تک کہ وہ غسلخانے میں داخل ہو گیا۔ بثینہ نے دروازہ بھیڑ دیا، مڑی اور واپس جانے لگی اور ابھی آدھے راستے میں ہی تھی کہ پیچھے بڑے دھماکے سے گرنے کی آواز سنائی دی۔

❋

اس شام شارع علی پر 'گروپی' کا چائے خانہ گاہکوں سے اٹا پڑا تھا، جس میں زیادہ تر اس قسم کے نوجوان عاشق جوڑے تھے جو باغ کی مدھم روشنیوں میں راحت محسوس کرتے ہیں، کیونکہ یہ ان کے چہروں کی پردہ پوشی کرتی ہیں، اور جہاں وہ کسی کے مخل ہوے اور کسی کی توجہ میں آئے بغیر عشق و محبت کی باتیں کر سکتے ہیں۔

ایک شخص، پچاس سال کے پیٹے میں، مضبوط کاٹھی کا اور ہٹا کٹا، ڈھیلا ڈھالا سوٹ، بغیر ٹائی کی سفید قمیص پہنے، داخل ہوا۔ اس کے کپڑے اس کے تن و توش پر غیر مناسب اور ضرورت سے زیادہ بڑے نظر آ رہے تھے؛ یوں لگتا تھا جیسے یہ کسی اور کے ہوں۔ وہ دروازے سے قریب ایک میز کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ پھیکے ترکی قہوے کے فنجان کا آرڈر دیا، اور خاموش بیٹھا جگہ اور گاہے گاہے اپنی گھڑی کو دیکھتا رہا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد ایک دبلا پتلا، گہری رنگت کا نوجوان، جو ورزشی کپڑے پہنے ہوے تھا، وہاں پہنچا اور سیدھا بڑے تن و توش والے کے پاس آیا۔ دونوں بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوے اور پھر بیٹھ کر دھیمے دھیمے باتیں کرنے لگے۔

''خدا کا شکر کہ تم سلامت ہو، طٰہ۔ کب باہر نکلے؟''

''دو ہفتے پہلے۔''

''یقیناً تم پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ کیا یہاں آتے ہوے تم نے وہی کیا جو حسان نے بتایا تھا؟''

طٰہ نے سر ہلا دیا اور شیخ شاکر نے بات جاری رکھی، ''برادر حسان بالکل محفوظ ہے۔ اس کے ذریعے مجھ سے ملا کرو۔ وہ ملنے کا وقت اور جگہ بتا دیا کرے گا۔ عام طور پر ہم ایسی جگہیں منتخب کرتے ہیں جن پر شک و شبہ نہ کیا جا سکے۔ مثلاً یہ جگہ۔ یہاں کافی جمگھٹا ہے اور یہ تاریک بھی ہے، اور اسی لیے مناسب بھی۔ اسی طرح ہم عوامی باغوں اور کھانے پینے کی جگہوں پر بھی ملتے ہیں، اور کبھی کبھی باروں

Scanned with CamScanner

میں بھی۔لیکن۔۔۔باروں میں بیٹھنے کے عادی مت ہو جانا۔''

شیخ شاکر ہنسا،لیکن طٰہ بالکل ساکت رہا اور ایک دبیز خاموشی اس پر طاری ہو گئی۔شیخ نے تلخی سے بات جاری رکھی۔''سکیورٹی ادارے نے سارے اسلامیوں کو مجرم قرار دینے کی مہم چلا دی ہے۔حراستیں،تعذیب،اور قتل۔یہ ہمارے غیر مسلح بھائیوں کو پکڑتے ہوئے ان پر گولیاں چلا دیتے ہیں،پھر ان پر حکام کی مزاحمت کرنے کی تہمت دھرتے ہیں۔ہر روز بچ بچ کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔یقیناً قیامت کے روز یہ ان معصوموں کے خون سے رنگے ہوئے آئیں گے۔میں اپنی رہائش گاہ چھوڑنے اور مسجد نہ آنے جانے پر مجبور ہو گیا ہوں۔اور،جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو،میں نے اپنا حلیہ بھی بدل لیا ہے۔اور ہاں،اب یہ ذکر نکلا آیا ہے تو،شیخ شاکر کی اس مغربی ہیئت کذائی کی بابت کیا خیال ہے؟''

فضا میں خوشگواری پیدا کرنے کی خاطر شیخ نے بڑے زور کا ٹھٹھا مارا،لیکن بے سود۔ان کے درمیان ایک ٹس سے مس نہ ہونے والا تاریک سایہ دیکھتے ہی دیکھتے پھیل گیا تھا۔شیخ اس کے آگے سپر انداز ہو گیا،ایک لمبی سی سانس لی،خدا سے معافی مانگی اور بولا،''چلو اب کھل اٹھو،طٰہ۔مجھے معلوم ہے کہ تم پر کیا گزری ہے اور،بیٹے،میں تمھاری تکلیف کی قدر کرتا ہوں۔کفار نے تمھارے ساتھ جو کیا ہے،میں چاہتا ہوں کہ تم اسے ربنا سبحانہ وتعالی کے پاس اپنے کھاتے میں شمار کرو۔یقیناً وہ تمھیں اس کا بہترین اجر دے گا،انشاء اللہ۔جان لو کہ وہ لوگ جو راہِ خدا میں اذیتیں اٹھاتے ہیں،ان کا مقام جنت ہے۔تمھارے ساتھ جو کچھ پیش آیا ہے ایک حقیر سا محصول ہے جو مجاہد اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر خوشی خوشی ادا کرتے ہیں۔ہمارے حکام اپنی منفعت یا حرام کی دولت کی خاطر برسرِ پیکار ہیں،لیکن ہم خدا کے دین کے لیے لڑ رہے ہیں۔ہم آخرت کے طالب ہیں،وہ اِس دنیا کے حریص ہیں۔ان کا مال حقیر اور گھاٹے کا سودا ہے،لیکن خدا نے ہمیں اپنی مدد دینے کا وعدہ کیا ہے اور وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔''

اور جیسے وہ اپنی محزونی سے نکلنے کے لیے شیخ کے کلمات کا منتظر تھا،طٰہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا،''مولانا،انھوں نے مجھے ذلیل کیا۔اتنا کہ مجھے لگا جیسے سڑک کے کتے بھی مجھ سے زیادہ عزتِ نفس کے مالک ہیں۔انھوں نے میرے ساتھ وہ کیا کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی مسلمان کبھی ایسا کرنے کا اہل ہو سکتا ہو۔''

''یہ مسلمان کہاں ہیں!یہ تو کافر ہیں،فقہا کے اجماع کی رو سے۔''

Scanned with CamScanner

''اگر کافر بھی ہوں تو، ان کے پاس ذرہ برابر بھی رحم نہیں ہے؟ کیا ان کے بیٹے بیٹیاں اور بیویاں نہیں جنھیں چاہتے ہوں اور جن سے شفقت کرتے ہوں؟ اگر مجھے اسرائیل میں حراست میں لیا گیا ہوتا تو یہودی بھی میرے ساتھ وہ نہ کرتے جو انھوں نے کیا ہے۔ اگر میں نے اپنے ملک کی مخبری یا اپنے دین سے خیانت کی ہوتی، تب بھی انھوں نے میرے ساتھ اتنی بری حرکتیں نہ کی ہوتیں۔ میں اپنے سے اس جرم کا پوچھتا ہوں جس کی سزا اتنی روح فرسا ہو۔ کیا خدا کے احکام کی پابندی اتنا بڑا جرم بن گئی ہے؟ نظر بندی کے دوران میں اکثر سوچتا تھا کہ میرے سامنے جو پیش آرہا ہے وہ حقیقی نہیں ہے، کہ یہ ایک کابوس ہے اور میرے بیدار ہوتے ہی ختم ہو چکا ہوگا۔ اگر مجھے خداے عزّوجل پر ایمان نہ ہوتا تو اس عذاب سے بچنے کے لیے میں نے خودکشی کر لی ہوتی۔''

طٰہٰ کا الم شیخ کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا اور وہ خاموش رہا۔ طٰہٰ نے اپنے ہاتھ کی مٹھی بنائی اور بولا، ''انھوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تا کہ انھیں نہ جان لوں۔ لیکن میں نے خدا سے قسم کھائی ہے اور اپنے سے عہد کیا ہے کہ انھیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ معلوم کروں گا کہ وہ کون تھے اور ان میں ایک ایک سے انتقام لوں گا۔''

''بیٹے، میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ اس المناک تجربے سے آگے نکل آؤ۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ مطالبہ بے حد سخت ہے، لیکن تمھارا جو حال ہے اس میں صرف یہی کرنا دانشمندی ہے۔ تمھارے ساتھ نظر بندی میں جو کچھ پیش آیا صرف تم سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ ان تمام لوگوں کی تقدیر ہے جو ہمارے نکبت زدہ ملک میں بآوازِ بلند سچ بولتے ہیں۔ اور اس کے ذمے دار صرف چند اہلکار نہیں بلکہ وہ سارا کافر اور مجرم نظام ہے جو ہم پر حکومت کرتا ہے۔ تمھیں اپنے غیظ و غضب کا ہدف اس نظام کو بنانا چاہیے نہ کہ چند مخصوص افراد کو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کریم میں کہا ہے، 'اور تمھارے لیے رسول اللہ ایک اچھی مثال تھے۔' صدق اللہ العظیم۔ رسول مصطفیٰ کے خلاف مکہ میں لڑائی کی گئی، ان کی اہانت کی گئی، اور ان کو اتنی اذیت پہنچائی گئی تھی کہ انھوں نے اپنے رب سے اپنی کمزوری اور اہانت کی شکایت کی۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے جہاد کو کفار کے خلاف کوئی ذاتی جھگڑا نہیں سمجھا۔ اس کے برعکس انھوں نے اپنی ساری توانائی کو پیغامِ خدا پہنچانے کے لیے صرف کیا، یہاں تک کہ آخرِکار جب خدا کے دین کو کامیابی نصیب ہوئی تو انھوں نے سارے کفار کو بخش دیا اور آزاد کر دیا۔ یہ وہ سبق ہے جو

Scanned with CamScanner

تمھیں سیکھنا اور جس پر عمل کرنا چاہیے۔''

''وہ تو رسولِ خدا تھے، اور اس کی مخلوق میں سب سے افضل۔ میں کوئی نبی نہیں۔ مجھ میں یہ استطاعت نہیں کہ جو کچھ ان مجرموں نے میرے ساتھ کیا ہے اسے بھول جاؤں۔ میرے ساتھ جو ہوا ہے، مسلسل، ہر لحظہ میرا تعاقب کرتا ہے۔ میری نیند اڑ گئی ہے۔ جب سے رِہا ہوا ہوں، ابھی تک مسجد کا رخ نہیں کر سکا اور نہ مجھے لگتا ہے کہ اب کبھی وہاں جاؤں گا۔ سارا دن اپنے کمرے میں اکیلا پڑا رہتا ہوں، کسی سے بات نہیں کرتا، اور کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے ہوش وحواس میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔''

''ہاتھ پاؤں مت ڈال دو، طٰہٰ۔ ہزاروں مسلمان نوجوانوں نے نظر بندی بھگتی ہے، بڑی بھیانک اذیتیں اٹھائی ہیں، لیکن جب نکلے تو پہلے سے کہیں زیادہ عزم سے ظلم کا مقابلہ کرنے کے لیے۔ اسلامیوں کی ایذا دہی سے حکومت کا اصل مقصد ان کو محض جسمانی تکلیف پہنچانا نہیں ہے۔ وہ اصل میں انھیں نفسیاتی طور پر تباہ کر دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنی جدوجہد کی صلاحیت سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اگر تم نے افسردگی کے آگے سرِخم کر دیا تو یہ کفار کے مقاصد کو پورا کرنا ہوگا۔''

شیخ نے اسے لمحہ بھر دیکھا اور پھر میز پر پڑے ہوئے اس کے ہاتھ کو تھام لیا اور کہا، ''مسجد کب لوٹو گے؟''

''کبھی نہیں۔''

''نہیں، لوٹنا تم پر واجب ہے۔ تم ایک ممتاز طالب علم ہو جس نے خود کو جہاد کے لیے وقف کیا ہوا ہے اور ایک شاندار مستقبل جس کا منتظر ہے۔ خدا پر بھروسا رکھو، جو ہوا ہے اسے بھول جاؤ، اور اپنی پڑھائی اور شعبے کی طرف مراجعت کرو۔''

''ناممکن ہے۔ میں لوگوں کا سامنا کیسے کروں گا، خاص طور پر جو...''

طٰہٰ یکلخت خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ اتر گیا اور اس نے بڑے زور کی آہ بھری۔

''مولانا، انھوں نے دس بار میری آبرو کی ہتک کی۔''

''بس بس، خاموش!''

''انھوں نے دس بار میری آبروریزی کی، میرے آقا... دس بار۔''

Scanned with CamScanner

''میں نے تم سے کہا کہ بس کرو، طٰہ!''

شیخ نے بڑی سختی سے یہ لفظ کہے لیکن طٰہ نے بڑے زور سے میز پر مکا مارا۔ میز اس بری طرح ہل گئی کہ پیالیاں ٹکرا کر جھنجھنا اٹھیں۔ شیخ اپنی جگہ سے تیزی سے اٹھا اور بڑی ہلچل کے عالم میں سرگوشی کی، ''اپنے کو قابو میں رکھو، طٰہ! سب لوگ ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ سنو، گھنٹہ بھر بعد میں میٹرو سینما کے سامنے تمھارا انتظار کروں گا۔ پوری احتیاط کرنا اور یقین کر لینا کہ کوئی تمھاری ٹوہ تو نہیں لے رہا۔''

❁

دو ہفتے تک حاج عزام نے ترغیب، تحریص، تہدید، تشدد، غرض سبھی حربے آزما ڈالے۔ اس نے ساری ترکیبیں کر کے دیکھ لیں، لیکن سعاد نے اسقاط کے خیال کو شدومد سے رد کر دیا۔ ان کی باہمی زندگی آناً فاناً بالکل ختم کر رہ گئی۔ اب نہ وہ پیار دُلار کی باتیں باقی رہیں، نہ لذیذ پکوان، نہ حشیش بھرے حقے، اور نہ ہی بستر میں ملنا ملانا۔ اگر کچھ باقی بچا تھا تو بس حمل گرانے کا موضوع۔ وہ ہر روز آ کر اس کے سامنے بیٹھ جاتا۔ اس سے نرمی اور سکون کے ساتھ گفتگو کرتا، پھر رفتہ رفتہ برہم ہو جاتا اور دونوں لڑنے لگتے، اور وہ چلّا کر کہتا، ''تم نے معاہدہ کیا تھا اور اس سے پھر گئی ہو۔''

''تو پھانسی دے دو۔''

''شروع ہی سے ہم نے اتفاق کیا تھا کہ حمل نہیں ٹھہرے گا۔''

''تم اپنے کو خدا سمجھتے ہو کہ جو چاہا حلال کر دیا اور جو چاہا حرام؟''

''ہوش کی باتیں کرو۔ مجھے اس مخمصے سے نکالو۔ خدا کے واسطے!''

''نہیں۔''

''طلاق دے دوں گا۔''

''ٹھیک ہے، دے دو۔''

اس نے 'طلاق' کا لفظ یوں ہی رواروی میں کہہ دیا تھا ورنہ اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ اسے اپنی گرفت میں ہی رکھنا چاہتا تھا۔ تاہم اپنی اس عمر میں اولاد ہونے کا خیال بالکل ناممکن تھا۔ اگر وہ خود اس کی اجازت دے بھی دے تو اس کے لڑکے کہاں ماننے والے تھے۔ اگرچہ اس کی پہلی بیوی حاجہ

Scanned with CamScanner

صالحہ کو اس کی دوسری شادی کا کوئی علم نہ تھا، لیکن اگر بچہ ہو گیا تو وہ یہ بات اس سے کیسے مخفی رکھ سکے گا۔

سعاد کو قائل کرنے سے مایوس ہو کر حاج عزام اسے چھوڑ کر اٹھا اور اسکندریہ جا کر اس کے بھائی حمیدو سے ملا اور جو کچھ پیش آیا تھا وہ بیان کیا۔ حمیدو تذبذب میں پڑ گیا، پھر سر جھکا کر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا، ''میری بات سنو حاج، ہم دونوں شریف آدمی ہیں اور صحیح بات سے کسی کو برہم نہیں ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہے، میں اس کا بھائی ہوں، لیکن میں اسقاطِ حمل کے لیے اس سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ حرام بات ہے اور میں خدا کا خوف رکھتا ہوں۔''

''لیکن رئیس حمیدو، ہم نے اس پر اتفاق کیا تھا۔''

''اتفاق کیا تھا اور اب اس سے پھر گئے۔ قصور ہمارا ہی ہے، یا سیدی۔ ہم دوستانہ طور پر اس معاہدے میں داخل ہوئے تھے اور اسے دوستانہ طور پر ہی ختم کر دینا چاہیے۔ حاج، آپ خدا کے مقرر کیے ہوئے شرعی حقوق اسے ادا کر دیں اور طلاق دے دیں۔''

اس لمحے حمیدو کا چہرہ اسے بڑا رذیل، کاذب اور کراہت انگیز لگا اور اس کا جی چاہا کہ اس کے طمانچہ جڑ دے اور خوب مارے، لیکن آخر میں ہوشمندی غالب آ گئی اور وہ دل میں پیچ و تاب کھاتا وہاں سے رخصت ہوا۔ قاہرہ کے راستے میں اچانک ایک خیال آیا اور اس نے خود سے کہا، ''صرف ایک شخص ہے جو میری جان چھڑوا سکتا ہے۔''

❁

خلیج کی جنگ کے باعث شیخ السمان کی مشغولیت حد سے بڑھ گئی تھی۔

ہر روز وہ لیکچروں اور سیمیناروں کا انتظام کرتا اور اخباروں میں بڑے طول طویل مضامین لکھ کر ان میں کویت کو آزاد کرانے کی شرعی وجوہات کی وضاحت کرتا۔ حکومت نے اسے متعدد بار ٹیلیوژن پر بولنے کے لیے بلایا اور قاہرہ کی بڑی بڑی مسجدوں میں جمعے کا خطبہ دینے کی دعوت دی، اور شیخ نے لوگوں کے سامنے وہ شرعی شواہد پیش کرنے شروع کر دیے جن کی رو سے عرب حکام کویت کو عراقی حملے سے نجات دلانے کے لیے امریکیوں کو بلوانے میں برحق تھے۔

حاج عزام پورے تین دن شیخ السمان کو تلاش کرتا رہا۔ بالآخر مدینۃ نصر کی مسجد السلام میں اس کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ شیخ کے چہرے کو تشویش سے دیکھتے ہوئے جو پہلی بات کہی وہ یہ تھی،

Scanned with CamScanner

''مولانا، کیا بات ہے؟ آپ بڑے مضمحل نظر آ رہے ہیں؟''

''جب سے جنگ شروع ہوئی ہے، مشکل ہی سے سو سکا ہوں۔ ہر روز سیمینار اور جلسے، اور چند دنوں میں، انشاءاللہ، علمائے اسلام کے ہنگامی اجتماع میں شرکت کرنے سعودی عرب جا رہا ہوں۔''

''نہیں، مولانا، اپنی صحت کا خیال رکھنا آپ پر لازم ہے۔''

شیخ نے لمبا سانس کھینچا اور بڑبڑایا، ''میں جتنا بھی کرتا ہوں اس سے کم ہے جو مجھ پر واجب آتا ہے۔ میں خدائے عزّوجل سے یہی مانگتا ہوں کہ میرے عمل کو قبول کرے اور اسے ترازو میں میرے نیک اعمال کے پلڑے میں رکھے۔''

''کیا سعودی عرب جانا ملتوی نہیں ہو سکتا کہ آپ کچھ آرام کر لیں؟''

''معاذاللہ کہ میں غفلت برتوں! مجھے شیخ الغامدی نے بلایا ہے جو بڑے ممتاز عالم ہیں؛ ہم خدا پر کسی اور کو فوقیت نہیں دیتے۔ میں وہاں اپنے دیگر برادر علما کے ساتھ شرکت کروں گا اور ہم سب مل کر ایک شرعی بیان جاری کریں گے جو ان فتنہ انگیزوں کے سارے دلائل کا منھ بند کر دے گا اور لوگوں پر ان دلائل کی بے ربطی کو ظاہر کر دے گا۔ ہم، انشاءاللہ، اس بیان میں ان شرعی وجوہات کا ذکر کریں گے جن کی رو سے مسلمانوں کو مجرم اور کافر صدام حسین سے بچانے کے لیے مغربی مسیحی افواج سے مدد طلب کرنا جائز قرار پاتا ہے۔''

حاج عزام نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ ایک لمحہ خاموشی رہی۔ پھر شیخ نے اس کا شانہ تھپتھپا کر بڑی محبت سے پوچھا، ''اور تمھارے کیا حال چال ہیں؟ میرے خیال میں تم کسی مسئلے کے سلسلے میں میرے پاس آئے ہو۔''

''میں آپ کی فکروں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔''

شیخ مسکرایا اور اپنی آرام دہ کرسی سے اپنا بھاری بھر کم جسم ٹیکتے ہوئے کہا، ''تم مجھے فکرمند کرو، یہ ناممکن ہے۔ مہربانی سے بتاؤ کیا بات ہے۔''

❁

جب حاج عزام اور شیخ السمان عمارتِ یعقوبیان میں سعاد کے اپارٹمنٹ پہنچے تو اسے گھریلو کپڑوں میں ملبوس پایا۔ سعاد نے لیے دیے انداز میں شیخ السمان کو خوش آمدید کہا اور بڑی تیزی سے اندر چلی

Scanned with CamScanner

گئی، پھر چند لمحوں بعد ٹھیک سے سر ڈھانکے، ایک چاندی کی سینی میں برف ڈلے نیبو کے شربت سے بھرے گلاس اٹھائے لوٹی۔ شیخ نے اپنے شربت کی ایک چسکی لی، لذت لیتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور، جیسے کہ موضوع چھیڑنے کے لیے کسی مناسب بات کا متلاشی ہو، عزام کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا، ''بڑا شاندار شربت ہے! تمھاری اہلیہ بڑی اچھی گرہستن ہیں۔ میرے بھائی، اس نعمت پر خدا کا شکر بجالاؤ۔''

عزام نے دھاگے کا سرا پکڑ لیا اور بولا، ''ہزار حمد و شکر، یا مولانا۔ سعاد بڑی اچھی گھروالی ہے اور بڑی صالح اور طیب بیوی۔ لیکن یہ ضدی بھی ہے اور ستاتی بھی ہے۔''

''ضدی؟'' شیخ السمان نے دکھاوے کی حیرانی سے پوچھا اور سعاد کی طرف ملتفت ہوا، جس نے باگ خود سنبھال لی اور بڑے گمبھیر لہجے میں بولی، ''ظاہر ہے، حاج نے آپ کو مسئلے سے آگاہ کر دیا ہوگا۔''

''خدا کبھی مشکلیں نہ پیدا کرے۔ بیٹی، میری بات سنو۔ تم مسلمان ہو اور شریعت اللہ کی پابندی کرتی ہو۔ اور ہمارے رب، سبحانہ وتعالیٰ، نے اس دنیا کے تمام معاملات میں شوہر کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اور مصطفیٰ، صلواۃ اللہ علیہ وسلامہ، نے اپنی صحیح حدیث میں یہاں تک کہا ہے، 'اگر خدا نے کسی مخلوق کو کسی دوسری مخلوق کے آگے سجدہ کرنے کی اجازت دی ہوتی، تو میں بیوی کو اپنے خاوند کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیتا۔' صدق رسول اللہ۔''

''بیوی کو شوہر کا حکم حلال باتوں میں ماننا چاہیے یا حرام باتوں میں؟''

''حرام باتوں سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، بیٹی۔ خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق اس کی اطاعت نہیں کر سکتی۔''

''تو مولانا بتائیے، کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں حمل گروادوں؟''

لمحہ بھر خاموشی رہی جس کے بعد شیخ السمان نے مسکرا کی بڑی پرسکون آواز میں کہا، ''بیٹی، تم نے شروع ہی میں اس سے اتفاق کیا تھا کہ بچے نہیں ہوں گے۔ حاج عزام ایک عمر رسیدہ آدمی ہے اور اس کے حالات اسے اس کی اجازت نہیں دیتے۔''

''تو ٹھیک ہے، خدا کے قانون کے مطابق مجھے طلاق دے دیں۔''

Scanned with CamScanner

''اگر وہ تمھیں اس حال میں طلاق دیتا ہے جب پیٹ سے ہو تو وہ شرعی اعتبار سے نومولود کی کفالت کا ذمے دار ہو گا۔''

''یعنی آپ کو اس سے اتفاق ہے کہ حمل گروادوں؟''

''خدا کی پناہ! ظاہر ہے کہ اسقاطِ حمل گناہ ہے۔ لیکن بعض فقہا کی رائے میں اگر حمل رہ جانے کے اولین دو ماہ کے اندر اندر گروا دیا جائے تو یہ اسقاط نہیں کہلائے گا۔ کیونکہ جنین میں روح تیسرے مہینے اترتی ہے۔''

''یہ کہاں کہا گیا ہے؟''

''اسلامی علما کے دیے گئے مصدقہ فتاویٰ میں۔''

سعاد بڑے تمسخر سے ہنسی اور بڑی تلخی سے بولی، ''وہ امریکی شیوخ ہوں گے!''

''عزت مآب شیخ سے ادب سے بات کرو!'' حاج عزام نے اس کی سرزنش کی۔

سعاد نے حاج عزام پر بڑی خونخوار نظر ڈالی اور بڑے محکم انداز میں کہا، ''سبھی کو چاہیے کہ ادب سے بات کریں۔''

شیخ نے نرمی سے مداخلت کی، ''خدا ہمیں اپنے غضب سے محفوظ رکھے۔ سعاد، میری بیٹی، اپنے کو سبک نہ کرو۔ میں مسئلے پر، معاذ اللہ، اپنی رائے کی بنیاد پر بحث نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو صرف مستند فقہی رائے پیش کر رہا ہوں۔ بعض ثقہ نے کہا ہے کہ اگر ناگزیر حالات کا سامنا ہو تو تیسرے ماہ سے قبل جنین کا اسقاط قتل سے تعبیر نہیں کیا جانا چاہیے۔''

''یعنی میں اسقاط کرا لوں تو یہ حرام نہیں ہو گا؟ کون ایسی بات کہہ سکتا ہے؟ آپ اگر قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہیں تب بھی میں آپ کا یقین نہیں کر سکتی۔''

اس پر حاج عزام کھڑا ہو گیا، اس کے قریب آیا اور گرم ہو کر بولا، ''میں کہہ رہا ہوں کہ ہمارے شیخ کے ساتھ تمیز سے بات کرو۔''

سعاد بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے ہاتھ لہرا کر چلّائی، ''ہمارے شیخ، ہنھ! کون شیخ اور کہاں کا شیخ؟ تم نے اسے پیسے دیے ہیں کہ چند دھوکے بازی کے کلمے بول دے۔ پہلے دو ماہ میں اسقاط جائز ہے؟ شرم سے ڈوب مرو، شیخ! خدا سے کہاں بھاگو گے؟''

Scanned with CamScanner

شیخ السمّان، جسے اس یورش نے اچانک آلیا تھا، چہرے پر بڑا خشمگیں تاثر لا کر تہدیدی انداز میں بولا، ''اپنے نفس کا احترام کرو، بیٹی۔ خیال رکھو کہ کہیں اپنی حد سے باہر نہ نکل جاؤ!''

''بھاڑ میں گئی تمھاری 'حد سے باہر نہ نکل جاؤ۔' مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ تم شیخ نہیں، مسخرے ہو۔ اپنے ساتھ لانے کے لیے اس نے تمھاری کتنی مٹھی گرم کی ہے؟''

''غلیظ عورت! کتے کی بچی!'' حاج عزام چلّایا اور اس کے گال پر تھپڑ جڑ دیا۔ وہ چیخیں مار کر رونے اور واویلا مچانے لگی، لیکن شیخ السمّان نے حاج کا ہاتھ پکڑ لیا اور سعاد سے دور لے جا کر مدھم لہجے میں کچھ کہنے لگا۔ جلد ہی دونوں اپنے پیچھے دروازہ پھٹاک سے بند کر کے وہاں سے نکل لیے۔

❁

سب وشتم اور لعنتوں کے ہجوم میں سعاد نے انھیں وہاں سے بھگا دیا۔ شیخ السمّان کے کلام اور عزام کے چانٹا مارنے پر وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔ شادی کے بعد سے یہ پہلی بار تھا کہ اس نے اسے مارا تھا: وہ اس کی سوزش ابھی تک اپنے گال پر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے سے عہد کیا کہ وہ اس کا بدلہ لے کر رہے گی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے ساتھ کھلم کھلا جھڑپ ہو جانے پر اسے ایک خفیہ راحت کا احساس بھی ہو رہا تھا کہ ہر وہ تار جو اسے اس کے ساتھ باندھے ہوئے اور اس کا پابند کیے ہوئے تھا، آخر الامر ٹوٹ گیا ہے۔ حاج نے اسے مارا تھا اور برا بھلا کہا تھا۔ آئندہ سے وہ بالکل واضح طور پر اس کے ساتھ اپنی حقارت اور کراہت کا اظہار کیا کرے گی۔ حقیقت میں لڑائی اور سب وشتم پر اس کی قدرت اس کے لیے بالکل نئی چیز تھی، گویا کہ وہ بیر جو اس کے اندر اندر پک رہا تھا، اچانک پھٹ پڑا تھا۔ ہر وہ شے جس کی درشتی اس نے برداشت کی تھی اور جس نے اسے اذیت پہنچائی تھی، اس کے حساب کا وقت آ پہنچا تھا۔ وہ حمل گروانے کے مقابلے میں اسے قتل کر دینے یا خود قتل ہو جانے کے لیے تیار تھی۔

جب اسے کچھ سکون آیا تو اس نے اپنے سے پوچھا کہ اسے حمل کی اتنی پروا کیوں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ دیندار تھی اور اسقاط حرام ہے، اور اسے آپریشن سے بھی بری طرح ڈر لگتا تھا کیونکہ بہت سی عورتیں اس کے دوران مر جاتی تھیں۔ یہ سب باتیں بالکل درست تھیں لیکن ثانوی۔ ایک جلتی ہوئی خواہش نے اسے اپنے حمل کے تحفظ کی خاطر اتنی خونخواری سے لڑنے پر آمادہ کیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اگر اس کے بچہ ہو گیا تو اسے اپنی عزتِ نفس واپس مل جائے گی۔ اس کی زندگی کو

ایک نیا اور پر معنی مقصد مل جائے گا۔ وہ وہ نادار عورت نہیں رہے گی جسے کروڑ پتی عزام نے دوپہر کی چند ساعتوں کے مزے لینے کے لیے خریدا ہے، بلکہ ایک حقیقی بیوی بن جائے گی جسے نہ نظر انداز کیا جا سکتا ہو اور نہ جس کی سبکی کی جاسکتی ہو۔ وہ ایک بچے کی ماں ہوگی، حاج کے بیٹے کو اپنی بانہوں میں لے کر باہر آئے جائے گی۔ کیا یہ اس کا حق نہیں؟

وہ بھوکی رہی تھی، دستِ سوال پھیلایا تھا، اور ذلت کا ذائقہ چکھا تھا، اور راہِ راست سے بھٹکنے سے سو بار انکار کیا تھا، اور آخر میں اپنا جسم ایسے آدمی کے سپرد کر دیا تھا جو اس کے باپ کی عمر کا تھا؛ اس کی بے کیفی، اس کی افسردگی، اس کے جھریوں زدہ چہرے، اس کے خضاب لگے بالوں، اور اس کی مضمحل رجولیت کو سہا تھا، اور یہ ظاہر کیا تھا کہ اس کی تسکین ہوگئی ہے، کہ اس کا جسم خواہش سے کراہ رہا ہے، صرف اتنے ہی کے لیے تاکہ وہ اس کے پاس چھپ چھپا کر آئے اور واپس چلا جائے، گویا کہ وہ ایک داشتہ ہو؛ اس نے یہ سب کچھ اس لیے کیا تھا کہ ہر رات سرد بستر میں اور ایک ڈراؤنے ہو حق اپارٹمنٹ میں تنہا سوئے، جہاں وہ ہر رات بجلی جلائے رکھنے پر مجبور ہو جاتی تھی تاکہ اپنی وحشت کو دور رکھ سکے، اور ہر روز اپنے بیٹے کے فراق میں آنسو بہاتی تھی؛ پھر جب عزام کے آنے کا وقت ہوتا تھا تو اس کے لیے بناؤ سنگار کرتی تھی اور اپنا پارٹ ادا کرتی تھی جس کی اسے اجرت دی گئی تھی۔ ان تمام ذلتوں کو سہنے کے بعد کیا یہ اس کا حق نہیں تھا کہ کم از کم ایک بار ہی وہ خود کو بیوی اور ماں محسوس کر سکے؟ کیا یہ اس کا حق نہیں تھا کہ اس کے جائز بچہ پیدا ہو اور دولت کا وارث بنے اور اسے ہمیشہ کے لیے غربت کی تکالیف سے محفوظ رکھے؟ یہ حمل خدا نے اسے اس کے طویل صبر کے جائز صلے کے طور پر عطا کیا تھا اور وہ اس سے کبھی کسی بھی قیمت پر دستبردار نہ ہوگی۔

سعاد نے اس طرح سوچا۔ پھر غسلخانے میں گئی، کپڑے اتارے اور جیسے ہی گرم پانی اس کے ننگے جسم پر گرنا شروع ہوا، ایک بالکل نئے اور عجیب سے احساس نے اسے آلیا کہ اس کا یہ جسم جسے عزام کب سے استعمال، آلودہ اور ذلیل کرتا رہا ہے، آن کی آن میں آزاد ہو گیا ہے، تنہا اس کی اپنی ملکیت بن گیا ہے۔ اس کے ہاتھ، بانہیں، ٹانگیں اور چھاتیاں، جسم کا ہر ہر عضو آزادی سے سانس لے رہا ہے اور اسے اپنے اندر ایک مبہم سی حسین نبض دھڑکتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے، ایک نبض جو بڑھتی اور نمو پاتی جائے گی اور اسے روز بروز بھر دے گی یہاں تک کہ وقت آنے پر ایک چاند سا بچہ باہر

Scanned with CamScanner

آئے گا جس میں اس کی شباہت ہوگی اور جو اپنے باپ کی دولت کا وارث بنے گا، اسے اس کی عزت لوٹا دے گا، اسے مستحق بنا دے گا۔ وہ غسل سے فارغ ہوئی، جسم خشک کیا، شب خوابی کے کپڑے پہنے، عشا کی نماز اور سنتیں پڑھیں، اور بستر پر بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کی، یہاں تک کہ اس پر غنودگی طاری ہوگئی۔

❁

"کون ہے؟"

کمرے کے باہر حرکت اور کھسر پھسر کی آواز سن کے وہ جگ گئی۔ اسے خیال گزرا کہ کوئی چور دبے قدموں اپارٹمنٹ میں گھس آیا ہے، اور خوف سے تھرتھراتے ہوئے سوچا کہ کھڑکی کھول کر ہمسایوں کو مدد کے لیے آواز دے۔

"کون ہے؟"

اس نے بلند آواز سے پھر چلا کر کہا اور اندھیرے میں بستر پر بیٹھے بیٹھے کچھ سننے کی کوشش کی، لیکن آوازیں آنی بند ہوگئی تھیں اور خاموشی چھا گئی تھی۔ اس نے معاملے کی خود چھان بین کرنے کا فیصلہ کیا اور پاؤں بستر سے نیچے فرش پر رکھے، لیکن خوف نے اس کے اعضا مفلوج کر دیے۔ اس نے خود کو قائل کر لیا کہ یہ محض اس کے تخیل کی کارستانی تھی۔ واپس بستر پر لیٹ گئی اور ایک تکیہ سر کے اوپر رکھ لیا اور چند لمحے دوبارہ نیند میں غرق ہو جانے کی کوشش کی۔ اچانک دروازہ اتنے پھٹاک سے کھلا کہ دیوار سے جا ٹکرایا اور وہ اس پر ٹوٹ پڑے۔

چار یا پانچ تھے۔ اندھیرے میں ان کے چہرے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ اس پر جھپٹ پڑے، ایک نے تکیہ اس کے منھ پر رکھ دیا اور باقیوں نے اس کے ہاتھ پاؤں پکڑ لیے۔ اس نے اپنا پورا زور لگا کر ان کی گرفت سے نکل جانے اور چیخنے کی کوشش کی، اس آدمی کی کلائی پر کاٹا جو اس کا دم گھونٹ رہا تھا لیکن اس کی مزاحمت ناکام ہو کر رہ گئی، کیونکہ انھوں نے اسے مضبوطی سے باندھ دیا تھا اور اسے ہلنے جلنے سے پوری طرح معذور کر دیا تھا۔ یہ بہت مضبوط اور مشاق تھے، اور ایک نے اس کے شب خوابی کے لباس کی آستین اوپر چڑھائی اور اسے کسی نوکیلے کانٹے سے ملتی جلتی شے اپنے بازو میں کھبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ ڈھیلا پڑنے اور پرسکون ہونے لگا، آنکھیں مند

Scanned with CamScanner

گئیں اور اسے لگا کہ اس کے آس پاس کی ہر چیز خواب کی طرح دور ہٹتی اور معدوم ہوتی جا رہی ہے۔

❁

فرانسیسی زبان کا Le Caire [لو کیر یا القاہرہ] نامی اخبار کوئی سو سال پہلے شارع الجلاء کی اسی قدیم عمارت سے نکلنا شروع ہوا تھا جہاں سے اب بھی، اور ہر روز بلا ناغہ شائع ہوتا ہے، قاہرہ کے ان باشندوں کے لیے جو فرانسیسی زبان بولتے ہیں۔

حاتم رشید جب کلیۂ فنون سے فارغ ہوا تو اس کی فرانسیسی ماں نے اسے اس اخبار میں کام دلوا دیا تھا۔ اس نے صحافت میں اپنی اہلیت ثابت کر دی اور جلد ہی ترقی کرتے کرتے پینتالیس سال کی عمر میں ہی اس کا مدیرِ اعلیٰ بن گیا۔ وہ اخبار میں بڑی مبسوط تبدیلیاں لایا اور مصری پڑھنے والوں کی خاطر اس میں ایک عربی حصے کا اضافہ کیا۔ اس کی ادارت کے دور میں اخبار کی یومیہ اشاعت تیس ہزار تک پہنچ گئی جو دوسرے چھوٹے مقامی اخباروں کے مقابلے میں ایک خاصی بڑی تعداد ہے۔ یہ کامیابی حاتم کی دلجمعی، استقلال اور اعلیٰ کارگزاری کا طبعی اور برحق نتیجہ تھی، اور مختلف ماحولوں سے اس کے پراثر روابط، اور کارکردگی کی اس حیرت انگیز صلاحیت کا بھی جو اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔

اور اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ ستر سے زیادہ افراد (انتظامی عملہ، نامہ نگار، اور فوٹو گرافر) اخبار میں اس کے زیرِ ہدایت کام کرتے تھے، تو ذہن میں سب سے پہلا سوال یہ آئے گا: کیا وہ اس کی ہم جنس پرستی سے آگاہ ہیں؟ جواب، ظاہر ہے، ہاں میں نکلے گا، کیونکہ مصریوں کو دوسروں کی ذاتی زندگی سے خاص دلچسپی ہوتی ہے اور وہ بڑی جستجو اور ارتکاز سے اس کی کرید کرتے ہیں۔ ہم جنس پرستی کو پوشیدہ رکھنا محال ہے۔ اخبار میں ہر کام کرنے والے کو معلوم ہے کہ ان کا سربراہ ہم جنس پرست ہے۔ اس سے جو تنفر اور حقارت پیدا ہوتی ہے اس کے باوجود، حاتم رشید کی جنسی کجروی اس کے مضبوط، پیشہ ورانہ پیکر کے سامنے ایک دور کا، رنگ پریدہ سایہ معلوم ہوتی ہے۔ انھیں اس کی ہم جنس پرستی کا علم ہے لیکن اس کے ساتھ اپنے روزمرہ کے تعامل میں وہ اسے کبھی محسوس نہیں کرتے کیونکہ وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور سخت گیر ہے، اور دن کا زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنے کے باوجود، ایک ادنیٰ سی حرکت یا نگاہ بھی اس سے صادر نہیں ہوتی جو اس کے نجی میلان کی جانب اشارہ کرتی ہو۔

Scanned with CamScanner

اخبار کی سربراہی کے زمانے میں، ظاہر ہے، چند سوقیانہ واقعات ضرور ہوے ہیں۔ ایک مرتبہ وہاں ایک کاہل الوجود اور پھسڈی صحافی کام کرتا تھا۔ حاتم نے اس کی کارکردگی کی بابت کئی منفی رپورٹیں تیار کیں تاکہ بعد میں ان کی بنیاد پر اسے اخبار سے نکالا جا سکے۔ صحافی کو مدیرِ اعلیٰ کی نیت کا علم تھا اور اس سے انتقام لینے کی خاطر اس نے ہفتہ وار ادارتی میٹنگ میں تمام نامہ نگاروں کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے بولنے کی اجازت مانگی، جو حاتم نے دے دی۔ صحافی اس سے مخاطب ہوا اور بڑے استہزائی لہجے میں بولا، ''جناب، میں مصر میں ہم جنس پرستی کے مظہر کی بابت ایک تفتیشی مضمون تجویز کرنا چاہتا ہوں۔''

حاضرین پر یکدم خاموشی چھا گئی جس میں سخت تناؤ کی کیفیت تھی۔ صحافی حاتم کی اہانت کرنے پر اپنی مسکراہٹ کو نہ چھپا سکا۔ حاتم نے کچھ نہیں کہا، بس سر جھکا کر اپنے چمکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا (جیسا کہ وہ حیرت اور تناؤ کے عالم میں کیا کرتا تھا)۔ پھر کرسی پر پشت ٹیکتے ہوے بڑے سکون سے کہا، ''میں نہیں سمجھتا کہ یہ موضوع قارئین کی دلچسپی کا ہے۔''

''کیوں نہیں، ان کا اس سے بہت تعلق ہے، کیونکہ ہم جنس پرستوں کی تعداد بڑھ گئی ہے اور ان میں سے کئی ملک میں سربراہانہ عہدوں پر فائز ہیں، اور علمی مطالعات بتاتے ہیں کہ ہم جنس پرستی سے جو نفسیاتی کجرویاں پیدا ہوتی ہیں ان کے باعث ہم جنس پرست کسی ادارے کی قیادت کرنے کے نفسیاتی طور پر اہل نہیں ہوتے۔''

حملہ بے حد درشت اور جارحانہ تھا اور حاتم نے اس کا جواب درشتی کے ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ بڑی مستحکم آواز میں بولا، ''تمھاری صحافتی ناکامیابی کا ایک سبب تمھارا دقیانوسی اندازِ فکر ہے۔''

''تو کیا ہم جنس پرستی اب ترقی پسندانہ عمل بن گئی ہے؟''

''یہ ہمارے ملک کا کوئی قومی مسئلہ بھی نہیں ہے۔ میرے عزیز تعلیم یافتہ آدمی، مصر ہم جنس پرستی کے باعث نہیں بلکہ رشوت ستانی، آمریت، اور سماجی ناانصافی کے باعث پسماندہ ہے۔ لوگوں کی ذاتی زندگیوں کی جاسوسی کرنا بڑا رکیک طرزِ عمل ہے جو لوکیر جیسے جمے ہوے اخبار کے شایاں نہیں۔''

صحافی نے اعتراض کرنا چاہا لیکن حاتم نے اس کی بات ترشی سے کاٹ دی، ''بحث ختم۔ براہ کرم خاموش رہیں تاکہ ہم دوسرے موضوعات پر بات کر سکیں۔''

Scanned with CamScanner

اس طرح حاتم نے پہلا پالا ہنر مندی سے مار لیا اور سب پر اپنی شخصیت کی دھاک بھی بٹھا دی، اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ افشا کے خوف کے آگے جھکنے والی اسامی نہیں ہے۔ ایک دوسرے خجالت انگیز موقعے پر، جو اور بھی زیادہ سوقیانہ تھا، ایک زیر تربیت صحافی نے اس کے ساتھ بڑی گستاخ حرکت کی۔ وہ چھپائی کے کمرے میں کارکنوں کے درمیان کھڑا اخبار کی طباعت کی نگرانی کر رہا تھا کہ یہ صحافی اس سے بات کرنے کے بہانے وارد ہوا اور قریب آ کر میز پر پڑے کاغذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حاتم کی پشت سے بھڑ کر اسے دھکا دیا۔ حاتم فوراً اس حرکت کا مطلب سمجھ گیا اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے ہٹ گیا، اور حسب معمول چھاپے خانے کا دورہ جاری رکھا۔ بعد میں دفتر پہنچ کر اس نے صحافی کو بلا بھیجا، حاضرین کو کمرے سے جانے کے لیے کہا اور صحافی کو چند منٹ کھڑا رہنے دیا، اور اس اثنا میں اسے بیٹھنے کی اجازت دیے یا اس پر توجہ کیے بغیر کاغذات دیکھتا رہا۔ بالآخر سر اٹھایا، کچھ دیر تک اسے دیکھا، اور آہستگی سے کہا، ''سنو، یا تو شائستگی سے پیش آؤ، یا میں تمھیں اخبار سے باہر کرتا ہوں۔ سمجھے؟''

صحافی نے اپنے تعجب اور معصومیت کا ڈھونگ رچایا، لیکن حاتم نے کاغذات پر نظر لوٹانے سے پہلے بڑے فیصلہ کن لہجے میں کہا، ''یہ آخری تنبیہ ہے۔ مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ جاؤ۔ انٹرویو ختم۔''

❋

حاتم رشید صرف ایک مخنث ہی نہیں بلکہ باصلاحیت اور متجسس آدمی بھی ہے جس نے بہت کچھ تجربے سے سیکھا ہے اور جس کی لیاقت اور ذکاوت اسے پیشہ ورانہ کامیابی کے نقطۂ کمال پر لے آئی ہے۔ مزید براں، وہ بڑی شاندار ذہانت کا بھی مالک ہے اور بے تکان کئی زبانیں بول سکتا ہے (انگریزی، ہسپانوی، فرانسیسی اور، ظاہر ہے، عربی)۔ اس کے وسیع اور عمیق مطالعے نے اسے اشتراکی فکر سے متعارف کرایا ہے جو اس پر کافی اثر انداز ہوئی ہے۔ اس نے مصر کے نامی گرامی اشتراکیوں سے دوستی پیدا کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اسے 1970 کی دہائی کے آخر میں ایک مرتبہ قومی سکیورٹی کے تفتیش کاروں کے سامنے طلب کیا گیا تھا۔ انھوں نے باز پرس کی لیکن آخر میں چند گھنٹوں بعد اس کی فائل میں یہ درج کر کے کہ ''حامی تو ہے لیکن منظم نہیں'' اسے چلتا کیا۔ اس کی اشتراکیت کی وجہ سے ہی اس کا نام خفیہ اشتراکی تنظیموں (مزدوروں کی پارٹی، مصری اشتراکی پارٹی) میں رکنیت کے لیے

Scanned with CamScanner

متعدد بار پیش کیا گیا ہے لیکن اس کی مشہورِ عام ہم جنس پرستی کے باعث ان کے اربابِ حل وعقد اسے رکن بنانے سے باز رہے ہیں۔

تو یہ ہے حاتم رشید کی حقیقی اور عوامی شخصیت۔ رہی اس کی ہم جنسی کی خفیہ زندگی، تو یہ ایک ایسا مقفل صندوق ہے جو ممنوعہ، گناہ آلود اور لذت انگیز کھلونوں سے بھرا ہے، جسے وہ ہر رات کھول کر ان سے کھیلتا ہے اور پھر سے تالا لگا کر اسے بھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ مسلسل کوشش کرتا ہے کہ جس قدر ہو سکے، ہم جنس پرستی کو اپنی زندگی میں کم سے کم جگہ دے؛ اپنی یومیہ زندگی صحافی اور منصرم کی طرح گزارے اور اپنے عیش وعشرت کو بستر میں صرف چند شبانہ ساعتوں تک محدود کر دے۔ وہ اپنے آپ سے کہتا ہے کہ دنیا میں بیشتر لوگوں کے اپنے مخصوص مشاغل ہوتے ہیں جن سے وہ زندگی کے دباؤوں کو کم کرتے ہیں۔ شراب، حشیش، عورت یا جوے کی رسیا وہ اعلیٰ منصب شخصیتیں — جیسے ڈاکٹر، مشیر، یونیورسٹی کے اساتذہ — اپنے ان شوقوں کے باعث کم کامیاب نہیں ہوتیں اور نہ ان کی عزتِ نفس کم ہو جاتی ہے۔ وہ خود کو قائل کرتا ہے کہ ہم جنسی بھی اسی قسم کی چیز ہے، بس اس کا اپنا الگ ذائقہ ہے۔

یہ خیال اسے بہت بھاتا ہے کیونکہ اس سے بڑی راحت ملتی ہے اور بڑے توازن اور توقیرِ نفس کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ ایک مستقل عاشق سے پائیدار تعلق کا متلاشی رہتا کہ اپنی ضروریات کو بے فکری سے پورا کر سکے اور اپنی ہم جنسی کو رات کی چند گھڑیوں کے لیے بستر تک محدود کر دے، کیونکہ جب اس کا عاشق نہیں ہوتا اور وہ تنہا ہوتا ہے تو ترغیب کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ اس وقت اس کی منھ زور شہوت اسے ذلت آمیز حالات سے دوچار کر دیتی ہے۔ وہ درد و الم کے ایسے دنوں سے بھی گزر چکا تھا جن میں وہ مجبور ہو کر ہم جنسوں کے اڈوں پر جاتا اور وہاں کے مشتبہ اور کوڑا کرکٹ لوگوں میں سے کسی عاشق کا انتخاب کر کے اس کے ساتھ خود کو آلودہ کرتا، صرف ایک رات کی حاجت کے لیے، اور بعد میں وہ اسے کبھی نظر نہ آتا۔ کتنی ہی مرتبہ وہ چوری، اہانت اور اٹھائی گیری کا ہدف بنا ہے، اور ایک بار تو انھوں نے محلۂ الحسین کے عوامی حمام میں اسے بڑی بری طرح مارا تھا اور اس کی سونے کی گھڑی اور بٹوا بھی لے گئے تھے۔

اس قسم کی جنونی راتوں کے نتیجے میں حاتم رشید کئی دن کے لیے گھر میں بند ہو کے بیٹھ جاتا، نہ کسی سے ملتا نہ بات کرتا۔ وہ خوب شراب پیتا اور اپنی پوری زندگی پر غور کرتا، اپنی ماں اور باپ کو طیش

Scanned with CamScanner

اور تنفر کے ساتھ یاد کرتا۔ وہ اپنے سے کہتا کہ اگر انھوں نے تھوڑا سا وقت اسے بھی دیا ہوتا تو وہ آج اس قعرِ مذلت میں اس حد تک نہ گرا ہوتا، لیکن وہ دونوں تو اپنے پیشہ ورانہ عزائم کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے، خود کو دولت اور ناموری کے لیے وقف اور اسے خادموں کے حوالے کیے ہوئے تھے کہ جس طرح چاہیں اس کے جسم سے کھیلتے پھریں۔ وہ کبھی ادریس کو ملامت نہیں کرتا تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی اس بات پر شک نہیں کرتا تھا کہ وہ اسے صدق دلی سے چاہتا تھا، لیکن اسے یہ تمنا ضرور تھی کہ کاش اس کا باپ، ڈاکٹر حسن رشید، صرف ایک بار ہی اپنی قبر سے اٹھ کر آئے اور اپنے بارے میں اس کی رائے سنے۔ وہ اس کے روبرو کھڑا ہو جائے گا اور اس کی سنگین نگاہوں، بھاری تن و توش اور بارعب پائپ کا سامنا کرے گا۔ وہ اس سے ذرا بھی خائف نہیں ہوگا اور اس سے کہے گا، ''متبحر عالم صاحب، اگر آپ کو اپنی زندگی مدنی قانون کے لیے ہی وقف کرنی تھی تو پھر شادی کیوں کی، بچے کیوں پیدا کیے؟ آپ قانون کے نابغہ ہوں گے، لیکن آپ کو یقیناً یہ معلوم نہیں کہ حقیقی باپ کیسے بنا جاتا ہے۔ بتائیے تو سہی، آپ نے زندگی میں کتنی بار مجھے چوما ہے؟ کتنی بار میرے پاس بیٹھے ہیں کہ اپنی الجھنوں کے بارے میں آپ کو بتا سکوں؟ آپ نے مجھے ہمیشہ اس طرح برتا ہے جیسے میں کوئی نایاب فنی چیز یا پینٹنگ ہوں جسے آپ نے صرف اس لیے خریدا ہو کہ آپ کو بھا گئی تھی، اور پھر اسے بھول بھال گئے ہوں، اور جب بھی آپ کے بھرے پرے اوقاتِ کار نے اجازت دی ہو، اسے یاد کر لیا ہو، تھوڑی دیر دیکھ لیا ہو، اور پھر سے بھلا دیا ہو۔''

اور جینت، اپنی ماں، کو بھی وہ حقیقت کا سامنا کروائے گا۔ ''تم لیٹن کوارٹر کی ایک چھوٹی سی بار میں محض ساقی گری کرتی تھیں۔ تم غریب تھیں اور غیر تعلیم یافتہ، اور میرے باپ کے ساتھ تمھاری شادی اتنی بڑی معاشرتی چھلانگ تھی جس کا تم تصور بھی کبھی نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کے باوجود تم نے بعد کے تیس سال میرے باپ کو حقارت سے دیکھنے اور اس سے پیسے لوٹنے میں گزارے، صرف اس لیے کہ وہ مصری تھا اور تم فرانسیسی۔ تم نے وحشیوں کے درمیان مہذب یورپی ہونے کا کھیل کھیلا۔ تم مصر اور مصریوں پر جھینکتی رہیں اور ہر ایک کے ساتھ سرد مہری اور غرور کا برتاؤ کرتی رہیں۔ میری طرف سے غفلت تمھاری مصر سے کراہت کا ایک حصہ تھی، اور مجھے گمان ہے، بلکہ مجھے پورا یقین ہے کہ تم نے میرے باپ سے ایک مرتبہ سے زیادہ جنسی بے وفائی کی ہے، کم از کم موسیو بینار کے ساتھ، سفارت

خانے کا سیکرٹری جس کے ساتھ تم گھنٹوں ٹیلیفون پر باتیں کرتی تھیں، صوفے پر پڑی، رسیور کو چمٹائے، اور سر گوشیوں میں، تمھارا چہرہ شہوت سے اینٹھا ہوا، مجھے باہر نوکروں کے ساتھ کھیلنے کے لیے بھیج کر۔ تم واقعی ایک کسبی تھیں، ویسی ہی کہ پیرس کے شراب خانوں میں آدمی کے ہتھیلی کھولنے کی دیر ہے اور درجن بھر کھنچی چلی آئیں۔"

ایسے تاریک لمحوں میں حاتم پر یاس چھا جاتی ہے، اپنی اہانت کا احساس اس کو تار تار کر دیتا ہے، اور وہ کسی طفل کی طرح خود کو آہ و زاری کے سپرد کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی اسے خودکشی کرنے کا خیال بھی آتا ہے لیکن اس پر عمل کرنے کے لیے جو ہمت درکار ہے اسے وہ اپنے میں مفقود پاتا ہے۔

اگرچہ اس وقت اس کے حالات بڑے اطمینان بخش ہیں: عبدہ سے اس کا تعلق جاری ہے اور مستحکم ہو گیا ہے اور وہ کیوشک اور اس کمرے کے ذریعے جو اس نے انھیں چھت پر کرائے پر لے دیا ہے، عبدہ کی زندگی کو اپنی زندگی سے منسلک کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کی جسمانی تسکین کا سامان ہو گیا ہے اور اس نے 'شے نو باز' اور ہم جنسوں کے دوسرے ٹھکانوں کے پھیرے لگانے ترک کر دیے ہیں۔ وہ عبدہ سے اپنی تعلیم مکمل کر لینے کے اشارے کرنے لگا ہے تاکہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور قابلِ احترام آدمی بن جائے جسے اس کے جذبات اور خیالات کو سمجھنے کی قدرت حاصل ہو جائے اور اس کی دائمی دوستی کا مستحق بن سکے۔

"عبدہ، تم ذہین اور حساس آدمی ہو اور کوشش کرو تو اپنے حالات بدل سکتے ہو۔ اب تم روزی کما رہے ہو، تمھارے اہل و عیال مطمئن اور خوش ہیں، اور تمھاری زندگی میں قرار آ گیا ہے۔ لیکن پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں۔ تمھیں چاہیے کہ تعلیم حاصل کرو، ایک باعزت آدمی بن جاؤ۔"

وہ اپنے صبح گاہی دورۂ عشق سے فارغ ہو چکے تھے۔ حاتم بستر سے ننگ دھڑنگ اترا اور خواب آلود انداز میں پنجوں کے بل چند قدم رقص کرتے ہوئے اٹھائے۔ اس کے چہرے پر وہی آسودگی اور رعنائی تھی جو عام طور پر دل بھر کے ہمبستری کرنے کے بعد در آتی تھی۔ وہ اپنے لیے گلاس میں مشروب انڈیلنے لگا۔ عبدہ، جو ابھی تک بستر پر پسرا ہوا تھا، ہنسا اور مذاقاً بولا، "تم کیوں چاہتے ہو کہ میں تعلیم حاصل کروں؟"

"تاکہ باعزت بن جاؤ۔"

''تمھارا مطلب ہے اب نہیں ہوں؟''

''ہو، بالکل ہو۔ لیکن اس کی شہادت دینے کے لیے تمھیں پڑھ لکھ کر باقاعدہ سند لینی ہوگی۔''

''میں بس اتنی ہی شہادت دوں گا: لا الہ الا اللہ۔''

عبدہ خوب زور سے ہنسا لیکن حاتم نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا، ''میں تم سے سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ تمھارے لیے کوشش کرنا ضروری ہے۔ پرائمری اور ہائی اسکول پاس کرو اور کسی بڑے شعبے میں جاؤ، مثلاً قانون۔''

''کہاوت ہے: بوڑھا ہوا، کتاب اٹھائی!''

''نہیں، عبدہ۔ اس طرح مت سوچو۔ تم چوبیس سال کے ہو۔ تمھاری ساری زندگی تمھارے آگے ہے۔''

''ہر چیز قسمت اور نصیب سے ہوتی ہے۔''

''پھر وہی رجعت پسندانہ باتیں لے بیٹھے! تم اس دنیا میں اپنی قسمت آپ پیدا کر سکتے ہو۔ اگر ہمارے ملک میں انصاف ہوتا، تو تم جیسے آدمی کی تعلیم حکومت کے خرچ پر ہوتی۔ تعلیم، علاج معالجہ، اور روزگار دنیا کے تمام لوگوں کا بنیادی حق ہے، لیکن مصری حکومت فیصلہ کیے بیٹھی ہے کہ تم جیسے غریب لوگوں کو جاہل ہی رکھے گی، تاکہ وہ یہ نہ جان لیں کہ وہ انھیں لوٹ رہی ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ حکومت مرکزی سیکیورٹی ادارے میں سپاہی بھرتی کرنے کے لیے غریب ترین اور جاہل ترین لوگوں کا انتخاب کرتی ہے؟ عبدہ، اگر تم پڑھے لکھے ہوتے تو مرکزی سیکیورٹی میں بدترین حالات میں اور چند سکوں کی خاطر نوکری کرنے پر کبھی راضی نہ ہوتے۔ اُس وقت جبکہ گروگھنٹال ہر روز عوام کی روزی سے لاکھوں کروڑوں لوٹ رہے ہیں۔''

''تو تم چاہتے ہو کہ میں گروگھنٹالوں کو لوٹنے سے منع کردوں؟ میں، جو فوج کے کمانڈر کا سامنا کرنے کی جرأت بھی نہ کرسکا، ان توپ لوگوں کا کیا حساب لوں گا؟''

''اپنی ذات سے شروع کرو، عبدہ۔ جدوجہد کرو اور خود کو تعلیم دو۔ اپنے حقوق حاصل کرنے کی راہ کا یہ پہلا قدم ہے۔'' پھر حاتم اسے کچھ دیر تک دیکھتا رہا اور بولا: ''اور کون جانے، ایک دن تم 'وکیل صاحب عبدربہ' بن جاؤ۔''

عبدہ بستر سے اٹھا، قریب آ کر اسے شانوں سے پکڑ لیا، گالوں پر چوما، اور بولا، ''اور میری تعلیم کا خرچ کون برداشت کرے گا؟ اور جب تعلیم ختم کرلوں گا تو میرے لیے دفتر کون مہیا کرے گا؟''

اچانک جیسے حاتم کے جذبات سلگ اٹھے ہوں۔ منھ کو عبدہ کے چہرے کے قریب لاکر سرگوشی میں کہا، ''میرے پیارے، میں دوں گا۔ ساری زندگی کبھی تم سے الگ نہیں ہوں گا اور نہ کبھی تم سے خست کروں گا۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو بھینچ لیا اور لمبے گرم بوسوں میں کھو گئے، لیکن انھیں دور سے ایک آواز آتی سنائی دی، اور رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ کوئی بڑے زور سے بار بار دروازہ پیٹ رہا ہے۔ حاتم نے تشویش سے عبدہ کی طرف دیکھا اور انھوں نے، جس طرح بھی بنا، بعجلت کپڑے پہنے، حاتم نے دروازے کی سمت بڑھنے میں سبقت کی، اور جس کسی کا بھی سامنا ہو اس کے لیے اپنے چہرے پر ناگواری اور غرّے کا تاثر لانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے روزن سے جھانکا اور تعجب سے کہا، ''تمھاری بیوی ہے، عبدہ۔''

عبدہ تیزی سے آگے آیا، دروازہ کھولا اور غصے سے چیخا، ''ہدیہ، کیا ہوا؟ تم اس وقت یہاں کیسے؟ کیا چاہتی ہو؟''

ہدیہ نے اپنی بانہوں میں سوتے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''میری مدد کرو، عبدہ! لڑکا بخار میں تپ رہا ہے اور مسلسل قے کیے جا رہا ہے۔ ساری رات چلّاتا رہا ہے۔ حاتم بک، آپ سے التجا کرتی ہوں، ڈاکٹر بلا دیں یا ہمیں اسپتال لے چلیں!''

❁

جب بثینہ نے غسلخانے کا دروازہ کھولا تو زکی الدسوقی کو فرش پر پھیلا ہوا پایا۔ اس کے کپڑے قے سے سنے ہوئے تھے، اور وہ ہلنے جلنے سے معذور تھا۔ اس نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ برف کی طرح سرد تھا۔

''زکی بک، کیا طبیعت خراب ہے؟''

اس نے کچھ بے ربط سے الفاظ بڑبڑا کر کہے اور مسلسل خلا میں دیکھے گیا۔ وہ ایک کرسی اٹھا لائی اور اسے اپنی بانہوں میں بھر کر اس پر بٹھا دیا (اور اس لمحے اس پر منکشف ہوا کہ وہ کس قدر

Scanned with CamScanner

ہلکا پھلکا ہے)، اس کے سنے ہوئے کپڑے اتارے، اور گرم پانی سے اس کے ہاتھ، منھ اور سینہ دھلایا۔ جلد ہی اسے افاقہ ہونے لگا۔ اب وہ اس کے سہارے کسی قدر دشواری کے ساتھ کھڑے ہونے اور چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔ وہ اسے بستر پر لٹا کر اوپر چھت پر اپنے کمرے میں آئی اور وہاں سے پودینے کے پانی کا ایک گرم گلاس بنا کر جلد ہی لوٹی، جسے پی کر زکی نے خود کو گہری نیند کے حوالے کر دیا۔ بثینہ نے پوری رات اس کے برابر صوفے پر بیٹھے بیٹھے گزاری اور کئی بار اٹھ کر اس کا معائنہ کیا۔ اس کی پیشانی کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا کہ کتنی گرم ہے، اور ناک کے نیچے انگلی رکھ کر اطمینان کیا کہ اس کا تنفس باقاعدہ آ جا رہا ہے۔ وہ جاگتی رہی اور ارادہ کر لیا کہ اگر اس کی حالت بگڑی تو ڈاکٹر کو بلائے گی۔ اس کے سالخوردہ، محوِخواب چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ اسے پہلی بار، صاف سیدھی حقیقت میں، محض ایک نیک دل، نشے میں دھت، ضعیف آدمی معلوم ہوا، نحیف و نزار، معتدل مزاج، اور ایک بچے کی طرح شفقت کا مستحق۔

صبح اس نے زکی کے لیے گرم دودھ کے ساتھ ہلکا سا ناشتہ تیار کیا۔ اتنے میں ابسخروں آ پہنچا اور اسے پتا چلا کہ کیا پیش آیا ہے۔ وہ غمزدگی سے سر جھکا کر اپنے بیمار آقا کے پاس کھڑا ہو گیا اور بار بار دکھ بھری آواز میں کہتا رہا: ''عالیجاہ، ہزار بار آپ کی سلامتی کے لیے دعائیں۔''

زکی نے آنکھیں کھولیں اور اسے اشارے سے چلے جانے کے لیے کہا۔ پھر وہ دقت کے ساتھ کھڑا ہوا اور دیوار سے پیٹھ ٹیک کر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اور خفیف سی آواز میں بڑبڑایا، ''میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے اور معدے میں بڑی تکلیف ہے۔''

''آپ ڈاکٹر کو بلانا چاہتے ہیں؟''

''نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ میں نے ضرورت سے زیادہ پی لی تھی۔ ایسا میرے ساتھ کئی بار ہو چکا ہے۔ بس پھیکے ترکی قہوے کا ایک فنجان پیوں گا اور ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

وہ خود کو سنبھالے ہوئے ہونے اور اپنے کس بل کا مظاہرہ کر رہا تھا، جس پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور بولی، ''بس بس، اتنی مردانگی بہت کافی ہے۔ اب تم بوڑھے آدمی ہو اور تمھاری صحت بھی کمزور ہے۔ اب اور پینا پلانا اور رتجگے بند! تمھارے لیے ضروری ہے کہ اپنی عمر والوں کی طرح رات سویرے سو جایا کرو۔''

Scanned with CamScanner

زکی مسکرایا اور اس کی طرف احسان مندی سے دیکھتے ہوئے کہا، ''شکریہ، بثینہ۔تم ایک اچھی اور مخلص انسان ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمھارے بغیر کیسے گزارہ کروں گا۔''

بثینہ نے اس کے چہرے پر ہاتھ رکھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

اس نے اسے پہلے بھی کئی بار چوما تھا لیکن اس مرتبہ اس کے چہرے کا لمس مختلف محسوس ہوا۔ اپنے لب اس کی پیشانی سے لگاتے ہوئے اسے محسوس ہوا جیسے وہ اسے بہت اچھی طرح جانتی ہے، اسے اس کی بوڑھی، ان گھڑ سگندھ محبوب ہے، اور وہ اب وہ زکی بک نہیں رہا ہے جو اس سے دور ہو اور بیتے دنوں کے قصے سنا رہا ہو۔ وہ تو اب وہ ناگوار عاشق بھی نہیں رہا ہے جو اِس سے بہت مختلف تھا۔ وہ اب اس سے قریب تھا، جیسے وہ زمانوں سے اسے جانتی ہو، جیسے وہ اس کا باپ ہو، یا ماموں یا چچا، جیسے اس کی بوباس اور خون بھی اسی جیسا ہو۔ اس کا دل بے اختیار چاہا کہ بڑے زور سے اسے بھینچے اور اس کے لاغر، نازک سے جسم کو اپنی بانہوں میں لے لے اور اپنے مشام کو اس کے اگلے وقتوں کی ان گھڑ بوباس سے، جو اسے اتنی پسند تھی، بھر لے۔

اسے محسوس ہوا کہ جو کچھ ان دونوں کے مابین پیش آ رہا تھا، عجیب اور غیر متوقع تھا۔ اسے یاد آیا کہ ابھی کل ہی تو اس نے چکمادے کر اس سے دستخط کرانے کی کوشش کی تھی اور اس پر بڑی ندامت محسوس کی تھی۔ اسے خیال آیا کہ جو دھوکا اس نے کل دیا تھا وہ زکی کے لیے اپنے حقیقی جذبات سے مزاحمت کی اس کی آخری کوشش تھی؛ اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ دراصل اس چاہت سے بھاگنا چاہتی تھی جو وہ اس کے لیے محسوس کرتی تھی۔ اگر اس نے اس سے اپنے تعلق کو صرف جنس اور پیسے تک محدود رکھا ہوتا تو یہ اس کے لیے زیادہ راحت بخش ثابت ہوتا۔ وہ جنس کا طلبگار تھا، بثینہ پیسے کی ــ ٹھیک اسی طرح اس نے اس تعلق کا تصور کیا تھا، لیکن وہ ان حدود سے تجاوز کر گئی۔

اور اب اس کے حقیقی جذبات بالکل سامنے آ گئے ہیں اور چیزیں بالکل واضح ہو گئی ہیں۔ وہ اس کے ساتھ دائم رہنا چاہتی ہے، اس کی خبر گیری اور احترام کرنے کی خواہش مند ہے، اس کے لیے گہری ممنونیت محسوس کرتی ہے، اور اسے یقینِ کامل ہے کہ وہ جو کچھ بھی اس سے کہے گی، وہ اسے سمجھے گا۔ وہ اسے اپنی زندگی کے بارے میں بتائے گی، اپنے ماں باپ، اور طٰہٰ سے اپنی پرانی محبت کے بارے میں؛ وہ تو طلال سے اپنے تعلق کی گھناؤنی تفاصیل بھی اسے بتا دے گی اور اس پر خجالت نہیں

محسوس کرے گی۔ جب وہ اسے سب کچھ بتادے گی تو اس کا دل ہلکا ہو جائے گا، جیسے کوئی بڑا بھاری بوجھ سر سے اتر گیا ہو۔ جب زکی بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہا ہوتا ہے تو اسے اس کا بوڑھا چہرہ کتنا من بھاؤنا لگتا ہے، اور اس وقت بھی جب وہ اس سے کسی تفصیل کی وضاحت کے لیے کہتا ہے، پھر اس کی حکایتوں پر اپنی رائے دیتا ہے۔

زکی کے لیے اس کے جذبات اس عرصے میں آہستہ آہستہ شدت پکڑتے گئے تھے، یہاں تک کہ اُس صبح اسے معلوم ہوا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اپنے جذبات کو بیان کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی اور لفظ نہیں تھا۔ یہ ایسی گرم اور تپتی ہوئی محبت نہیں تھی جو اسے طٰہ کے لیے محسوس ہوتی تھی، بلکہ ایک بالکل ہی دوسری نوع کی: پرسکون اور گہری، راحت، اعتماد اور احترام سے ملتی جلتی کوئی شے۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی، اور جب یہ بات اس پر واضح ہوگئی تو وہ زکی کی بابت اپنے سارے اندیشوں سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہوگئی، اور بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ وہ اس کے ساتھ بے فکر اور خوش وخرم گھڑیاں گزارتی۔ کوشش کرتی کہ دن کا زیادہ حصہ اس کے ساتھ گزارے، اور جس قدر ممکن ہو، رات کا بھی۔ سونے سے پہلے وہ ان کے درمیان جو کچھ ہوا تھا اس کو اپنے ذہن میں دہراتی اور مسکرا دیتی، اور ایک بیکراں گدازی سے سرشار ہو جاتی۔

لیکن ایک چھوٹی سی کیٹلی اور کانٹے کی طرح نوکدار چیز ہمیشہ اس خیال سے اس کے ضمیر میں کھبنے لگتی ہے کہ وہ زکی سے دغا کرنے والی تھی۔ اس نے معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے زکی پر زور ڈالا تھا تاکہ اس کا اپارٹمنٹ ملاک کے ہتھے چڑھ جائے۔ زکی کو اس پر جو اعتماد تھا، اس نے اس کو نقصان پہنچانے کے لیے اس کا بے جا فائدہ اٹھایا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہوا تھا؟ کیا اس کا مقصد یہی نہیں تھا کہ جب وہ نشے میں دھت ہو تو دستاویز پر دستخط کروالے اور اپنی دھوکے بازی کا معاوضہ پانچ ہزار پاؤنڈ کی شکل میں ملاک سے وصول کرے؟ جب بھی دھوکے کا لفظ اس کے دماغ میں گونجتا، اسے زکی کی مہربان مسکراہٹ، اس میں زکی کی دلچسپی، اس کے جذبات کی پاسداری یاد آ جاتی۔ اسے یاد آتا کہ اس نے ہمیشہ اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ اور اس پر مکمل بھروسا کیا ہے۔ ایسے لمحوں میں وہ خود کو بہت گرا ہوا اور دغاباز محسوس کرتی، اپنے آپ کو حقارت سے دیکھتی اور خود ملامتی کے گرداب میں جا گرتی۔

یہ احساس اسے مسلسل اذیت پہنچاتا رہا، یہاں تک کہ ایک صبح وہ ملاک کے پاس پہنچی۔ صبح

Scanned with CamScanner

کا اولین وقت تھا اور ملاک نے بس ابھی ابھی دکان کھولی تھی۔ اس کے سامنے دودھ والی چائے کا پیالہ تھا اور وہ آرام آرام سے چسکیاں لے رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی، سلام علیک کی، اور قبل اس کے کہ اس کی ہمت جواب دے جائے، فوراً بول پڑی، ''ملاک چچا، جو ہم نے طے کیا تھا، وہ کام میں نہیں کر سکوں گی۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

''وہی، دھوکے سے زکی بک سے دستخط کرانے کا معاملہ۔ میں یہ نہیں کروں گی۔''

''کیوں؟''

''بس یونہی۔''

''تمھارا حتمی جواب ہے؟''

''ہاں۔''

''اچھا، ٹھیک ہے۔ شکریہ۔''

ملاک نے سکون سے کہا اور چائے کی چسکی لے کر اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ اس سے رخصت ہوتے ہوئے بثینہ کو یوں لگا جیسے ایک بہت بڑی فکر سے آزاد ہو گئی ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اس پر تعجب ہوا کہ ملاک نے اس کے عذر کو تکرار کیے بغیر قبول کر لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ طیش میں آ کر پھٹ پڑے گا، لیکن وہ پرسکون رہا تھا، جیسے اسی کا متوقع ہو یا پھر یہ کہ کسی اور ادھیڑ بن میں ہو۔ اس بات نے بثینہ کو چند دنوں تک مضطرب رکھا، لیکن پھر جلد ہی اپنے اندیشوں سے پیچھا چھڑا کر وہ پہلی بار ایک گہری طمانیت محسوس کرنے لگی، کیونکہ اس نے زکی کو دھوکا دینا چھوڑ دیا تھا اور اس سے مخفی رکھنے کے لیے اب کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی۔

❁

صبح کے آٹھ بجے شیخ شاکر اور طٰہ حلوان کی طرف جانے والی میٹرو میں سوار ہوئے۔ چند دنوں تک وہ طویل بحثیں کرتے رہے تھے، جن میں شیخ شاکر نے طٰہ کو جو کچھ اس کے ساتھ پیش آیا تھا اسے بھلا دینے اور اپنی زندگی کو از سر نو استوار کرنے پر راضی کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن طٰہ پر غضب اور انتقام کا بھوت اس بری طرح سوار تھا کہ وہ متعدد بار جسمانی شکستگی کے قریب پہنچ گیا۔ بالآخر، ایک لمبی

Scanned with CamScanner

بحث کے بعد، شیخ اس کے روبرو چلا کر بولا، ''تو آخر تم چاہتے کیا ہو؟ تم پڑھنا نہیں چاہتے، کام نہیں کرنا چاہتے، اور تم اپنے رفیقوں میں سے کسی سے ملنا نہیں چاہتے، حتیٰ کہ اپنے گھر والوں سے بھی نہیں۔ تم چاہتے کیا ہو، طٰہٰ؟''

''میں ان لوگوں سے انتقام لینا چاہتا ہوں جنھوں نے مجھے آزار پہنچایا اور مجھے ذلیل کیا۔''

''اور یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وہ کون ہیں؟ تم نے ان کے چہرے کہاں دیکھے تھے!''

''ان کی آوازوں سے۔ میں سینکڑوں آوازوں میں ان کی آواز پہچان سکتا ہوں۔ مولانا، میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ مجھے اس افسرِ اعلیٰ کا نام بتادیں جس کی نگرانی میں مجھے ایذا پہنچائی گئی تھی۔ آپ نے پہلے کہا تھا کہ اس کا نام جانتے ہیں۔''

شیخ شاکر خاموش ہوگیا اور سوچنے لگا۔

''مولانا، میں التجا کرتا ہوں۔ جب تک اس کا نام معلوم نہ ہوجائے، مجھے سکون نہیں ملے گا۔''

''مجھے اس کی قطعی پہچان تو نہیں لیکن مرکزی تحفظ میں ایذادہی عام طور پر دو آدمیوں کی نگرانی میں ہوتی ہے، کرنل صالح رشوان اور کرنل فتحی الوکیل۔ دونوں کافر اور مجرم ہیں اور ان کے نصیب میں جہنم لکھا ہے، اور یہ کتنا خراب نصیب ہے! لیکن افسر کا نام جان لینے سے تمھیں کیا فائدہ پہنچے گا؟''

''میں اس سے انتقام لوں گا۔''

''یہ واہی تباہی بات ہے۔ کیا تم اپنی ساری زندگی کسی ایسے شخص کی تلاش میں گزار دو گے جسے تم نے دیکھا تک نہیں؟ جنونی خیال ہے اور ناکام رہے گا۔''

''میں آخر دم تک اس کو ڈھونڈوں گا۔''

''تم اکیلے پوری حکومت سے لڑو گے، پوری فوج، پولیس، اور لاتعداد بھیانک اسلحے سے؟''

''آپ یہ کہہ رہے ہیں، جبکہ خود آپ ہی نے ہمیں بتایا تھا کہ ایک سچا مسلمان اپنے آپ میں ایک پوری قوم ہوتا ہے۔ کیا حق تبارک وتعالیٰ نے یہ نہیں کہا ہے: 'خدا کے حکم سے کتنی ہی مرتبہ ایک چھوٹی سی جماعت ایک کثیر التعداد جماعت پر غالب آئی ہے! 'صدق اللہ العظیم۔''

''اس میں شک نہیں کہ خدا برحق کہتا ہے، لیکن پوری حکومت سے لڑائی میں تمھیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ تم مرجاؤ گے، میرے بیٹے۔ پہلی مڈبھیڑ ہوتے ہی وہ تمھیں مار ڈالیں گے۔''

طٰہ خاموش ہو گیا اور شیخ کے چہرے کو دیکھنے لگا، کیونکہ موت کا ذکر اس پر اثر انداز ہوا تھا۔ پھر اس نے کہا، ''میں اب مرا ہوا ہی ہوں۔ انھوں نے نظر بندی میں مجھے مار ڈالا تھا۔ جب وہ استہزائی ہنسی کے ساتھ آدمی کی آبرو کو آلودہ کرتے ہیں، جب وہ اسے عورت کا نام دے کر کہتے ہیں کہ اپنے نئے نام کے ساتھ جواب دے، اور ایذا دہی کی شدت کے باعث اسے یہ کرنا پڑتا ہے... وہ مجھے 'فوزیہ' کہہ کر پکارتے تھے۔ ہر روز مجھے زدوکوب کرتے، یہاں تک کہ مجھے ان کے سامنے کہنا پڑتا، 'میں عورت ہوں؛ میرا نام فوزیہ ہے۔' آپ چاہتے ہیں کہ یہ سب بھلا دوں اور جیے جاؤں؟''

اس نے یہ بڑی تلخی کے ساتھ کہا اور دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹ لیا۔ شیخ نے کہا، ''سنو، طٰہ۔ ہمارے رب سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے اپنی ذمے داری سے سبکدوش ہونے کے لیے آخری بار کہتا ہوں: اس حکومت سے جھگڑے میں ملوث ہونے کا مطلب یقینی طور پر اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔''

''مجھے اب موت کا خوف نہیں رہا۔ میں نے شہید ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ مجاہد کی موت مروں اور جنت میں داخل ہوں۔''

دونوں کے درمیان خاموشی در آئی۔ شیخ اپنی جگہ سے اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور طٰہ کے پاس آیا اور تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا، پھر گرمجوشی سے بغلگیر ہوا، اور مسکرا کر بولا ''بارک اللہ فیک، میرے بیٹے! حقیقی ایمان اپنے ایمان رکھنے والوں کے ساتھ یہی کرتا ہے۔ اب گھر جاؤ اور سفر کے لیے اپنا تھیلا تیار کرو۔ ہم کل صبح ملیں گے اور میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔''

''کہاں؟''

شیخ کی مسکراہٹ کچھ اور پھیل گئی اور اس نے سرگوشی میں کہا، ''یہ نہ پوچھو۔ بس وہی کرو جو کہتا ہوں۔ وقت آنے پر سب کچھ جان لو گے۔''

❄

یہ گفتگو گزشتہ کل ہوئی تھی۔ طٰہ سمجھ گیا کہ شروع میں شیخ کی مخالفت اس کے عزم اور بلند حوصلگی کی استقامت کو آزمانے کا ایک حیلہ تھی۔ اس وقت دونوں کھچا کھچ بھری ہوئی میٹرو کے ڈبے میں ایک دوسرے کے برابر خاموش بیٹھے تھے۔ شیخ کھڑکی کے باہر کے منظر کو دیکھ رہا تھا اور طٰہ مسافروں کو بغیر دیکھے تک رہا تھا، ایک بے چین کر دینے والا سوال اس کے ذہن میں مسلسل چکرا رہا تھا۔ شیخ اسے کہاں

لے جا رہا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ وہ شیخ پر بھروسا کرتا تھا، تاہم اسے خوف اور اندیشے بھی محسوس ہو رہے تھے۔ اسے لگا جیسے وہ کسی خطرناک مقام کی طرف بڑھ رہا ہے جو اس کی زندگی میں حدِ فاصل اور جوہری نوعیت کا ثابت ہوگا۔ جب شیخ نے اس سے کہا، ''اگلے اسٹیشن، طرہ الاسمنت، پر اترنے کے لیے تیار ہو جاؤ'' تو اسے جھرجھری آ گئی۔

❁

اس اسٹیشن کا نام 'طرہ' اُس سیمنٹ کمپنی کے نام پر رکھا گیا ہے جسے بیس کی دہائی میں سوئس لوگوں نے بنایا تھا اور انقلاب کے بعد جسے قومیا لیا گیا تھا اور اس کی پیداوار میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ یہ دنیائے عرب کی بڑی سے بڑی فیکٹریوں میں شمار ہونے لگی تھی۔ اس کے بعد، تمام دوسری بڑی کمپنیوں کی طرح، اسے بھی 'بے روک ٹوک تجارت کی پالیسی اور نجکاری کے سامنے جھکنا پڑا، اور غیر ملکی کمپنیوں نے اس کے بہت سے حصص خرید لیے۔ میٹرو کی پٹری ٹھیک اس فیکٹری کے بیچ سے ہو کر گزرتی ہے۔ دائیں طرف انتظامیہ کی عمارتیں اور دیوہیکل چمنیاں ہیں، بائیں طرف وسیع صحرا پھیلا ہوا ہے جس کے اطراف میں پہاڑ ہیں۔ ان پہاڑوں میں پتھروں کے گڑھے منتشر ہیں جن میں بڑی بڑی چٹانوں کو ڈائنامائٹ کے دھماکوں سے اڑا کر مال بردار گاڑیوں کے ذریعے سیمنٹ کی بھٹیوں میں جلانے کے لیے لایا جاتا ہے۔

شیخ شاکر، طٰہ کے ساتھ گاڑی سے اترا اور دونوں اسٹیشن کو عبور کر کے پہاڑوں کی سمت میں صحرا کی طرف چل دیے۔ سورج تپ رہا تھا، فضا خاک سے اٹی ہوئی تھی جس نے پورے علاقے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ طٰہ کو حلق میں خشکی اور پیٹ کے بالائی حصے میں مسلسل دباؤ سا درد محسوس ہوا، اور بعد میں کچھ متلی اور کھانسی۔ شیخ نے مذاقاً کہا، ''صبرِ جمیل، مجاہد صاحب! یہاں کی فضا سیمنٹ کے غبار سے آلودہ ہے۔ جلد ہی اس کے عادی ہو جاؤ گے۔ خیر، اب ہم پہنچ ہی گئے ہیں۔''

وہ پتھروں کے ایک چھوٹے سے ٹیلے کے سامنے آ کر رک گئے، کچھ لمحے انتظار کیا۔ پھر کسی انجن کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی۔ پتھر لے جانے والا ایک دیوہیکل ٹرک قریب آ کر ان کے سامنے ٹھہر گیا۔ اس کا ڈرائیور ایک نوجوان آدمی تھا۔ یہ مزدوروں والا نیلا بالاپوش پہنے ہوئے تھا، گھسا پٹا اور رنگ اُڑا۔ اس نے شیخ کے ساتھ جلدی سے سلام علیک کی، جس نے اس کا جائزہ لیتے

ہوئے کہا، ''اللہ اور جنت،'' اور ڈرائیور نے، ''صبر اور نصر۔''

یہ خفیہ شناختی لفظ تھے۔ شیخ، طٰہ کا ہاتھ پکڑ کے اس کے ساتھ ڈرائیور کی کیبن میں چڑھ گیا۔ تینوں خاموش تھے۔ ٹرک پہاڑی راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ کمپنی کے دوسرے پتھر لے جانے والے ٹرک ان کے پاس سے گزرے، یہاں تک کہ ڈرائیور ایک تنگ سے کچے ذیلی راستے پر مڑ گیا، جس پر وہ کوئی آدھا گھنٹہ چلتے رہے۔ طٰہ اپنی تشویش کا اعتراف شیخ سے کرنے ہی کو تھا مگر دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے قرآن کے ایک چھوٹے سے نسخے سے تلاوت میں منہمک ہے۔ آخرکار فاصلے میں کچھ گڈمڈ سے پیکر ابھرے جو آہستہ آہستہ واضح ہو کر سرخ اینٹوں سے بنے گھروں کے ایک مجموعے کی شکل اختیار کر گئے۔ ٹرک رک گیا، طٰہ اور شیخ نیچے اترے، اور ڈرائیور نے سلام کیا اور ٹرک کا رخ پھیر کر واپس ہو گیا۔

منظر کچی آبادی والے علاقوں کے راستوں سے مشابہ تھا: ہر طرف سے غربت ٹپک رہی تھی، پانی بھرے گڑھوں والی کچی گلیاں، گھروں کے باہر گھومتی پھرتی مرغیاں اور بطخیں، ننگے پاؤں کھیلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچے، اور دروازوں کے سامنے بیٹھی ہوئی کچھ نقاب دار عورتیں۔ شیخ اعتماد سے قدم اٹھا رہا تھا، کسی ایسے آدمی کی طرح جو اس جگہ سے اچھی طرح واقف ہو، اور طٰہ کو اپنے پیچھے لیے ایک گھر میں داخل ہوا۔ وہ دروازے سے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے، جہاں اگر کچھ تھا تو بس ایک چھوٹی سی میز اور دیوار پر لٹکا ہوا ایک سیاہ تختہ۔ فرش پر بڑی بڑی زرد رنگ چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں، جن پر باریش اور سفید جلبابوں میں ملبوس نوجوانوں کی ایک جماعت بیٹھی تھی۔ شیخ کو دیکھتے ہی وہ لپک کر اسے سلام کرنے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے شیخ سے معانقہ کیا، اسے بوسہ دیا۔ البتہ ایک نے کچھ تاخیر کی۔ یہ عمر میں سب سے بڑا تھا، خوب موٹا تازہ، دراز قامت، چالیس کے لگ بھگ، بڑی سی سیاہ، گھنی ڈاڑھی، سفید جلباب پر گہرا سبز پٹکا ڈالے ہوئے۔ اس کی دائیں بھوں سے پیشانی کے بالائی حصے تک ایک دھاری پڑی تھی، جیسے یہ کسی پرانے، بڑے زخم کا نشان ہو جس کے باعث وہ پوری طرح سے آنکھ بند نہیں کر پاتا تھا۔ وہ شیخ شاکر کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا اور اپنی بھرائی ہوئی آواز میں کہا، ''السلام علیکم! مولانا، آپ کہاں تھے؟ ہم پورے دو ہفتوں سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

''بلال، اشد ضرورت ہی تمھارے پاس آنے سے روکے رہی۔ کیسے ہو؟ تمھارے برادروں کا کیا حال ہے؟''

''الحمدللہ، ہم سب ٹھیک ہیں، انشاءاللہ۔''

''اور کام کیسا چل رہا ہے؟''

''جیسا کہ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا، کامیابی ہی کامیابی ہے۔ اللہ کے فضل سے۔''

شیخ شاکر نے طٰہ کے گرد اپنا بازو ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا،''یہ طٰہ الشاذلی ہے، میں نے تم سے اس کا ذکر کیا تھا، بلال۔ ایک جرأت مند، متقی، پابندِ شعائر نوجوان کی بہترین مثال۔ اور ہم خدا پر کسی کو سبقت نہیں دیتے۔''

پھر اس نے اس آدمی سے ہاتھ ملانے کے لیے طٰہ کو آگے کیا۔ طٰہ کو اس کی گرفت بڑی سخت محسوس ہوئی۔ جب وہ اس کے بدنما چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کے کانوں میں شیخ شاکر کے الفاظ گونج رہے تھے،''طٰہ، میں خدا کے حکم سے تمھیں تمھارے خداپرست بھائی سے ملوا رہا ہوں، شیخ بلال، امیرِ عسکر۔ طٰہ، یہاں شیخ بلال خدا کے حکم سے تمھیں سکھائیں گے کہ تم کس طرح وہ حاصل کر سکتے ہو جو تمھارا حق ہے اور کس طرح تمام ظالموں سے انتقام لے سکتے ہو۔''

❁

سعاد اٹھی اور بمشکل اپنی آنکھیں کھول پائی۔ اسے پیٹ میں درد اور متلی محسوس ہو رہی تھی اور سر بھی دکھ رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا تھا اور تکلیف دے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے اندازہ ہوا کہ وہ اسپتال میں ہے۔ کمرہ بہت بڑا اور اونچی چھت کا تھا۔ ایک کونے میں پرانی کرسیاں اور چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ دو کواڑوں والا دروازہ، جس میں دونوں طرف مدوّر شیشے کے روزن تھے، سنہ چالیس کی دہائی کی مصری فلموں کے کسی جراحی کے کمرے سے مشابہ تھا۔ پلنگ کے برابر ایک ہٹی کٹی، چپٹی ناک والی نرس کھڑی ہوئی تھی۔ وہ سعاد پر جھکی۔ اس کے منھ پر ہاتھ رکھا، اور مسکرا کر بولی،''خدا کا شکر کہ آپ صحیح سلامت ہیں۔ خدا نے آپ پر بڑا کرم کیا ہے۔ بہت خون بہا تھا۔''

''جھوٹی!'' سعاد پھنسی پھنسی آواز میں چلّائی۔ نرس لپک کے پیچھے ہٹ گئی۔''تم نے زبردستی حمل گرایا ہے۔ میں تمھیں دیکھ لوں گی!''

Scanned with CamScanner

نرس کمرے سے نکل گئی۔ ایک جنونی غصہ اس پر طاری ہو گیا۔ وہ اپنے پاؤں پٹختے اور زور زور سے چلّانے لگی، ''مجرمو، تم نے میرا اسقاط کر دیا ہے! ہنگامی پولیس کو بلاؤ! میں تم سب کو جیل بھجواؤں گی!''

جلد ہی دروازہ کھلا اور ایک نوجوان ڈاکٹر ظاہر ہوا، پیچھے پیچھے نرس چلی آ رہی تھی۔ سعاد نے چیخ کر کہا، ''میں پیٹ سے تھی؛ تم نے جبراً میرا حمل گرا دیا ہے!''

ڈاکٹر مسکرایا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹا ہے اور ڈرا ہوا بھی۔ اس نے ہڑبڑا کر کہا، ''آپ کا خون بہنے لگا تھا، مادام۔ اپنے اعصاب ٹھنڈے رکھیں۔ اشتعال آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

سعاد پھر پھٹ پڑی۔ وہ چیخیں مار کر انھیں برا بھلا کہنے اور رونے لگی۔ اتنے میں دروازہ دوبارہ کھلا اور اس کا بھائی حمیدو داخل ہوا، ساتھ میں حاج عزام کا لڑکا فوزی تھا۔ حمیدو نے پاس آ کر بہن کو بوسہ دیا۔ سعاد بھائی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

حمیدو کا چہرہ تڑمڑ گیا۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے اور کچھ بولا نہیں۔ فوزی کمرے کے انتہائی کونے سے آہستگی کے ساتھ کرسی کھینچ کر لایا اور بستر کے برابر بیٹھ گیا۔ پھر سر پیچھے ڈال کر بڑے نپے تلے لہجے میں اور ہر ہر لفظ کو صاف صاف ادا کر کے جیسے بچوں کو سبق سکھا رہا ہو، کہا، ''سنو، سعاد۔ ہر چیز نصیب اور قسمت سے ہوتی ہے۔ حاج عزام نے ایک معاملے میں تم سے معاہدہ کیا تھا اور تم اس کے خلاف گئیں، اور 'جو ابتدا کرتا ہے وہ زیادہ ناانصاف ہوتا ہے۔'''

''خدا تم سے اور تمھارے باپ سے انتقام لے! مجرمو! کتے کی اولاد!''

''زبان بند کرو!''

فوزی نے یہ لفظ گرمی سے کہے۔ اس کی بھنویں تن گئیں اور چہرے پر سختی اور سفاکی آ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر لیکچر دینے لگا۔

''تمھاری بدتمیزی کے باوجود حاج نے تمھارے ساتھ اللہ کی مرضی کے مطابق عمل کیا ہے۔ تمھارا خون جاری ہو گیا تھا اور تم مر جاتیں۔ ہم تمھیں اسپتال لے آئے اور ڈاکٹر حمل گرانے پر مجبور ہو گیا۔ اسپتال کے کاغذات موجود ہیں اور ڈاکٹر کی رپورٹ موجود ہے۔ حمیدو، اسے بتا دو۔''

حمیدو نے خاموشی سے سر جھکا لیا اور فوزی کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔

Scanned with CamScanner

''میرے والد، حاج عزام، ایک خدا ترس آدمی ہیں۔ انھوں نے تمھیں طلاق دے دی ہے اور تمھارے حقوق سے زیادہ دیا ہے۔ خدا انھیں اس کی جزا دے۔ مہر اور نفقے کا حساب ہم نے خدا کے قانون کے مطابق لگایا ہے۔ اس کے علاوہ ہماری طرف سے بھی کچھ ہے۔ تمھارے بھائی حمیدو کے پاس بیس ہزار پاؤنڈ کا چیک ہے۔ اسپتال کے اخراجات ادا کر دیے گئے ہیں اور ہم نے گھر سے تمھاری ساری ضروری چیزیں اٹھالی ہیں جو تمھیں اسکندریہ بھیج دی جائیں گی۔''

ایک دبیز خاموشی چھا گئی۔ سعاد، جو ٹوٹ کر رہ گئی تھی، دبی دبی آواز میں رونے لگی۔ فوزی کھڑا ہو گیا۔ وہ اس لمحے میں قوی اور فیصلہ کن دکھائی دے رہا تھا، گویا کہ ہر چیز کا دارومدار اس کے الفاظ پر ہو۔ اس نے دو قدم دروازے کی طرف اٹھائے، پھر مڑا، جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو، اور کہا، ''رئیس حمیدو، اپنے بہن کے ہوش ٹھکانے لاؤ۔ اس کا دماغ کچھ کچا ہے۔ پورا معاملہ طے ہو گیا ہے اور اس کا جو نکلتا تھا اس کی ایک ایک دمڑی اسے مل گئی ہے۔ ہم نے معاملہ عزت کے ساتھ شروع کیا تھا اور عزت ہی کے ساتھ اسے ختم کر رہے ہیں۔ اگر تم اور تمھاری بہن مشکلیں کھڑی کرنے کی کوشش کرو گے یا اول فول بکو گے، تو ہمیں تمھیں تمھاری اوقات پر لوٹانا آتا ہے۔ یہ ملک ہمارا ہے، حمیدو۔ ہماری پہنچ بہت دور تک ہے، اور لوگوں سے نبٹنے کے لیے ہمارے پاس ہر قسم کے طریقے ہیں، اب آگے تمھاری مرضی۔''

وہ آہستہ، سوچے سمجھے قدموں سے آگے بڑھا، یہاں تک کہ کمرے سے باہر نکل گیا، دروازے کے پٹ اس کے پیچھے پھڑ پھڑاتے رہے۔

❁

جس طرح کوئی شخص اپنے دیدہ زیب سوٹ پر پڑے خاک کے ذرات کو انگلی سے جھٹک کر بڑھا چلا جاتا ہے، یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، اسی طرح حاج عزام نے سُعاد جابر سے اپنی گلوخلاصی کی اور اس کے لیے اپنی دل بستگی کو مٹا دیا۔ لیکن اس کے لہکتے ہوئے، گرم اور لذیذ جسم کی یاد تھی کہ لوٹ لوٹ کر آتی رہی، اور اس نے اسے بھول جانے کی بڑی زبردست اور المناک کوشش کی، جس کے لیے وہ آخری منظر کے دوران اس کے بہیمانہ اور نفرت انگیز چہرے کو عمداً نظروں کے سامنے لاتا، ان مشکلوں اور فضیحتوں کا تصور کرتا جو اس سے جان نہ چھڑانے کی صورت میں اسے لاحق ہوتے۔ وہ یہ کہہ کر خود کو

Scanned with CamScanner

دلاسا دیتا کہ سعاد سے اس کی شادی، ہر چند کہ اس کے لیے بڑا شاندار زمانہ ثابت ہوئی تھی، اسے بہت مہنگی نہیں پڑی تھی۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ سعاد کے ساتھ اس کا تجربہ دہرایا بھی جاسکتا ہے۔ غریب حسین عورتیں بڑی تعداد میں موجود ہیں، اور پھر نکاح حلال ہے، جس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔

اس قسم کے خیالات کے ذریعے وہ سعاد کی شبیہ کو اپنی یادوں سے محو کرنے کی کوشش کرتا، جس میں کبھی کامیاب ہوتا، کبھی ناکام رہتا۔ اسے بھلا دینے کے لیے اس نے خود کو کام کے بحرِ بیکراں میں غرق کر دیا تھا۔ 'تاسو' موٹروں کی ایجنسی کے عنقریب ہونے والے افتتاح سے پہلے اس نے اپنے بیٹوں فوزی اور مومن کے ساتھ دفتر میں ایک آپریشنز روم قائم کر لیا تھا، جیسے جنگ کا قصد ہو۔ اس نے 'سمیرامس' ہوٹل میں بڑے زبردست پیمانے پر ہونے والی دعوت کی تیاریوں کی خودنگرانی کی تھی، شہر کی تمام نامی گرامی شخصیتوں کو ذاتی طور پر مدعو کیا تھا۔ سب کے سب کشاں کشاں چلے آئے تھے، حالیہ اور سابق وزرا، بلند مرتبت حکومتی عہدیدار، بڑے بڑے قومی اخباروں کے مدیرانِ اعلیٰ، جن کی دوستی اسے یوں مہنگی پڑی کہ بیسیوں کاریں تحفتاً، یعنی کوڑیوں کے مول، ان کو دینی پڑیں۔ یہ جاپانی افسروں کی صوابدید سے ہوا تھا اور بسا اوقات ان کی ایما پر۔

دعوت دیر تک جاری رہی۔ ٹیلی وژن نے اس کے بعض بعض حصے قیمتاً اشتہارات کے طور پر نشر کیے اور اخباروں نے بھی اس کا مفصل حال شائع کیا۔ الاخبار کے ایک معروف اقتصادی کالم نگار نے 'تاسو' ایجنسی کے افتتاح کو ایک دلیرانہ، وطن پرستانہ قدم سے تعبیر کیا، جو ایک مستند مصری تاجر محمد عزام نے مغربی کاروں کی اجارہ داری کو توڑنے کے لیے اٹھایا تھا۔ کالم نگار نے تمام مصری تاجروں سے اصرار کے ساتھ کہا تھا کہ وہ مصر کے احیا اور اس کی اقتصادی بہبود کی خاطر حاج عزام ہی کی طرح صحیح اور دشوار راہ اختیار کریں۔ پورے دو ہفتے اخبار حاج عزام کی تصاویر اور بیانات سے بھرے رہے۔ معاہدے پر دستخط کے موقعے کی تصویر منفرد اور اثر انگیز تھی۔ اس میں حاج عزام کو، اپنے بھاری تن و توش، سوقیانہ چہرے، لپکتی جھپکتی عیار نگاہوں کے ساتھ، 'تاسو' کمپنی کے بورڈ کے سربراہ مسٹر ین کی کے برابر بیٹھے دکھایا گیا تھا، جو جاپانی، منحنی قامت، ناک کی سیدھ میں دیکھنے والا، اور سنجیدہ و شائستہ چہرے والا آدمی تھا — گویا دونوں آدمیوں کی ہیئت کذائی کا فرق اس وسیع فرق کی تلخیص کر رہا ہو کہ جاپان میں کیا ہوتا ہے اور مصر میں کیا۔

Scanned with CamScanner

شروع کے چند مہینوں میں ہی ایجنسی نے بڑا زبردست منافع کمایا جو تمام تو قعات سے بڑھ چڑھ کر نکلا۔ حاج عزام پر نفع بارش کی طرح گر رہا تھا، جسے اس نے اپنے رب کی نعمت کے طور پر شکر کے ساتھ قبول کیا اور ہزاروں لاکھوں پاؤنڈ صدقے میں دے ڈالے۔ جاپانی جانب نے حاج عزام کو قاہرہ اور اسکندریہ میں سروس اسٹیشنوں کے اضافی منصوبوں کی پیشکش کی۔ یہ حاج عزام کی زندگی کے بہترین دن تھے، سوائے اس کے کہ صرف ایک چیز انھیں مکدر کیے دے رہی تھی — ایک چیز جسے اس نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ الفولی ملاقات کے لیے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ عزام مسلسل ملتوی کیے جا رہا تھا، یہاں تک کہ اسے مزید ٹالنے کی گنجائش نہیں رہی۔ آخر میں اس نے ہاں کر ہی دی، اور ایک دشوار دوبدو کی پہلے سے تیاری کر کے الفولی سے ملنے 'شیریٹن' پہنچا۔

❁

دن کے بیچ تاریک اور خلقت سے اٹی راہداری اسپتال کے استقبالی حصے سے زیادہ صعید کو جانے والی کسی ریل گاڑی کے تیسرے درجے کے ڈبے سے مشابہ تھی: عورتیں اپنے بیمار بچوں سے لدی پھندی کھڑی تھیں، پسینے کی بُو دم گھونٹے دے رہی تھی، فرش اور دیواریں غلاظت سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ چند مرد نرس، جو معائنے کے کمرے میں داخلے کا کام سنبھالے ہوئے تھے، عورتوں کو گالیاں اور دھکے دے رہے تھے، اس پر غیر مختتم تو تو میں میں، چیخ پکار اور افراتفری مستزاد۔ حاتم رشید اور عبدہ، ہدیہ کے ساتھ، بچے کو اٹھائے، جس نے رونا نہیں چھوڑا تھا، وہاں پہنچے۔ وہ کچھ دیر اس بھیڑ میں کھڑے رہے، پھر حاتم ایک نرس کے پاس آیا اور بولا کہ وہ اسپتال کے سربراہ سے ملنا چاہتا ہے۔ نرس نے برہمی سے اس پر نظر ڈالی اور کہا کہ سربراہ موجود نہیں ہے۔ قریب تھا کہ عبدہ اس سے جھگڑ پڑتا کہ نرس نے کہا کہ بچے کو دکھانے کے لیے اسے اپنی باری کا انتظار کرنا ہوگا۔ بعد ازاں حاتم باہر سب سے قریبی عوامی ٹیلیفون کے پاس گیا اور اپنی یادداشتی کتبیا سے، جو اس کی جیب سے کبھی جدا نہ ہوتی تھی، چند نمبر نکال کر ملائے۔ نتیجے میں اسپتال کا نائب منتظم خود بھاگا بھاگا ان کے پاس آیا اور بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا اور سربراہ کی غیر موجودگی پر معذرت کی۔ نائب منتظم کوئی چالیس کے لگ بھگ ایک گورا چٹا آدمی تھا — گورا چٹا اور فربہ، جس کا چہرہ نیک اور کشادہ دلی کا تاثر دیتا تھا۔ اس نے بچے کا بغور معائنہ کیا اور تشویشناک آواز میں کہا،

''افسوس کہ معاملے میں کافی دیر ہوگئی ہے اور حالت نازک ہے۔ بچہ خشکا گیا ہے اور تپ میں مبتلا ہے۔''

اس نے چند کاغذوں پر کچھ لکھ کر عبدہ کو دیا، جس کے اعصاب بڑے شدید دباؤ کے عالم میں تھے؛ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جارہا تھا اور بیوی پر برس رہا تھا۔ پھر وہ بچے کو اپنے بازوؤں میں لے کر نرس کے ساتھ بھاگا، جس پر ڈاکٹر کی تشویش گویا خود بخود منتقل ہوگئی تھی۔ بچے کو انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں لایا گیا۔ اس کے ننھے سے بازوؤں میں گلوکوز پہنچانے والی نلکیاں لگا دی گئیں، لیکن اس کا چہرہ بالکل پیلا پڑ چکا تھا، آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، اور اس کا رونا مدھم پڑتا جارہا تھا۔ ہر شخص شدید مایوسی محسوس کررہا تھا۔ عبدہ نے نرس سے پوچھا تو وہ جواب میں بولا، ''علاج کے اثر کو ظاہر ہونے میں کم سے کم دو گھنٹے لگیں گے۔ خدا رحیم و کریم ہے۔''

سکوت پھر چھا گیا، ہدیہ خاموشی سے رونے لگی۔ حاتم، عبدہ کو ایک طرف لے گیا، نوٹوں کی ایک گڈی اس کی جیب میں ٹھونس دی، اور اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا، ''یہ رکھ لو، عبدہ، اسپتال کے خرچ کے لیے، اور اگر کسی چیز کی ضرورت پڑے تو مہربانی سے مجھے فون کرنا۔ مجھے مجبوراً اب اخبار جانا ہے۔ میں رات کو حال معلوم کروں گا۔''

❋

''کاش میں تم سے بہت پہلے ملا ہوتا!''

''کیوں؟''

''میری زندگی بالکل مختلف ہوتی۔''

''تم ابھی زندہ ہو۔ اسے بدل سکتے ہو۔''

''کیا بدل سکتا ہوں، بثینہ؟ میں پینسٹھ سال کا ہوگیا ہوں۔ یعنی معاملہ ختم۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟ ممکن ہے تم بیس تیس سال اور زندہ رہو۔ عمر خدا کے ہاتھ میں ہے۔''

''تیس سال اور زندہ رہنا، کم سے کم — ایسا ہو تو بہت اچھا ہو۔''

دونوں ساتھ ساتھ ہنس پڑے، زکی اپنی خرخراتی آواز میں، بثینہ اپنی مترنم اور مسلسل چہچہاہٹوں میں۔ دونوں پلنگ پر برہنہ پڑے تھے، وہ اسے اپنی آغوش میں لیے اپنے شانوں پر اس کے شاداب گھنے بالوں کے لمس سے محظوظ ہورہا تھا۔ دونوں خاص طور پر ایک دوسرے کے جسم کے احساس سے بالکل آزاد ہوگئے تھے اور گھنٹوں برہنہ گزارتے تھے۔ وہ اس کے لیے کافی بناتی، وِسکی

کے جام اور ہلکی پھلکی لذیذ چیزیں تیار کرتی، اور کبھی کبھی دونوں ساتھ سوتے۔ کبھی کبھار وہ اس کے ساتھ مباشرت کرتا، لیکن زیادہ تر دونوں بس ساتھ ساتھ اسی طرح لیٹے رہتے۔ وہ بتی بجھا کر سڑک سے آنے والی مرتعش، خفیف سی روشنی میں اس کے چہرے کو تکتا۔ ایسے لمحوں میں وہ اسے بالکل غیر حقیقی معلوم ہوتی، ایک حسین تصوراتی پیکر کی مانند، ایک شبانہ مخلوق جو صبح کی اولین روشنی میں اتنے ہی ناگہانی طور پر غائب ہو جانے والی ہو جتنے ناگہانی طور پر ظاہر ہوئی تھی۔ وہ باتیں کرتے: اندھیرے میں بثینہ کی آواز گہری، میٹھی اور گرم سنائی دیتی۔ اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا، ''ہم کب سفر کریں گے؟''

''کہاں جا رہے ہیں؟''

''تم نے مجھ سے کہیں ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔''

اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا، ''تم ابھی تک اس ملک سے نفرت کرتی ہو؟''

چھت پر نظریں گاڑے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں تمھاری نسل کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میرے زمانے میں حب الوطنی دین و ایمان ہوا کرتی تھی۔ جانے کتنے نوجوانوں نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے اپنی جان دی۔''

بثینہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی، ''تم نے انھیں ملک سے نکالنے کے لیے مظاہرے کیے؟ ٹھیک ہے، وہ نکل گئے۔ تو کیا اس کا مطلب ہے کہ ملک میں جو ہو رہا ہے، سب صحیح ہے؟''

''ملک کے انحطاط کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جمہوریت نہیں ہے۔ اگر کوئی حقیقی جمہوری نظام ہوتا تو آج مصر ایک بڑی طاقت ہوتا۔ مصر کا آزار آمریت ہے، اور آمریت کی حتمی انتہا غربت، فساد، اور تمام شعبوں میں ناکامی ہے۔''

''یہ اونچی باتیں ہیں۔ میں تو اپنی ہی قامت کے برابر خواب دیکھتی ہوں۔ میں آرام دہ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میرا خاندان ہو، چاہنے والا شوہر ہو، پالنے پوسنے کے لیے بچے ہوں، ایک چھوٹا سا خوشنما گھر ہو، بجائے چھت پر بنے کمرے کے۔ میں کسی صاف ستھرے ملک جانا چاہتی ہوں، جہاں نہ گرد و غبار ہو نہ غربت نہ ظلم۔ تمھیں پتا ہے، میری ایک دوست کا بھائی لگاتار تین بار ہائی اسکول کے امتحان میں فیل ہوتا رہا۔ پھر وہ ہالینڈ چلا گیا، ایک ولندیزی عورت سے شادی کر لی، اور اب وہیں

رہتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہاں اس طرح کی ناانصافی اور ابتری نہیں جیسی یہاں ہے۔ وہاں ہر کسی کو اس کا حق ملتا ہے اور لوگ ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ سڑک صاف کرنے والے کی بھی عزت کی جاتی ہے۔ اسی لیے میں کہیں باہر جانا چاہتی ہوں۔ وہاں رہنا، کام کرنا اور باعزت بن جانا چاہتی ہوں۔ اپنی روزی آپ کمانا چاہتی ہوں، بجائے اس کے کہ کسی طلال جیسے کے ساتھ چند پاؤنڈ کے لیے گودام میں جاؤں۔ ذرا تصور تو کرو۔ وہ مجھے ہر مرتبہ کے دس پاؤنڈ دیتا تھا، مالبرو سگریٹ کے دو پیکٹ کی قیمت۔ میں واقعی بڑی احمق تھی!''

''تم ضرورت مند تھیں اور ضرورت مند سوچتے نہیں۔ بثینہ، میں نہیں چاہتا کہ تم ماضی میں رہو۔ جو کچھ تمھارے ساتھ ہوا وہ ایک ورق ہے جو پلٹ چکا ہے۔ بس۔ مستقبل کی بابت سوچو۔ اس وقت ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور میں ہرگز تم سے جدا نہیں ہوں گا۔''

ایک لمحہ خاموشی طاری ہوگئی۔ پھر اس افسردہ کیفیت کو دور کرنے کے لیے زکی نے زندہ دلی سے کہا، ''ایک یا زیادہ سے زیادہ دو ماہ میں مجھے ایک بڑی رقم ملنے والی ہے، پھر تمھیں باہر لے چلوں گا۔''

''سچ مچ؟''

''سچ مچ۔''

''ہم کہاں جائیں گے؟''

''فرانس۔''

اس نے خوشی سے چیخ ماری اور بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگی۔ پھر بناوٹی مکاری سے بولی، ''بس تم خود کو قابو میں رکھو اور اپنی صحت کا خیال رکھو، ایسا نہ ہو کہ وہاں غش کھا کر چت ہو جاؤ۔ بڑی مصیبت ہوگی۔''

جب وہ ہنستی ہے تو اس کے چہرے کے عضلات سکڑنے لگتے ہیں، پیشانی پر پسینہ بہنے لگتا ہے، اور وہ کسی قدر وحشی اور عجیب نظر آنے لگتی ہے، جیسے کسی مسرت نے اچانک آلیا ہو، اور اس نے فیصلہ کیا ہو کہ اسے مضبوطی سے دبوچ لے گی کہ کہیں اس سے بچ کر نہ نکل جائے۔ زکی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور سرگوشی کی، ''ٹھیک ہے؟ طے ہو گیا نا؟''

''طے ہو گیا!''

Scanned with CamScanner

اس نے شروعات بثینہ کے ہاتھوں سے کی۔ یکے بعد دیگرے اس کی انگلیوں کے بوسے لینے لگا، پھر اس کی ہتھیلی اور بازوؤں کی طرف بڑھا، اور پھر اس کے بھرے بھرے، گداز سینے کی طرف۔ جب وہ اس کی گردن پر پہنچا اور اس کے گھنے بالوں کو اٹھا کر اس کے ننھے سے پیارے پیارے کانوں کو اپنے منھ میں لیا تو اسے اپنے نیچے اس کا بدن خواہش سے سلگتا ہوا محسوس ہوا۔

معاملہ سرگوشی سے شروع ہوا۔ 'سرگوشی' بالکل صحیح لفظ ہے۔ یہ حد درجہ دبی دبی سی آواز تھی جو ناگہانی آئی اور پھر جب زکی، بثینہ کے ہونٹ ایک گرم گرم بوسے میں ہڑپ کیے جا رہا تھا، منقطع ہوگئی۔ انھیں ایک دوسرے کو بھینچتے ہوئے چند ثانیے ہی گزرے ہوں گے کہ وہی آواز پھر آئی، اس مرتبہ زیادہ واضح۔ جس کمرے میں وہ سوئے ہوئے تھے اس کا دروازہ کھلا تھا، اور زکی کے ذہن میں یہ خیال کوندے کی طرح آیا کہ کوئی باہر کے کمرے میں حرکت کر رہا ہے۔ وہ ننگ دھڑنگ بستر سے کدک کر اٹھا اور بثینہ نے بڑے زور کی چیخ ماری اور چھلانگ مار کر نکلی اور جیسے تیسے اپنے برہنہ جسم پر کپڑے پہننے لگی۔ اس کے بعد نہایت ہیبت ناک، کابوسی منظر پیش آئے۔ ایسے ڈراؤنے لمحے جنھیں زکی اور بثینہ کبھی نہیں بھولیں گے: کمرے میں روشنی ہوگئی اور ایک باوردی پولیس افسر ظاہر ہوا، جس کے پیچھے چند مخبر تھے۔ ان کے درمیان سے نکل کر دولت سامنے آئی، جس کے چہرے پر منحوس، اتراہٹ بھری، خبیث مسکراہٹ تھی۔ اس کی آواز تیزی سے بلند ہوئی، موت کی طرح بلند بانگ اور نفرت آگیں۔ ''ایسی بدچلنی اور بے حیائی! روز ایک نہ ایک طوائف کو پکڑ لانا اور اس کے ساتھ شب باشی کرنا۔ بہت غلاظت ہو چکی، بھائی صاحب۔ شرم سے ڈوب مرو!''

''منھ کو لگام دو!''

اس طرح چلّا کر زکی نے اپنے اولین ردعمل کا اظہار کیا۔ اس کا اچنبھا جا تا رہا تھا اور وہ حد سے زیادہ ہیجان میں نظر آ رہا تھا، سارا ننگا بدن تھر تھرا رہا تھا اور اس کی آنکھیں غصے کے مارے ابلی پڑ رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ غیر شعوری طور پر پتلون اٹھانے کے لیے اٹھا اور اسے پہنتے ہوئے اس نے چلّا کر کہا، ''کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا پھکڑ پن ہے؟ میرے دفتر میں گھسنے کی اجازت تمھیں کس نے دی؟ پراسیکیوٹر کا وارنٹ لائے ہو؟''

Scanned with CamScanner

یہ زکی نے نوجوان افسر کے منھ کے پاس منھ لا کر چنگھاڑ کر کہا۔ افسر نے، جس کا تاثر پہلے ہی سے معاندانہ تھا، بڑے اطمینان سے للکار کر کہا، ''کیا تم مجھے میرے کام کے اصول پڑھا رہے ہو؟ مجھے کسی پراسیکیوٹر سے وارنٹ لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ خاتون تمھاری بہن ہے، تمھارے ساتھ رہتی ہے۔ اس نے اپنے گھر میں تمھارے فحاشی کرنے کی شکایت اور سرکاری معائنے کی درخواست داخل کی ہے، کیونکہ وہ تمھارے خلاف بے دخلی کا مقدمہ کرنے والی ہیں۔''

''بکواس ہے۔ یہ میرا نجی دفتر ہے۔ اور یہ یہاں میرے ساتھ نہیں رہتی۔''

''تاہم اس نے اپنی چابی سے دروازہ کھولا اور ہمیں داخل کیا۔''

''چابی ہو بھی تو کیا! یہ دفتر میرا ہے، میرے نام سے ہے۔''

''تو یہ تم رپورٹ میں ثابت کر سکتے ہو۔''

''ثابت، کیا؟ جہنم بھجوا کر چھوڑوں گا۔ تمھیں لوگوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔''

''طوائفوں کی عزت کہنا زیادہ صحیح ہوگا!'' دولت نے چلا کر کہا، اسے گھور کر دیکھا اور اس کی طرف محتاط انداز سے بڑھی۔

''میں کہتا ہوں، منھ بند کرو!''

''منھ تم بند کرو، غلاظت کی پوٹ، بڈھے!''

''خاتون، براہ کرم خاموش ہو جائیں،'' افسر نے چیخ کر دولت سے کہا۔ وہ مصنوعی غصے کا اظہار کر رہا تھا تاکہ اپنی جانبداری کی پردہ پوشی کر سکے۔ پھر اس نے زکی کی طرف رخ کر کے کہا، ''سنیے، جناب۔ آپ عمر رسیدہ آدمی ہیں اور یہ لچر گفتگو آپ کو زیب نہیں دیتی۔''

''آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟''

''ہم جانچ پڑتال کریں گے اور آپ کا بیان لیں گے۔''

''کاہے کی جانچ پڑتال؟ صاف صاف کہو کہ تمھیں خاص طور پر اس کی خبر کی گئی ہے، اس گرگٹ نے خبر کی ہے۔''

''معلوم ہوتا ہے آپ میں ادب کی کمی ہے۔ سنیے، کیونکہ آخری بار کہہ رہا ہوں۔ کوشش کریں

Scanned with CamScanner

کہ آپ کی رات برباد نہ ہو۔''

''مجھے دھمکی دے رہے ہو۔ بس، ٹیلی فون کرنے کی دیر ہے، تم اپنی اوقات سے واقف ہو جاؤ گے۔''

''اچھا، ٹھیک ہے۔ میں معذرت خواہ ہوں،'' افسر نے بڑے غیظ وغضب سے کہا۔ پھر بولا، ''چلو، اپنی ماں کے لال، تھانے چلو، تم، اور تمھاری طوائف۔''

''میں متنبہ کر رہا ہوں، منھ سے ایسے لفظ مت نکالو جن کا بڑا کڑا حساب دینا پڑے۔ اور ہمیں گرفتار کرنے کا تمھیں کوئی حق نہیں۔''

''حق ہے یا نہیں ہے، یہ میں خوب جانتا ہوں۔''

افسر نے مڑ کر اپنے گرگوں سے کہا، ''انھیں لے چلو۔'' گرگے، جو ایسے ہی خفیہ لفظ کے اشارے کے منتظر تھے، زکی اور بثینہ پر ٹوٹ پڑے۔ زکی نے مزاحمت کی اور دھمکیاں دینے اور چلا چلا کر احتجاج کرنے لگا، لیکن ان لوگوں نے اسے بڑی مضبوطی سے اپنے شکنجے میں جکڑے رکھا۔ بثینہ چیخنے لگی، اس نے اپنے گالوں پر طمانچے مارے، اور ان سے التجا کرنے لگی، لیکن وہ اسے کھینچتے ہوئے باہر لے چلے۔

❁

شروع شروع میں طٰہ کو دشواری ضرور محسوس ہوئی لیکن یہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زائل ہوتی گئی، اور وہ درسی اور ورزشی تربیت گاہ کے سخت گیر نظام کا عادی ہو گیا: تڑکے اٹھنا، نماز ادا کرنا، تلاوتِ قرآن، ناشتہ؛ پھر تین گھنٹے جسمانی لیاقت اور حربی فنون کی لگاتار بڑی سخت مشقیں۔ اس کے بعد سارے برادران فقہ، تفسیر اور علوم قرآن وحدیث کے درس کے لیے جمع ہوتے، جو شیخ بلال اور دیگر علما دیتے۔ ظہر کے بعد کا وقت اسلحہ کے استعمال کی مشقوں کے لیے مخصوص تھا۔ برادران ایک بڑی سی بس میں سوار ہوتے (جس پر 'طرہ سیمنٹ کمپنی، مصر' لکھا تھا) اور پہاڑ کے عین قلب میں جاتے، جہاں وہ بندوق سے نشانہ بازی اور بم بنانے اور استعمال کرنے کی مشق کرتے۔ تربیت گاہ کا آہنگ تھکا دینے کی حد تک تیز رفتار تھا اور طٰہ کو سوچنے کی مہلت بھی نہ ملتی۔ عشا کے بعد کی ان ساعتوں میں بھی جو بات چیت کرنے کے لیے تھیں، برادران کی گفتگو عام طور پر مذہبی مباحث کے گرد گھومتی رہتی، جس

Scanned with CamScanner

کے درمیان حکومت کے کفر کے شرعی ثبوت پیش کیے جاتے اور اس سے برسرِ پیکار ہونے اور اسے نیست ونابود کرنے کی ضرورت پر زور دیا جاتا۔

جب سونے کا وقت آتا تو برادران ایک دوسرے سے جدا ہوتے۔ شادی شدے پہاڑ کے دامن میں اپنے گھروں کو چلے جاتے، جبکہ چھڑے ایک چھوٹی سی عمارت میں جا سوتے جو ان کے لیے مخصوص تھی۔ ٹھیک تبھی، بتیاں گل ہو جانے اور خاموشی چھا جانے کے بعد، طٰہ الشاذلی اپنے بستر پر اندھیرے میں لیٹ کر اپنی زندگی کے واقعات کو بالکل صاف صاف دیکھتا، جیسے ایک حیرت انگیز، ضوفشاں توانائی اس کی یادوں سے ناگہانی پھوٹ پڑی ہو۔ اسے بثینہ السید نظر آتی اور ایک بے پناہ دلنوازی اس کے رگ و پے میں سما جاتی۔ کبھی کبھی وہ اپنے دونوں کے پرمسرت ایام کو یاد کر کے مسکرا بھی دیتا۔ پھر غصہ اسے اپنی گرفت میں لے لیتا، یہ یاد کر کے کہ آخری بار بثینہ نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بڑی حقارت سے کہا تھا، ''ہمارے درمیان جو کچھ بھی تھا اسے ختم سمجھو، طٰہ، ہم اب اپنے اپنے راستے پر جائیں گے۔'' اچانک اپنی حراست کی یادیں لگاتار ضربوں کی طرح اس پر برسنے لگتیں: زدوکوب اور اہانت؛ اور ہر مرتبہ جب انھوں نے اس کی جنسی بے آبروئی کی، اس کا یہ احساس کہ وہ کمزور ہے، وامانده ہے، شکستہ ہے؛ اس کا آنسوؤں میں پھٹ پڑنا اور گڑگڑا کر سپاہیوں سے کہنا کہ وہ اس موٹے سے ڈنڈے کو اس کے بدن میں داخل نہ کریں؛ ان کے کہنے پر اس کا دبی دبی آواز میں ہکلا ہکلا کر کہنا، ''میں عورت ہوں،'' تاہم ان کا پھر مارنا اور اس سے پھر اس کا نام پوچھنا، اس کا مری مری سی آواز میں جواب دینا، ''فوزیہ،'' جس پر ان کا ٹھٹھے مار کر ہنسنا، جیسے کہ کوئی مزاحیہ فلم دیکھ رہے ہوں...

یہ سب یاد کر کے طٰہ کی نیند اڑ جاتی۔ وہ جاگتا رہتا، اپنے پرانے زخموں کو کریدتا، تاریکی میں اس کا چہرہ مرتز جاتا، اور تنفس میں تیزی آجاتی۔ وہ یوں ہانپنے لگتا جیسے دوڑ رہا ہو، اور ایک شدید نفرت اس پر آسیب کی طرح سوار ہو جاتی، جو اس وقت تک مدھم نہ پڑتی جب تک اسے آفیسروں کی آوازوں کا خیال نہ آتا، جنھیں وہ اپنے ذہن میں مختلف قسموں میں تقسیم کرتا، ان میں فرق کرتا، اور اپنی یادداشت میں بڑی توجہ سے محفوظ کر لیتا۔ اس کے بعد ایک ایسی جلتی ہوئی خواہش، جس سے اس کا جسم کپکپانے لگتا، اس پر طاری ہو جاتی، وہ ان سے انتقام لینے کے درپے ہو جاتا، اور تصور کرتا کہ وہ ان

Scanned with CamScanner

سب کو، جنھوں نے اسے ایذا پہنچائی ہے، اس کی عصمت دری کی ہے، مثالی سزائیں دے رہا ہے۔

انتقام کی اس پیاس نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور اسے آگے بڑھائے جا رہی تھی، اتنا کہ اس نے تربیت گاہ کی مشقوں میں حیرت انگیز پیش رفت کا مظاہرہ کیا۔ اپنی نوخیزی کے باوجود وہ ایسے بہت سوں پر غالب آتا جو جسمانی مبارزت کا کہیں زیادہ تجربہ رکھتے تھے، اور چند مہینوں میں ہی عام بندوقوں، نیم خودکار اور خودکار رائفلوں کے استعمال میں امتیاز حاصل کر لیا، اور بڑی صفائی اور آسانی سے دستی بم بنانا سیکھ گیا۔ اس کی اس سریع پیش رفت پر سارے برادران حیرت زدہ تھے، حتیٰ کہ ایک مرتبہ گولی چلانے کی مشق میں اس کا نشانہ بیس میں صرف ایک بار خطا گیا تھا، شیخ بلال اس کے پاس آیا اور شانہ تھپتھپاتے ہوے بولا، اس کی بھوں کا زخم ہمیشہ کی طرح، جب وہ جوش میں آیا ہوا ہو، اضطراراً ہلنے لگتا، ''بارک اللہ فیک یا طٰہٰ! تم نشانہ بازی میں طاق ہو گئے ہو!''

''تو مجھے جہاد میں شریک ہونے کی اجازت کب دیں گے؟'' طٰہٰ نے جرأت مندی سے کہا، اور موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوے وہ سوال بھی کر دیا جو اس کے دماغ کو گھیرے ہوے تھا۔ شیخ بلال کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بڑے انس سے سرگوشی میں بولا، ''میرے بیٹے، جلدی نہ کرو، ہر چیز کا اپنا وقت ہوتا ہے۔''

پھر وہ تیزی سے پلٹ کر لوٹ گیا، جیسے بات کو وہیں روک دینا چاہتا ہو، طٰہٰ کو اپنے مبہم جواب سے غیر مطمئن چھوڑ کر۔ طٰہٰ اپنا انتقام لینے کے لیے بے تاب تھا اور محسوس کرتا تھا کہ وہ کارروائی کے لیے بالکل تیار ہے، تو پھر یہ تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟ وہ اپنے ان ساتھیوں سے کم نہیں تھا جو جہاد پر جاتے اور واپس آ کر اپنے کارناموں کا ذکر کرتے اور اخوان کی داد و تحسین وصول کرتے۔ اس کے بعد طٰہٰ کئی مرتبہ شیخ بلال کے پاس گیا اور ان سے گزارش کی کہ وہ اسے عمل کے لیے بھیج دے، لیکن وہ طٰہٰ کو مسلسل مبہم سے جواب دے کر ٹالتا رہا، یہاں تک کہ، آخری موقعے پر، طٰہٰ طیش میں آ گیا اور شدت سے چیخا، ''جلد... جلد... یہ 'جلد' کب آئے گی؟ اگر آپ کے خیال میں میں جہاد کے قابل نہیں تو صاف کیوں نہیں کہہ دیتے، میں تربیت گاہ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

شیخ بلال کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، جیسے طٰہٰ کے جوش سے بہت خوشی محسوس کر رہا ہو، اور بولا، ''خدا پر توکل کرو، طٰہٰ، جلد ہی تمھیں خوشخبری ملنے والی ہے، انشاءاللہ۔''

Scanned with CamScanner

اور سچ مچ ایک ہفتہ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ ایک برادر نے اسے مطلع کیا کہ شیخ بلال نے اسے بلایا ہے۔ظہر کی نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ لپک کر شیخ بلال کے دفتر پہنچا: ایک تنگ سا کمرہ جس میں ایک پرانی سی میز اور چند بوسیدہ کرسیاں پڑی تھیں، اور ایک چٹائی جس پر شیخ بیٹھا قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔وہ اپنی تلاوت میں اتنا مستغرق تھا کہ چند لمحوں کے بعد ہی کہیں جا کر اپنے پاس طٰہٰ کی موجودگی کا احساس ہوا۔اس نے مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا اور اپنے پاس بٹھالیا۔

''ایک اہم کام کے سلسلے میں بلایا ہے۔''

''حکم دیں۔''

''حکم صرف خدا ہی دے سکتا ہے۔سنو، میرے بیٹے، ہم نے تمھاری شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

شیخ نے یہ بڑے ناگہانی طور پر کہا اور ہنسا، لیکن طٰہٰ نہیں ہنسا۔اس کے گہری رنگت کے چہرے پر سختی آ گئی۔''میری سمجھ میں نہیں آیا،'' طٰہٰ نے چوکنا ہو کر کہا۔

''تمھاری شادی ہونے والی ہے، میرے بیٹے۔کیا شادی کے معنی نہیں جانتے؟''

اس پر طٰہٰ نے آواز بلند کی، ''نہیں، مولانا، میں نہیں جانتا۔میں آپ سے جہاد پر جانے کی اجازت مانگتا ہوں اور آپ مجھ سے شادی کی بات کرتے ہیں! کیا میں یہاں شادی کرنے آیا تھا؟ میں بالکل نہیں سمجھتا، سوائے اس کے کہ آپ نے یہاں میرا مذاق اڑانے کے لیے مجھے بلایا ہے۔''

پہلی مرتبہ شیخ کا چہرہ غضب سے سکڑ گیا اور وہ چلّایا، ''طٰہٰ، تمھارا مجھ سے اس پیرائے میں گفتگو کرنا نامناسب ہے، اور میں تمھارا شکر گذار ہوں گا کہ آئندہ اپنے پر قابو رکھو، ورنہ مجھے غصہ آ جائے گا۔صرف تمھی کو سکیورٹی میں اذیتیں نہیں پہنچائی گئی ہیں۔انھوں نے ہزارہا برادران کو اذیت پہنچائی ہے۔خود میرے چہرے پر بھی ان اذیتوں کے نشان ہیں، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، لیکن میں اپنے ہوش وحواس کھو کر اپنے شیوخ کے سامنے چلّانے نہیں لگتا۔کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمھیں جہاد پر جانے سے روکے ہوئے ہوں؟ جیسا کہ خدا جانتا ہے، میرے بیٹے، معاملہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔عملی کارروائیوں کی بابت فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے، مجھے تو ان کی بابت آخری لمحے سے پہلے پتا بھی نہیں چلتا۔میں تربیت گاہ کا امیر ہوں، طٰہٰ، میں تو جماعت کی مجلسِ شوریٰ کا رکن بھی

نہیں ہوں۔ امید کہ تم یہ بات سمجھ لو گے اور اپنے آپ کو اور مجھے، دونوں کو یکسوئی بخشو گے۔ فیصلہ کرنے والا میں نہیں ہوں۔ میں صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ تمھارا نام جماعتی شوریٰ کے برادران کو پیش کر دوں۔ اس معاملے میں میں ان سے پہلے ہی اصرار کر چکا ہوں اور مشقوں میں تمھاری بہادری اور ترقی کی متعدد رپورٹیں لکھ کر بھیج چکا ہوں لیکن انھوں نے ابھی تک تمھیں بھیجنے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔ سو اس میں قصور میرا نہیں ہے، جس طرح تم سوچے بیٹھے ہو۔ تاہم اپنے تجربے کی بنیاد پر میرا خیال ہے، وہ تمھیں جلد ہی بھیجیں گے، انشاءاللہ۔''

طٰہ نے کچھ نہیں کہا اور کچھ دیر کے لیے سر جھکا لیا۔ پھر مدھم آواز میں کہا: ''میرے اشتعال پر مجھے معاف کیجیے گا، مولانا۔ خدا جانتا ہے میں آپ کے لیے کتنی محبت اور کتنا احترام محسوس کرتا ہوں، شیخ بلال۔''

''کوئی بات نہیں، بیٹے،'' شیخ بلال نے بدبدا کر کہا اور اپنی تسبیح پڑھتا رہا۔ طٰہ بولتا رہا، جیسے اس نوک جھونک کے نقوش محو کرنا چاہتا ہو، ''لیکن یہ شادی کا معاملہ مجھے عجیب معلوم ہوتا ہے۔''

''اس میں عجیب بات کیا ہے؟ یہ اپنی مخلوق پر اللہ کی سنتوں میں سے ایک ہے۔ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے فرد اور اسلامی معاشرے کی راست کرداری کی خاطر شرع کیا ہے۔ تم ایک جوان آدمی ہو اور تمھاری فطری ضرورتیں ہیں۔ تمھاری شادی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ایک عمل ہوگی، جس کا انشاءاللہ تمھیں ثواب ملے گا۔ المصطفیٰ نے اپنی صحیح حدیث میں کہا ہے، 'تم میں سے جو شادی کرنے کی استطاعت رکھتا ہے، وہ شادی کرے۔' اور حضور نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ ہم مسلمانوں کو فحاشی سے بچانے کے لیے شادی میں آسانی اور عجلت پیدا کریں۔ یہاں ہم خدا اور اس کے رسول کے متعینہ راستے پر زندہ رہتے اور مرتے ہیں اور، انشاءاللہ، اس سے شمہ برابر بھی انحراف نہیں کرتے۔ میں نے تمھارے لیے ایک فاضل اور صالح بہن کا انتخاب کیا ہے، اور ہم کسی کو خدا پر سبقت نہیں دیتے۔''

''میں ایسی عورت سے شادی کروں جسے جانتا بھی نہیں؟'' طٰہ نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔

شیخ بلال نے مسکراتے ہوئے کہا، ''اللہ کے حکم سے تمھاری اس سے ملاقات ہوگی۔ یہ بہن رضویٰ ابوالعلا ہے، مسلمان عورتوں میں ایک بہترین نمونہ۔ اس کی اسیوط کے رہنے والے بھائی حسن نورالدین سے شادی ہوئی تھی۔ جب وہ شہید ہوا، اللہ اس پر رحم کرے، اس وقت اس کا بچہ اس کے

Scanned with CamScanner

پیٹ میں تھا، اور وہ یہاں ہمارے ساتھ اسلامی زندگی گزارنے چلی آئی۔"

طٰہٰ نے کچھ نہیں کہا۔ لگتا تھا جیسے وہ کچھ متردد ہو، چنانچہ شیخ بلال نے بات جاری رکھی، "معاذ اللہ کہ میں کوئی چیز تم پر مسلط کروں، بیٹے۔ تم رِضویٰ سے ملو گے، اس کی شکل وصورت دیکھو گے، اس سے بات چیت کرو گے، جیسا کہ شرع حنیف کا تقاضا ہے۔ پھر تم پوری آزادی سے اپنا فیصلہ کر سکتے ہو۔ مجھے امید ہے، طٰہٰ، کہ تم **الزواج فی الاسلام** نامی کتاب سے رجوع کرو گے، وہی جو ہم نے تم لوگوں کو جماعت میں تقسیم کی تھی۔ اور یہ بھی جان لو، میرے بیٹے، کہ ایک شہید کی بیوہ سے شادی اور اس کے یتیم بچے کی سرپرستی، اللہ کے حکم سے، تمھارا ثواب دگنا کر دے گی۔"

❁

نصف شب کے قریب، بچے کی حالت بہت بگڑ گئی اور انتہائی نگہداشت کے یونٹ کے اسکرین پر تنفس اور نبض کی کارکردگی میں ابتری ظاہر ہونے لگی۔ ڈیوٹی پر تعینات ڈاکٹر کو بلایا گیا، جو بھاگی بھاگی آئی اور اس نے نرس میں انجکشن لگانے کے لیے کہا۔ نرس نے انجکشن لگایا اور بچے کی حالت کچھ سدھری، لیکن گھنٹے سے پہلے ہی پھر خراب ہونے لگی اور جلد ہی وہ زندگی سے جدا ہو گیا۔ نرس سسکیاں بھر کر رونے لگی، چادر سے اس کا ننھا سا چہرہ ڈھانپ دیا، اور کمرے سے نکل آئی۔

اسے دیکھتے ہی ہدیہ نے اتنی پرشور، کرب انگیز چیخ ماری کہ پورا اسپتال گونج گیا۔ پھر فرش پر بیٹھ کر سر ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور بین کرنے لگی۔ رہا عبدہ، تو اس کا سیاہ چہرہ مسخ ہو گیا اور اس نے اتنے زور سے اپنے دانت کٹکٹائے کہ ان کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس نے سگریٹ کے پیکٹ کو ہاتھوں سے کچل کر اس کے چیتھڑے اڑا دیے، اس طرح کہ تمباکو اس کی انگلیوں میں خاک کی طرح منتشر ہو گیا۔ اس نے نہ رونے کی غیر معمولی کوشش کی، لیکن اس کے باوجود آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے؛ پھر اس نے پورے طور پر اپنے کو آہ و بکا کے حوالے کر دیا اور زور زور سے سسکنے لگا۔ وہاں سبھی لوگوں کے آنسو نکل آئے: صفائی کرنے والے، نرسیں اور دیگر مریضوں کے گھر والے، حتیٰ کہ ڈاکٹر نے بھی آنسو پونچھنے کے لیے اپنا چشمہ آنکھوں سے اتارا۔ عبدربہ اور اس کی بیوی بچے کی لاش کو صبح تجہیز و تکفین کے وقت تک اسپتال کے سرد خانے میں رکھنے پر مجبور تھے۔ یہ ایک اور المیہ منظر تھا: جب بچے کے ننھے سے جسم کو بڑے بڑے جسموں کے درمیان رکھا جا رہا تھا تو سرد خانے کا بوڑھا انچارج

Scanned with CamScanner

(جو اپنے کام کی نوعیت کے باعث موت کے منظر کا عادی تھا)، خود پر قابو نہ رکھ سکا، اور مرتعش، جذبات سے پُر آواز میں دہرانے لگا: "لا الٰہ الا اللہ" اور "انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

کسی نہ کسی طرح خبر عمارتِ یعقوبیان کی چھت پر رہنے والوں تک پہنچ گئی تھی اور سب جاگتے رہے۔ اپنے کمروں کے دروازے کھولے وہ خاموشی میں سر جھکائے انتظار کرتے رہے، جیسے تعزیت کرنے والوں کے شامیانے میں بیٹھے ہوں۔ بعضوں نے (جن کے پاس ٹیپ ریکارڈر تھے) قرآن کریم کی ریکارڈنگ پورے زور وشور سے بجانی شروع کر دی جس کی آواز پوری چھت پر پھیل گئی۔

فجر سے ذرا پہلے عبدربہ اور ہدیہ چھت پر پہنچے، درد وکرب اور تھکن سے نڈھال۔ چھت کے تمام مکین تعزیت کرنے کے لیے لپکے، ان کا درد وغم پھر بھڑک اٹھا تھا۔ مردوں نے عبدہ کو اپنے گلے سے لگایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا (ان سب کے جذبات مخلصانہ تھے، حتیٰ کہ ان کے بھی جو اپنی درندگی اور عداوت میں بڑھ چڑھ کے تھے، جیسے ڈرائیور علی، جس کے منہ سے معمول کے مطابق ٹھرّے کے بھبکے اٹھ رہے تھے، لیکن اس وقت کسی کھوئے ہوئے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا)۔ البتہ چرخ، دراز کاٹھی اور سفید مونچھ والا بوڑھا دربان، الشاذلی، مغموم باپ کے پاس آیا اور مصافحہ کیا (دونوں کے درمیان ایک خاص ہمدمی تھی)۔ عبدہ نے اسے سینے سے لگا کر بڑی شدت سے بھینچا، اس کے سفید جلباب میں منہ ڈال کر اپنے صعیدی لہجے میں دکھ سے کہا: "خالو، میرا بیٹا گزر گیا!"

عورتیں جانتی ہیں کہ آلام سے کیسے نبٹا جاتا ہے۔ ان کی تیز، بلند آہنگ چیخیں پھٹ پڑیں، جس سے سارا سکون درہم برہم ہو گیا، اور اکثر نے تو اس زور سے اپنے گالوں پر دوہتڑ مارے کہ زمین پر آ رہیں۔ غم کا وفور آہستہ آہستہ فرو ہوا اور، جیسا کہ ایسے موقعوں پر عام طور پر ہوتا ہے، مردوں نے عبدہ سے اصرار کے ساتھ کہا کہ وہ اپنی بیوی کو لے کر تھوڑا سا آرام کر لے کیونکہ ان کے سامنے دشوار دن آ رہا ہے۔ آخر میں میاں بیوی بات مان گئے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ لیکن کمرے کی بتی صبح تک جلتی رہی، کیونکہ وہ سوئے نہیں، بلکہ ایک طویل گفتگو میں ڈوبے رہے، جس میں گرمی آتی گئی اور جو بالآخر ایک بڑے تلخ اور شدید جھگڑے میں بدل گئی جس کی بازگشت ساری چھت پر سنائی دینے لگی۔ ہدیہ کی اونچی آواز میں مذمت اور للکار تھی، عبدہ کی آواز دھیرے دھیرے مدھم پڑ کر بالکل ساکت ہو گئی۔ اگلے دن دفن اور ماتم پرسی کی رسومات کے ادا ہو جانے کے بعد، چھت کے باسی

Scanned with CamScanner

عمارت کے سامنے مال برداری کی ایک بڑی سی گاڑی کو رکتا دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ عبدہ مزدوروں کو کمرے سے سامان اٹھانے میں مدد دے رہا ہے۔ انھوں نے تشویش کے ساتھ پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ نقل مکانی کر کے اِمبابہ کے ایک کمرے میں جا رہے ہیں۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور اس کا انداز اتنا ناگوار تھا کہ وہ نہ صرف اس پر اپنا تعجب ظاہر کرنے سے باز رہے بلکہ مناسب گرمیِ جذبات کے ساتھ انھیں الوداع کہی۔

❁

''تمھاری بسم اللہ ہی غلط ہو رہی ہے، عزام۔''

''اعوذ باللہ، کمال بک۔ میں اپنے الفاظ پر قائم ہوں۔ لیکن معاملہ کچھ وقت چاہتا ہے۔''

وہ 'شیریٹن' میں بیٹھے تھے اور فضا میں تناؤ کی کیفیت تھی۔ عزام نے کسی اور ہی موضوع پر بات کرنا شروع کیا لیکن کمال الفولی کی بھنویں چڑھ گئیں اور وہ تیزی سے بولا، ''میری توجہ کو اور چیزوں میں نہ بھٹکاؤ! میں بچہ نہیں ہوں۔ تم نے اقرار کیا تھا اور اقرار سے پھر گئے ہو۔ میں نے تین مہینے ہوئے تمھیں معاہدہ تیار کر کے 'بڑے صاحب' سے دستخط کروانے کے لیے دیا تھا اور تم مزید التوا کیے جا رہے ہو۔''

''کمال بک، التوا کی بات کرتے ہوئے تمھیں شرم آنی چاہیے! مجھے اپنے جاپانی شریک کے سامنے معاملہ پیش کرنا ہے، جس کے لیے مناسب موقعے کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''جاپانیوں کا اس سے کیا لینا دینا ہے؟ منافعے کی تقسیم کا معاہدہ تمھارے اور 'بڑے صاحب' کے درمیان ہے۔''

''جناب باشا صاحب، جاپانیوں کے لیے ہر بات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اگر میں ان کے پیٹھ پیچھے کچھ کرتا ہوں، تو وہ ایجنسی کا معاہدہ ہی منسوخ کر دیں گے۔''

کمال الفولی نے حقے کا ایک لمبا کش لیا، پھر بڑی سی مہنال کو میز پر رکھ دیا اور ناگہانی اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسری میز سے اس کا بیٹا اور محافظ بھی کھڑے ہو گئے۔ رخصت کی تیاری سے پہلے اس نے اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے قطعیت سے کہا، ''عزام، تم آگ سے کھیل رہے ہو، اور مجھے اس پر تعجب ہے، کیونکہ تم ایک ذہین آدمی ہو۔ جان لو کہ جنھوں نے تمھیں اسمبلی میں داخل کیا ہے، وہ اس

Scanned with CamScanner

سے باہر کرنے کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔''

''مجھے دھمکی دے رہے ہو، کمال بک؟''

''جو چاہو سمجھو۔''

حاج عزام اٹھا اور اپنا بازو الفولی کے کندھے کی طرف بڑھایا، اس سے بغلگیر ہونے کی کوشش میں، یہ کہتے ہوئے، ''باشا صاحب، ذرا سی بات کا بتنگڑ نہ بنائیں۔''

''السلام علیکم!''

الفولی رخصت ہونے کے لیے مڑا لیکن حاج عزام اس کا شانہ تھامے رہا، اور بولا، ''یہ سب 'لے اور دے' کا معاملہ ہے۔ تین بار خدا کی قسم، میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔''

الفولی نے غصے سے اپنا شانہ جھٹکا لیکن عزام اس سے کچھ اور قریب ہوا اور یوں سرگوشی کی جو گڑگڑاہٹ سے مشابہ تھی، ''کمال بک، مہربانی سے میری بات سنیں۔ مجھے آپ سے کچھ مطلوب ہے، جو ہم دونوں کے لیے اطمینان بخش ہوگا۔''

الفولی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا، اس کا چہرہ ابھی تک غصے سے بھرا ہوا تھا۔ عزام نے کہا، ''میں 'بڑے صاحب' سے ملنا چاہتا ہوں۔''

'''بڑا صاحب' کسی سے نہیں ملتا۔''

''کمال بک، مہربانی سے میری مدد کریں۔ میں عزت مآب سے ملنا چاہتا ہوں اور ساری صورت حال کی وضاحت خود کرنا چاہتا ہوں۔ ہم نے جو نان اور نمک ساتھ کھایا ہے اس کا لحاظ کرو اور میری درخواست کو رد نہ کرو۔''

الفولی اسے ایک گہری، ٹٹولتی ہوئی نظر سے تکتا رہا، جیسے اس کی گہرائیوں کو ایک آخری بار ٹٹول رہا ہو۔ پھر رخصت ہوتے ہوئے بولا، ''دیکھا جائے گا۔''

❁

ایجنسی کے چوتھائی منافع سے دستبردار ہونا حاج عزام کے لیے اتنا آسان نہیں تھا، لیکن پھر یہ بھی تھا کہ صاف صاف منع کر دینے کی قدرت بھی اس میں نہ تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ جب تک ان لوگوں کو اس کی ذرا سی بھی امید باقی ہے کہ وہ دے دے گا، یہ لوگ اس پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ اس نے

Scanned with CamScanner

'بڑے صاحب' سے ملاقات کی درخواست کی تھی اور اس پر اصرار کیا تھا تو ایک تو اس لیے کہ کچھ اور وقت مل جائے، اور، دوسرے اس لیے کہ اسے ایک عجیب لیکن مستحکم احساس تھا کہ اگر وہ 'بڑے صاحب' سے روبرو ملاقات کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ اسے شرح گھٹانے پر آمادہ کر لے گا۔ اس کی ایک اہم غرض اور بھی تھی: وہ یقین کر لینا چاہتا تھا کہ بنیادی طور پر 'بڑے صاحب' کا وجود بھی ہے۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ الفولی 'بڑے صاحب' کا نام اس کی لاعلمی میں استعمال کر رہا ہو؟ واجبی سا امکان تھا، لیکن تھا تو سہی!

کئی ہفتے اور متعدد ٹیلیفونی مکالموں کے بعد، جن میں عزام، الفولی سے 'بڑے صاحب' سے ملاقات کا وقت لینے پر اصرار کرتا رہا، ایک صبح عزام کے دفتر میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، اور اسے سیکرٹری کی مترنم آواز یہ کہتی سنائی دی، "حاج عزام، السلام علیکم! کمال بک آپ سے بات کریں گے۔"

اسے الفولی کی دوٹوک آواز سنائی دی، "'بڑے صاحب' سے تمھاری ملاقات جمعرات کے دن صبح دس بجے طے ہوئی ہے۔ اپنے دفتر میں تیار رہنا۔ ہم تمھیں لانے کے لیے گاڑی بھیجیں گے۔"

❁

دولت نے اپنا منصوبہ بڑی ہوشیاری سے بنایا تھا، اور رشوتیں دے کر سارے افسروں کو اپنی طرف کر لیا تھا۔ وہ زکی الدسوقی کے ساتھ انتہائی اجڈپن اور بیہودگی کے ساتھ پیش آئے۔ انھوں نے اسے ٹیلیفون استعمال کرنے سے بھی منع کر دیا اور اس پر فقرے کسے، "اپنے کو بڑا ویلنٹینو سمجھتا ہے، ہنھ!"

"تو جناب ہی وہ مشہور 'شرابی شیخ' ہیں!"

"مشین تو ٹھپ ہو چکی ہوگی، یقیناً ہاتھ سے کام چلانا پڑتا ہوگا!"

وہ خوب زور زور سے قہقہے مار رہے تھے، جن کے بعد گلے سے خرخراتی آوازیں نکلتیں اور کھانسی کے دورے پڑتے۔ اس ہنسی ٹھٹھول میں دولت انھیں خوش کرنے اور شہہ دینے کی خاطر شامل ہو رہی تھی، اور اتراہٹ کے مارے بھی۔ زکی خاموش ہی رہا، اس نے انھیں کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دیوار جو اس نے اپنے بچاؤ کے لیے اپنے گرد کھڑی کی تھی، منہدم ہو چکی تھی۔ معاملہ ختم ہو چکا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اگر اس نے مزاحمت کی تو ان کا سفلہ پن اور بڑھ جائے گا۔ اسے بثینہ پر انتہائی افسوس ہوا، جو ابھی تک سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ افسر جس نے انھیں حراست میں لیا تھا، کینہ

Scanned with CamScanner

توزی سے ہنس کر بولا، ''کیوں خواجہ، کیا خیال ہے، مزاج درست ہو گئے؟''

زکی نے دھیمی آواز میں جواب دیا، ''تمھارا برتاؤ غیر قانونی ہے۔ میں تمھاری شکایت کروں گا۔''

افسر چلّایا، ''ابھی تک دماغ آسمان پر ہے! تمھاری اترابہٹ اور شیخی بازی گئی نہیں؟ شرم کرو! ایک پاؤں پہلے ہی قبر میں لٹکا ہے! تمھاری عمر والے کو مسجد میں بیٹھ کر اعتکاف کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ رنڈی سے چمٹے پڑے ہو اور اس کے اوپر سے اٹھا کر ننگ دھڑنگ لایا جا رہا ہے۔ اس پر بھی ہیکڑی ہے کہ جاتی نہیں اور ٹرّائے جا رہے ہو۔''

بثینہ نے افسر سے آہ وزاری کرنی چاہی لیکن اس نے سختی سے ڈپٹ دیا، ''چپ رہ، رنڈی! یا چاہتی ہے کہ تیرے خلاف فی الفور بدچلنی کا الزام لگا دوں؟''

دونوں نے پوری طرح ہاتھ پیر ڈال دیے اور افسر کے سوالات کا جواب دینے لگے۔ زکی نے اپنے بیان میں اس پر تاکید کی کہ شکایت مکر و فریب پر مبنی ہے اور یہ کہ دولت دفتر میں اس کے ساتھ نہیں رہ رہی تھی۔ اس نے بثینہ کی موجودگی کی وضاحت میں کہا کہ یہ اس کے ایک دوست کی بیٹی ہے، کہ اس کا اپنے گھر والوں سے جھگڑا ہو گیا تھا اور اس نے اسے اپنے یہاں بلایا تھا تا کہ فریقین میں مصالحت کرا دے۔ اس کے بعد اس نے رپورٹ پر دستخط کر دیے، بثینہ اور (فریادی کی حیثیت سے) دولت نے بھی دستخط کیے۔ اس کے بعد دولت افسر کا شکریہ ادا کر کے، اور اطمینان کر کے کہ معاملہ ٹھیک چل رہا ہے، رخصت ہوئی۔ ان تمام اہانتوں کو سہنے کے بعد زکی نے اپنے فخر کو ایک طرف ڈالا اور افسر سے منت سماجت کرنے لگا، حتیٰ کہ اس نے ناگواری سے زکی کو ٹیلیفون استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ اس نے اپنے کسی دوست کو فون کیا، جو ایک عدالتی جج رہ چکا تھا، اور اس سے مدد چاہی۔ جج بھاگا بھاگا وہاں پہنچا، اس کے چہرے پر نیند کے آثار ابھی تک باقی تھے، اور تھانے کے سربراہ کے پاس گیا۔ اس نے زکی کو بلوایا، بیٹھنے کی دعوت دی، اس کے لیے قہوے کا فنجان منگوانے پر اصرار کیا، اور ایک سگریٹ پیش کیا (وہ اس ہنگامے میں اپنا سگریٹ کا پیکٹ دفتر ہی میں بھول آیا تھا)۔ پھر سربراہ نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر نرمی سے کہا، ''ظاہر ہے، میرے ہمکاروں سے جو زیادتیاں سرزد ہوئی ہوں، ان کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں، معاملہ اخلاقی ہے، اور بھڑوں کے چھتّے سے کم نہیں۔ یہاں سارے افسر مذہبی روایات کے معاملے میں خاصے غیور

Scanned with CamScanner

واقع ہوئے ہیں اور، الحمدللہ، سب کے سب دیندار ہیں۔''
زکی نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ وہ سگریٹ پیتا رہا اور افسر کو تکنے گیا۔ دریں اثنا جج نے بیچ میں کہا، ''پاشا صاحب، امید ہے کہ معاملہ درست ہوجائے گا۔ آپ کا ممنون ہوں گا۔''
''عزت مآب، آپ کی گزارشات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہیں۔ افسوس کہ رپورٹ نمبر ڈال کر داخل کردی گئی ہے، اسے حذف نہیں کیا جاسکتا۔ عزت مآب دستور العمل سے واقفیت کے معاملے میں ہمارے استاد ہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتے ہیں کہ انھیں اور لڑکی کو آج رات گھر جانے دیں اور جب یہ صبح پراسیکیوٹر کے سامنے حاضر ہوں تو میں وہاں کے وکیل سے، باذن اللہ، تفتیش روک دینے کے لیے کہوں۔''
اگلے روز پراسیکیوٹر کے سامنے حاضر ہونے کے اقرار نامے پر زکی اور بثینہ نے دستخط کیے، اور جب وہ تھانے سے نکل رہے تھے تو زکی نے اپنے دوست جج سے ہاتھ ملا کر شکریہ ادا کیا۔ دوست بولا، ''زکی بک، ہم ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ ہمارے درمیان شکریہ کیسا! برسبیل تذکرہ، یہ بالکل واضح ہے کہ تمھاری بہن دولت باثر ہے اور سارے کے سارے افسر اس کی مٹھی میں ہیں۔ اگر تھانے کا افسر چاہتا تو وہ رپورٹ کو ہمارے سامنے ہی پرزے پرزے کرسکتا تھا۔''
زکی اداسی سے ہنسا۔ جج نے تسلی دینے کے لیے کہا، ''فکر نہ کرو۔ صبح ہوتے ہی میں پولیس کے افسرِ اعلیٰ کے دفتر فون کروں گا اور خدا نے چاہا تو سب کچھ آسان ہوجائے گا۔''
زکی نے دوبارہ اس کا شکریہ ادا کیا اور بثینہ کے ساتھ ساتھ عمارتِ یعقوبیان کی سمت میں چلنے لگا۔ صبح کی روشنی شارع سلیمان پاشا پر رسنے لگی تھی، جو تمام تر خالی پڑی تھی، سوائے بلدیہ کے چند کارکنوں کے جو کاہلی سے جھاڑو لگا رہے تھے، اور چند لوگوں کے جو یا تو کسی وجہ سے صبح تڑکے اٹھ گئے تھے یا کسی طویل شبانہ محفل سے لوٹ رہے تھے۔ زکی بے حد تھکا ہوا تھا، چکر بھی آرہے تھے اور متلی بھی محسوس ہورہی تھی۔ نہ وہ ہیجان کے عالم میں تھا نہ غصے کے۔ بس اسے معدے میں بے چینی محسوس ہورہی تھی، دماغ خالی خالی سا تھا اور افکار پراگندہ۔ آہستہ آہستہ اسے خیال آیا کہ طوفان سے پہلے کے تیز بادلوں کی طرح گراں بار آلام اس کے قریب آتے جارہے ہیں۔ بعد میں وہ ان سینکڑوں اہانتوں اور گالیوں کو اپنے ذہن میں دہرانے والا تھا جن سے تھانے میں اس کی تواضع کی

گئی تھی۔ وہ خود کو اس انکسار سے ان کے سامنے سپر انداز ہو جانے پر کبھی معاف نہیں کرے گا۔ (خود کو بے رحمی سے تکلیف پہنچانے کے لیے) وہ اس عزت و احترام کا مقابلہ، جو اسے ساری زندگی حاصل رہی تھی، اس مجروح کر دینے والی اہانت سے کرتا جو اس کے ساتھ تھانے میں روا رکھی گئی تھی، جہاں وہ اس کے ساتھ اس طرح پیش آئے تھے جیسے وہ کوئی جیب کترا یا بھڑوا ہو۔ خاص طور پر جو بات اس کے دل کو کچوکے لگاتی وہ اس کا ان کے سامنے یوں مکمل طور پر تسلیم بجالانا تھا۔ اگر انھوں نے اسے مارا پیٹا ہوتا تو اسے اس پر اعتراض نہ ہوتا۔ اس نے ان کی اطاعت کیوں کی اور کیوں ان کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ چیتھڑے کی طرح ہو گیا؟ اس کی قوتِ ارادی اس حد تک کیسے جاتی رہی، عزتِ نفس کیسے ڈھیر ہو گئی؟ اسے آخر تک ان کی مزاحمت کرنی چاہیے تھی، چاہے کچھ بھی ہو جاتا، اگر اپنے وقار کے دفاع کے لیے نہیں، تو کم از کم بثینہ کی عزت کی سلامتی کے لیے ہی، جسے انھوں نے غارت کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں کیا سوچے گی، اور وہ کیسے اس سے نظریں چار کر سکے گا، خاص طور پر جب وہ اس کی حمایت سے عاجز رہا تھا، حتیٰ کہ اس کی مدافعت میں ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہیں نکلا تھا؟

اس نے مڑ کر بثینہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے برابر برابر خاموشی سے چل رہی تھی۔ اچانک اس نے خود کو بھرائی ہوئی آواز میں کہتے سنا، ''آؤ، چل کر 'ایکسیلسیر' میں ناشتہ کریں۔ تمھیں بھوک لگ رہی ہو گی۔''

اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، بس اس کے پیچھے پیچھے خاموشی سے عمارتِ یعقوبیان کے سامنے کے بڑے سے ریستوران میں چلی آئی جو اس وقت بالکل خالی پڑا تھا، سوائے صفائی کرنے والے عملے کے، جو فرش کو صابن اور پانی سے پوچے لگانے میں مصروف تھا، اور ایک تنہا معمر غیر ملکی کے جو کافی دور بیٹھا ہوا قہوہ پیتے ہوئے کوئی فرانسیسی اخبار پڑھ رہا تھا۔ دونوں شارع سلیمان باشا اور شارع عدلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس کی ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ زکی نے (مع کیک) دو کپ 'کومبلیہ' [مکمل] چائے کا آرڈر دیا۔ ایک دبیز، الم انگیز خاموشی دونوں پر حاوی ہو گئی، حتیٰ کہ زکی نے چائے کی چسکی لے کر آہستہ آہستہ، راستہ ٹٹولتے ہوئے، بولنا شروع کیا، ''میں تم سے منت کرتا ہوں کہ اپنے کو ضیق میں نہ ڈالو۔ زندگی میں انسان کو ایسے بہت سے بیہودہ موقعوں کا سامنا

کرنا پڑتا ہے اور انھیں اپنے ذہن پر سوار کیے رکھنا مناسب نہیں۔ مصری پولیس افسر پاگل کتوں کی طرح ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہنگامی قانون کے تحت ان کے ہاتھ میں بہت زیادہ اختیار آ گیا ہے۔"

جو کچھ اس نے کہنا شروع کیا تھا، محض پوچ اور نامناسب تھا، اور بثینہ اسے سنتے ہوئے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کے سامنے چائے اور کیک یوں ہی بنا ہاتھ لگائے پڑے رہے۔ زکی کو اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر دل گرفتہ ہے۔ بولا، "میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ دولت کو دفتر کی چابی کہاں سے ملی۔ اس نے اس ساری رکیک حرکت کا منصوبہ مجھے رکوانے کی غرض سے بنایا ہے، لیکن وہ دعویٰ ہار جائے گی۔ وکیل نے مجھے یقین دلایا ہے کہ ہار جائے گی۔"

وہ ان بے مقصد باتوں سے اپنی پشیمانی کی مزاحمت کر رہا تھا، اس بات کی کوشش میں تھا کہ اس دل فگار صورت حال کو محض باتوں، امکانات، اور مفروضات میں بدل دے، اس امید میں کہ شاید یہ انھیں اس آزار سے نکالنے میں کامیاب ہو جائے جو انھیں کچلے دے رہا تھا۔

"وکیل نے مجھ سے 'رکوانے' کے قانونی شرائط کی وضاحت کی ہے۔ یہ ایک کافی گنجلک موضوع ہے اور عدالتیں ایسے سرسری پن سے فیصلے نہیں کرتیں۔ دولت اپنی لاعلمی کے باعث انھیں آسان سمجھتی ہے۔"

اس کی کوشش ناکام رہی اور بثینہ پر خاموشی جوں کی توں طاری رہی، اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، گویا وہ اپنی سننے اور بولنے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہو۔ زکی میز کے اوپر اس کی طرف جھکا اور پہلی بار روشنی میں دیکھا کہ اس کا رنگ کس قدر بیمار اور زرد نظر آ رہا ہے، آنکھیں کس قدر سرخ پڑ گئی ہیں، اور چہرے اور گردن پر خراشوں کے نشان ہیں جو پولیس سے مزاحم ہونے کے نتیجے میں پڑ گئے تھے۔ وہ بڑے پیار سے مسکرایا، اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے، اور سرگوشی کی، "بثینہ، اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو اس احمقانہ واقعے کو بھول جاؤ۔"

اس کی رقت بثینہ کی بساط سے زیادہ تھی۔ یہ گویا وہ آخری ہلکا سا مس تھا جس کا، چٹخا ہوا اور بمشکل اپنے کو سنبھالے ہوئے، پہاڑ منہدم ہونے سے پہلے منتظر تھا۔ وہ رونے لگی اور بڑی دبی دبی سی آواز میں کہا، "ساری عمر میں ہر چیز میں بدقسمت رہی ہوں۔"

❁

طٰہ رضوئی سے دوسری بہنوں کی موجودگی میں ملا۔ اس نے اسے بے نقاب دیکھا اور خاصی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ اس سے عمر میں تین سال بڑی ہے، اور دین کی بابت اس کا گہرا علم اور اس کے بولنے کا نرم اور پرسکون انداز اسے اچھا لگا۔ اس نے طٰہ کو اپنے اور اپنے سابق شوہر، حسن نورالدین، کے بارے میں بتایا، اور یہ بھی کہ انھوں نے اسے کس طرح مار ڈالا تھا۔ بولی، ''اخباروں میں لکھا تھا کہ اس نے افسروں پر گولی چلائی تھی اور وہ اسے مارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ اس رات اس نے ایک گولی بھی نہیں چلائی تھی۔ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا، اور جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، انھوں نے اپنی خودکار بندوقوں کے کئی راؤنڈ چلا دیے۔ وہ فوراً شہادت پا گیا، اور ساتھ ساتھ تین اور برادر بھی۔ انھوں نے انھیں دانستہ مار ڈالا۔ اگر وہ چاہتے تو انھیں زندہ حراست میں لے سکتے تھے۔''

طٰہ کے چہرے پر ملال تیر گیا اور اس نے تلخی سے کہا، ''انھیں تازہ ہدایات دی گئی ہیں کہ جتنے زیادہ اسلامیوں کو موت کے گھاٹ اتار سکیں، اتار دیں۔ یہ اسے 'قلب میں ضرب لگانے' کی پالیسی کا نام دیتے ہیں۔ اگر اس کافر حکومت نے یہودیوں کے ساتھ اتنا ہی وحشیانہ سلوک کیا ہوتا تو القدس کو آزاد ہوئے آج زمانہ ہو گیا ہوتا۔''

رضوئی نے اپنا سر جھکا لیا اور ایک بوجھل سکوت چھا گیا۔ پھر وہ اپنی بات کی طرف لوٹ آئی، گویا اس کی زندگی میں جو کچھ پیش آیا تھا، صراحت سے بیان کر دینا چاہتی ہو۔ ''میرے مرحوم شوہر کی شہادت کے بعد، میرے گھر والوں نے کسی اور سے میری شادی کرنے کی کوشش کی۔ مجھے معلوم ہوا کہ جو دولھا ان کی نظر میں تھا وہ ایک مالدار انجینئر ہے، لیکن اس نے نماز پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ گھر والوں نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ شادی کے بعد پابندِ ارکان بن جائے گا، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ تارکِ صلوٰۃ شرعاً کافر ہے اور ایک مسلمہ کے لیے اس سے شادی کرنا جائز نہیں، لیکن مجھ پر اتنا سخت دباؤ ڈالا گیا کہ میری زندگی جہنم بن گئی۔ مشکل یہ ہے کہ میرے گھر والے احکامِ دین کے پابند نہیں۔ اچھے لوگ ہیں لیکن بدقسمتی سے ابھی تک دورِ جاہلیت میں ہیں۔ مجھے خوف تھا کہ میری مذہبی روش فساد کھڑا کر دے گی؛ میں چاہتی تھی کہ میرے بیٹے عبدالرحمٰن کی نشوونما خدا کی اطاعت گذاری میں ہو۔ تو میں نے شیخ بلال سے رابطہ قائم کیا اور ان سے گزارش کی کہ

Scanned with CamScanner

مجھے تربیت گاہ میں رہنے کی اجازت دے دیں۔"

"تمھارے گھر والوں نے پھر کیا کیا؟"

"میں نے کسی کو بھیج کر کہلوا دیا کہ میری طرف سے مطمئن رہیں اور میں خدا کے حکم سے اولین فرصت میں ان سے ملنے آؤں گی، اور میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ اگر میں نے انھیں تکلیف پہنچائی ہے تو مجھے معاف کرے۔"

اس کا کلام سنتے ہوئے طٰہٰ کو محسوس ہوا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ بولتے میں اس کے حسین چہرے سے سنجیدگی اور خلوص کا جو تاثر مترشح تھا وہ اسے من بھاؤنا لگا۔ وہ کسی مجرم بچے کی طرح بول رہی تھی جو اپنی کوتاہیوں کا بے جھجک اعتراف کر رہا ہو۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس کا جسم بھرا بھرا اور متناسب اور اس کی چھاتیاں پھولی ہوئی اور مستحکم ہیں (اس خیال پر اس نے بعد میں خود پر لعنت ملامت کی اور خدا سے پناہ مانگی)۔

چند دن گزرنے کے بعد شیخ بلال نے اسے دفتر بلوایا اور مصافحہ کرتے ہوئے خوش آمدید کہا۔ پھر ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ لحہ بھر اسے دیکھ کر گہری آواز میں یوں کہا جیسے وہ اپنی گفتگو کو دوبارہ جاری رکھ رہا ہو، "تو ہاں، کیا خیال ہے؟"

"کس بات کے بارے میں؟"

شیخ زور سے ہنس دیا اور بولا، "کس بات کے بارے میں... تم نہیں جانتے، شیخ طٰہٰ؟ رضوی کے بارے میں، اور کس کے؟"

طٰہٰ چپ ہو گیا اور شرماہٹ سے مسکرا دیا۔ شیخ نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور بولا، "مبارکباد، بیٹے!"

جمعرات کے روز عشا کی نماز کے ختم ہوتے ہی برادران طٰہٰ کے گرد منڈلانے اور مبارکباد دینے لگے۔ اندرونی کمرے سے، جو عورتوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا، 'لع لع' کی مسرت انگیز چیخیں بلند ہونے لگیں۔ دو دن سے بہنوں نے دلہن اور اس کے جہیز کو تیار کرنے میں خود کو تھکا مارا تھا۔ سوا گھنٹہ تہنیتوں اور لع لع کے بعد شیخ بلال نے عقدِ قران انجام دیا۔ رضوی نے اپنی طرف سے بھائی ابوحمزہ کو شادی کے معاہدے کے لیے اپنا وکیل مقرر کیا (جو اس کا رشتے دار تھا اور، اسی کی طرح، اسیوط کا رہنے والا تھا)، اور دیگر برادران نے گواہوں کے طور پر خود کو پیش کیا۔ شیخ بلال نے شریعت میں

زواج کی جو حیثیت ہے اس کے بارے میں اپنے رواجی جملے دہرائے، پھر طٰہ کا ہاتھ ابوحمزہ کے ہاتھ پر رکھ کر عقد کے الفاظ ادا کیے، جو انھوں نے اس کے پیچھے دہرائے۔ جب وہ فارغ ہو لیے تو شیخ بڑبڑایا: ''اے خدا، ان کے ملاپ کو مبارک کر، اپنی اطاعت کی ہدایت کر، انھیں صالح اولاد دے!'' پھر اس نے طٰہ کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا، ''خدا تمھیں اور تمھارے زواج کو برکت دے اور تمھیں اور تمھاری زوجہ کو خیر میں مجتمع کرے!''

بعد ازاں سارے برادران دولھا کی طرف لپکے اور مبارکباد دینے لگے۔ لعلع کا بلند شور ابھرا، اور بہنیں دف بجا بجا کر گانے لگیں:

أتیناکم أتیناکم فحیونا نحییکم

ولولا الذهب الأحمر ماحلت بوادیکم

ولولا الحنطة السمراء ماسمنت عذاریکم

[ہم تمھارے پاس آئے ہیں، ہم تمھارے پاس آئے ہیں
سو تم ہمیں سلام کرو، ہم تمھیں سلام کریں گے
اگر زرِ سرخ نہ ہوتا
تو وہ تمھاری وادی میں پڑاؤ نہ ڈالتی
اگر گندم گندمی نہ ہوتا
تمھاری دوشیزائیں اتنی بھری بھری نہ ہوتیں]

طٰہ زندگی میں پہلی بار شادی کا اسلامی طریقہ دیکھ رہا تھا۔ وہ بہنوں کی مسرت اور نغمہ سنجی اور برادران کی پرجوش مبارکبادیوں سے متاثر ہوا۔ پھر بہنیں دلہن کو اس کے نئے گھر لے کر آئیں۔ یہ شادی شدوں کے لیے مخصوص بڑی سی عمارت کا صرف ایک وسیع کمرہ تھا جس کا علیحدہ چھوٹا سا غسلخانہ تھا۔ (اصلاً یہ عمارت سوئس لوگوں کے زمانے میں سیمنٹ کمپنی کے پتھر کی کانوں میں کام کرنے والوں کی رہائش گاہ ہوا کرتی تھی۔ پھر اسے خالی چھوڑ دیا گیا اور بالکل بھلا دیا گیا، یہاں تک کہ کمپنی میں کام کرنے والے اسلامیوں نے اسے لے کر جماعت کی خفیہ تربیت گاہ میں تبدیل کر دیا۔) عورتیں رخصت ہوئیں اور مسجد میں خاموشی چھا گئی۔ برادران دولھا کے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے رہے، بیچ بیچ میں ان کے قہقہے

Scanned with CamScanner

بلند ہوتے رہے۔ بالآخر شیخ بلال کھڑا ہو گیا اور بولا، ''اچھا برادران، اب ہم چلے۔''

طٰہ نے اسے ٹھہرائے رکھنے کی کوشش کی لیکن شیخ نے ہنس کر کہا، ''شادی کی رات اپنی طاقت باتیں کرنے میں ضائع نہ کرو!''

برادران اس پر ہنستے ہوئے فقرے برساتے ہوئے مسجد سے رخصت ہوئے۔ طٰہ نے انھیں الوداع کہی۔ جب وہ اکیلا رہ گیا تو اسے ہیبت محسوس ہونے لگی۔ شبِ زفاف میں کیا کرے گا، اس کا تصور اس نے مختلف شکلوں میں کیا تھا، لیکن آخر میں اس نے خدا پر توکل کیا اور فیصلہ کیا کہ ہر چیز کو اسی طرح ہونے دے گا جس طرح خدا نے مقدر کیا ہے۔ تاہم یہ خیال اسے مسلسل تشویش دلاتا رہا کہ خود اسے عورتوں کا کوئی تجربہ نہیں لیکن اس کی بیوی سابقہ تجربہ رکھتی ہے، اور شاید اس وجہ سے اسے خوش کرنا دشوار ثابت ہو۔ جیسے شیخ بلال نے اس کے خیالات پڑھ لیے ہوں، زفاف سے ایک دن پہلے وہ طٰہ کو ایک طرف لے گیا اور اسے زوج اور شرعی قوانین کی رو سے اس کی بیوی کے حقوق کے بارے میں بتایا۔ یہ تاکید بھی کی کہ کسی ایسی عورت سے شادی کرنے میں جو کنواری نہ ہو، ایک مسلمان کے لیے شرم اور جھجک کی کوئی بات نہیں ہے، اور کہا، ایک سابقہ شادی شدہ عورت سے شادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا نیا شوہر اسے عورت کی کمزوری پر محمول کر کے اس کے خلاف استعمال کرے۔ اس نے طنزیہ کہا، ''یہ دنیا پرست [سیکولرِسٹ] ہم پر کٹر مذہبی اور سخت گیر ہونے کی تہمت لگاتے ہیں، جبکہ خود ہزاروں نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہیں۔ تم دیکھو گے کہ ان میں سے اگر کوئی کسی سابق شادی شدہ عورت سے شادی کرتا ہے تو اس کے پہلے شوہر کا خیال اسے آسیب کی طرح چپک جاتا ہے، اور وہ اس سے بری طرح پیش آتا ہے، جیسے اس کی جائز شادی پر اسے سزا دے رہا ہو۔ اسلام میں ایسی کوئی نفسیاتی الجھنیں نہیں۔''

طٰہ سمجھ گیا کہ یہ سب رضوی سے اسے کس طرح سلوک کرنا چاہیے، اس کی بابت اشاراتی ہدایات ہیں۔ شیخ نے اس کے ساتھ مرد اور عورت کے درمیان تعلقات کا جائزہ لیا اور 'سورہ البقرۃ' کی اس آیت کی تشریح کی، ''تمھاری بیویاں تمھاری کھیتی ہیں، سو تم اپنے کھیت میں آؤ، جس طرح چاہو؛ اور اپنے حق میں آئندہ کے لیے کچھ کرتے رہو،'' اور بڑے بسط سے قرآنی کلمے ''اور اپنے حق میں آئندہ کے لیے کچھ کرتے رہو' [وَ قَدِّمُوا لِاَنفُسِکُم] کی شرح میں کہا کہ اس کے ذریعے خدائے عزّوجل ہمیں بتا رہا ہے کہ عورتوں کے ساتھ نرمی اور انسانیت کے ساتھ مباشرت کی جائے۔ شیخ کو یہ

Scanned with CamScanner

ملکہ حاصل تھا کہ وہ جنس کی باریک سے باریک تفاصیل کی بابت سنجیدگی اور شائستگی سے بات کرسکتا تھا، جس سے کسی کے احساسِ حیا کو ٹھیس نہیں پہنچتی تھی۔ طٰہ نے اس کی باتوں سے فائدہ اٹھایا اور بہت سی ایسی باتیں جو پہلے نہیں جانتا تھا، ان سے آگاہ ہوا۔ اس کے دل میں شیخ کی محبت بڑھ گئی، یہاں تک کہ اس نے اپنے سے کہا کہ ''اگر خود میرا باپ میرے ساتھ ہوتا تو وہ بھی میرے لیے شیخ بلال سے زیادہ نہیں کرسکتا تھا۔''

اب شادی کی رسومات تمام ہوچکی تھیں اور برادران اسے نازک لمحے سے خود نبٹنے کے لیے تنہا چھوڑ کر رخصت ہوچکے تھے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا اور دروازے پر دستک دے کر دلہن کے کمرے میں داخل ہوا، جہاں وہ اسے پلنگ کی پٹی پر بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ اس نے اپنا حجاب سر سے اتار دیا تھا۔ اس کے بال سیاہ اور چمکیلے تھے اور اس کے شانوں تک آتے تھے، اور اس کی جلد کی سفید گلگونی کے قرب میں ان کی سیاہی بڑی دلآویز نظر آرہی تھی۔ پہلی بار اس کی حسین گردن، اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ، اور اس کی انگلیوں کے پوروں کی نزاکت طٰہ کی توجہ میں آئی۔ اس حال میں کہ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا، اس نے گلا صاف کیا اور جھجکتے ہوئے کہا، ''السلام علیکم!''

رضوی مسکرائی، سر جھکالیا، اور حیا سے سرخ پڑتے ہوئے جذبات بھری سرگوشی کی، ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔''

❄

حاتم رشید کو خبر اگلے دن ملی۔ اسے رات دیر تک اخبار کے دفتر میں رہنا پڑا، جب تک پہلی طباعت نہ نکل آئی، جس کے بعد وہ صبح کے چار بجے کے قریب تھکا ماندہ گھر لوٹا، خود سے کہا، ''اب سوؤں گا۔ صبح عبدہ کا حال معلوم کروں گا۔'' وہ دیر سے بیدار ہوا، شاور سے نہایا، کپڑے پہنے، اور اسپتال جانے کے لیے نکلا۔ عمارت کے داخلے میں اسے دربان الشاذلی نظر آیا، جس نے نپے تلے انداز میں کہا، ''عبدہ آپ کے لیے کمرے اور کیوشک کی چابیاں چھوڑ گیا ہے۔''

''کیا؟'' حاتم ہکا بکا ہوکر بولا۔ دربان نے اسے بچے کی وفات کا بتایا اور جو کچھ اس کے بعد پیش آیا تھا۔ حاتم نے سگریٹ سلگائی اور پرسکون رہنے کی جدوجہد کرتے ہوئے پوچھا، ''اس نے بتایا کہ کہاں جارہا ہے؟''

Scanned with CamScanner

"کہہ رہا تھا کہ امبابہ جا کر رہے گا اور اپنا نیا پتا دینے سے انکار کر دیا۔"

حاتم لوٹا، چھت پر آیا، اور وہاں لوگوں سے عبدہ کا نیا پتا پوچھنے لگا۔ وہ ان کی شوخ چشمی اور معاندانہ نگاہوں کو برداشت کرتا رہا (جو زبانِ حال سے کہہ رہے تھے، "عبدہ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ تم جو کچھ اس کے ساتھ کر چکے ہو اسے کافی سمجھو!") لیکن آخر کار اسے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ شام کو وہ دو گھنٹے تک مقفل کیوشک کے سامنے اپنی کار میں بیٹھا رہا، مبادا عبدہ کچھ بھول گیا ہو اور فاضل چابی سے تالا کھول کر، جو اپنے پاس رکھتا تھا، لینے واپس آئے۔ وہ مسلسل تین روز تک وہاں آتا رہا لیکن عبدہ کبھی ظاہر نہ ہوا۔

مگر حاتم نے ہاتھ پاؤں نہیں ڈال دیے۔ وہ اسے ہر جگہ اور اسے جاننے والے ہر شخص کے پاس تلاش کرتا رہا، لیکن بے سود۔ شدید تلاش کا ایک طویل ہفتہ گزرنے کے بعد حاتم پر واضح ہو گیا کہ عبدہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا ہے۔ حزن اور یاس کی ایک بپھری ہوئی لہر اس پر پھیل گئی۔ درد انگیز اور متصادم جذبات نے اسے گھیر لیا۔ وہ عبدہ کی کمی محسوس کر رہا تھا: اس کا وہ اشتیاق، اس کا گٹھا ہوا مضبوط جسم، اس کی شگفتہ طبیعت اور پاکیزگی، اس کی بیٹھی ہوئی سی آواز، اس کا صعیدی لہجہ۔ اور حاتم کا دل بھی اس کے اوپر ہمدردی سے چھلکنے لگا: اسے معلوم تھا کہ اسے اپنے بچے سے کتنی محبت تھی اور اس کی موت سے اس پر کیا کچھ الم نہ گزر رہا ہوگا۔ اسے ندامت ہوئی کہ وہ اس دن اسے اسپتال چھوڑ کر اخبار کے دفتر چلا گیا تھا، اور اپنے سے کہا، "اس مشکل گھڑی میں اس کے پاس رہنے کے لیے میں کام کو ملتوی بھی تو کر سکتا تھا۔ اسے اپنے قریب میری ضرورت تھی لیکن مجھ سے کہتے ہوئے حجاب مانع رہا۔"

دن بدن حاتم کی تڑپ بڑھتی گئی۔ واقعی بدقسمت ہونے کے احساس نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ کئی سال تکلیف اور تعب میں گزارنے کے بعد کہیں جا کر اسے ایک اچھے دل کا اور حساس رفیق ملا تھا جس نے اس کے لیے مشکلیں نہیں پیدا کی تھیں، اور اس کی زندگی میں قرار آنے لگا تھا، کہ عبدہ کا بچہ مر گیا اور وہ اسے اپنا نکبت زدہ سفر از سرِ نو شروع کرنے کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب اسے پھر ہر رات شہر کے مرکز کی سڑکوں کی خاک چھاننی ہوگی کہ سکیورٹی کے محکمے کا کوئی رنگروٹ مل جائے، جو ہو سکتا ہے چور اچکا یا جرائم پیشہ نکلے، اسے زدوکوب کرے اور اسے لوٹ لے، جیسا پہلے کئی بار ہو چکا تھا۔ اسے پھر 'شِے نوبار' میں کسی بر غل اور الحسین کے 'جبلاوی' حماموں میں کسی نوخیز لڑکے کی تلاش میں

نکلنا پڑے گا جس سے اپنی شہوت کو تسکین دلا سکے، صرف اس لیے کہ بعد میں اسے اس کے سفلے پن اور ندیدے پن کو برداشت کرنا پڑے۔ وہ عبدہ کو کیوں کھو بیٹھا، جبکہ اسے اس سے اتنی محبت تھی، اور وہ اس سے اطمینان محسوس کرنے لگا تھا، اس نے دونوں کی مشترک زندگی کے منصوبے بنائے تھے؟ کیا واقعی اس کے لیے کسی چاہنے والے کے ساتھ طویل مدت تک پر مسرت زندگی گزارنا اتنا دشوار ہے؟ اگر وہ مذہبی ہوتا تو یقین کر لیتا کہ یہ آزمائشیں اس کی ہم جنس پرستی کی سزا ہیں، لیکن اسے کم از کم دس ایسے ہم جنسوں کا علم تھا جو اپنے عاشقوں کے ساتھ بے فکری اور چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ تو پھر خاص طور پر اسے کیوں عبدہ سے ہاتھ دھونا پڑے؟

رفتہ رفتہ اس کی افتادِ طبع بگڑنے لگی۔ اس کی بھوک مرگئی، وہ بہت زیادہ پینے لگا اور گھر سے چپک کر بیٹھ گیا۔ اس نے اخبار جانا بھی چھوڑ دیا، الّا یہ کہ کسی ہنگامی معاملے میں وہاں جانا پڑ جائے، جس سے نبٹتے ہی وہ پھر گھر لوٹ آتا، جہاں اگر کچھ تھا تو خاموشی، غمگینی، اور یادیں: عبدہ یہاں بیٹھتا تھا، یہاں کھانا کھاتا تھا، یہاں اپنی سگریٹ بجھاتا تھا، اور یہاں . . . یہاں وہ اس کے پہلو میں لیٹتا تھا، جبکہ حاتم اس کے سیاہ جسم کو تھپتھپاتا، اس کے بدن کے ہر حصے کے بوسے لیتا، اور ہیجان شہوت سے لرزتی ہوئی آواز میں سرگوشی کرتا: ”تم صرف میرے ہو، عبدہ۔ تم میرے خوبصورت سیاہ گھوڑے ہو!“

حاتم پوری پوری راتیں اپنی یادوں میں غلطاں گزار دیتا، اور عبدہ کے ساتھ اپنے تعلق کے لمحے لمحے کی بازخوانی کرتا، یہاں تک کہ ایک رات، مدہوشی اور یاس کی گھٹاؤں کے درمیان، ایک خیال اجاگر ہو کر اس کے دماغ میں بجلی کی طرح گزرا۔ اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ عبدہ نے اس سے مذاق میں کہا تھا: ”ایک صعیدی دوسرے صعیدیوں سے دور نہیں رہ سکتا۔ میں کہیں بھی جاؤں، میرے لیے ضروری ہے کہ صعیدیوں کے قہوہ خانے کا پتا چلاؤں اور وہاں جا کے بیٹھوں۔“

حاتم نے خود پر قابو پایا اور بے چینی سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے ایک بجے سے آگے کا وقت تھا۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہی وہ اِمبابہ میں راہگیروں سے صعیدیوں کے قہوے خانے کا پتا پوچھ رہا تھا، اور اگلے نصف گھنٹے میں اس نے وہ جگہ ڈھونڈ نکالی۔ اپنی کار سے قہوہ خانے کے دروازے تک کی اس مختصر مسافت میں اسے محسوس ہوا کہ پیشانی سے پسینہ بہنے لگا ہے، اور قریب ہے کہ اس کا دل شدت خفقان سے دھڑکنا بند ہو جائے گا۔

Scanned with CamScanner

قہوہ خانہ تنگ اور حد درجہ گندا تھا۔ حاتم سرعت سے اندر داخل ہوا اور بے صبری سے چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا (بعد میں وہ اس پر غور کرنے والا تھا کہ کسی چیز کے لیے ہماری شدید رغبت اور اس کے پورے ہو جانے کے امکان کے درمیان کیا تعلق ہے؛ اگر ہم دل و جان کے ساتھ چاہیں تو کیا وہ چیز ہمیں ضرور مل جاتی ہے جسے ہم چاہتے ہیں؟)۔ اسے عبدہ کو پالینے کی اتنی شدید خواہش تھی کہ وہ، حقیقت میں، اسے مل گیا۔ وہ اسے قہوہ خانے کے ایک دور افتادہ گوشے میں بیٹھا گڑگڑی پیتا نظر آیا۔ وہ ایک خوب ڈھیلا ڈھالا گہرے رنگ کا جلباب اور سر پر ایک بڑا سا صعیدی طرز کا عمامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس لحظے میں وہ اسے بھاری بھرکم اور مرعوب کن دکھائی دے رہا تھا، جیسے کوئی جادوئی کالا بھجنگ عفریت تصور سے نکل کر مجسم ہو گیا ہو۔ یہ بھی معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی اصلی صورت پر لوٹ آیا ہو؛ جیسے اس نے اپنے مغربی پہناوے کے ساتھ، حاتم رشید کے ساتھ اپنی ساری غیر معمولی لیکن حادثاتی تاریخ بھی اتار پھینکی ہو۔ حاتم اس کے سامنے ایک لمحہ خاموش کھڑا رہا، اسے بغور دیکھتا رہا، جیسے وہ اس کے وجود کی توثیق و تصدیق کو گرفت کر لینا چاہتا ہو، کہ کہیں وہ دوبارہ غائب نہ ہو جائے۔ اسے اس کی طرف لپکنے میں دیر نہیں لگی، اور وہ اتنی ہانپتی آواز میں بولا کہ گاہکوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، "عبدہ، آخرکار!"

❋

پہلی رات ان کی مباشرت سیدھی سادی اور بے ساختہ رہی، یوں جیسے وہ برسوں سے اس کی بیوی رہی ہو۔ گلاب اس کی انگلیوں کے لمس سے کھِل گیا اور اس نے ایک سے زیادہ دفعہ اس کی آبپاشی کی، حتیٰ کہ وہ سیراب ہو گیا۔ بعد میں جب اس نے دونوں کی شبِ زفاف کی تفصیلات کو اپنے ذہن میں دہرایا تو اسے حیرت ہوئی اور وہ اپنے سے پوچھنے لگا کہ یہ کیسے ہوا کہ وہ رِضویٰ کے ساتھ اتنی آسانی سے کامیاب رہا، جبکہ اس سے پہلے اس نے کسی عورت کو چھوا بھی نہ تھا؟ اس کا وسوسہ، تردد اور ناکامی کا خوف، سب کہاں چلے گئے تھے؟ شاید اس لیے کہ اس نے خود کو رِضویٰ کے ساتھ جذباتی طور پر پرسکون محسوس کیا تھا، یا اس لیے کہ اس نے شیخ بلال کی ہدایتوں پر حرف بحرف عمل کیا تھا، یا اس لیے کہ اس کی بیوی نے اپنے تجربے سے اسے ہمت دلائی تھی اور پراسرار کمین گاہوں سے اسے باخبر کیا تھا۔ یہ اس نے بڑی مہارت اور ہوشیاری سے کیا تھا، لیکن اپنی مسلمان عورت کی فطری حیا اور شرم سے دستبردار ہوئے بغیر۔

Scanned with CamScanner

طٰہٰ نے ان سب باتوں پر غور کیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس عورت سے اس کی شادی ربنا سبحانہ کی جانب سے ایک بڑی نعمت ہے، کیونکہ وہ مہذب، ایماندار اور سچی اسلام پرست انسان ہے۔ وہ اسے چاہنے لگا اور دونوں کے یومیہ نظام میں راحت محسوس کرنے لگا۔ وہ صبح اس سے رخصت ہوتا اور سارا دن تربیت گاہ میں گزارتا اور عشا کی نماز کے بعد واپس آتا تو کمرے کو صاف ستھرا اور خوش ترتیب، اور گرم گرم اشتہا انگیز کھانے کو اپنا منتظر پاتا۔ اسے نیچی سی گول میز کے گرد اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا کتنا پسند تھا! وہ اسے اپنے سارے دن کی روداد سناتا، اور وہ اس سے بہنوں سے اپنی باتوں کا ذکر کرتی اور اس دن کے اخباروں میں جو کچھ پڑھا ہوتا اس کا خلاصہ پیش کرتی (کیونکہ طٰہٰ کو اخبار پڑھنے کا وقت کہاں ملتا تھا)۔ دونوں ننھے عبدالرحمٰن کی حرکتوں پر ہنستے، اور اس کی شرارتیں جو اس وقت تک ختم ہو کر نہ دیتیں جب تک وہ یکدم نیند کے پنجوں میں نہ آ جاتا۔ اس وقت رضوئ کمرے کے فرش پر اس کے لیے بچھائے ہوئے بستر پر لاکر اسے لٹا دیتی۔ پھر کھانے کی باقیات کو ہٹانے اور توجہ سے برتن دھونے کے لیے لوٹتی۔

پھر وہ اجازت لے کر غسلخانے جاتی اور طٰہٰ سیدھا اپنے اور اس کے پرانے آہنی پلنگ پر جا کر لیٹ جاتا اور اس کا انتظار کرتے ہوئے چھت کو گھورنے لگتا۔ اس کا دل خواہش کے اس لذیذ تناؤ سے چھلکنے لگتا جس سے وہ تازہ واقف ہوا تھا، جو اسے بہت اچھا لگتا تھا اور جس کے وقوع کا وہ ہر رات انتظار کرتا تھا۔ اس کے لیے اس کی ہیجانی خواہش، غسلخانے سے نکلتے ہوئے اس کا فسوں کار جسم، گرم پانی سے تازہ دم، بالکل برہنہ، سوائے ایک تولیے کے جو اس کے گرد لپٹا ہوتا؛ ان کے درمیان خواہش کے تناؤ سے لبریز ہوس کے وہ خاموش لمحے جب وہ اس کی طرف پیٹھ پھیر کر آئینے کے سامنے خود کو بناتی سجاتی، دبی دبی، ہلکے ہلکے ہانپتی ہوئی آواز میں بے ترتیب، بے معنی فقرے کہتی، جیسے کسی موضوع پر بات کرنے کا سوانگ رچا رہی ہو، جیسے اس کے لیے اپنے شوق اور خواہش کو چھپا رہی ہو۔ وہ اشارہ سمجھ جاتا اور اسے اپنا وقت لینے دیتا، پھر اس کے لمبے، دبلے پتلے، لچکدار جسم کو اپنے سے لگا کر بھینچتا اور اپنے بوسوں اور جلتی ہوئی سانسوں سے اسے گدگداتا، یہاں تک کہ اپنی ساری مٹھاس کو نثار اور اپنے سارے احساسات کو اس کی آغوش میں خالی کر دیتا: اپنے غم و اندوہ، یادیں، ناکام خواب، انتقام کی وہ خواہش جو بجھ کر نہ دیتی تھی، ایذا رسانوں سے اپنی شدید نفرت؛ حتیٰ کہ وہ جلتی ہوئی جنسی خواہشیں جو

Scanned with CamScanner

چھت پر اپنے کمرے میں اس پر طاری ہوتی تھیں اور اسے تکلیف پہنچاتی تھیں۔ یہ سب وہ رضوی کے جسم میں اتار کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا، پرسکون، آگ ماند پڑ جاتی، اور اس کی جگہ ایک دھیمی دھیمی پائیدار محبت لے لیتی جو ہر رات کے ساتھ اور مستحکم ہوتی جاتی۔

مباشرت سے فارغ ہو کر وہ اسے سچی شکر گزاری سے تکتا اور اس کے ہاتھوں، چہرے، اور بالوں کو بوسوں سے ڈھانپ دیتا۔ وہ اس کے جسم کے ایک ایک خط و خال اور تفصیل سے اور اس کی مخصوص زبان سے اس درجہ واقف ہو گیا تھا کہ ان کی ہم آغوشی گھنٹوں جاری رہتی، جس کے دوران رضوی کا چہرہ کئی بار فرطِ کیف سے جگمگانے لگتا۔

اس کے ساتھ طٰہ کی نئی زندگی کے کئی ماہ گزر گئے جن میں اس نے شادمانی کا ذائقہ چکھا، یہاں تک کہ ایک رات جب وہ اس سے ہم آغوش ہوا تو خلافِ معمول اس کی ادائیگی میں لڑکھڑاہٹ سی آ گئی۔ وہ جھنجھلا گیا اور مباشرت وہیں منقطع کر دی۔ دونوں کے درمیان خموشی در آئی۔ یکبارگی وہ اتنی تندی کے ساتھ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا کہ دونوں کے نیچے پلنگ ہلنے لگا، اور لپک کر بتی جلا دی۔ رضوی نے اپنے برہنہ جسم کو ڈھانپنے کے لیے اپنے کپڑے ٹٹولے اور بڑی تشویش سے پوچھا، ''کیا ہوا؟''

وہ خاموش رہا اور آہستگی سے صوفے پر جا بیٹھا۔ پھر دوہرے ہو کر سر ہاتھوں میں لے لیا۔ چہرہ سکڑنے لگا جیسے کوئی چیز اسے تکلیف دے رہی ہو۔ وہ پریشان ہو کر تیزی سے اس کی طرف لپکی، ''کیا ہوا، طٰہ؟''

شاید اپنے بارے میں اس کی سچی تشویش سے متاثر ہو کر اس نے بے چینی کا اظہار کیا اور بڑی گہری سانس لے کر اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا، ''رضوی، مہربانی سے مجھے غلط نہ سمجھنا۔ ظاہر ہے، میں شادی پر بہت خوش ہوں اور خدا کا ہزار بار احسان مند کہ اس نے مجھے تم جیسی صالح بیوی عطا کی۔ لیکن میں تربیت گاہ میں شادی کروانے نہیں آیا تھا۔ میں شیخ شاکر کے ساتھ ایک خاص مقصد سے آیا تھا، خدا کی راہ میں جہاد کرنے! میں سال بھر سے یہاں ہوں۔ میں نے ہر طرح کی مشقیں پوری کر لی ہیں، اس کے باوجود انھوں نے کوئی ایک مہم بھی میرے سپرد نہیں کی ہے۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں وقت کے ساتھ ساتھ میرا ارادہ کمزور نہ پڑ جائے۔''

وہ مدھم، غمناک آواز میں بول رہا تھا۔ پھر اپنے زانو پر ہاتھ مار کر تلخی سے چلایا، ''اگر یہ سب

شادی کی خاطر تھا تو تربیت گاہ کے علاوہ میں تم سے کہیں بھی شادی کر سکتا تھا۔ میں روز اپنے سے سینکڑوں بار پوچھتا ہوں، 'میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟' بتاؤ رضوی، کیا کر رہا ہوں میں؟ مجھے یقین ہے کہ شیخ بلال نے جہاد کی طرف سے میری توجہ ہٹانے کے لیے تم سے میری شادی کر دی ہے۔"

رضوی ایک عقلمند، سمجھنے والی ماں کی طرح مسکرائی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت سے بولی، "خدا سے پناہ مانگو اور ان خیالات کو اپنے دماغ سے نکال دو، کیونکہ یہ شیطان کے وسوسے ہیں۔ شیخ بلال ایک ایماندار آدمی ہیں اور کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ اگر انھوں نے جہاد کے لائق نہ سمجھا ہوتا تو تمھیں تربیت گاہ سے چلتا کیا ہوتا، بالکل اسی طرح جیسے وہ کبھی کسی گمراہ عورت سے تمھاری شادی نہ کرتے، جو تمھیں تمھارے دین سے بھٹکا دیتی . . . " (اور اب اس کی آواز میں ملامت کا رنگ آ گیا)۔ "میں تمھاری بیوی ہوں، طٰہ، اور جہاد کے لیے تمھاری حوصلہ افزائی کرنے والوں میں سب سے پہلی ہوں گی۔ اور اگر تم شہادت پا گئے تو تم پر فخر کرنے والوں میں بھی سب سے پہلی، اور خدا سے دعا کرتی ہوں کہ تمھارے ساتھ ساتھ میں بھی شہادت پاؤں۔ لیکن مرحوم شہید حسن سے یہ بات میرے تجربے میں آئی ہے کہ عسکری حکمت عملی کھیل یا گلگشت نہیں اور بڑی دوٹوک تدابیر کی پابند ہے، جن سے صرف جماعت کی شوریٰ کے اراکین ہی باخبر ہیں۔"

طٰہ نے اعتراض کرنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ رضوی نے جلدی اور نرمی سے اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، جیسے اسے بولنے سے روکنا چاہتی ہو، اور سرگوشی کی، "صبر کرو، طٰہ، صبر کرو۔ **ان اللّٰہ مع الصابرین!**"

❁

جمعرات کی صبح ٹھیک دس بجے ایک سیاہ 'فینٹم' مرسیڈیز عمارتِ یعقوبیان کے سامنے آ کر رکی۔ دیدہ زیب کپڑوں میں ملبوس، چالیس کے لگ بھگ عمر کا ایک شخص باہر نکلا اور کچھ پوچھنے لگا، یہاں تک کہ اسے حاج عزام کے دفتر میں پہنچا دیا گیا، جہاں اس نے حاج عزام کو سلام کر کے تنک مزاجی سے اپنا تعارف کرایا، "جمال برکات، باشا کے سکرٹیریٹ سے۔"

حاج عزام کار میں اس کے برابر بیٹھ گیا، لیکن پورے سفر کے دوران انھوں نے بمشکل چند تواضعی کلموں کا تبادلہ کیا، جس کے بعد عزام اپنی تسبیح اور دعائیں پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔ اسے یہ

اندازہ تو تھا کہ 'بڑا صاحب' مربوط قنات کے پاس رہتا ہے لیکن اس نے کبھی اس کی رہائش گاہ کا تصور اس طرح نہیں کیا تھا۔ ایک وسیع وعریض قصر — ان شاہی محلات کو یاد دلانے والا جو اس نے بچپن میں دیکھے تھے۔ ایک بلند پہاڑی پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ کسی ناقابلِ تسخیر قلعے سے مشابہ نظر آ رہا تھا، جس کے اردگرد کم از کم ایک سو فدّان اراضی تھی، ساری کی ساری مزروعہ۔ خارجی پھاٹک سے قصر کے دروازے تک کی مسافت طے کرنے میں کار کو آدھے گھنٹے کے قریب وقت لگا، جس کے دوران وہ اس سڑک پر چلتی رہی جو باغوں اور درختوں کے بیچ سے ہو کر جاتی تھی۔ تین بار کار کو حفاظتی چوکی کے پاس ٹھہرنا پڑا جہاں محافظ عملے نے اس کی تلاشی لی۔ یہ بڑے لحیم شحیم آدمی تھے جو پورے سوٹ پہنے ہوئے تھے اور ان کی ٹائیوں کا رنگ سوٹ ہی جیسا تھا۔ ان کی پیٹیوں سے بڑے بڑے پستول لٹکے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں سیٹیاں بجانے والے برقی ڈنڈے تھے جن سے بڑی احتیاط کے ساتھ انھوں نے کار کا معائنہ کیا، جس کے بعد انھوں نے حاج عزام کا شناختی کارڈ دیکھا اور اس کی تفصیلات کا مقابلہ ان تصریحات سے کیا جو سیکرٹری نے انھیں پیش کی تھیں۔ یہ تین بار ہوا، جس سے حاج عزام ضیق میں آ گیا، اتنا کہ آخری بار وہ تقریباً اعتراض کرنے کے درپے ہوا، لیکن پھر اس نے اپنے غصے کو دبا لیا اور خاموش ہی رہا۔ بالآخر کار ایک کشادہ، پیچ وخم کھاتے ہوئے راستے پر چڑھی جو اسے قصر کے دروازے تک لے آیا۔ یہاں بھی حفاظتی کارروائی اسی احتیاط اور مکملیت سے کی گئی، اور اس بار تو انھوں نے حاج عزام کا بستہ کھول کر اس کا بھی معائنہ کیا، پھر اس سے الیکٹرونک دروازے سے ہو کر گزرنے کے لیے کہا۔ ناگواری کے آثار اس کے چہرے سے ہویدا تھے، جس پر سیکرٹری نے اس کے پاس آ کر بڑی ترشی سے کہا، "محافظتی کارروائی ضروری ہے۔"

سیکرٹری نے اس سے پیش ایوان میں انتظار کرنے کے لیے کہا اور غائب ہو گیا۔ عزام کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا۔ اس درمیان میں وہ سنگِ مرمر کے ستون، عالیشان قالینوں کے ایرانی نقش ونگار، اور بڑے بڑے کرسٹل کے فانوس، جو بلند چھت سے لٹکے ہوئے تھے، دیکھتا رہا۔ رفتہ رفتہ اسے برہمی اور اپنی اہانت کا احساس ہونے لگا، اور خیال گزرا کہ اس طویل انتظار اور مبالغہ آمیز محافظتی کارروائیوں کو دانستہ اسے ذلیل کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ "میری اہانت کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ مجھ سے پیسہ بھی لوٹ رہے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ چوتھائی منافع تیار مل جائے اور شکریے کا

Scanned with CamScanner

ایک لفظ بھی ادا نہ کرنا پڑے، غنڈے، بے ادب!''

عزام کے ماتھے پر بل پڑ گئے، چہرے پر سیاہی امڈ آئی، اور جی چاہا کہ ملاقات چھوڑ چھاڑ کر چلتا بنے۔ اس کا جی چاہا کہ فوراً اٹھ کھڑا ہو، سیکرٹری کو بلوائے، اور اس سے کہے کہ وہ جا رہا ہے، ہر چہ بادا باد۔ لیکن اندر اندر جانتا تھا کہ یہ محال ہے۔ یہ لوگ صبح سے دوپہر تک اس سے انتظار کروائیں تو بھی وہ اعتراض کا ایک لفظ منھ سے نہیں نکال سکتا۔ وہ بڑے لوگوں کے حلقے میں ہے اور ادنیٰ سی غلطی بھی اسے تباہ کر دے گی۔ اسے لازم ہے کہ اپنا حیلہ تیار رکھے، اپنے سارے تجربے کو جمع کرے اور 'بڑے صاحب' کو خود پر رحم دلا کر چوتھائی سے کم لینے پر آمادہ کرے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا، اور اگر کوئی حماقت کی تو اسے اس کا فوری اور بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

بالآخر اسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس پر ایسی ہیبت طاری ہوگئی کہ پیچھے مڑنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ ایک محافظ ظاہر ہوا اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک طویل راہداری سے گزرتے ہوئے، جس کے چمکائے ہوئے مرمریں فرش پر ان کے قدموں کی آواز گونجنے لگی، آخر ایک بہت بڑے ہال کمرے میں پہنچ گئے، جہاں سامنے بلوط کی لکڑی کی بڑی میز تھی، اور ایک اور لمبی چوڑی میز جو کانفرنس کے لیے مخصوص تھی، جس کے گرد دس عدد کرسیاں ترتیب سے جمی ہوئی تھیں۔ محافظ نے عزام کو اشارہ کیا کہ بیٹھ جائے اور بڑی بدتمیزی سے بولا، ''یہاں اس وقت تک انتظار کرو جب تک باشا کی کال نہ آئے!''

''کال نہ آئے'' پر اسے وسوسہ ہونے لگا۔ کیا اس کا مطلب تھا کہ بڑا صاحب وہاں موجود نہیں تھا؟ اگر ایسا ہی تھا تو اس نے رابطہ کر کے ملاقات سے معذرت کیوں نہیں کر لی کہ اسے اتنی زحمت تو نہ اٹھانی پڑتی؟ اور یہ لوگ اسے اتنی دیر سے انتظار کیوں کروا رہے ہیں؟ اچانک اسے ایک بلند آواز سارے کمرے میں گونجتی سنائی دی، ''خوش آمدید، عزام!''

ہیبت کے مارے وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور آواز کے مصدر کی تلاش میں چاروں طرف دیکھا، جو دھیرے سے ہنسی اور جاری رہی، ''ذرومت! میں کہیں اور ہوں، لیکن تم سے بات کر سکتا ہوں اور تمھیں دیکھ سکتا ہوں۔ افسوس کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ چلو سیدھے سیدھے مطلب کی بات کریں۔ تم کس لیے مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟''

حاج نے اپنے ہوش وحواس یکجا کیے اور کوشش کی کہ وہ سب کہے جس کی دو ہفتوں سے تیاری کرتا رہا ہے، لیکن مارے خوف کے سارے خیالات اس کے ذہن سے بخارات کی طرح تحلیل ہو گئے تھے۔ چند لمحوں بعد وہ بڑی مشکل سے کہہ سکا،''میں آپ کے خدمت گذاروں میں سے ہوں، جناب۔ بس، عالیجاہ حکم فرمائیں۔ آپ کے کرم میں غرقاب ہوں اور آپ کا لطف وکرم سارے ملک پر ہے۔ خدا آپ کا سایہ مصر پر سدا سلامت رکھے! بس اتنی امید کرتا ہوں کہ عالیجاہ میرے معاملے میں رعایت کریں گے۔ مجھ پر بہت ذمے داریاں ہیں، اور، خدا جانتا ہے، کئی گھروں کی کفالت بھی۔ چوتھائی مجھ پر بہت بڑا بار ہوگا، سرکار۔''

'بڑا صاحب' خاموش رہا، جس سے عزام نے ہمت پکڑی اور بولے گیا،''عالیجاہ، میں آپ کے کرم کا حریص ہوں۔ نبی کے واسطے مجھے دل شکستہ نہ لوٹائیں۔ مثلاً آپ شرح کو گھٹا کر آٹھ فیصد کر سکتے ہیں۔ مجھ پر بڑا کرم ہوگا۔''

خاموشی کا ایک اور لمحہ گزر گیا۔ پھر 'بڑے صاحب' کی آواز برہمی سے ابھری،''اے عزام، سنو۔ تمھارے ساتھ ضائع کرنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ شرح یہی ہے اور سب کے لیے یہی ہے۔ تمھاری ایجنسی جیسے بڑے بزنس میں ہم چوتھائی منافعے کی شرح پر شرکا کی حیثیت سے معاملہ کرتے ہیں۔ ہم اپنے کام کے بدلے میں یہی شرح لیتے ہیں۔ ہم تمھیں محصول، انشورنس، سیفٹی اسٹینڈرڈ اور آڈٹ کے اداروں سے بچاتے ہیں، اور ایسے دوسرے بیسیوں اداروں سے جو تمھارے کاروبار کو روک دینے اور تمھیں ایک جھٹکے میں فنا کر دینے پر قادر ہیں۔ تم خاص طور پر اس پر خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم تمھارے شریک کار ہونے پر راضی ہو گئے ہیں، کیونکہ تمھارا کاروبار بڑا غلیظ ہے۔''

''غلیظ؟''

عزام نے یہ لفظ بلند آواز میں کہا، کچھ جنبش سی کی، اور انکار کی بڑبڑاہٹ منھ سے نکل گئی، جس نے 'بڑے صاحب' کو اور بھڑکا دیا۔ اس نے بلند آواز میں اسے خبردار کیا،''کیا تم واقعی احمق ہو یا احمق ہونے کا ڈھونگ رچا رہے ہو؟ تمھارا اصلی منافع ایک غلیظ دھندے سے آتا ہے، جس کا جاپانی ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ تم منشیاتی سفوف کا دھندا کرتے ہو اور ہمیں سب معلوم ہے۔ میز کے پاس آکر بیٹھو اور وہ فائل کھولو جس پر تمھارا نام لکھا ہوا ہے۔ تمھیں اس میں اپنی

Scanned with CamScanner

سرگرمیوں کی رپورٹوں کی فوٹو کاپیاں ملیں گی: سیکورٹی کی تفتیش، انسدادِ منشیات والوں اور عام مخبروں کی رپورٹیں۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ ہم نے انھیں روکے رکھا ہے، اور چاہیں تو لمحہ بھر میں انھیں حرکت دے کر تمھیں برباد کر سکتے ہیں۔ بیٹھ جاؤ، عزام، اور احمق نہ بنو۔ فائل پڑھو اور اسے اچھی طرح سمجھ لو۔ فائل کے آخر میں تمھیں ہمارے درمیان شراکت کے معاہدے کی نقل ملے گی۔ اگر چاہو تو اس پر دستخط کردو۔ ورنہ جیسی تمھاری مرضی۔''

پھر 'بڑے صاحب' نے زوردار استہزائی قہقہہ بلند کیا اور آواز منقطع ہوگئی۔

❁

عبدہ اس سے خشک مزاجی سے ملا۔ کھڑے ہوئے بغیر اس نے سردمہری کے ساتھ ہاتھ ملایا، پھر چہرہ ہٹا کر گڑگڑی پینے میں مصروف ہوگیا۔ حاتم نے مسکرا کر دوستداری سے کہا، ''ملنے کا یہ کیا جنگلی طریقہ ہے؟ کم سے کم میرے لیے چائے تو منگواؤ۔''

عبدہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر تالی بجائی اور ویٹر سے حاتم کے لیے چائے کا گلاس منگوایا۔

حاتم نے گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے کہا، ''میری ہمدردیاں تمھارے ساتھ ہیں۔ تم ہمارے خدا اور اس کی قدرت پر ایمان رکھتے ہو۔ لیکن کیا غمزدگی مجھ سے ملنے سے تمھیں منع کرتی ہے؟''

عبدہ یکبارگی پھٹ پڑا، ''بس بس، حاتم بک! خدا ہمیں معاف کرے، میرا بیٹا میری وجہ سے مرا۔''

''یعنی؟''

''یعنی تمھارے ساتھ مل کر گناہ کرنے پر خدا نے مجھے سزا دی ہے۔''

''تو کیا جس کسی کا بیٹا مر جاتا ہے تو اس لیے کہ خدا اسے سزا دے رہا ہوتا ہے؟''

''ہاں، ہمارا خدا، سبحانہ و تعالیٰ، دیر کرتا ہے لیکن بھولتا نہیں۔ میں نے تمھارے ساتھ مل کر بہت غلط کام کیے ہیں۔ میں سزا کا مستحق ہوں۔''

'' تم سے اس پر کس نے یقین کروایا ہے؟ تمھاری بیوی ہدیہ نے؟''

''تمھیں اس سے کیا غرض کہ ہدیہ نے یا کسی اور نے؟ میں تم سے کہے دے رہا ہوں، ہمارا معاملہ ختم ہوگیا۔ تم اپنی راہ لگو، میں اپنی۔ میں تم سے نہیں ملوں گا، اور تم بھی مجھ سے کبھی نہ ملنا۔''

اس کی آواز گھٹی گھٹی اور مضطرب تھی۔ وہ چلا رہا تھا اور ہاتھ یوں ہلا رہا تھا جیسے اس مقام پر پہنچ جانا چاہتا ہو جہاں سے واپسی ناممکن ہو جائے۔ حاتم کچھ دیر خاموش رہا، پھر سکون سے بولنا شروع کیا جیسے اس نے اپنا داؤ بدل لیا ہو۔

''ٹھیک ہے، جناب۔ ہمارا اتفاق ہو گیا۔ تم چھت اور کیوشک چھوڑ کر چلے گئے ہو اور ہمارے تعلق کو ختم کرنا چاہتے ہو۔ میں اس سے متفق ہوں۔ لیکن تم اپنے اور اپنی بیوی کے خرچ کے لیے پیسہ کہاں سے لاؤ گے؟''

''رزق خدا کے ہاتھ ہے۔''

''اس میں شک نہیں کہ رزق خدا ہی مہیا کرتا ہے۔ چاہے ہمارا تعلق ختم ہو گیا ہو، تمھاری مدد کرنا پھر بھی میرا فرض ہے۔ تمھارے اس وحشی برتاؤ کے باوجود، عبدہ، مجھے تمھاری فکر ہے ... سنو، میں نے تمھارے لیے ایک اتنی عمدہ ملازمت ڈھونڈ نکالی ہے کہ تم مجھے نیکی سے یاد کرو گے۔''

عبدہ خاموش رہا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہچکچا رہا ہو۔ اس نے گڑگڑی کا بڑا لمبا کش لیا، گویا اپنے تذبذب کی پردہ پوشی کر رہا ہو۔

''پوچھو گے نہیں، کیا ملازمت ہے؟ ... میں نے المنیرہ میں واقع فرانسیسی ثقافتی مرکز میں تمھیں دربان رکھنے کے لیے کہا ہے۔ صاف ستھرا اور آسان کام ہے اور ماہانہ تنخواہ پانچ سو پاؤنڈ۔''

عبدہ خاموش رہا، نہ انکار کیا نہ اعتراض۔ حاتم نے، یہ محسوس کر کے کہ وہ کامیاب رہا ہے، بات جاری رکھی، ''تم اس سے بہتر کے اہل ہو، عبدہ۔ لو۔''

اس نے دستی تھیلی سے قلم اور چیک بک نکالی، چشمہ چڑھایا، ایک چیک کاٹا اور ہنستے ہوئے کہا، ''یہ ہزار پاؤنڈ کا چیک ہے، کام شروع کرنے تک تمھارے اخراجات کے لیے۔''

اس کا ہاتھ ایک لمحے بڑھا رہا حتیٰ کہ عبدہ نے اپنے ہاتھ کو ہولے سے حرکت دی اور مدھم آواز میں ''شکریہ'' کہتے ہوئے چیک لے لیا۔

''عبدہ، میں نے اپنے تعلق کو کبھی تمھارے اوپر زبردستی مسلط نہیں کیا تھا۔ اگر تم نے مجھے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو چھوڑ دو۔ لیکن مجھے تم سے ایک آخری فرمائش کرنی ہے۔''

''کیا فرمائش؟''

حاتم اس کی طرف جھکا حتیٰ کہ اس سے مس ہونے لگا، پھر اس کی ٹانگ پر ہاتھ رکھا اور جذبات سے جلتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی، ''میرے ساتھ آج رات رہو۔ صرف آج رات، اور یہ ہماری آخری رات ہوگی۔ وعدہ رہا، عبدہ۔ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آج رات میرے ساتھ آؤ تو اس کے بعد مجھے کبھی نہیں دیکھو گے۔ تم سے منت کرتا ہوں۔''

وہ کار میں پہلو بہ پہلو بیٹھے۔ خاموشی، جس میں تناؤ کی کیفیت تھی، ان کے درمیان طاری رہی۔ حاتم بڑی جز رسی سے اپنے منصوبے کو عمل میں لا رہا تھا اور خیال کر رہا تھا کہ آخر میں وہ عبدہ کو اپنے سے ہلگائے رکھنے میں کامیاب ہو جائے گا، کیونکہ وہ پیسے اور نئے کام کی کشش میں آنے سے باز نہیں رہ سکے گا، بالکل جس طرح پھر سے لذت کا مزہ چکھتے ہی وہ دونوں کے باہمی تعلق کی تجدید کر لے گا۔ دوسری طرف، عبدہ نے حاتم کی دعوت قبول کی تھی تو اس جواز کے ساتھ کہ یہ ایک ضرورت تھی جو حالات نے اس پر عائد کر دی تھی۔ کیوشک چھوڑنے کے بعد سے ابھی تک اسے اپنے اور بیوی کے خرچ کے واسطے کچھ مل نہیں سکا تھا، حتیٰ کہ چائے اور تمبا کو بھی قہوے خانے کے مالک سے ادھار پر پی رہا تھا، جو اسی کے قصبے کا رہنے والا تھا۔ اس نے اپنے صعیدی واقف کاروں سے دو ماہ سے کم میں تین سو پاؤنڈ قرض لے ڈالے تھے، اور کوئی مناسب کام ڈھونڈ نکالنے کی اپنی لاحاصل جستجو سے تھک گیا تھا۔ اس نے مزدور کا کام بھی کیا لیکن اس کا متحمل نہ ہو سکا اور چند ہی دنوں میں اسے چھوڑ دیا۔ اتنی محنتِ شاقہ برداشت کرنے کی طاقت اب اس میں نہیں رہی تھی۔ سارا دن بھاری بھاری ظروف کمر پر لاد کر اوپر لانا اور نیچے لے جانا، وہ بھی صرف چند پاؤنڈ کے عوض، جن میں سے آدھے ٹھیکیدار ہتھیا لیتا، اس پر گالیاں اور بے عزتی مستزاد۔ تو وہ کرتا بھی تو کیا؟ حاتم جو کام اسے پیش کر رہا تھا، صاف ستھرا بھی تھا اور باعزت بھی، اور فقر و فاقے سے محفوظ رکھنے والا۔ تو پھر وہ کیوں نہ صرف ایک رات اس کے ساتھ سوئے، اسے صرف ایک بار اس کی مرضی کرنے دے، پھر چیک بھنائے، اپنے قرضے اتارے، اپنی ضرورتیں پوری کرے، اور نیا کام ملتے ہی تعلق توڑ لے اور اپنی زندگی کے اس متعفن صفحے کو پلٹ دے؟ اسے پورا یقین تھا کہ خدا اسے معاف کر دے گا اور اس کی توبہ قبول کر لے گا۔ اس کے بعد، پہلا موقع ملتے ہی، وہ حج کرنے جائے گا، جہاں سے اپنے گناہوں سے پاک ہو کر لوٹے گا، اتنا ہی پاک و صاف جتنا ماں کے پیٹ سے نکلتے وقت تھا۔ آج کی رات آخری رات ہوگی جس میں وہ گناہ کا مرتکب ہوگا؛ صبح ہوتے ہی وہ توبہ کر کے راہِ راست پر آ جائے گا۔

اس نے اندر اندر فیصلہ کیا کہ وہ حاتم سے اپنی ملاقات کا ذکر ہدیہ سے نہیں کرے گا، کیونکہ اگر اسے پتا چل گیا تو وہ اس کی زندگی جہنم بنا دے گی۔ اور حقیقت میں بچے کی موت کے بعد سے کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا جس میں ہدیہ اس سے نہ جھگڑی ہو، اسے برا بھلا نہ کہا ہو، اور خدا سے اس پر اپنا قہر نازل کرنے کے لیے نہ کہا ہو۔ غم واندوہ نے اس کی عقل ماؤف کر دی تھی۔ وہ اس کے اعصاب اور پوری زندگی پر ایک بھاری بوجھ بن گئی تھی؛ اس سے اس طرح برتاؤ کرتی جیسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بچے کو مار ڈالا ہو۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جرم کا یہ احساس ہدیہ سے خود اس میں بھی رس آیا تھا اور اس پر اس درجہ حاوی ہو گیا تھا کہ اکثر اسے سونے نہ دیتا۔ لیکن یہ سب آج رات ختم ہو جائے گا۔ وہ حاتم کے جسم کو آخری بار آسودہ کرے گا، ملازمت حاصل کرے گا، اور توبہ کرے گا۔

بغیر کچھ کہے دونوں اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ حاتم نے بتی جلائی اور شگفتگی سے کہا، ''تمھارے بغیر گھر سنسان لگتا ہے۔''

عبدہ یکبارگی اس سے قریب ہوا، ہم آغوش ہوا، اور اس کے کپڑے اتارنے کی کوشش کی تاکہ اس کے ساتھ جفتی کرے۔ وہ اس کام سے نبٹ لینے کی جلدی میں تھا، لیکن حاتم اس کی جلد بازی کو اپنے لیے اس کے اشتیاق کی دلیل سمجھا، اور زنانہ مسرت کی ہنسی کے ساتھ سرگوشی کی، ''صبر کرو، عبدہ!''

وہ سرعت سے گھر کے اندر گیا۔ اس دوران عبدہ نے بار کھولی، وِسکی کی بوتل نکالی، اپنے لیے ایک بڑا سا جام انڈیلا، اور برف یا پانی ملائے بغیر ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا۔ اسے نشے میں آنے کی شدید ضرورت محسوس ہوئی، اور اس تھوڑی سی دیر میں جو حاتم کو اپنے بناؤ سنگار میں لگی، اس نے کئی جام اپنے پیٹ میں اتار لیے۔ شراب فوری اثر پذیر ہوئی۔ اسے اپنی رگوں میں خون بڑی حدت اور جوش سے دوڑتا ہوا محسوس ہوا، اور اس خیال نے کہ وہ بہت مضبوط اور قادر ہے، کہ کوئی چیز اسے اپنی من مانی کرنے سے نہیں روک سکتی، اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ حاتم غسلخانے سے اپنے برہنہ جسم پر ریشمی، گلابی شب خوابی کا لباس پہنے نکلا اور دبے پاؤں باورچی خانے میں گیا، اور گرم گرم کھانا لیے لوٹا، جو اس نے میز پر لگا دیا، اپنے لیے وِسکی کا ایک جام انڈیلا، جسے ہولے ہولے چسکیاں لے کر پینے لگا، بڑے ترغیب انگیز انداز میں جام کی کور کو زبان سے چاٹتے ہوئے، پھر اس نے عبدہ کے مضبوط شانے پر اپنا ہاتھ رکھا، آہ بھری، اور سرگوشی کی، ''میں نے تمھاری بہت کمی محسوس کی ہے!''

Scanned with CamScanner

عبدہ نے اس کا ہاتھ الگ کیا اور مخمور آواز میں بولا، ''حاتم بک، ہم نے معاہدہ کیا ہے۔ یہ ہماری آخری رات ہے۔ صبح ہوتے ہی ہم اپنی اپنی راہ لیں گے، ٹھیک ہے نا؟''

حاتم مسکرایا اور، عبدہ کے موٹے موٹے لبوں پر انگلی پھیرتے ہوئے، خود اسی کے لہجے کی مذاقاً نقل اتارتے ہوئے، بولا، ''بالکل ٹھیک، صعیدی۔''

اس بار عبدہ ضبط نہ کر سکا اور جھپٹ کر اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر ایک بچے کی طرح اٹھا لیا، ہر چند کہ وہ ہنس ہنس کر احتجاج کرتا رہا اور ترغیب انگیز چیخیں مارتا رہا، لا کر بستر پر ڈال دیا، اس کا پاجامہ اتار دیا، اور خود کو اس پر ڈال دیا۔ اس نے بڑی تندی کے ساتھ اس سے جفتی کی، اسے اس طرح بھنبھوڑ ڈالا جیسے پہلے کبھی نہیں کیا تھا، حتیٰ کہ حاتم فرطِ لذت و تکلیف سے کئی بار بڑے زور سے چلّا اٹھا۔ ایک گھنٹے سے کم میں اس نے حاتم کے بدن میں اپنی شہوت کو تین بار آسودہ کیا، ایک لفظ کہے بغیر، جیسے خلاصی پانے کے لیے کسی گرانبار کام کو بڑے جوش سے ادا کر رہا ہو۔ جب وہ فارغ ہوئے، حاتم پیٹ کے بل ننگا ہی پھیل گیا اور نشے کی سرمستی میں آنکھیں موند لیں، کسی نشے میں دھت یا سوئے ہوئے آدمی کی طرح، جو اس شاندار اور لذیذ خواب سے کبھی بیدار نہ ہونا چاہتا ہو۔ اس درمیان میں عبدہ پڑے پڑے چھت کو گھورتا رہا اور بغیر کچھ کہے دو سگریٹ پھونک ڈالے۔ پھر اس نے جست لگائی اور اپنے کپڑے پہننے لگا۔ حاتم یہ محسوس کر کے کہ وہ کیا کر رہا ہے، فوراً اٹھ کر بستر میں بیٹھ گیا اور تشویش سے پوچھا، ''کہاں جا رہے ہو؟''

''بس، اب جا رہا ہوں۔''

عبدہ نے یہ بڑی لاتعلقی سے کہا، جیسے معاملہ ختم ہو گیا ہو۔ حاتم بستر سے نکلا، آ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور بولا، ''آج رات یہیں رہو، صبح چلے جانا۔''

''میں اب اور ایک منٹ نہیں رکوں گا۔''

حاتم نے اپنے ننگے جسم سے اسے بھینچ لیا اور سرگوشی کی، ''رات بھر کے لیے ٹھہر جاؤ، میری خاطر۔''

یکبارگی عبدہ نے اسے اتنے زور سے دھکا دیا کہ حاتم بستر کے پاس والی کرسی پر جا پڑا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا اور اس نے طیش میں آ کر کہا، ''پاگل ہو گئے ہو؟ تمھاری یہ مجال کہ مجھے دھکا دو!''

Scanned with CamScanner

عبدہ نے سرکشی سے جواب دیا، ''بس وقت آ گیا۔ تم اپنے، ہم اپنے رستے!''

عبدہ کے بے ٹوک جملے سے، جس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنے منصوبے میں ناکامیاب رہا ہے، حاتم طیش میں آ گیا۔ اور بولا، ''ہم نے معاہدہ کیا تھا کہ تم رات ساتھ گزارو گے۔''

''جو معاہدہ کیا تھا، وہ پورا کر دیا ہے۔ مجھ پر اب تمھارا کچھ نہیں نکلتا۔''

''تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟''

عبدہ نے جواب نہیں دیا اور خاموشی سے کپڑے پہنتا رہا، جس پر حاتم اور بھی زیادہ طیش میں آ کر بولے گیا، ''مجھے جواب دو! تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟''

''ایک انسان، تمھاری طرح۔''

''تم صرف ایک جاہل، برہنہ پا صعیدی ہو۔ میں نے تمھیں سڑک سے اٹھا کر صاف ستھرا کیا اور انسان بنایا۔''

عبدہ نے اس کی طرف آہستہ سے قدم اٹھایا، دیر تک اسے اپنی شراب سے سرخ آنکھوں سے دیکھتا رہا، پھر دھمکی آمیز لہجے میں کہا، ''دیکھو، مجھ سے بدتمیزی نہ کر بیٹھنا۔ سمجھے؟''

لیکن حاتم کا اپنے پر قابو جاتا رہا تھا، گویا کوئی شیطانی لعنت اسے چھو گئی ہو اور انتہا کی طرف دھکیل رہی ہو۔ اس نے استہزائی نظروں سے عبدہ کو دیکھا اور کہا، ''عبدہ، کیا دماغ الٹ گیا ہے؟ صرف ایک ٹیلیفون کر کے تمھیں جہنم پہنچا سکتا ہوں۔''

''تمھاری مجال نہیں۔''

''ہے یا نہیں، ابھی بتاتا ہوں۔ اگر تم یہاں سے گئے تو میں پولیس کو بلا کر کہتا ہوں کہ تم نے میرے ہاں چوری کی ہے۔''

عبدہ جواب دینے کو ہوا لیکن پھر سر ہلا کر رخصت ہونے کے لیے دروازے کی جانب بڑھا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ قوی تر ہے، اور حاتم اپنی دھمکی پر عمل نہیں کر سکتا۔ اس نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن حاتم نے اس کا جلباب پکڑ لیا اور چلّایا، ''تم نہیں جا رہے!''

''مجھے چھوڑو۔ میں خبردار کر رہا ہوں!''

''جب میں کہوں کہ ٹھہرو، تو اس کا مطلب ہے، ٹھہرو!''

Scanned with CamScanner

یہ الفاظ چلا کر کہتے وقت حاتم پیچھے سے اس کے جلباب کی گردن مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ عبدہ مڑا، آسانی سے اپنا ہاتھ کھینچا اور بڑے زور اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔ حاتم نے ایک لمحہ اسے گھور کر دیکھا، اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں، جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ پھر اس نے چلا کر کہا: ''تو اپنے آقا پر ہاتھ اٹھاتا ہے، نوکر، کتے کے بچے؟ تیری ماں کی جان کی قسم، نہ تجھے نوکری ملے گی نہ پیسہ! سب سے پہلے بینک فون کر کے چیک رکواتا ہوں۔ تو اسے ابال کر پیتا رہ۔''

عبدہ کچھ دیر کمرے کے وسط میں کھڑا رہا حتیٰ کہ معاملہ اس کے ذہن میں سلجھا۔ پھر اس نے کسی غصے میں آئے ہوئے جنگلی جانور کی سی بھیانک چیخ ماری اور حاتم پر جھپٹ پڑا اور ہاتھ پیروں سے اس کی تواضع کر ڈالی۔ اس کا سر دبوچ کر پوری قوت سے دیوار سے مارنے لگا — حتیٰ کہ اسے گرم چپچپاتا ہوا خون اپنے ہاتھوں پر چھلکتا ہوا محسوس ہوا۔

بعد میں، ہمسایوں نے پولیس کی رپورٹ میں بتایا کہ صبح چار بجے کے لگ بھگ انھیں حاتم کے اپارٹمنٹ سے چیخ پکار کی آوازیں آتی سنائی دی تھیں، لیکن اس لیے کوئی مداخلت نہیں کی کہ انھیں حاتم کی مخصوص نجی زندگی کا علم تھا۔

❁

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ''اسے چاہیے کہ اللہ کی راہ میں لڑے، ان لوگوں سے جو دنیا کی زندگی کو خریدے ہوئے ہیں آخرت کے عوض میں، اور جو کوئی اللہ کی راہ میں لڑتا ہے تو مارا جائے یا جیت جائے (بہر صورت) ہم اس کو عنقریب اجرِ عظیم دیں گے۔ اور تمھیں کیا (عذر) ہے کہ تم جنگ نہیں کرتے ہو اللہ کی راہ میں اور ان لوگوں کے لیے جو کمزور ہیں مردوں میں سے اور عورتوں اور لڑکوں (میں سے) جو یہ کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار، ہم کو اس بستی سے باہر نکال جس کے باشندے (سخت) ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنی قدرت سے کوئی دوست پیدا کر دے، اور ہمارے لیے اپنی قدرت سے کوئی حمایتی کھڑا کر دے۔''

شیخ بلال نے بڑی خوش آہنگ اور شیریں آواز میں سورۃ النساء سے یہ آیات پڑھیں جس سے اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان پر ہیبت طاری ہو گئی اور انھوں نے اس کے پیچھے پیچھے اطاعت گذاری سے 'دعائے قنوت' دہرائی۔ فجر کی نماز ختم ہوئی اور شیخ بلال بیٹھے بیٹھے تسبیح پڑھنے لگا۔ اس دوران برادران ایک ایک کر کے اس کے پاس محبت اور احترام کے ساتھ

Scanned with CamScanner

ہاتھ ملانے آتے رہے۔ جب طٰہٰ الشاذلی اس پر آ کر جھکا تو شیخ بلال نے اسے نرمی سے اپنی طرف کھینچا اور سرگوشی کی، ''میں دفتر میں تمھارا انتظار کروں گا۔ تم چلو، میں بس ابھی آتا ہوں، انشاءاللہ۔''

طٰہٰ دفتر کی طرف چل دیا، اپنے آپ سے پوچھتے ہوئے: بھلا شیخ کیا چاہتا ہوگا؟ ایسا تو نہیں کہ اس نے شیخ کی بابت جو کہا تھا وہ رضویٰ نے اسے بتا دیا ہے؟ وہ ہمیشہ کہتی ہے کہ وہ شیخ بلال کو اپنے والد کی طرح چاہتی ہے، لیکن کیا وہ اسے اتنا چاہتی ہے کہ جو کچھ اس کے شوہر نے اس کی بابت کہا ہو وہ جا کر اسے بتا دے؟ اگر اس نے ایسا ہی کیا ہے تو اسے اپنے شوہر کو سخت حساب دینا ہوگا۔ وہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا، کیونکہ بیوی کو اپنے شوہر کے رازوں کا امانتدار ہونا چاہیے۔ اگر شیخ نے پوچھا کہ اس نے رضویٰ سے یہ کہا تھا، تو وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ وہ اس کے سامنے وہی سب دہرا دے گا، پھر جو ہونا ہے، ہوتا رہے۔ شیخ اس کے ساتھ کیا کرے گا؟ زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ تربیت گاہ سے نکال دے گا۔ یوں ہی سہی۔ آخر اس کے یہاں رہنے کا مقصد ہی کیا ہے، کھائے، پیے، سوئے اور کچھ نہ کرے؟ اگر شیخ اسے جہاد پر جانے کی اجازت نہیں دیتا، تو یہی بہتر ہوگا کہ یہاں سے نکال دے، تاکہ وہ جہاں سے آیا ہے وہیں لوٹ جائے۔

طٰہٰ انھیں فکروں میں غلطاں تھا جب اس نے دفتر کے دروازے کو دھکیل کر کھولا اور احتیاط سے داخل ہوا۔ یہاں اسے دو برادر منتظر ملے۔ برادر ڈاکٹر مجوب، جو چالیس سے متجاوز ایک سلوتری تھا، اس رُوداد نسل میں سے جنھوں نے ستر کی دہائی میں الجماعۃ الاسلامیہ کی بنیاد رکھی تھی؛ اور فیوم کا رہنے والا برادر عبدالشافی، جو قاہرہ یونیورسٹی میں قانون کا طالب علم رہ چکا تھا، بعد ازاں کئی مرتبہ حراست میں رکھا گیا اور حفاظتی پولیس اس کے پیچھے لگی رہی، یہاں تک کہ اس نے اپنا پڑھنا پڑھانا چھوڑا اور تربیت گاہ میں رہنے چلا آیا۔ طٰہٰ نے دوستی کے ساتھ ان سے مصافحہ کیا اور تینوں بیٹھ کر عام سی باتیں کرنے لگے، گو اندرونی طور پر بھی تشویش اور دھڑکا محسوس کر رہے تھے۔ شیخ بلال آ پہنچا، ان سے ہاتھ ملائے، گرمجوشی سے گلے لگایا، اور چہرے پر مسکراہٹ لا کر ان سے بولا، ''جوانانِ اسلام، تمھارا دن آ پہنچا! جماعت کی مجلسِ شوریٰ نے ایک اہم کارروائی کے لیے تمھارا انتخاب کیا ہے۔''

خاموشی کا ایک لمحہ گزرا۔ پھر برادران نے زور سے ''اللہ اکبر!'' کا نعرہ لگایا اور خوشی کے مارے ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے لگے، جن میں طٰہٰ سب سے زیادہ خوش تھا اور خوب زور سے

Scanned with CamScanner

چلایا، ''الحمدللہ، اللہ اکبر!'' شیخ کی مسکراہٹ کشادہ ہوگئی اور بولا، ''ماشاءاللہ! خدا مبارک کرے اور تمھارے ایمان میں اضافہ فرمائے! اسی لیے دشمنانِ اسلام تمھارے خوف سے کانپتے ہیں، کیونکہ تمھیں موت اسی طرح عزیز ہے جس طرح انھیں زندگی!''

پھر اس کے چہرے پر گمبھیرتا لوٹ آئی اور وہ ڈیسک کے پاس آ کر بیٹھ گیا، کاغذ کا ایک بڑا ورق اپنے سامنے پھیلایا، اور اپنے جلباب کی جیب میں قلم کھوجتے ہوئے بولا، ''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کارروائی کو آج ایک بجے عمل میں لانا ہے، ورنہ پھر کم از کم ایک ماہ انتظار کرنا ہوگا۔ بیٹھ جاؤ، لڑکو، اور پوری توجہ سے سنو۔''

❁

دو گھنٹے بعد کھانا پکانے کی گیس کے سلنڈروں سے اوپر تک بھرا، بار برداری کا ایک چھوٹا سا ٹرک اہرام کے قریب فیصل کے علاقے کی طرف جا رہا تھا۔ ڈاکٹر مجوب ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا تھا اور اس کی بغل میں طٰہٰ الشاذلی۔ برادر عبدالشافی نے ٹرک کے پچھلے حصے میں سلنڈروں کے بیچ میں اپنی جگہ سنبھال رکھی تھی۔ انھوں نے اپنی ڈاڑھیاں مونڈ ڈالی تھیں اور گیس کے تقسیم کاروں والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کارروائی سے کم از کم گھنٹہ بھر پہلے جگہ کا بصری معائنہ کر لیں، پھر سڑک پر بالکل عام انداز میں رہیں، یہاں تک کہ قومی محافظتی افسر اپنے گھر کے باہر نکلے۔ عمارت کے دروازے سے نکلنے اور کار تک پہنچنے کے درمیانی عرصے میں ان پر لازم تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، اسے روکے رکھیں، پھر تین خود کار بندوقیں چلا دیں جو ڈرائیور کی سیٹ کے نیچے مخفی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی انھیں چند کڑی ہدایتیں کی گئی تھیں: اگر کارروائی سے پہلے افسر اپنی کار میں داخل ہو جائے تو وہ اپنے ٹرک سے رکاوٹ کھڑی کریں، پھر اپنے سارے کے سارے دستی بم ایک ساتھ اس پر ماریں، ٹرک چھوڑ کر ہر ایک مختلف سمت میں ہوا میں گولیاں چلاتا ہوا بھاگ کھڑا ہو، تاکہ کوئی پیچھا نہ کر سکے۔ اگر انھیں گمان ہو کہ ان پر نظر رکھی جا رہی ہے تو (امیرِ جماعت کی حیثیت سے) ڈاکٹر مجوب کو کارروائی کو فوراً منسوخ کرنے کا حق حاصل ہے؛ اس صورت میں انھیں چاہیے کہ ٹرک کو کسی گلی میں چھوڑ کر الگ الگ عوامی سواری سے تربیت گاہ لوٹ آئیں۔

فیصل کے علاقے میں داخل ہوتے ہی ٹرک کی رفتار کم ہو گئی اور بھائی عبدالشافی نے اپنے اوزار سے سلنڈر بجانے شروع کر دیے تاکہ علاقے کے ساکنوں کو ان کی آمد کا علم ہو جائے۔ چند

عورتیں اپنی بالکنیوں اور کھڑکیوں میں آئیں اور ٹرک کو آواز دی۔ ٹرک کئی بار رکا۔ عبدالشافی سلنڈر اٹھا کر رہنے والے کو دے آتا، پیسے لیتا، اور خالی سلنڈر لیے ٹرک میں لوٹ آتا۔ یہ سب شیخ بلال کی ہدایات تھیں۔ اسے فکر تھی کہ انھیں اچھی آڑ مہیا ہو جائے۔ ٹرک شارع عاکف پر پہنچا، جہاں افسر کی رہائش گاہ تھی، اور ایک عورت نے اپنی بالکنی سے پکار کر ایک سلنڈر کے لیے کہا۔ عبدالشافی ایک سلنڈر اٹھا کر اس کے پاس لے گیا۔ اس سے مجوب اور طٰہٰ کو خوب اطمینان سے جگہ کا معائنہ کرنے کا موقع مل گیا۔ افسر کی کار، جو نیلے رنگ کی انیس سو ستر کی دہائی کے آخر کی مرسیڈیز تھی، عمارت کے سامنے تیار کھڑی تھی۔ مجوب نے ہوشیاری سے فاصلے، آس پاس کی دکانوں، اور باہر آنے جانے کے راستوں کا جائزہ لیا۔ جب عبدالشافی واپس ہوا تو ٹرک وہاں سے دور چلا گیا۔ ڈاکٹر مجوب نے گھڑی دیکھی اور کہا، ''پورا گھنٹہ پڑا ہے۔ چائے پینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

اس نے یہ شگفتہ لہجے میں کہا، جیسے ان کے دل میں اطمینان پیدا کرنا چاہتا ہو۔ پاس کی گلی میں ٹرک ایک چھوٹے سے چائے خانے کے سامنے آکر رک گیا۔ تینوں بیٹھ گئے اور پودینے کی چائے پینے لگے۔ اپنے سراپے میں یہ بالکل عام لوگ نظر آرہے تھے، جس سے کسی قسم کے شک شبہے کے ابھرنے کا امکان نہیں تھا۔ مجوب نے گلاس سے سنائی دینے والی چائے کی چسکی لی اور کہا، ''الحمدللہ، سب بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔''

طٰہٰ اور عبدالشافی نے دبی آواز میں جواباً کہا، ''الحمدللہ۔''

''معلوم ہے، جماعت کے برادران پورے ایک سال سے ہدف کا مشاہدہ کر رہے ہیں؟''

''پورے ایک سال سے؟'' طٰہٰ نے پوچھا۔

''قسمیہ، پورا ایک سال۔ چھان بین بے حد دشوار ہے کیونکہ محافظتی ادارے کے بڑے بڑے افسر مبالغے کی حد تک خود کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ مختلف نام استعمال کرتے ہیں، ایک سے زیادہ جگہوں پر قیام کرتے ہیں، اور کبھی اپنے گھر والوں سمیت ایک فرنشڈ اپارٹمنٹ سے دوسرے میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ساری باتیں ان کی ٹوہ لگانا تقریباً ناممکن بنا دیتی ہیں۔''

''افسر کا نام کیا ہے، برادر مجوب؟''

''یہ ضروری ہے کہ تمھیں اس کا علم نہ ہو۔''

Scanned with CamScanner

''جانتا ہوں کہ یہ ممنوع ہے لیکن پھر بھی جاننا چاہتا ہوں۔''

''اس کا نام جاننے سے تمھیں کیا فرق پڑے گا؟''

طٰہ خاموش ہو گیا، پھر لمحہ بھر مجوب کو دیکھ کر ناگواری سے بولا،''برادر مجوب، ہم نے جہاد خالی خولی نہیں شروع کیا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ خدا ہمیں شہادت سے سرفراز کرے اور ہماری روحیں مل کر اپنے خالق کی طرف بلند ہو جائیں۔ تو کیا تم مجھ پر تھوڑا سا بھی بھروسا نہیں کر سکتے، خاص طور پر جب ہم موت کے کنارے کھڑے ہیں؟''

طٰہ کی بات نے مجوب پر اثر کیا، جو اسے بہت پسند کرتا تھا، اور اس نے مدھم آواز میں کہا، ''صالح رشوان۔''

''کرنل صالح رشوان؟''

''مجرم، کافر، قصاب! وہ اپنی نگرانی میں اسلامیوں کی ایذا دہی کے نظارے سے مزے لیتا تھا۔ حراست میں لیے گئے بہت سے برادران کو موت کے گھاٹ اتارنے کی ذمے داری براہ راست اسی پر آتی ہے، بلکہ اس نے خود اپنے ریوالور سے اسلام کے دو بہترین جوانوں کو مار ڈالا تھا۔ امیرِ قیوم برادر حسن الشرباصی، اور جماعت کے ترجمان ڈاکٹر محمد رافع کو۔ وہ 'العقرب' کے جیل خانے میں روکے ہوئے برادران کے سامنے انھیں قتل کرنے کی ڈینگیں مارتا تھا۔ خدا ہمارے معصوم شہدا پر اپنی رحمت کرے، اپنی کشادہ جنت میں انھیں جگہ دے، اور ہمیں بخیریت ان سے ملا دے، انشاء اللہ!''

ایک بجنے میں پانچ منٹ پہلے گیس کا ٹرک عمارت کے داخلے کے سامنے سڑک کی دوسری جانب آ کر ٹھہر گیا۔ عبدالشافی اتر کر ڈرائیور کی کیبن کے پاس آیا، جیب سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکالی، اور یہ ظاہر کیا جیسے ڈرائیور مجوب کے ساتھ حساب کتاب پر نظر ڈال رہا ہے۔ دونوں قابلِ سماعت آواز میں فروخت شدہ سلنڈروں کی تعداد کی بابت بحث میں منہمک ہو گئے اور بالکل فطری نظر آئے۔ طٰہ دروازے کا قبضہ پکڑ کر بالکل تیار ہو گیا۔ اسے عمارت میں داخلے کا دروازہ اپنے سامنے بالکل صاف نظر آ رہا تھا اور اسے اپنا دل اس تیزی سے دھڑ دھڑاتا محسوس ہوا جیسے پھٹ پڑے گا۔ اس نے اپنے ذہن کو ایک واحد نقطے پر مرتکز کرنے کی سخت کوشش کی، لیکن چشمِ تصور میں پیکروں کا پر شور آبشار گزر گیا۔ ایک منٹ کے گزران میں اسے اپنی زندگی کا ایک ایک منظر دکھائی دیا — عمارتِ

Scanned with CamScanner

یعقوبیان کی چھت پر اپنا کمرہ، اپنے بچپن کی یادیں، اپنے نیک طبیعت ماں باپ، اپنی پرانی حبیبہ بثینہ السید، اپنی بیوی رضوئ، پولیس اکیڈمی کا قائد جرنیل جس نے اسے اپنے باپ کے پیشے کا طعنہ دیا تھا، قید خانے کے وہ سپاہی جنھوں نے اسے زدوکوب کیا تھا اور اس کے جسم کی آبروریزی کی تھی۔ وہ یہ جاننے کی آرزو میں جلا جارہا تھا کہ آیا یہ وہی افسر ہے جس نے حراست کے دوران اپنی نگرانی میں اس کی ایذادہی کروائی تھی، لیکن اس نے اس خیال سے مجوب سے اپنی آرزو کا ذکر نہیں کیا تھا کہ مبادا اسے گھبراہٹ محسوس ہو اور وہ اسے کارروائی سے خارج کر دے۔ طٰہٰ عمارت کے دروازے کو تکتا رہا، یادیں اس کے سامنے تیزی سے گزرتی رہیں، اور پھر افسر ظاہر ہوا۔ وہ بالکل ویسا ہی نظر آرہا تھا جیسا انھوں نے اس کا نقشہ کھینچا تھا: بھاری بھرکم، صاف رنگ، نیند اور گرم غسل کے آثار ہنوز چہرے پر موجود، سکون اور اعتماد سے قدم اٹھاتا ہوا، منھ کے گوشے سے سگریٹ لٹکی ہوئی۔

طٰہٰ نے تیزی سے ٹرک کا دروازہ کھولا، اتر کر سڑک پر آیا، اور اس کی طرف چل دیا۔ جس طرح بھی ہو، اسے روکے رکھنے کی ذمے داری اس کے سپرد کی گئی تھی، تاکہ دوسرے برادران اس پر گولیاں چلاسکیں۔ جس کے بعد اسے کود کر ٹرک پر چڑھنا اور دستی بم چھوڑنا تھا تاکہ اس کی آڑ میں وہ فرار ہو جائیں۔ طٰہٰ افسر کے قریب آیا اور اپنی آواز کو بالکل فطری بنا کر پوچھا، ''جناب، مہربانی کر کے بتائیں کہ شارعِ عاکف پر دس نمبر کس طرف ہوگا؟''

افسر نے بنار کے رعونت سے اشارہ کیا اور بڑبڑایا، ''اس طرف،'' اور کار کی طرف بڑھ گیا۔

یہ وہی تھا۔ وہی جس نے اپنی نگرانی میں اسے ایذا پہنچوائی تھی، جس نے کتنی بار سپاہیوں سے اسے زدوکوب کرنے اور اپنے چابکوں سے اس کی کھال ادھیڑ دینے اور ڈنڈا اس کے جسم میں داخل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یہ وہی تھا: وہی بھرّائی ہوئی آواز، وہی لاابالی لہجہ، اور تمباکو نوشی کی عادت کی وجہ سے وہی خفیف سی کھکھار۔ طٰہٰ کا شعور رخصت ہو گیا اور وہ اس کی طرف جھپٹا اور منھ سے ایک مبہم، بڑی گونج دار چیخ بلند کی جو کسی غضبناک دھاڑ جیسی تھی۔ افسر نے خوفزدہ آنکھوں سے مڑ کر اسے دیکھا۔ ہیبت کے مارے اس کا چہرہ سکڑ گیا جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے اپنا منھ کھولا لیکن کچھ کہہ نہ سکا، کیونکہ پے بہ پے خودکار بندوقیں چلنے کی آوازیں پھٹ پڑیں، سب کی سب گولیاں افسر کے جسم کو لگیں اور وہ زمین پر ڈھیر ہو

Scanned with CamScanner

گیا۔ اس کے جسم سے خون ابلنے لگا۔ طٰہٰ نے منصوبے کی خلاف ورزی کی اور وہیں اپنی جگہ کھڑا رہا تاکہ افسر کو مرتا ہوا دیکھے؛ پھر اس نے نعرہ لگایا، ''اللہ اکبر! اللہ اکبر!'' اور ٹرک تک پہنچنے کے لیے لپکا۔ لیکن ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ پہلی منزل پر شیشوں کے بڑی شدت سے ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دیں اور دو آدمی ظاہر ہوئے اور ٹرک کی سمت میں گولیاں چلانے لگے۔

طٰہٰ سمجھ گیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ سر نیچا کر کے کج مج دوڑنے لگا، جیسا کہ اسے مشق کرائی گئی تھی، تاکہ گولیوں کو جل دے سکے۔ وہ ٹرک کے قریب آتا جا رہا تھا، گولیاں اس کے ہر طرف بارش کی طرح برس رہی تھیں، لیکن جب وہ ٹرک سے کوئی دو میٹر کے فاصلے پر تھا، اسے اچانک اپنے کندھے اور سینے میں خنکی کا احساس ہوا، خنکی جو برف کی سی ٹیسیں پیدا کر رہی تھی اور جس نے اسے لاعلمی میں آلیا تھا۔ اس نے اپنے جسم پر نظر ڈالی تو اسے فوارے کی طرح ابلتے ہوئے خون سے لت پت پایا۔ خنکی شدید درد میں بدل گئی، درد جس نے اپنے دانت اس کے وجود میں گڑو دیے۔ وہ ٹرک کے پچھلے پہیے کے پاس زمین پر گر پڑا اور شدتِ درد سے چلانے لگا۔ پھر اسے لگا کہ وہ خوفناک درد آہستہ آہستہ زائل ہوتا جا رہا ہے اور ایک عجیب سی، چھا جانے والی راحت محسوس ہوئی جو اسے اپنی آغوش میں سمیٹے لے رہی ہے۔ اسے کانوں میں دور سے ملی جلی آوازیں آتی سنائی دیں: جیسے گھنٹیاں نغمگی سے بج رہی ہوں، خوش الحانی سے کچھ پڑھا جا رہا ہو، سریلی گنگناہٹیں۔ یہ خود کو دہراتی ہوئی اس کے پاس آنے لگیں، جیسے اسے ایک نئی دنیا میں خوش آمدید کہہ رہی ہوں۔

❋

عصر کے وقت سے 'میکسم' تہہ و بالا ہو کر رہ گیا ہے۔

ریستوران کے اپنے کارندوں کے علاوہ دس دوسرے کام کرنے والوں کو مدد کے لیے بلایا گیا ہے، اور ان میں سے ہر ایک فرش، دیواروں اور غسلخانے کو صابن، پانی، اور جراثیم کش مادے سے صاف کرنے میں منہمک ہے۔ پھر انھوں نے میزوں، کرسیوں کو کمرے کے دو طرفہ منتقل کر دیا تاکہ داخلے سے بار تک ایک راہداری سی بن جائے اور بیچ میں ایک چوڑی سی جگہ نکل آئے جو رقص کرنے کے فرش کے طور پر کام آسکے۔ وہ کرستین کی نگرانی میں انتھک کام کرتے رہے۔ وہ ورزشی مشقوں والا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے تھی اور خود بھی چیزیں ہٹانے میں ان کی مدد کر رہی تھی (جو پورے عزم سے کام

کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کرنے کا اس کا انداز تھا)، اور گاہے گاہے ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس کی آواز بلند ہوتی، جس میں وہ ہر کسی کے لیے مونث کا صیغہ استعمال کرتی، اور کہتی، ''یہ سب یہاں سے ہٹا کر وہاں رکھو! اچھی طرح صاف کرو! کیا بات ہے؟ تم تھکی ہوئی ہو یا کیا؟''

سات بجے جگہ خوب چمکنے دمکنے لگی تھی۔ میزوں پر سفید براق میز پوش، جو خاص طور پر موقعے کی مناسبت سے نکالے گئے تھے۔ پھر پھولوں کی ٹوکریاں آئیں، اور کرستین نے خود اپنی نگرانی میں انھیں سجوایا، چھوٹے گلدستوں کو کھلوا کر پھولوں کو گلدانوں میں لگوایا، بڑی ٹوکریوں کو باہر داخلے کے پاس اور پوری راہداری میں رکھنے کو کہا۔ اس کے بعد اس نے اپنی ڈیسک کی دراز سے ایک نفیس پرانی تختی نکالی جس پر فرانسیسی اور عربی میں لکھا تھا ''آج رات ریستوران ایک نجی محفل کے لیے مخصوص ہے'' اور اسے بیرونی دروازے پر لٹکا دیا۔ سر اندر کر کے ایک آخری نگاہ ڈالی اور ریستوران کی چھب ڈھب سے مطمئن ہو کر کپڑے تبدیل کرنے کے لیے سرعت سے اپنے گھر بھاگی جو پاس ہی تھا۔

گھنٹہ بھر بعد جب وہ لوٹی — دیدہ زیب نیلے رنگ کا لباس پہنے ہوئے، مہارت سے دھیما دھیما میک اَپ کیے ہوئے، پچاس کی دہائی کے انداز میں بال کا جوڑا، بطرزِ 'شینیوں' [chinon] اوپر کی طرف باندھے ہوئے — تب تک موسیقاروں کی جماعت آ چکی تھی اور اس کے اراکین اپنے اپنے سازوں کے سُر ملا رہے تھے: مزمار، سیکسوفون، وائلن، اور تال دینے کے ساز۔ اور ان سب کا باہم متصادم آہنگ موسیقی کے کسی جناتی وجود کے ہمہمے کی طرح بلند ہو رہا تھا۔

مدعوئین آنے شروع ہو گئے تھے۔ چند عمر رسیدہ لوگ آئے، جوزکی الدسوقی کے احباب میں سے تھے اور ان میں سے کئی سے کرستین واقف تھی، اس نے سب سے ہاتھ ملائے، انھیں بار پر مدعو کیا جہاں وِسکی اور بیئر بلا قیمت پیش کی جا رہی تھی۔ مہمانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ بثینہ کے تجارتی کالج کے زمانے کے دوست اپنے گھر والوں کے ساتھ آئے۔ ڈرائیور علی آیا (اور دھکم پیل کرتے ہوئے سیدھے بار کا رخ کیا)، اور دھوبی صابر، اپنے بیوی بچوں سمیت، نیز بہت سے دوسرے چھت والے۔ عورتیں چمکتے ہوئے سنہری تارکشی والے، سلمہ ستارہ ٹکے گاؤن پہنے تھیں۔ شادی کی عمر والی لڑکیاں خوب بن ٹھن کے اپنے زیباترین لباسوں میں آئیں، خود اپنے حق میں موقعے سے فائدہ اٹھانے کے خیال سے۔ چھت کے مکین ریستوران کے ٹھاٹ باٹ اور اس کے پرانے دور کے یورپی

Scanned with CamScanner

انداز سے سخت رعب میں آ گئے تھے، لیکن رفتہ رفتہ عورتیں اِدھر اُدھر گوشوں میں اپنی تفریحی گفتگو سے اس رعب کو توڑنے میں کامیاب ہوگئیں اور بلند قہقہے لگانے لگیں جو سب موقعے کی مناسبت کے برعکس عریانی سے زیادہ قریب تھے۔

نو بجے کے قریب دروازہ کھلا اور چند لوگ تیزی سے اندر داخل ہوئے، ان کے پیچھے پیچھے زکی الدسوقی آرام آرام سے چلا آ رہا تھا۔ اس نے بڑا نفیس سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا، سفید قمیص، گردن کے گرد ایک بڑی، سرخ بو ٹائی بندھی تھی، اور اس کے رنگے ہوئے بال ایک بالکل نئی طرز پر پیچھے کی طرف کڑھے ہوئے تھے، جو اس کے بال بنانے والے نے تجویز کی تھی اور جو اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی، یعنی وہ اپنی اصلی عمر سے دس سال چھوٹا لگ رہا تھا۔ اس کے قدم کچھ رک رک کر اٹھ رہے تھے اور آنکھیں سرخ تھیں، ڈبل وسکی کے دو جام چڑھانے کے نتیجے میں، جن سے اس نے شام کی ابتدا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے داخل ہونے کی دیر تھی کہ ہر طرف سے ''مبارکباد! ہزار بار مبارکباد!'' کی آوازیں، سیٹیاں اور تالیاں بلند ہونے لگیں، اور ان کے بیچ میں کہیں کہیں چند ہچکچاتی ہوئی لع لع کی چیخیں بھی۔ جب سب لوگ اس سے ہاتھ ملا رہے تھے اور اپنی تہنیت پیش کر رہے تھے، کرسٹین لیک کر اس کے پاس آئی، بغلگیر ہوئی، اور اسے اپنے گرمجوش انداز میں بوسہ دیا۔

''تم بالکل فلم اسٹار نظر آ رہے ہو!'' اس نے بڑے جذباتی انداز میں بے ساختہ کہا، پھر ایک سرد آہ سی بھری، ایک لمحہ اسے دیکھا، اور بولی: ''میں تمھارے لیے کتنی خوش ہوں، زکی! تم نے اب وہ کیا ہے، جو تمھیں بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔''

یہ زکی بک الدسوقی کی بثینہ السید سے شادی کی محفل تھی۔ بثینہ کو بال سنوارنے والے کے یہاں سے آنے میں کچھ دیر لگی، کہ دیر لگانا دلہنوں کی عام ریت ہے، لیکن وہ جلد ہی وہاں پہنچ گئی، اپنے شادی کے سفید ملبوس میں جس کے لمبے فرشی دامن کے سرے اس کی بہنوں اور ننھے بھائی مصطفیٰ نے اٹھائے ہوئے تھے۔ دلہن کے رونما ہوتے ہی سب اس کے جلوے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور پابندیوں سے بے نیاز، لع لع کی چیخوں کا ایک مسلسل نغمہ ریز طوفان ابل پڑا۔ سارے حاضرین مسرور تھے، اور جیسے ہی موسیقاروں کی جماعت نے شادی کا نغمہ ختم کیا اور بوفے شروع ہوا، کرسٹین نے موقعے کے یورپی طرز کو بحال کرنے کی کوشش میں، پیانو بجاتے ہوئے، ایڈتھ پیاف

کے گیت ''گلاب رنگ زندگی'' کے بول اپنی سریلی آواز میں گانا شروع کردیے:

جب تم مجھے اپنی بانہوں میں بھر کے
مجھ سے سرگوشی کرتے ہو...
تو مجھے زندگی گلاب رنگ نظر آتی ہے
مجھ سے محبت کے بول کہتے ہو...
روزمرہ کے بول...
تو میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے...

دولھا دلہن سب سے الگ رقص کرنے لگے۔ بثینہ کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی اور تقریباً لڑکھڑا رہی تھی، لیکن پھر دولھا کی رہنمائی میں ٹھیک قدم اٹھانے لگی، جس نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے کچھ اس طرح اپنے سے لگا کر بھینچا کہ اس کی یہ حرکت سب کی نظر میں آگئی اور وہ قہقہے لگا کر فقرے چست کرنے لگے۔ زکی کو محسوس ہوا کہ شادی کے لباس میں بثینہ کوئی حیرت انگیز، پاک صاف نومولود کی طرح لگ رہی ہے، کہ اپنے ماضی کی ساری کثافتوں سے ہمیشہ کے لیے دامن جھٹک چکی ہے جن سے بلاقصور آلودہ ہوگئی تھی۔ جب گانا ختم ہوا تو کرستین نے خوش اطواری سے مزید فرانسیسی نغمے تجویز کیے لیکن بے سود۔ لوگوں کا مطالبہ اتنا شدید تھا کہ آخر میں اس کی رعایت کرنی ضروری تھی۔ چنانچہ موسیقاروں نے رقص کی مشرقی دھنیں بجانی شروع کردیں۔ یہ ایک طلسمی لمحہ تھا، کیونکہ عورتیں اور جوان لڑکیاں یوں اچھلنے کودنے لگیں جیسے آخرکار انھوں نے خود کو پالیا ہو۔ وہ تالیاں بجا رہی تھیں، گا رہی تھیں، اور موسیقی کے آہنگ پر جھوم رہی تھی اور کئیوں نے تو کولھوں پر پٹکے باندھ کر ناچنا بھی شروع کردیا تھا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ دلہن بھی یہی کرے۔ آخر میں اس نے سپر ڈال دی اور انھیں اپنے کولھوں پر پٹکا باندھنے دیا اور خود بھی ان کے ساتھ ناچنے لگی۔ اس اثنا میں زکی الدسوقی اسے محبت اور حیرت سے تکا کیا، اور آہنگ کے ساتھ ساتھ تالیاں بجاتا رہا۔ پھر، دھیرے دھیرے اپنے بازو اٹھا کر، حاضرین کے پرمسرت قہقہوں کے درمیان وہ بھی اس کے ساتھ رقص میں شامل ہوگیا۔

❁❁

آج کی کتابیں

کراچی کی کہانی
(جلد اول و دوم)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.1100

ریت پر لکیریں
(انتخاب)
محمد خالد اختر
Rs.300

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

انیس
(سوانح)
نیر مسعود
Rs.375

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.150

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

لغاتِ روزمرہ
(تنقید و تحقیق)
شمس الرحمن فاروقی
Rs.250

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.280

کافکا کے افسانے
(افسانے)
نیر مسعود
Rs.70

Scanned with CamScanner

خالد طور

حصار شکن

1

لق ودق صحرا میں بہت سے نخلستان بھی تھے، جن کے اطراف کھجوروں کے پیڑ تھے اور درمیان میں پانی کے مدوّر تالاب، جن کے اُتھلے پانی میں کھجوروں کے لمبے پیڑوں کے عکس ایک دوسرے میں مدغم دکھائی دیتے تھے اور رات انھیں ایسی مخملیں چادروں میں بدل دیتی تھی جن پر ستارے ٹانکے گئے ہوں۔ چاندنی راتوں میں ان کے پانی کا رنگ سیاہی مائل نیلا ہو جاتا تھا، کبھی شام کے دھندلکوں میں آسمان کی وسعتوں جیسا، زندگی کے دلکش اظہار کی مانند اور کبھی زہرِ ہلاہل کی طرح، موت کا بھیانک روپ دھارتے ہوئے...

''کائنات کی وسعت لامحدود ہے،'' ان نخلستانوں سے گزرتے ہوئے میں نے کئی بار سوچا۔ ''آسمان سے آگے کیا ہوگا؟ شاید ایک اور کرۂ آسمان، ایک اور کرۂ کائنات، جس میں ایک سورج، سیارے، چاند، زمینیں، بہت سے ستارے، آتش، آب، ہوا اور خاک ہوگی، جہاں زندگی کے خوبصورت اظہار بھی ہوں گے اور موت کے بھیانک روپ بھی... اس آسمان سے آگے کیا ہوگا؟ شاید ایک اور آسمان، ایک اور کائنات، کیونکہ کائنات کی حقیقت یہی ہے کہ جس قدر آگے بڑھتے جائیں، کائنات کی وسعت اسی قدر بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ حد کہیں بھی نہیں ملتی۔ یہی فطرتِ کائنات ہے کہ وسعتِ فطرت وسعتِ کائنات کی طرح لامحدود ہے...'' میں چلتی رہی، آگے بڑھتی رہی۔ صحرائی ریت کے تودے اب چھوٹے سے ہوتے جا رہے تھے اور ان کا سلسلہ اب

Scanned with CamScanner

جھاڑیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آسمان پر چند پرندے انھیں جھاڑیوں کی طرف اڑتے جا رہے تھے۔ جھاڑیوں کا سلسلہ بھی دور تک جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں شام ہونے سے پہلے جھاڑیوں کے سلسلے سے گزر جانا چاہتی تھی۔ جھاڑیاں بل کھاتی پگڈنڈی کی طرح دائیں بائیں بلند ہوتی ہوئی، کسی مہیب جنگل کی سمت جا رہی تھیں۔ نگاہوں میں افق تک سطح زمین سے بلند ہوتا ہوا نباتاتی سلسلہ آسمان سے یوں مل رہا تھا جیسے کسی سمندر تک ڈیلٹا کی بے شمار ہلکی اور گہری سبز لکیریں اپنا اپنا بہاؤ دکھاتی ہوئی مل رہی ہوں اور جنھیں دیکھ کر زمستان کے ابتدائی تاثر سے بے رنگ فطرت میں بھی ایک لطیف رنگینی احساس تصور میں جھلکتی نظر آتی ہو۔ شاید میں بہت تھک چکی تھی۔ آسمان پر پرندوں کی ایک اور لیکن بڑی ڈار نظر آئی۔

''وسعت کا احساس پرندوں کو ہو جاتا ہے، لیکن گہراؤ کا احساس رینگنے والے حشرات الارض کو نہیں ہوتا۔''

آسمان صاف تھا، کہیں بادل کا ایک سفید پنبہ بھی دکھائی نہ دیا۔

''آسمان صاف ہو یا ابر آلود، فطرت کا انداز خود میں ایک، کبھی نہ ختم ہونے والی کشش کو دکھاتا رہتا ہے، جیسے بہت سے بہیمانہ خیالات میں جذبۂ ترحم اپنی انفرادیت برقرار رکھتا ہے۔ ریت کے ایک تودے سے اچھل کر دوسرے پر جانا دشوار نہیں ہوتا لیکن وجود بہر حال کسی ایک سے پیوست رہتا ہے۔ یہ احساس ناگزیر ہے کہ وجود اور ارضی پیوستگی، دونوں ہی اس لطیف انداز کو برقرار رکھتے ہیں جو ریت کے ایک تودے سے اچھل کر دوسرے تک جاتے ہوئے دونوں سے جدا ہونے والے وجود کو پل بھر ہی میں خود سے آشنا کر دیتا ہے۔ زمین گھوم کر آسمان تک جا سکتی ہے، آسمان چکر کھا کر زمین سے مل سکتا ہے... شاید سب کچھ ممکن ہے، کچھ بھی ناممکن نہیں۔''

میں جھاڑیوں کے درمیان پگڈنڈیوں میں سے ایک پر تیزی سے چل رہی تھی۔ سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ خار دار جھاڑیوں میں کچھ چڑیاں اپنے اپنے گھونسلوں کے آس پاس ٹہنیوں پر پھدک رہی تھیں۔ کچھ جھاڑیوں میں سرخ اور عنابی پھول بھی کھلے ہوئے تھے جن پر تتلیاں رقص کناں تھیں۔

''میں کہاں جا رہی ہوں، کیوں جا رہی ہوں؟''

چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں، اب بڑے جھاڑ جھنکاڑ میں بدل رہی تھیں، کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے

Scanned with CamScanner

پیڑ بھی نظر آنے لگے تھے۔

''سفر کی بے سبی خوبصورت شے ہے،'' اس جملے کو یاد کرتے ہوئے میں نے کتنی بار اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ کو بکھرتے محسوس کیا تھا۔ ''میں ا۔ ۔ ۔ پھر کہاں ملوں گی؟ وہ تو ایک ڈھانچہ تھا، لیکن میں نے اپنے تصور میں اسے کتنی ہی بار زندہ دیکھا ہے، ایک جوانِ رعنا، ایک فکر میں ڈوبا ہوا انسان۔'' میرے قدم اور تیز ہو گئے۔ ''تو کہاں ہے؟ تیری تلاش میں میں نے اپنی روح کے طویل و عریض صحراؤں میں مدتوں اپنے بدن کو جلایا ہے۔ تیری تلاش میں میں نے اپنی انا کے گنبد میں اسیر جذبات کی مانند خود کو محبوس ہوتے دیکھا ہے۔ تیری تلاش میں میں نے اپنی انا کے گنبد کو توڑ کر اپنی جبلتوں کو پہچانا اور ان سے اپنے اسیر جذبات کو رہائی دلائی ہے۔ میں نے تجھے زندگی کی طرح تلاش کیا ہے۔ تو کہاں ہے؟ تیرے لیے میں اب تک سنسنا رہی ہوں جیسے ببول کی شاخیں اور سوکھے پتے بادِ شمال سے سنسناتے ہیں۔ ۔ ۔ ہوائیں کہتی ہیں کہ بہار آئے گی، ببول کی شاخوں پر سبز پتے نکلیں گے، میں ببول کے کانٹوں کو اس فاختہ کی طرح بھول جاؤں گی جو دو شاخہ ٹہنی پر چند تنکوں سے آشیانہ بنا کر، اس میں بیٹھ کر، ایک لافانی کیفیت جمال میں خود سے بیگانی ہو جاتی ہے اور اس کی ہُو ہُو دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ ہوائیں کہتی ہیں کہ بہار آئے گی۔ ۔ ۔ بہار آئے گی! میں نہیں بھولی، ایک بار، صرف ایک بار، اے نیلے آسمان، اپنا رنگ بدل کر خود کو بھی دیکھ لے۔ میں نہیں بھولی۔ ستاروں سے ٹانکی ہوئی چادروں کو، فطرت کے حسین اظہار میں زندگی کے احساسِ جمال کو میں نہیں بھولی۔ زہرِ ہلاہل کی طرح موت کے ہولناک روپ کو، جو کبھی پل بھر کے لیے خوبصورت ہو جاتا ہے اور دوسرے ہی لمحے ایک مہیب چہرہ بن جاتا ہے، افعی اپنی کینچلی بدل کر یقیناً خوبصورت ہو جاتا ہے لیکن اس کی تھیلیوں میں سم قاتل موت کا بھیانک روپ دھار کر نہاں رہتا ہے، میں نہیں بھولی۔ ۔ ۔ شاید کبھی نہ بھول پاؤں گی۔''

جھاڑ جھنکاڑ سے آگے درخت تھے۔ شام کے ابتدائی سائے درختوں کے تنوں سے کھنچ کر لمبے ہوتے ہوئے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے۔

''میں کیونکر بھول سکتی ہوں کہ میں نے زندگی سے بھرپور کتنی کیفیات کو محسوس کیا ہے اور کتنے زہر کے پیالوں کو پیا ہے!''

Scanned with CamScanner

جنگل کی خنک ہوا میں تیزی نمودار ہوئی۔ ہر شام کی مانند، پرندے درختوں پر بسیرا کرنے سے پہلے شور مچا رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دن بھر کی تھکن کو ایک انبساط انگیز کیفیت سے مٹا دینا چاہتے ہوں۔ جنگل میں ایک کٹیا نظر آئی، جس کے اوپر دُود کش سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ جھونپڑی کے سامنے ایک فقیروں جیسا بوڑھا دکھائی دیا۔ میں کٹیا کے قریب پہنچی۔ بوڑھے کی کمر نہ تو خمیدہ تھی نہ سیدھی، اس کے کندھے آگے کی سمت جھکے ہوئے تھے۔ سفید بال، ماتھے پر زندگی کے گزرے ہوئے ماہ و سال کا حساب دیتی ہوئی شکنیں، لمبی، جھکی ہوئی ناک، پتلے ہونٹ، سفید رنگ جواب مٹیالا سا ہو چکا تھا، پھٹی ہوئی پوستین اور بوسیدہ سا شلوکا پہنے ہوئے۔ اس نے سر گھما کر، سفید ابروؤں کے نیچے بھنچی بھنچی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ کٹیا کی سمت بڑھا اور مجھے بھی کٹیا کے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کٹیا میں جنگلی درختوں کی سوکھی ہوئی ٹہنیاں پتوں سمیت ایک مٹی سے لپے ہوئے آتشدان میں سلگ رہی تھیں، جن سے اٹھتا ہوا دھواں دود کش سے اوپر کٹیا کی مٹی سے ہی لپی چھت کی سمت کھنچ رہا تھا۔ کٹیا کی چھت میں شاید کوئی ترچھا سوراخ تھا۔ دھوئیں کو دود کش کھینچ کر ہر رات آسمان کی مخملیں ستاروں سے ٹانکی ہوئی چھت کی سمت اٹھا دیتا ہوگا تاکہ خس و خاشاک سے بنی یہ کٹیا آلودہ نہ ہو۔

''آؤ! آؤ!'' بوڑھے نے کہا۔ ''لیکن میرے لیے خوشی کو لاؤ... میں بہت غمزدہ ہوں۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' بوڑھے نے آتشدان میں سوکھے پتوں سمیت ایک خشک ٹہنی پھینکی۔ ''میں نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے جاننے کی خواہش ہے کہ تم کون ہو... لیکن آئی ہو تو میرے لیے خوشی کو لاؤ۔ میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔ میں یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ تم اس بے مثال حسن کے ساتھ تنہا کس کی تلاش میں یہاں آئی ہو۔'' بوڑھا رکا، اس نے میری سمت پھر آنکھیں بھینچ کر دیکھا۔ پہلی بار میری نگاہیں اس کی سفید ڈاڑھی پر گئیں۔ رخساروں پر جہاں ڈاڑھی کے بال ختم ہوتے تھے، وہاں گہرے گڑھے سے نمایاں تھے جن پر ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کی بھنویں بھی سفید تھیں۔ ''شاید...'' بوڑھے نے آتشدان میں ایک خشک ٹہنی پھینکتے ہوئے کہا، ''شاید تمھیں اُسی کی تلاش ہے... لیکن وہ آج صبح مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ عجیب حال تھا اس کا... وحشت زدہ چہرہ، پھٹی پھٹی آنکھیں، متوحش انداز

گفتگو۔بس چیخے جا رہا تھا کہ میں بے قصور ہوں، میرا کوئی جرم نہیں ہے، وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے... وہ مجھے پکڑنے کے لیے قلعے سے نکل چکے ہوں گے... میرا اشہب[1] بھاگ گیا تھا۔وہ سیدھا دراب[2] پر گیا ہوگا۔اسے دیکھ کر کسی نے عسس[3] کو خبر دے دی ہوگی۔ مجھے بچاؤ، وہ بہت ظالم ہیں... اگر انھوں نے مجھے گرفتار کرلیا تو مجھے بہت اذیت سے ماریں گے۔وہ لوہے کی گرم سلاخوں سے میرے سارے بدن کی کھال زندہ حالت میں اتار دیں گے... مجھے بچاؤ... میں تھک چکا ہوں، نڈھال ہوں... ایک قدم بھی نہیں چل سکتا... میں جانتا ہوں کہ سرحد یہاں سے قریب ہے لیکن میں رات کے وقت سرحد پار نہیں کر پاؤں گا۔میرے بازو شل ہیں۔سرحدی راستے پر جنگل ہے، وہاں درندے ہوں گے، میں اس حالت میں ان سے نہیں بچ پاؤں گا... مجھے بچاؤ... کل صبح کا ستارہ نظر آنے تک مجھے اپنی کٹیا میں پناہ دو۔میں صبح پرندوں کے بولنے سے پہلے فرار ہو جاؤں گا۔''

بوڑھا رکا، اُس کی بھنچی ہوئی آنکھوں کی سفید پلکیں نم آلود تھیں اور آواز میں رقت نمایاں تھی۔

''وہ کل رات آیا تھا۔'' بوڑھے نے گہرا سانس لیا۔''صبح مجھے چھوڑ گیا، ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا... مجھے کیا، وہ سب کو چھوڑ گیا۔''

میں حیرت سے بوڑھے کی بے ربط باتیں سن رہی تھی۔

''کون تھا وہ؟ کس کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے آتشدان کے سامنے بچھے ایک بڑے سے بوریے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمھیں اس کی تلاش نہیں ہے؟'' بوڑھے نے بھی بوریے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''چھوڑو، میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تمھیں کس کی تلاش ہے۔''

''کیا تم راہب ہو؟''

میرے اس سوال پر بوڑھے کا سر جھٹکے سے اوپر اٹھا۔''مت پوچھو!'' اس نے کربناک انداز میں کہا۔''مت پوچھو... اس نے بھی یہی پوچھا تھا۔'' بوڑھا بہت پریشان تھا۔

1۔اشہب: مکمل سفید گھوڑا۔

2۔دراب: قلعے کی فصیل کا بڑا دروازہ۔

3۔عسس: قلعے کی فصیلوں کی رکھوالی کرنے والوں کا نگرانِ اعلیٰ۔

Scanned with CamScanner

''کون تھا وہ؟'' میں نے پھر پوچھا۔
''کل اسی وقت... اسی وقت وہ آیا تھا،'' بوڑھے نے کہا۔''عجیب واقعہ پیش آیا تھا اس کے ساتھ...'' بوڑھے نے سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی الم انگیز سی تھی۔ بوڑھی آنکھیں سنگ آلود تھیں۔
''کیا میں تم سے پوچھوں...'' بوڑھے نے کہا۔''نہیں نہیں، میں تم سے نہیں پوچھوں گا کہ تم کون ہو... مجھے اور کوئی داستان نہیں سننا ہے۔ کل شام تک میں بہت خوش تھا۔ اس نے مجھے غمزدہ کیا ہے۔ وہ کل شام میرے پاس آیا تھا۔ اس وقت میری بیٹی سرحد پار گئی ہوئی تھی۔'' بوڑھے نے کٹیا کے دروازے کی سمت دیکھا جہاں ایک موٹا سا، بوسیدہ سا قالین لٹکا ہوا تھا۔''ابھی تک واپس نہیں آئی... کئی بار کہہ چکا ہوں کہ بیٹی، جلدی آجایا کر، لیکن ہر بار یہی کہتی ہے کہ بابا، کام بہت زیادہ ہوتا ہے۔''
''کیا تمھاری بیٹی بھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ اس کے باوجود کہ وہ مجھے بتا چکا تھا، میں نے حیرت سے یہ سوال کیا۔
''ہاں،'' بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔''یہاں سے نصف فرسنگ[4] دور سرحد ہے اور سرحد کے قریب ہی قصبہ ہے۔ وہاں کے ایک دولتمند شیخ کے گھر کام کرتی ہے۔ وہ معاوضے میں اناج دیتے ہیں، کپڑے اور جوتے بھی دیتے ہیں اور ہر شام واپس آتے ہوئے میری بیٹی جو کی روٹیاں، پنیر اور کبھی کبھی دودھ بھی لے آتی ہے... ہم غریبوں کی کوئی سرحد نہیں ہوتی، لیکن آج صبح مجھے سرحد نظر آئی تھی۔'' بوڑھا رکا، کھانسا اور پھر مسلسل کھانسنے لگا۔ میں نے کٹیا میں پڑے مٹی کے گھڑے میں سے پانی آبخورے میں ڈال کر بوڑھے کو دیا۔ اس نے گھونٹ گھونٹ پانی پیا۔ اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی۔ چند قطرے اس کے لبوں سے لڑھک کر سفید ڈاڑھی میں ڈوب سے گئے۔
''قریب ہی چشمہ ہے،'' بوڑھے نے آبخورہ بوریے پر رکھ دیا۔''ہر صبح میری بیٹی پانی بھر لاتی ہے... وہ ایک خوبصورت جوان تھا، خوبصورت لمبی لمبی آنکھوں والا، اس کے سر پر خود تھی جس پر کسی پرندے کے پر لگے ہوئے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسے پر شاہی فوج کے سالاروں کے سروں پر ہی سجائے جاتے ہیں۔ اس کے کندھے چوڑے اور مضبوط تھے۔ اس کے گلے میں طلائی زنجیر سے بندھا

4۔ فرسنگ: فرسخ۔ تین میل کی مسافت۔ ایک میل چار ہزار گز کا ہوتا ہے۔

ہوا ایشیم یمنی بھی لٹک رہا تھا جو نقشبندِ زماں عُزی [5] کا نشان ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ نقش ہر ماں اپنے بیٹے کو میدانِ جنگ میں بھیجتے ہوئے عزی کی پرستش کے بعد دیتی ہے کہ وہ اسے گلے میں پہن لے۔ اس کے کندھوں سے کہنیوں تک کسا ہوا چمڑا بندھا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ سالار اپنے خادموں سے اس قسم کا چمڑا بازوؤں پر بندھوایا کرتے ہیں۔ چمڑے کے اندر لچکیلی دھات ہوتی ہے جو شمشیر کے وار کو روکنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس نے مخملیں پیرہن پر صفیق [6] تو پہنا ہوا تھا لیکن زرہ بکتر نہیں تھی۔ اس کی گھٹنوں تک پھولی ہوئی شلوار چمڑے کے لمبے جوتوں میں دھنسی ہوئی تھی۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ... ''بوڑھے نے کٹیا کے دروازے کی سمت دیکھا۔'' شام ہو چکی ہے، میری بیٹی ابھی تک نہیں آئی... لمحوں کا تو کوئی بھروسا نہیں۔ کئی بار کہہ چکا ہوں کہ بیٹی، دیر نہ کیا کر۔ راستے میں جنگل ہے، گھنے درخت ہیں، جھاڑیاں ہیں... لیکن وہ بھی کیا کرے۔ گھر کی تمام خادماؤں پر نگران عورت، بہت سخت گیر ہے... وہ کل شام آیا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ وہ شاہی رسالے کا کوئی افسر ہے... وہ کیوں آیا تھا؟ میرے پاس کیوں آیا تھا؟'' بوڑھے پر پھر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ ''رات بھر کٹیا میں چھپا رہا۔ بار بار یہی کہتا تھا کہ میں فرار ہو جاؤں گا، صبح ہونے سے پہلے ہی بھاگ جاؤں گا۔ مجھے کچھ دیر آرام اور نیند کی اشد ضرورت ہے... میری بیٹی کیوں نہیں آئی...''

5۔ عُزی: (Uzee) اہلِ عرب کی قدیم ترین دیوی۔ یہ خالصتاً عرب کی دیوی تھی۔ اہلِ عرب اسے رحم، ہمدردی اور ممتا کی دیوی مانتے تھے۔ کعبے میں عُزی کا بت ہُبل کے بائیں ہاتھ تھا۔ کچھ اسلامی محققین نے اسے 'عُزہ' یا 'عُزیٰ' کہا ہے جو درست نہیں ہے۔ عزہ کنعان کے ایک اونچے مقام قریت یعریم کے رہنے والے اَبی نداب کا بیٹا تھا، جس کے گھر میں عہد کا صندوق رکھا گیا تھا۔ عزہ اور اس کا بھائی اخیو عہد کے صندوق کو یروشلم لے جا رہے تھے اور داؤد بادشاہ، اپنے ساتھیوں کے ساتھ، بیل گاڑی کے آگے ساز بجاتا اور گاتا ہوا چل رہا تھا کہ ایک بیل کا پاؤں پھسلا۔ عہد کا صندوق، جسے کاہنوں کے سوا کسی کو چھونے کی اجازت نہ تھی، گرنے لگا تو عزہ نے اسے تھام لیا جس پر طیش میں آ کر بنی اسرائیل کے خدا نے آسمانی بجلی گرا کر عزہ کو مار دیا۔ جس جگہ یہ واقعہ رونما ہوا، بنی اسرائیل نے اسے پرض عزہ یعنی عزہ کا ٹوٹنا کا نام دیا۔ (بحوالہ توریت، باب سموئیل، آیات 8:3:6 اور تواریخ آیات 11:6:13۔) عُزی کا بنی اسرائیل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ اہلِ عرب کی دیوی تھی۔ الازہر یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے عربی زبان کے کلاسیکی شاعر اُمراُلقیس کا ایک نوحہ تلاش کیا تھا جس میں عُزی کا ذکر موجود تھا۔

6۔ صفیق: وہ سخت کپڑا جو قدیم زمانے میں جنگجو مخملیں پیرہن کے اوپر اور زرہ بکتر کے نیچے پہنا کرتے تھے۔

Scanned with CamScanner

بوڑھے کی باتیں پھر بے ربط ہو گئیں۔" . . . بھاگ جاؤں گا، وہ بار بار یہی کہتا تھا۔ میں اس ملک میں نہیں رہوں گا، چلا جاؤں گا، فرار ہو جاؤں گا . . . ورنہ وہ مجھ بہت اذیت سے ماریں گے۔ مجھے بچھوؤں سے بھرے کنویں میں پھینک دیں گے۔ مجھے آرے سے چروا دیں گے۔ میں نے دیکھا ہے . . . سب دیکھ چکا ہوں . . . جب وہ سزا دیتے ہیں تو ان کے سینوں میں دل کی جگہ آہنی ڈھالیں ہر جذبے کو ڈھانپ لیتی ہیں۔ وہ رحم کے کسی جذبے کو احساس تک پہنچنے ہی نہیں دیتی ہیں۔ وہ درندے بن جاتے ہیں۔ سزا یافتہ کی کربناک چیخیں ان کو مخمور کر دیتی ہیں۔ میں بھاگ جاؤں گا . . . اس نے مجھے دکھ دیا ہے۔ کاش وہ مجھے اپنی داستان نہ سناتا . . . میری بیٹی ابھی تک کیوں نہیں آئی! اب تک تو اسے آ جانا چاہیے تھا۔" بوڑھے کی باتیں بہکی بہکی سی تھیں۔ "جب وہ آیا تھا تو اس قدر نڈھال تھا کہ اس کا مرصع کمر بند میں نے کھولا تھا۔ اس کی شمشیر اور کمر بند اتارنے میں اس کی مدد کی تھی۔ پیش قبض بھی اتارا تھا . . . میری بیٹی نے آج اتنی دیر کیوں کر دی ہے! کتنی بار کہوں کہ مجھے انتظار کی اذیت نہ دیا کر . . . لیکن وہ کیا کرے . . . کل رات میری بیٹی نے اسے کھانے کے لیے جو کی روٹی اور پنیر دیا تھا اور کاسے میں دودھ بھی۔ دودھ کا کٹورا تو خادماؤں کی نگران کبھی کبھی ہی دیتی ہے . . . وہ ہر روز میری بیٹی سے صبح صبح برتن دھلواتی ہے۔ جس رات شیخ کے مہمان آئے ہوئے ہوں، اگلے دن برتن دھوتے دھوتے میری بیٹی کو دوپہر ہو جاتی ہے . . . وہ بھی مہمان بن کر اس کلبۂ مفلس میں آیا تھا لیکن اس نے مہمانوں والی کوئی خوشی مجھے نہیں دی . . . اس نے مجھے رنج دیا، غم دیا . . . میں راہب نہیں ہوں، لکڑہارا ہوں۔" بوڑھے نے پھر ایک سوکھی ٹہنی آتشدان میں پھینکی۔ "میں لکڑہارا ہوں لیکن اب میرے بازوؤں میں قوت نہیں ہے۔ اب میں درختوں پر نہیں چڑھ سکتا۔ اب میری بیٹی صبح سے شام تک کام کرتی ہے۔ جب سے اس کی ماں مری ہے، وہ میرے ساتھ ہے۔ میں بوڑھا تو اس کے بغیر چند روز بھی نہ جی سکوں گا۔ مجھے جینے کی خواہش بھی نہیں ہے . . . لیکن وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی . . . اسے اب تک آ جانا چاہیے تھا . . . وہ کل شام آیا تھا، صبح ہمیں چھوڑ گیا۔ میری بیٹی بہت روئی تھی۔ ایک رات کے مہمان کے اس طرح ہمیشہ کے لیے چلے جانے پر وہ بہت روئی تھی . . . ابرِ زمستاں کی طرح، آہستہ آہستہ، وہ دیر تک برسی تھی . . . کسی بے گناہ کے مارے جانے پر دکھ تو ہوتا ہی ہے، لیکن جو داستان اس نے سنائی تھی، اسے سن کر تم بھی اپنے آنسوؤں کے چشمے کو اُبلنے سے نہ روک پاؤ گی۔"

Scanned with CamScanner

باہر قدموں کی چاپ خزاں رسیدہ خشک پتوں کے پاؤں تلے کچلے جانے کی آواز محسوس ہوئی۔
''میری بیٹی آ گئی!'' بوڑھا بولا۔ کٹیا کے دروازے کا بھاری قالین ایک سمت سے اٹھا اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت اندر داخل ہوئی۔ دبلی پتلی، بوڑھے ہی کی طرح اس کے زرد رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ معمولی لباس، بکھرے بال، باپ ہی کی طرح اداس چہرہ، تھکن سے آنکھوں میں سرخ ڈورے، نحیف و نزار، ایک ہاتھ میں کھانے کا برتن اور ایک کپڑے کی پوٹلی۔ یہ چیزیں باپ کو پکڑاتے ہوئے وہ مجھے دیکھ کر چونکی، ٹھٹکی۔
''آؤ بیٹی آؤ'' بوڑھے نے کہا۔ ''آج رات یہ ہماری مہمان ہے... لیکن میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ ہمارے لیے غم نہ لانا، ہمیں کوئی داستان نہ سنانا۔''
''کیا یہ اُسے ڈھونڈتی ہوئی یہاں آئی ہے؟'' بوڑھے کی بیٹی نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غم کا گہرا سایہ تھا۔
''نہیں۔'' بوڑھے نے بھی میری طرف دیکھا۔ ''نہ میں نے پوچھا ہے کہ یہ اکیلی یہاں کسے تلاش کر رہی ہے اور نہ ہی پوچھوں گا۔ یہ بھی کوئی داستان سنا دے گی۔ ہمیں اب اور کچھ نہیں سننا... بھوک لگی ہے مجھے، اسے بھی لگی ہوگی۔'' بوڑھے نے بوریے پر بیٹھتے ہوئے کھانے کا برتن آتشدان کے سامنے رکھا اور پوٹلی کھولی، جس میں جو کی تین روٹیاں اور پنیر تھا۔ برتن میں دودھ تھا۔
''نگران عورت آج میرے کام سے بہت خوش تھی۔'' بوڑھے کی بیٹی نے کندھے سے بوسیدہ سی چادر اتاری۔ اس کے کندھے جھکے سے تھے اور ہڈیاں نمایاں تھیں۔ وہ سیدھی پانی لینے مٹی کے گھڑے کی سمت گئی۔ کاسے میں پانی انڈیلا، دو چار گھونٹ پیا اور پھر ہتھیلی پر ڈال کر منھ پر چھینٹے دیے اور قریب ہی پڑے میلے تولیے سے پونچھتے ہوئے، مڑ کر بوڑھے کی طرف دیکھا۔
''یہ عجیب اتفاق ہے،'' اس نے آتشدان کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''کل بھی اس نے تین روٹیاں، پنیر اور دودھ دیا تھا۔ میں اس کے لیے خوراک تو لے آئی تھی، زندگی کہاں سے لاتی!'' اس کے چہرے پر الم انگیز کیفیت بہت گہری تھی۔ بوڑھے نے جو کی روٹیاں تقسیم کیں، پنیر کے بھی تین حصے کیے اور تین کاسوں میں دودھ بھی انڈیلا۔ کھانے کے بعد بوڑھے کی بیٹی تین میلے کچیلے تکیے لائی اور آتشدان کے سامنے بوریے پر رکھ دیے۔ ہمیں یہیں سونا تھا۔ باہر ہوا میں دھیمی سی سرسراہٹ تھی جو

وقفے وقفے سے تیز ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ کٹیا کے دروازے پر موٹا بھاری قالین ہوا کے جھونکوں سے مرتعش ہو رہا تھا اور کٹیا میں جلتے ہوئے چراغ کی لو تھر تھرا جاتی تھی، لیکن آتشدان نے کٹیا کو بہت گرم کر رکھا تھا، ہمیں چادروں یا کمبلوں کی ضرورت نہیں تھی۔

''زمستاں کی آمد آمد ہے،'' بوڑھے نے کہا۔ ''کل شام جب وہ آیا تھا تو خنکی کے باوجود پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بہت دور سے بھاگ کر آیا تھا۔ تھکن سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں، جیسے صبح کی لالی میں افق پر سفید سورج ایک نارنجی بدلی سے نکل کر دوسری میں چھپ جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں شدتِ غم اور کرب کا احساس بار بار نمایاں ہو رہا تھا... اس نے ہمیں اپنی داستان سنائی۔''

''مجھے بھی سناؤ،'' میں نے میلے تکیے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں بابا،'' بوڑھے کی بیٹی نے تیزی سے کہا۔ ''مجھے اور غمزدہ نہ کرو۔ میں دن بھر اسی سے متعلق سوچتی رہی ہوں۔ میں اور رونا نہیں چاہتی۔''

''دل پر غم کا بوجھ ہو...'' میں نے کہا، ''تو غم کے باعث کو بار بار یاد کرنے سے گرانباری دل کم ہو جاتی ہے، بہن۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔'' بوڑھے کی بیٹی کے لبوں پر مغموم سی مسکراہٹ آئی۔ ''ماں بھی یہی کہا کرتی تھی۔ میری اگر کوئی چھوٹی بہن ہوتی، تو تم جیسی ہی ہوتی۔''

''بابا،'' میں نے کہا، ''کیا بتایا تھا اس نے؟ مجھے بھی بتاؤ۔ میں بھی حادثاتِ روز و شب کا شمار کرنا چاہتی ہوں۔''

''مجھے اس کا ایک ایک لفظ یاد ہے،'' بوڑھے نے اپنی دائیں کہنی تکیے پر رکھی۔ ''وہ بہت تھکا ہوا تھا لیکن خوراک اور آتشدان کی گرمی نے جلد ہی اس کی قوت کو خاصا بحال کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر آنکھیں بند کیے لیٹا رہا، پھر اس نے ہماری طرف دیکھا۔''

2

جس قلعے کی سمت میرا گھوڑا بھاگ گیا ہے، میں اس قلعے کے قلعہ دار کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ شاہی رسالے کا نائب سالار ہوں۔ اتنی کم عمر میں اتنا بڑا عہدہ مل جانا دوسروں کے لیے باعثِ رشک اور خود

Scanned with CamScanner

میرے لیے باعثِ حیرت رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں بادشاہ [7] کے دربار میں 'حصار شکن' کے نام سے جانا جاتا ہوں۔ ایک جنگ میں پچیس جنگجو سواروں نے گھیر لیا تھا۔ میں پندرہ سواروں کو گرا کر، حصار توڑ کر نکل گیا تھا۔ مجھے نائب سالار بنا دیا گیا۔ میرا باپ عرب ہے لیکن ماں پیش دادیوں [8] کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے، لیکن عزیٰ کی پرستار ہے۔ تم لوگ نہیں جانتے کہ بادشاہ بے حد سفاک اور کینہ پرور ہے۔ میں نے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ جب وہ پیدا ہوا تھا تو ایک ماہرِ نجوم نے پیش گوئی کی تھی کہ اس میں دس عیب ہوں گے۔ اس کی خصلت میں ظلم، بے حیائی، بزدلی، بے عقلی، بدزبانی، کذب بیانی، بدصورتی، پست قامتی، خود غرضی اور بسیار خوری ہوگی۔ اس کے باپ نے طیش میں آکر نجومی کو زندہ جلا دیا تھا۔ میں دربار میں کئی بار حاضری دے چکا ہوں۔ نجومی کی ایک ایک بات سچی ہے۔ بے عقلی کے باوجود وہ اس لیے بہت کامیاب ہے کہ اس کے چند وزیر بے حد عیار اور زیرک ہیں۔ پھر اس کی کامیابی کی ایک وجہ ناقابلِ تسخیر عسکری قوت ہے جسے اس کے سپہ سالار نے تشکیل دے رکھا ہے۔ میں اس کی شاہی ضیافت میں بھی شریک ہو چکا ہوں۔ وہ کثرتِ مے نوشی کے ساتھ ساتھ اس قدر بسیار خور ہے کہ کھانا ختم ہونے کے بعد اس کے لیے چلنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ دو کنیزیں اسے پکڑ کر اندر حرم میں لے جاتی ہیں۔ اس کے حرم میں ایک سو بیویاں اور تین سو باندیاں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس کی ہوسناکی سے نہیں بچی۔ وہ ہر وقت قہقہے لگاتا رہتا ہے... مجھے اس سے نفرت تھی لیکن میں کبھی زبان سے اپنی نفرت کا اظہار نہیں کر پایا تھا... یہاں تک کہ میں تنہائی

7۔ ضحاک: ایرانی روایت کے مطابق یہ بادشاہ صحرائے عرب سے نکل کر پورے عرب پر قابض ہوا تھا۔ یہ انتہائی ظالم شخص تھا۔ جزیرہ نمائے عرب پر اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد اس نے ایران پر حملہ کیا اور ساسانیوں کو شکست دے کر ایرانی بادشاہ آذر جمشید کو آرے سے چروا دیا۔ آذر جمشید کی بیوی فرانگ اپنے شیر خوار بچے فریدوں کو لے کر بھاگ گئی۔ وہ ایک سبزہ زار میں پہنچی جہاں کے محافظ کے پاس ایک بڑی دودھیل گائے تھی۔ ضحاک کے خوف سے فرانگ کے پستانوں میں دودھ خشک ہو گیا تھا۔ اس نے فریدوں کو سبزہ زار کے محافظ کے سپرد کر دیا۔ فریدوں اسی گائے کا دودھ پی کر بڑا ہوا۔ پھر ایک آہن گر کاوہ نے اس کی ناک دیکھ کر اسے پہچان لیا جو بالکل آذر جمشید جیسی تھی۔ کاوہ نے اپنی پوستین سے پرچم بنایا، اہلِ فارس کو جمع کیا اور ضحاک کو شکست دے کر فریدوں کو ایران کا بادشاہ بنا دیا۔ اس کا پرچم تاریخ میں درفشِ کاویانی کے نام سے مشہور ہے۔ ضحاک کو زندہ حالت میں الٹی کھال اتروا کر اذیت ناک موت دی گئی۔

8۔ ساسانیوں کے آباؤ اجداد 'پیش دادی' کہلاتے تھے۔

میں بھی اس سے نفرت کا اظہار خود سے بھی نہ کر پاتا تھا۔ میں ہمیشہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دیا کرتا تھا کہ میری وفاداری، میری خدمات میرے وطن کے لیے ہیں، بادشاہ کے لیے نہیں ہیں۔ میں ہمیشہ اس خودفریبی کا شکار رہا۔ جنگوں میں ایک جانباز سالار کی طرح نہ صرف اپنے دستوں کی قیادت کرتا تھا بلکہ سرفروش سالار کی طرح لڑتا بھی تھا۔ مجھے دربار کی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دربار کیا ہے؟ ایک ایسا باڑا ہے جہاں چوپایوں کی جگہ درندے نظر آتے ہیں۔ یہ خونخوار درندے بادشاہ کی قربت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر پنجے مارتے رہتے ہیں۔ دربار سازشوں کا گڑھ ہے۔ بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر درباری گروہ بندیاں کرتے رہتے ہیں۔ درباریوں میں ہوسِ اقتدار اس قدر ہے کہ وہ ادھیڑ عمر کے بدہیئت، موٹے، پستہ قامت اور بدصورت بادشاہ کو اپنی نوجوان خوبصورت بیٹیاں پیش کرتے رہتے ہیں۔ درباری گروہوں میں تقسیم ہیں۔ بادشاہ کے چچازاد نے ایک مضبوط اور بڑا گروہ بنالیا، جس کا مقصد حصولِ منصب نہیں بلکہ بادشاہ کا تختہ الٹنا تھا۔ بادشاہ کے چچازاد سے ایک فاش غلطی ہوگئی۔ اس نے، بغیر پرکھے، سپہ سالار کو بھی اپنے گروہ میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ ہم عساکر سے تعلق رکھنے والے عقل کو ہمیشہ وفا کے ترازو میں تولتے ہیں۔ میں نے جب بھی یہ ترازو اٹھایا، وفا کا پلڑا ہی بھاری رہا۔ سپہ سالار کے لیے تو بادشاہ ہی ملک تھا۔ اس نے بادشاہ کے زیرک وزیروں اور بادشاہ کو سازش کی خبر دے دی۔ بادشاہ کے حکم پر اس کے چچازاد بھائی کو گروہ کے دیگر سرکردہ لوگوں کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا... بادشاہ بدطینت ہے، اس کی سفاکیوں کا کیا بیان کروں۔ اس کے سینے میں رحم کا کوئی جذبہ موجود ہی نہیں۔ اس کے قلبِ سیاہ میں عُزی نے اپنے رحم و کرم کا ایک کرمکِ شب تاب بھی نہیں بھیجا۔ وہ توہُبل [9] اور عشتارات [10] ہی کو خون اور چربی کے نذرانے پیش کرتا

9۔ ہُبل: کنعانیوں کے قدیم ترین دیوتا بعل کا عربی نام ہے۔ بعل عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی آقا یا مالک متاع اور خاوند ہیں۔ توریت کے ابواب خروج، قضاۃ، سموئیل، ہوسیع، یرمیاہ، سلاطین، گنتی اور تواریخ میں اس دیوتا کا ذکر موجود ہے۔ اسے سورج دیوتا بھی کہا جاتا تھا اور اونچے مقامات پر اس کی پرستش ہوا کرتی تھی۔ ابتدا میں اسرائیلی اس دیوتا سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کی عورتیں اپنے شوہروں کو بعل کہہ کر پکارتی تھیں کیونکہ وہ افزائش نسل کا دیوتا تھا اور جنگی دیوتا کی حیثیت سے بھی پہچانا جاتا تھا۔ اسرائیلی عورتیں اپنے بچوں کے نام بھی بعل کے نام پر رکھا کرتی تھیں لیکن بعد میں یوسیاہ بادشاہ کے وقت یہ رجحان ختم ہوگیا۔ بعل کی قدیم ترین مورتی تین ہزار سال قبل مسیح کی

(بقیہ اگلے صفحے پر)

Scanned with CamScanner

رہتا ہے۔ اس نے سازشی گروہ کے اراکین کو آرے سے چروا دیا۔ یہ ظالمانہ سزا بادشاہ کی پسندیدہ سزا ہے۔ میں یہ سزا دیکھ چکا ہوں۔ بادشاہ شراب پی کر، بدمستی کے عالم میں، دو نیم برہنہ کنیزوں کے ساتھ ایک اونچی مسند پر بیٹھ جاتا ہے۔ سزا یافتہ قیدی کی ساری پوشاک اتار دی جاتی ہے۔ اسے ہُبل کے مجسمے کے سامنے ایک چوڑے لکڑی کے تختے پر لٹا دیا جاتا ہے۔ ہتھیلیوں میں میخیں ٹھونک دی جاتی ہیں اور پاؤں آہنی کڑوں سے تختے پر باندھ دیے جاتے ہیں۔ قیدی کی ہر چیخ پر بادشاہ قہقہے لگاتا ہے۔

ہے جو راس شمرہ کے مقام پر کھدائی کے دوران میں ملی تھی۔ اس مورتی میں بعل کے سر پر جو خود نظر آتی ہے اس پر افزائش نسل کی مردانہ علامت موجود ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں گرز اور دوسرے میں نیزہ ہے جسے اس نے زمین پر ٹکایا ہوا ہے۔ کمر پر ناف کے نیچے کپڑے کی پانچ پٹیاں بندھی ہوئی ہیں اور ان میں ایک خنجر اور ایک تبر بندھا ہوا ہے۔ یہ آلات حرب جنگی دیوتا کی حیثیت سے اس کی قوت کا اظہار ہیں۔ سر پر خود کے سامنے تین انگلیاں اوپر کی سمت اٹھی ہوئی ہیں اور خود سے نیچے لٹکتے ہوئے خمیدہ بال بھی نظر آتے ہیں۔ بعل کو ہندو دیوتا شو کی طرح غارتگری اور خون بہانے کے ساتھ ساتھ بربادی کا دیوتا بھی مانا جاتا تھا۔ بعل کو عشتارات کا زرساتھی بھی مانا گیا ہے اور ان کی پرستش میں عریانی اور جنسی فعل کو عبادت کا درجہ حاصل تھا۔ اس پرستش میں جنسی جنون کو اہم ترین مقام حاصل تھا۔ عرب قبیلے بعل اور عشتارات، دونوں کی پرستش کرتے تھے لیکن کعبے میں صرف بعل یعنی عربی نام والے ہُبل کا ہی بت موجود تھا اور عشتارات کی جگہ عُزیٰ نے لے لی تھی۔ مسلمانوں نے فتح مکہ کے بعد ہُبل اور مناۃ کے ساتھ عُزیٰ کا بت بھی توڑ دیا تھا۔ بعل کا سب سے بڑا مندر بیت شمس میں تھا۔ (بحوالہ توریت، ابواب: سیموئیل، تواریخ، یرمیاہ)۔

10۔ عشتارات بھی سامی اقوام کی دیوی تھی۔ اسے عشق، جنسی بارآوری اور جنگ کی دیوی مانا جاتا تھا۔ یہ بعل کی مادہ ساتھی تھی۔ دونوں کی پوجا جنسی انداز میں ہوتی تھی۔ بنی اسرائیل نے تین سو پچاس برس تک اس دیوی کی پوجا کی تھی۔ عرب میں یمن کی مشہور ملکہ سبا، جسے اسلام میں بلقیس کا نام دیا گیا ہے، اسی دیوی کی زبردست پرستار تھی۔ عشتارات کی پرستش جہاں جنسی جنون سے کی جاتی تھی وہاں موسم بہار میں اس دیوی کے سامنے بھی، فیر بھیجائی دیوی سیبل کی طرح، ایتس کی اساطیر دہرائی جاتی تھی اور پجاری اس دیوی کو بھی اپنی رجولیت بھینٹ چڑھاتے تھے۔ یہودی اور مسلمان اقوام میں ختنہ کی رسم اسی دیوی کی پرستش کا نتیجہ ہے۔ اسرائیلی خونی رسم میں شریک ہوتے تھے۔ پھر کچھ علما نے اس رسم کو ختنہ میں بدل دیا۔ یوسیاہ بادشاہ نے جب بنی اسرائیل کو بت پرستی سے نجات دلائی تو اس رسم کو، جو ایتس کے ساتھ پجاریوں کا عہد کہلاتی تھی، ابرہام (ابراہیم) کا خدا سے عہد قرار دے کر ختنہ کے طور پر جاری رکھا۔ پہلے باپ خود بچے کا ختنہ کیا کرتا تھا۔ پھر عبرانی جراح بلایا جانے لگا۔ عیسائیوں میں پولس رسول نے اس مسئلے پر رسولوں کی کونسل بلائی تھی جس نے متفقہ طور پر ختنہ کو بت پرستی کی یادگار اور غیر فطری قرار دے کر ختم کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہودیوں اور مسلمانوں نے اسے جاری رکھا۔

Scanned with CamScanner

دو جلاّد تختے کو اس طرح ترچھا کر دیتے ہیں کہ قیدی کا سر ہبل کے بت کے آگے جھک جاتا ہے۔ جلاد ایک آہنی آرا لے کر، جس کی نوکیں بہت تیز اور چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں، قیدی کے برہنہ بدن کو رانوں کے درمیان سے آہستہ آہستہ چیرنا شروع کر دیتے ہیں۔ دونوں جلادوں کے ایک ساتھ نہایت آہستہ آرا چلانے سے قیدی کربناک انداز میں چیختا ہے۔ دونوں جلادوں نے قیدی کے پیروں کی سمت آرے کو چوڑے دستے پر مضبوطی سے پکڑا ہوتا ہے۔ بادشاہ کی مسند ان کے سروں کے اوپر ہوتی ہے جہاں سے بادشاہ کو قیدی کا چرتا ہوا بدن اور زخم سے بہتا خون صاف دکھائی دیتا ہے، جسے دیکھ کر وہ بدمست ہو کر قہقہے لگاتا ہے۔ جلاد آہستہ آہستہ جسم کو احتیاط سے چیرتے ہیں کہ آرا ریڑھ کی ہڈی نہ کاٹے اور قیدی کی فوری موت نہ واقع ہو جائے۔ بادشاہ قیدی کی اذیت سے زیادہ سے زیادہ لطف حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر قیدی آرے کی غلط جنبش سے مر جائے تو جلاد کو تختے پر لٹا دیا جاتا ہے۔ نیم برہنہ کنیزیں بادشاہ کو شراب پلاتی رہتی ہیں، یہاں تک کہ قیدی کے مرنے تک بادشاہ بیہوش سا ہو جاتا ہے۔ میں یہ مناظر کبھی تصور میں بھی دیکھتا ہوں تو مجھے قے محسوس ہوتی ہے، اُبکائیاں آتی ہیں۔ میدانِ جنگ میں دشمنوں کے سر شمشیر سے کاٹتے ہوئے، ان کی زرہ بکتر کاٹتے ہوئے، میرے چہرے پر اکثر خون کے چھینٹے پڑتے رہے ہیں لیکن میرا دل سنگین ہی رہتا ہے، مگر بے بس کی چیخیں سن کر میرا سارا بدن کپکپانے لگتا ہے۔ یہ بزدلی ہے، اور بزدلی بادشاہ کے دس عیوب میں سے ایک ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میدان میں سزا یافتہ قیدی کے ہاتھ میں شمشیر دے کر اسے مقابلے کا موقع دیا جائے۔ اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہونا میرا مسلک نہیں ہے۔ میرا بدن ایسی ندامت سے کپکپاتا ہے جسے میں اپنے پورے وجود میں محسوس کرتا ہوں۔ پھر یہ ندامت مجھے اپنے عمل پر بھی ہوتی ہے کیونکہ بادشاہ کے تمام قیدی ہم ہی گرفتار کرتے ہیں، ہم عسکری لوگ۔ اگرچہ میرا تعلق شاہی رسالے سے ہے، پھر بھی عساکر سے تعلق تو ہے۔ ہم عسکری لوگ ہی بادشاہ کی یہ خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ میں نے اکثر ندامت کی سیاہ چادروں کو اپنے وجود پر اترتے دیکھا ہے، خصوصاً جب بادشاہ کسی بے گناہ کو اپنے عتاب کا شکار بناتا ہے۔ ایک بار تو میں رویا بھی تھا۔ بادشاہ شہر سے گزر رہا تھا۔ اس کی نظر ایک بہت خوبصورت بچی پر پڑی جو اپنے نانا کے ساتھ جا رہی تھی۔ بادشاہ نے رک کر بوڑھے مرد سے اس کی نواسی کو عیاشی کے لیے مانگا۔ بوڑھے شخص نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ یا امیر، یہ تو ابھی نابالغ ہے۔ بادشاہ

نے طیش میں آ کر بوڑھے کو گرفتار کرنے کا حکم دیا اور پھر اسے آرے سے چروا دیا۔ بادشاہ نے بوڑھے کی نواسی کو نیم برہنہ حالت میں مسند پر اپنے پاس بٹھا کر اس کے بوڑھے نانا کو وحشیانہ سزا دی۔ بچی خوف سے بیہوش ہو گئی تھی۔ اس رات میری پلکیں تھر تھراتی رہی تھیں۔ پہلی بار میں رویا تھا۔

سازش کے سرغنہ، بادشاہ کے چچازاد، کو بادشاہ نے میرے والد کے حوالے کیا اور کہا کہ اسے قلعے میں لے جا کر ایک برس تک دردناک عذاب سے گزارا جائے لیکن مرنے نہ دیا جائے۔ اگلے زمستاں میں ایک تاریخ مقرر کی گئی جس دن عذاب سے گزارے جانے والے بادشاہ کے چچازاد کو آرے سے چروانا قرار پایا۔ بادشاہ کے چچازاد کو قلعے تک لے جانے کی ذمے داری مجھے سونپی گئی۔ اسے آہنی زنجیروں سے باندھ کر ابلق [11] پر بٹھا دیا گیا۔ میں اپنے اشہب پر سوار ہوا۔ قیدی کو جن زنجیروں اور قفلوں سے باندھا گیا، ان کی چابیاں مجھے دے دی گئیں۔ میرے ساتھ جانے کے لیے سواروں کا ایک دستہ تیار تھا۔ ایک درباری نے طنزیہ لہجے میں کہا کہ ''کیا حصار شکن کو بھی دستے کی ضرورت ہے؟'' سپہ سالار نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ ''ضرورت تو نہیں ہے، یہ اکیلا بھی قیدی کو قلعے تک لے جا سکتا ہے۔'' اس پر میرے والد نے فخر اور جوش میں بہ آوازِ بلند کہا، ''ایسی بات ہے تو میرا حصار شکن اکیلا ہی قیدی کو لے کر جائے گا۔ میرے حصار شکن کے اشہب کے سم جہاں پڑتے ہیں وہاں سے موت بھی بھاگ جاتی ہے۔'' میرے والد نے درباری کی جانب دیکھا اور کہا کہ ''تیرے طنز کا اب یہی جواب ہے کہ میرا حصار شکن اس اہم ترین قیدی کو اکیلا ہی قلعے میں پہنچائے گا۔'' قیدی مجھے سونپ دیا گیا۔ اشہب پر سوار ہوتے ہوئے ایک خیال سے میں چونکا ضرور تھا کہ کہیں طنز کرنے والا درباری بادشاہ کے چچازاد کا خفیہ ساتھی تو نہیں اور کہیں مجھ سے راستے میں قیدی کو چھڑانے کی کوشش تو نہیں کی جائے گی، لیکن اب سواروں کے دستے کو ساتھ لینا میرے والد کی توہین تھی۔ میں نے قیدی کو اکیلے ہی لے جانے کا فیصلہ کیا۔ طنز کرنے والے درباری کی آنکھوں میں مکارانہ چمک عیاں تھی۔ دارالحکومت سے میرے والد کا قلعہ بیس فرسنگ دور تھا اور مجھے شام تک قلعے میں پہنچنا تھا۔ میں قیدی کو لے کر دارالحکومت سے نکلا۔ دارالحکومت کے پاس بڑے پہاڑ کا چکر کاٹ کر ہم اس درّے تک پہنچے جو سیدھا سرحد کی سمت جاتا ہے اور اٹھارہ فرسنگ پر دائیں ہاتھ مڑ کر قلعے کی سمت راستہ جاتا

11۔ ابلق: سیاہ و سفید گھوڑا۔

نظر آتا ہے۔۔۔ تم نے بتایا ہے کہ تم لکڑ ہارے ہو۔ تم تو اس درّے کے گوشے گوشے سے واقف ہو گے جس کے درمیان پایاب ندی بہتی ہے اور دونوں کناروں پر گھنا جنگل ہے۔۔۔ میں جب درّے میں ندی کے دائیں کنارے پر پہنچا تو چاشت کا آفتاب اپنا احساس دلا رہا تھا۔ یہ میرے لیے انوکھا تجربہ تھا۔ دربار کی ایک اہم شخصیت کو قیدی بنا کر اس طرح تنہا لے جانا واقعی حیرت انگیز تھا۔ یہ تجربہ جہاں میرے لیے باعثِ مسرت تھا، وہاں اس کے ساتھ یہ اندیشہ بھی وابستہ تھا کہ بادشاہ کے چچازاد کو چھڑانے کے لیے اس کے ساتھی مجھ پر حملہ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے دم خم پر اعتماد تھا اور یہ انبساط بھی میرے ہمراہ تھا کہ سارا دربار میری حصار شکنی سے متاثر ہے، لیکن بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے خیال نے میری مسرت کو ختم کر دیا۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ مجھے بادشاہ سے نفرت ہے، لیکن اس نفرت کا اظہار بھی میرے لیے ہمیشہ سے ناممکن رہا ہے۔ نیم پہاڑی درّے میں بہتی ہوئی ندی کے ریتیلے کناروں پر سنگریزے بکھرے ہوئے تھے۔ انھی پتھروں کے درمیان اُگی ہوئی جھاڑیاں اور گھاس پھیل کر دونوں جانب بلند ہوتے ہوئے جنگل میں مدغم ہو جاتی ہے۔ ہمارے گھوڑے جھاڑیوں اور گھاس میں بکھرے سنگریزوں پر چل رہے تھے۔ گھوڑوں کو دوڑانا ناممکن تھا۔ قدم قدم چلتے ہوئے گھوڑے، زمستاں کی ابتدائی چاشت میں ہر سمت پھیلی خوشگوار دھوپ میں، سر اٹھائے چلے جارہے تھے۔ میرے اشہب کے پہلو میں قیدی کا ابلق قدم قدم چل رہا تھا۔ خوشگوار دھوپ کے باوجود خاموشی بوجھل سی محسوس ہو رہی تھی۔ ندی کے پانی میں تیزی نہیں تھی، ہوا بند تھی۔ نہ پانی کے سنگریزوں سے ٹکرانے کی آواز سنائی دیتی تھی نہ ہی سرسراہٹ جو ہوا کے جھونکے جھاڑیوں میں پیدا کیا کرتے ہیں۔ قیدی یوں خاموش تھا جیسے اس کے ہونٹ سی دیے گئے ہوں۔ بادشاہ کا چچازاد بادشاہ ہی کی طرح پست قامت ہے۔ اس کا جسم فربہ ہے لیکن بادشاہ کی طرح بدہیئت اور بدصورت نہیں ہے۔ مجھے بوجھل خاموشی سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ میں نے قیدی کی طرف دیکھا، وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا، ابلق کی ہر ٹاپ پر جھٹکے کھا رہا تھا۔ اس کے بدن پر جکڑی ہوئی زنجیروں کو ایک لمبی آہنی زنجیر سے میرے اشہب کی زین سے باندھا گیا تھا۔ گھوڑے جھاڑیوں میں کبھی کبھی آگے پیچھے ہو جاتے تھے، اور میں قاعدے کے مطابق اپنے اشہب کو قیدی کے ابلق کے پیچھے کر لیتا تھا۔ لمبی آہنی زنجیر کھنچ سی جاتی تھی۔ کھلی جگہ آنے پر گھوڑے متوازی ہو جاتے تھے۔

Scanned with CamScanner

''توتم بادشاہ کا تختہ الٹنا چاہتے تھے؟'' میں نے خاموشی سے تنگ آکر سوال کیا، اور ادھیڑ عمر کے قیدی نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔

''ہاں،'' اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہوتا کہ اس کا قلع قمع ہو جاتا۔''

''تختہ الٹ کر تم خود بادشاہ بن جاتے،'' میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''یہی چاہتے تھے تم؟''

قیدی خاموش ہو گیا۔ اس کے سر پر نہ تاج تھا نہ دربار میں پہنا جانے والا کلاہ۔ اس کے سر پر سخت چمڑے کی زندانی خود تھی جسے اچھی طرح پانی سے بھگو دیا گیا تھا۔ خود ایک آہنی زنجیر سے بندھی ہوئی تھی اور قیدی کے چہرے پر اس کی پیشانی کو آہنی زنجیر نے جکڑ رکھا تھا۔ یہ خود، جسے خودِ زندانی کہا جاتا ہے، انتہائی اذیت دہ ہوتی ہے۔ جیسے جیسے بھیگے ہوئے چمڑے کی نمی کم ہوتی ہے، زنجیر میں فشار نمودار ہوتا ہے اور یہ فشار پیشانی میں درد کی شدت میں بتدریج اضافہ کرتا ہے، یہاں تک کہ آہنی زنجیر کے حلقے پیشانی کی جلد کاٹ کر ہڈی میں دھنسنے لگتے ہیں۔ قیدی، درد کی شدت میں، سر کو زیادہ سے زیادہ جھکانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ شدید درد کو کم کر سکے۔

''تم خوش ہو سکتے ہو،'' میں نے کہا، ''یہ موسم تابستان کا نہیں ہے۔ تمھاری خود کی نمی شاید قلعے تک بھی قائم رہے گی اور تم اس شدید درد سے بچ جاؤ گے جس میں قیدی موت کی آرزو کرتے ہیں لیکن موت نہیں آتی۔''

''میں تکلیف میں خوش نہیں ہو سکتا،'' قیدی نے کہا۔ ''تم پوچھ رہے تھے کہ کیا میں بادشاہ بننا چاہتا تھا... کوئی ملک بھی بادشاہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کسی نہ کسی کو حکمران بننا ہی پڑتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو ملک تاراج ہو جائے گا۔ لیکن بادشاہ کو بادشاہ ہونا چاہیے، جلاّد نہیں۔''

''کیا تم بادشاہ کو جلاّد سمجھتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''سبھی عقلِ سلیم اور قلبِ صمیم رکھنے والے سمجھتے ہیں، کیونکہ حقیقی قلب رحم کے جذبات سے عاری نہیں ہوا کرتا۔ وہ صرف جلاّد ہی نہیں، بدطینت بھی ہے۔ نجومی کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی ہے۔ دس عیوب ہیں اس میں... لیکن تم نہیں سمجھو گے۔ شاید میری اس بات کا بدلہ بھی قلعے میں لے جا کر لو گے، کیونکہ وہ تمھارے لیے ہبل دیوتا کا جسمانی روپ ہو گا اور تم اس کے خلاف کچھ سننا بھی گناہ سمجھتے ہو گے۔'' قیدی کی آواز میں درد کا احساس تھا، اس کی پیشانی پر آہنی زنجیر تھوڑی سی کھنچ چکی تھی۔

Scanned with CamScanner

''تم سب ایک جیسے ہی ہوتے ہو!'' میں نے بالآخر اپنے احساسِ نفرت کو زبان دے ہی دی۔ ''تم لوگ جب تک اقتدار سے باہر رہتے ہو، اُس وقت تک تمھیں اپنے وجود میں ہر ممکن اچھائی نظر آتی ہے۔ اپنی اچھائی کو نہ صرف تم خود دیکھتے ہو بلکہ دوسروں کو دکھانے کی بھی ہر ممکن کوشش کرتے ہو... جیسے ہی طاقت اور اقتدار مل جاتا ہے تو تم سب بدطینت ہو جاتے ہو، جلاّد بن جاتے ہو۔''

''تو تم نے یہ بات مان ہی لی کہ بادشاہ بدطینت اور جلاّد ہے!'' قیدی نے سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ سی آئی۔

''میرے ماننے یا نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''نہ مجھے ہوسِ اقتدار ہے نہ میرے کوئی سیاسی عزائم ہیں۔ میں ملک کی عساکر میں رسالے کا نائب سالار ہوں... حصار شکن ہوں۔ یہی میری پہچان ہے اور یہ لقب مجھے میرے وطن نے دیا ہے۔ جو فرائض مجھے میرے ملک نے ادا کرنے کے لیے دیے ہیں، بادشاہ کوئی بھی ہو، مجھے تو بس وہی ادا کرنا ہیں۔''

''یہی تمھاری خطا بھی ہے۔'' قیدی نے سر جھکا لیا۔ ''تمھاری تربیت ہی اس انداز سے کی جاتی ہے کہ تم صرف احکام کو مانتے ہو اور سوچے سمجھے بغیر مانتے ہو۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم لوگوں کے سروں میں دماغ تو ہے لیکن عقل ہے ہی نہیں۔''

قیدی کی اس بات پر طیش کے بجائے مجھے ہنسی آ گئی۔

''ٹھیک کہتے ہو،'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر تمھارے دماغ میں عقل نام کی کوئی چیز ہوتی تو اس طرح زندانی نہ بنتے۔''

قیدی خاموش ہو گیا۔ چاشت کی دھوپ میں خنکی اور خوشگواری تو تھی لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا کہ خود کا چمڑا آہستہ آہستہ خشک ہو رہا ہے۔ قیدی بار بار سر جھکا رہا تھا۔

''شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔'' قیدی کی آواز میں مایوسی تھی۔ ''مجھ میں عقل ہوتی تو میں پہلے سپہ سالار کے رجحانات اور اس کے روّیوں کی چھان بین کرتا۔ میں تو چند ساتھیوں کی باتوں میں آ گیا کہ سپہ سالار بادشاہ سے نالاں ہے۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ سپہ سالار میری حمایت کرے گا... وہ ہوس کار تو بادشاہ ہی کی طرح بدخصلت، کینہ پرور اور جابر نکلا۔'' قیدی کی آواز میں مایوسی کے ساتھ ساتھ شکست خوردگی کا احساس بھی تھا۔

Scanned with CamScanner

''یہ خصلتیں اور جبر کسی بھی شخص کے ذہن میں منفی سوچ اور پیدا ہونے والی تاریک قوتیں ہیں،'' میں نے کہا۔ ''پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ ہم عسکری لوگوں میں عقل نہیں ہوتی؟ مثبت اور منفی سوچ تو ہر شخص میں عقل کی روشن قوت ہی سے پہچان میں آتی ہے۔''

میرے لہجے میں پوشیدہ طنز کو قیدی نے محسوس کر لیا تھا۔ اس کا سر اور جھک گیا تھا... چاشت دوپہر میں بدل رہی تھی۔ اس بار خاموشی نے طول پکڑا۔ ندی کی دونوں جانب بلند ہوتی ہوئی زمین پر بکھرے پتھروں میں اگی جھاڑیاں اب ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے سرسرانے لگی تھیں۔ گھوڑوں کے سموں کی آوازیں ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں میں تسلسل سے بلند ہو رہی تھیں، اس کے باوجود خاموشی بوجھل محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن پہلے جیسا ناگوار احساس بھی نہ تھا۔ قیدی سے تھوڑی سی گفتگو نے ناگواری کا احساس کم کر دیا تھا۔ دھوپ تیز ہونے پر بھی ناگوار نہیں تھی۔

''کیا تم بادشاہ سے نفرت کرتے ہو؟'' میں نے طویل خاموشی کو پھر توڑا۔

''مجھے اس سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔'' قیدی نے ذرا سا سر اٹھایا۔ خود کے چمڑے میں نمی کم ہو جانے اور آہنی زنجیر کے کسے جانے پر، پیشانی کے درد کی شدت کو وہ محسوس کرنے لگا تھا۔ ''اس کے لیے نفرت کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔''

''تم تو ان حلقہ ہائے زنجیر ہی سے بے حال ہو!'' میں نے قیدی کی طرف غور سے دیکھا۔ ''محل کے ناز و نعم میں پلے بڑھے ہو۔ تمھیں تو اندازہ بھی نہیں کہ قلعے میں تمھارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''

قیدی کے بدن میں جھرجھری سی نمودار ہوئی۔ اس نے جھٹکے سے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔

''جانتا ہوں کہ اب میری زندگی میں عذاب اور دردناک موت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔'' اس کی آواز میں دہشت سی نمودار ہوئی۔ ''لیکن میں اب اسے روک بھی نہیں سکتا۔'' اس کی آواز میں سنسناہٹ پھیلی لیکن جلد ہی اس کے چہرے پر نمودار ہونے والی دہشت، کرب میں بدل گئی۔ ''قصوروار اور بے گناہ لوگوں کے ساتھ بادشاہ کے بہیمانہ سلوک کو میں کتنی بار دیکھ چکا ہوں، تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ کیا تمھیں وہ معمر شخص یاد ہے... یقیناً یاد ہو گا... تم وہاں موجود تھے... وہ معمر شخص جس کی کمسن نواسی بادشاہ کو پسند آ گئی تھی۔''

"ہاں یاد ہے۔" میں نے تصور میں اس کمسن لڑکی کو دیکھا جو نیم برہنہ حالت میں، بادشاہ کے پہلو میں، اپنے نانا کی دردناک چیخیں سن کر بیہوش ہو گئی تھی۔ یہی وہ منظر تھا جس نے مجھ جیسے جنگجو سالار کی آنکھیں بھگو دی تھیں۔

"کیا تم جانتے ہو، اس بچی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" قیدی نے میری سمت دیکھا۔ پیشانی کے درد میں شدت نمودار ہونے پر اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔

"کیا ہوا تھا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اسی شب بادشاہ نے اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا... صرف اس بات پر کہ ہوس کاری کے دوران میں، بچی کی دردناک چیخوں سے بادشاہ کی عیاشی کے لمحات میں خلل آ گیا تھا۔ بادشاہ نے غضبناک ہو کر بچی کی زندگی ہی ختم کر دی۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چاروں جانب چمکتی ہوئی دھوپ ایک پل ہی میں تاریک سی ہو گئی ہے۔ ہر سمت ظلمت سی پھیل رہی ہے جس میں بے بسی کا احساس دردناک چیخوں میں [illegible] رہا ہے۔ پھر خاموشی چھا گئی... اس خاموشی میں صرف گراں جانی نہ تھی؛ درد بھی تھا اور روحانی کرب [illegible]

ندی کے دونوں کنارے اب ایک تنگ درّے میں داخل ہو رہے تھے۔ دوپہر کے سورج میں تمازت نمودار ہو کر فضا سے زمین پر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ قیدی اب وقفے وقفے سے کراہ رہا تھا۔ زندانی خود میں فشار بڑھ رہا تھا۔ ندی کے کناروں پر اب چٹانوں کے درمیان جھاڑیوں والا سنگریزوں سے اٹا راستہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اب ہمیں گھوڑوں کو آگے پیچھے لے کر چلنا تھا۔ قاعدے کے مطابق قیدی کے ابلق کو آگے اور میرے اشہب کو پیچھے چلنا تھا، لیکن میں نے کسی قاعدے کی پروا نہ کی اور اشہب کو آگے بڑھا دیا۔ زین سے، آہنی زنجیر سے بندھا ابلق پیچھے چلنے لگا۔ اب قیدی میری پشت پر تھا۔

"تم نے قاعدہ توڑا ہے۔" قیدی کی گھٹی گھٹی سی آواز آئی۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے سر میں دماغ ہے اور دماغ میں وہ ذہانت بھی ہے جو کسی شخص کو بھی اس کے ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہے، کبھی انا کی صورت میں تو کبھی خودداری کی شکل میں... ناگزیر خود اعتمادی کا احساس بن کر۔"

"کیا تم میرے والد سے میری شکایت کرو گے؟" میں نے مسکراتے ہوئے مڑ کر اسے

Scanned with CamScanner

دیکھا۔ "میرا اشہب اور تمھارا ابلق تو شکایت کر نہیں سکتے۔"

قیدی کا سر بہت جھک چکا تھا۔ وہ ابلق کی گردن پر جھکا ہوا تھا۔ "ایک زندانی کسی کی کیا شکایت کر سکتا ہے؟" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ "ہاں اگر میں قیدی نہ ہوتا تو تمھاری شکایت ضرور کرتا۔"

"تم کہتے ہو کہ ہم میں عقل نہیں ہوتی،" میں نے ہنستے ہوئے کہا، "لیکن تم خود اتنے بے عقل ہو کہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اگر تم قیدی نہ ہوتے تو تمھیں اس بات کی خبر کیسے ہوتی کہ میں نے قاعدہ توڑا ہے۔"

"کیا تم سوال و جواب سے اجتناب کرو گے؟" قیدی کی دھیمی سی آواز آئی۔ "بولنے پر مجھے پیشانی میں ٹیس اٹھتی محسوس ہوتی ہے۔"

"میں اگر تمھاری یہ خود اتار دوں تو بھی کیا ہوگا!" میں نے کہا۔ "ایک اور قاعدہ ٹوٹ جائے گا... لیکن قلعے کی فصیل نظر آتے ہی میں پھر تمھیں یہ زندانی خود پہنا دوں گا۔ قلعے کے زنداں خانے میں تو تمھیں ہر روز اس خود کو پہننا پڑے گا۔ قلعے میں تو وہ دردناک عذاب شروع ہو جائیں گے جو نہ ختم ہوتے ہیں اور نہ ہی مرنے دیتے ہیں۔"

قیدی کا سر اب ابلق کی زین سے ٹکراتا محسوس ہو رہا تھا۔

"اگر میری مدد کرنا چاہو..." قیدی کی آواز میں کپکپاہٹ کے ساتھ خوف بھی تھا۔ "تو مجھے قلعے کے زنداں خانے میں سم قاتل پہنچا دینا... میں اذیت کی موت سے تو بچ جاؤں گا۔"

ندی درّے کے اس حصے تک پہنچ چکی تھی جہاں وہ قلعے کی مخالف جانب جنگل کی پہاڑیوں میں ایک نیم دائرہ بناتی ہوئی سرحد کی سمت چلی جاتی ہے۔ دو فرسنگ پہلے وہ پھر دائیں جانب مڑتی ہے، درّہ کھل جاتا ہے اور ندی کا پاٹ چوڑا ہو جاتا ہے۔ وہیں سے قلعے کی فصیل بھی نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔

"اگر ہم یہاں سے..." میں نے کہا، "ندی کی دائیں جانب، مخالف سمت میں جنگل میں سے گزریں تو غروبِ آفتاب سے پہلے قلعے میں پہنچ جائیں گے۔ کیا تم نے یہ علاقہ دیکھا ہوا ہے؟" میں نے قیدی سے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

''ہاں . . . '' قیدی کی ڈوبتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''میں قلعے میں پہلے بھی جا چکا ہوں لیکن ایک باعزت مہمان کی طرح . . . اگر تم میری مدد کر سکو تو . . . مجھ سے سوال جواب نہ کرو۔''

''میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں کہ نہیں،'' میں نے جواب دیا، ''میں اس سلسلے میں سوچنا ہی نہیں چاہتا۔''

''تم کم از کم میرے سر کو تو اس عذاب سے نجات دلا سکتے ہو۔ یہ عذاب بزدل لوگوں کا تشکیل کردہ ہے اور تم حصار شکن ہو۔'' قیدی نے مجھ پر جذباتی دباؤ ڈالا۔ اس کا سر ابلق کی زین پر لٹکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کربناک کیفیت دکھائی دے رہی تھی۔

''میں اپنی تعریف سے متاثر نہیں ہوتا،'' میں نے کہا۔ ''نہ ہی کسی جذباتی دباؤ میں آیا کرتا ہوں۔ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ اگر میں تمھاری زندانی خود اتار بھی دوں تو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ قلعے کی فصیل نظر آنے پر مجھے پھر تمھیں خود پہنانی پڑے گی۔ وہ تمھارے لیے زیادہ تکلیف دہ ہوگی کیونکہ چمڑا خشک ہو کر اکڑ چکا ہوگا۔ دوبارہ خود پہناتے ہوئے ممکن ہے کہ تمھارے سر کی کھال اطراف سے اکھڑ جائے۔''

قیدی خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ کراہنے لگا۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ایک بے بس قیدی کو، کچھ دیر کے لیے ہی سہی، درد سے نجات دلاؤں یا نہیں۔ ایک خیال میرے ارادے کی راہ میں حائل تھا۔ اگر قیدی کی ماں، بادشاہ کی چچی نے بادشاہ کے قدموں میں سر رکھ کر، خون اور خاندان کا واسطہ دے کر، اس شقی القلب کو بھی اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ چچا زاد بھائی کو معاف کر دے، تو میری ہمدردی ہی میرے لیے مصیبت بن جائے گی۔ یہ قیدی بادشاہ کو خوش کرنے اور اپنی وفاداری کا احساس دلانے کے لیے میرے اس ہمدردانہ عمل کو میری بادشاہ سے بیوفائی بنا کر پیش کرے گا۔ یہ کہے گا کہ میرے ذہن میں بغاوت کے خیالات اور قلب میں باغیانہ جذبات موجود ہیں۔ اس کی گرفتاری میں میرے والد نے سپہ سالار سے مل کر جو کردار ادا کیا ہے، یہ رہائی کے بعد اس کا انتقام بھی لے سکتا ہے . . . اس سے ہمدردی کرنا اپنے لیے مصیبت کا در کھولنے کی مانند ہے۔ نہیں . . . میں اسے اسی حالت میں قلعے تک لے جاؤں گا۔ قیدی کے بار بار کراہنے پر مجھے بھی اس بزدلی کا احساس ضرور ہوا جو کسی بے بس معتوب کو دیکھ کر مجھے اکثر ہوا کرتا تھا۔

Scanned with CamScanner

''تم بادشاہ کے رشتے دار ہو،'' میں نے کہا۔'' چچازاد بھائی ہو . . . کیا یہ ممکن نہیں کہ تمھاری والدہ خون اور خاندان کا واسطہ دے کر تمھیں آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائے؟''

''ناممکن!'' قیدی نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔ پھر کراہنے لگا۔ پھر اس نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔'' بادشاہ بدخصلت ہے۔ وہ اپنے کیے ہوئے فیصلے کو بدلنے یا نظرثانی کرنے سے ڈرتا بھی ہے۔ دوسری جانب وہ خود کو ہُبل کی طرح ہر کمزوری سے مبرا سمجھتا ہے۔ وہ نہ میرے والد کی بات سنے گا نہ والدہ کی . . . اگر اسے غصہ آ گیا تو وہ انھیں بھی دردناک عذاب سے مروا دے گا . . . دیکھو، مجھ سے بولا نہیں جاتا . . . اگر تم مجھے اس دردناک حالت سے نکال سکتے ہو تو، کچھ دیر کے لیے ہی سہی . . . تو میں تمھارا یہ احسان اپنی آخری ہچکی تک یاد رکھوں گا۔ اگر تم مجھے اس اذیت سے نجات نہیں دلا سکتے تو مجھ پر رحم کرو . . . مجھ سے گفتگو نہ کرو۔''

خاموشی چھا گئی، بوجھل سی خاموشی۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں قیدی سے بہت سی باتیں کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اور اس میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ بھی ہونے لگا۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا، لیکن اسے بولنے میں شدید درد کا سامنا تھا۔ پھر مجھے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے مجھے بزدلی کا طعنہ دے کر جو وار کیا ہے وہ بھی کارگر ہے۔ مجھے اس بات کی خلش دل میں محسوس ہو رہی تھی کہ میں خود بھی کتنا بے بس ہوں کہ ایک بے بس انسان کو اس طرح زنجیروں میں جکڑ کر بزدلوں میں شامل ہو رہا ہوں۔ میں نے اس کی دردناک صورتحال کو محسوس کرتے ہوئے، نتائج کی پروا کیے بغیر، اس کی زندانی خود اتارنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اشہب کی باگیں کھینچیں۔ وہ سر اوپر اٹھاتے ہوئے رکا۔ پیچھے آتے ہوئے ابلق کی گردن میرے گھوڑے کی پشت سے ٹکرائی۔ قیدی کے ہونٹوں سے دھیمی سی چیخ نکلی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ گھوڑے کی گردن پر ادھ موا سا پڑا تھا۔

''تم قلعے کی عقوبت کیسے سہو گے!'' میں اشہب سے اتر کر اس کے قریب گیا۔ اپنے گھوڑے کی زین سے بندھی ہوئی آہنی زنجیر کھولی، اسے ابلق سے اتارا۔ پیشانی پر آہنی زنجیر کے فشار سے اس کی آنکھیں درد کی شدت سے اُبل رہی تھیں۔ میں نے اسے ندی کے کنارے سنگریزوں پر بٹھا دیا۔ اس کا بدن اب بھی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر چمڑا خشک ہو جانے پر خود زندانی اس قدر سخت ہو چکی تھی کہ مجھے اس کو اتارنے کے لیے بہت زور لگا کر تسمے کھولنے پڑے۔ وہ مسلسل چیخ رہا

Scanned with CamScanner

تھا۔ خود اتری تو قیدی کی پیشانی کی جلد میں دھنسے ہوئے آہنی زنجیر کے حلقے بھی اترے۔ ایک چیخ بلند ہوئی اور قیدی کی پیشانی سے خون کے قطرے بہہ کر اس کے ابروؤں میں اتر گئے۔

"عزیٰ تمھیں ہمیشہ اپنی امان میں رکھے،" قیدی نے نحیف سی آواز میں کہا۔ "ایک کرم اور کردو... مجھے ندی کے کنارے پر پانی کے پاس لے جا کر میری پیشانی ڈبو دو... یہ جل رہی ہے۔"

میں نے اسے ندی کے کنارے بٹھا دیا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے، سر کو جھکاتے ہوئے، اس نے اپنی پیشانی یوں پانی میں ڈبوئی جیسے ندی کو سجدہ کر رہا ہو۔ ندی کا پانی شورزدہ نہیں تھا پھر بھی پیشانی پر پانی لگنے سے وہ درد سے چیخا اور اس نے سر اوپر اٹھا لیا۔ خون آلود پانی اس کے چہرے پر لکیریں سی بنانے لگا۔

"مجھے پیاس لگی ہے لیکن آہنی زنجیریں مجھے پانی پینے نہیں دیتیں،" اس نے کہا۔ میں نے اپنے توشہ دان سے کاسہ نکال کر اسے پانی پلایا۔ پانی پی کر اس نے میری سمت خواب آلود سرخ آنکھوں سے دیکھا، چہرے پر درد کی کیفیت موجود تھی۔

"عزیٰ تمھیں ہمیشہ آباد رکھے،" اس نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیا تم عزیٰ کی پرستش کرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، اور کیا تم بھی؟" اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔

"ہاں، میں عزیٰ کا پرستار ہوں،" میں نے کہا۔ "یہ پرستش مجھے میری ماں نے سکھائی ہے۔"

"وہ تو پیش دادیوں میں سے ہے،" قیدی نے کہا اور مجھے حیرت ہوئی کہ وہ میرے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے۔ "پیش دادی ظالم نہیں تھے، اسی لیے تمھاری ماں کے خون میں رحم کے جذبات، اب تمھارے دل میں عزیٰ کی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں... تم نے جو کچھ میرے لیے کیا ہے... یہ رحم، یہ ہمدردی، یہ عفو و درگزر تو کوئی عزیٰ کا ماننے والا ہی اپنے دل میں دیکھ سکتا ہے... عزیٰ تمھیں ہمیشہ سلامت رکھے۔"

"لیکن میں تمھیں کچھ دیر کے لیے ہی اس عذاب سے نجات دے پاؤں گا،" میں نے کہا، اور وہ سنگریزوں پر نیم دراز ہو گیا۔ اس نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے دوپہر کا بھرپور احساس ہوا۔

"ہمارے دیوتاؤں میں سے کوئی بھی..." اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہا، "کوئی ایک بھی

ایسا نہیں ہے جس سے رحم کی امید کی جا سکے۔ ہُبل طاقت اور ہوس کا بے رحم دیوتا ہے۔ مناۃ[12] تقدیر کا دیوتا ہے، اور تقدیر کسی پر رحم نہیں کیا کرتی... کسی ایک کی اچھی تقدیر دوسرے کی بُری تقدیر سے وابستہ رہتی ہے۔ ایک عُزیٰ ہی تو ہے جو رحم کی دیوی ہے، جس میں ماں جیسی ماںتا ہے۔''

''ہم تاخیر کا شکار ہیں،'' میں نے کہا۔ ''تم زیادہ دیر آرام نہیں کر سکتے۔ یہاں سے ہم جنگل کا راستہ لیں تو شام تک قلعے میں پہنچ جائیں گے۔ میں تمھارے لیے جو کچھ کر سکتا تھا، میں نے کیا ہے، لیکن قلعے کی فصیل کو دیکھتے ہی مجھے پھر سے تمھیں اس عذاب میں مبتلا کرنا ہوگا۔ ہم اگر ندی کے ساتھ ساتھ جائیں تو رات ہو جائے گی۔ اگر مجھے تمھاری اذیت کا احساس نہ ہوتا تو ہم اب تک گھوڑے دوڑا کر جنگل پار کر چکے ہوتے۔'' قیدی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''لیکن میں جانتا ہوں کہ سرپٹ گھوڑے دوڑانے سے تمھاری موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ تم عام قیدی نہیں ہو، محل کے ایوانوں میں عیش و عشرت کی زندگی گزار چکے ہو۔ تم یہ سب کچھ نہیں سہہ سکتے اور بادشاہ تمھیں اگلے زمستاں تک زندہ بھی رکھنا چاہتا ہے... نہ جانے بادشاہ نے کیا سوچ کر تمھیں قلعے کے عقوبت خانے میں بھیجا ہے۔ تم وہ عذاب نہیں سہہ سکو گے... مر جاؤ گے... مجھے بہر حال تمھیں زندہ حالت میں قلعے میں لے کر جانا ہے۔ میں جس قدر تمھاری اذیت کم کر سکتا تھا، میں نے کر دی۔ اب ابلق پر سوار ہو جاؤ۔''

قیدی نے میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں خوف تھا اور التجا بھی تھی۔

''عُزیٰ تمھیں زندگی میں کوئی دکھ نہ دے،'' اس نے کہا۔

''کیا تم واقعی عُزیٰ کے پرستار ہو؟'' میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں،'' قیدی ابلق کے قریب آ گیا۔ میں نے اسے سہارا دے کر گھوڑے پر بٹھایا اور لمبی

12۔ مناۃ: دراصل مشتری سیارے سے منسوب ایک کنعانی دیوتا کا عبرانی نام ہے۔ یہ دیوتا رومن ایمپائر میں جوپیٹر (Jupiter) کے نام سے پوجا جاتا تھا۔ کنعان میں یہ تقدیر اور خوش بختی کا دیوتا بھی سمجھا جاتا تھا۔ اہل عرب اسے تقدیر کا دیوتا مانتے تھے۔ کعبے میں یہ ہُبل کے دائیں جانب تھا۔ توریت میں اسے منات کہا گیا ہے اور اس کا ذکر یسعیاہ باب کی آیات 11:56 میں ملتا ہے۔ عبرانی میں لفظ 'منا' کا مطلب حساب کرنا ہے اور 'منات' تقدیر بنانے والے کو کہتے ہیں۔ قرآن کی سورہ النجم میں اس دیوتا کا ذکر موجود ہے۔ آیت 25:53 میں اسے مناۃ کہا گیا ہے۔ یہ بھی ہُبل کی طرح خالصتاً عربی دیوتا نہیں تھا۔ کعبے میں صرف عُزیٰ ہی اہل عرب کی اپنی دیوی تھی۔

Scanned with CamScanner

آہنی زنجیر اپنے گھوڑے کی زین سے باندھ دی۔

''اگر تم عزیٰ کے پرستار ہو،'' میں نے اشہب پر سوار ہوتے ہوئے کہا، ''تو تمھارا ایمان بہت کمزور ہے۔ عزیٰ تو سراپا خیر کی دیوی ہے۔ وہ تو کسی کو دکھ دیتی ہی نہیں۔ وہ تو صرف دکھوں کو مٹاتی ہے۔''

''مجھے معاف کر دو،'' قیدی نے کہا۔ ''میری ذہنی حالت ایسی ہے کہ مجھے دانش کی کوئی بات سوجھ ہی نہیں رہی ہے... تم بہت اچھے انسان ہو، عزیٰ تمھیں ہر دکھ سے بچائے۔''

میرے اشہب نے ندی کے پانی کی طرف منہ گھمایا۔ میں پھر اترا۔ گھوڑوں کو بھی پیاس لگتی ہے، میں یہ بھول گیا تھا۔ میں نے گھوڑوں کو ندی کا پانی پلایا اور خود بھی شفاف پانی پیا جو آبِ زلال کی مانند تھا۔ میں نے اشہب کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ مجھے اپنے گھوڑے پر ہمیشہ سے ناز رہا ہے۔ وہ میرے اشارے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چلتا۔ میری اجازت کے بغیر اس نے پانی تک نہیں پیا تھا، اور اس کو دیکھ کر ابلق بھی پیاسا کھڑا رہا تھا۔ ہمیں تاخیر ہو رہی تھی۔ میں نے قیدی کی جانب دیکھا جو ابلق کے پانی پینے پر آگے کی سمت جھکا ہوا تھا۔

''دوپہر ڈھل رہی ہے اور میں تمھیں ندی کے کنارے کنارے ہی لے جانا چاہتا ہوں،'' میں نے کہا۔ ''جنگل کے راستے پر ہمارے گھوڑے اگر کسی درندے کو دیکھ کر بدک گئے تو تمھارا بچنا مشکل ہوگا۔''

''قلعے کے عذاب سے تو درندے کے پنجوں سے مر جانا کہیں بہتر ہوگا،'' قیدی نے کہا۔ ''کیا عقوبت خانے میں مجھے زہر لا دو گے؟''

''بہت مشکل ہے،'' میں نے جواب دیا۔ ''جس معتوب کو زندہ رکھنا ہوتا ہے، اس کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔ اس کا کھانا چکھ کر ہی اسے کھلایا جاتا ہے۔ نہ کوئی اسے مل سکتا ہے اور نہ ہی جلاد کے علاوہ کوئی اس کے پاس جا سکتا ہے۔ عقوبت دینے والے جلادوں کو جلاد خود لے کر جاتا ہے اور عقوبت کے بعد انھیں واپس بھی خود ہی لاتا ہے۔ حالت خراب ہونے پر طبیب اور کسی خادمہ کو اندر جانے کی اجازت بھی جلاد خود دیتا ہے اور خود ہی لے کر بھی جاتا ہے۔ طبیب اور خادمہ کی جامہ تلاشی بھی ہوتی ہے۔ تمھارے لیے آسان موت مرنا ممکن نہ ہوگا۔'' قیدی کے چہرے پر دہشت پھیل گئی۔ ''میں تمھاری اور کوئی مدد نہ کر پاؤں گا۔''

ہم ندی کے ریتیلے کناروں پر بکھرے سنگریزوں پر قدم قدم گھوڑوں کی ٹاپوں کو سن رہے تھے۔ قیدی کا ابلق اب میرے اشہب کے متوازی تھا۔ قیدی اب زین پر سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی

Scanned with CamScanner

پیشانی پر آہنی زنجیر کے حلقوں کے نشان اب سرخی مائل سیاہ سے نظر آ رہے تھے۔

''عزی قدم قدم تمھاری رہنما ہو،'' قیدی نے کہا۔ ''کچھ دیر کے لیے ہی سہی، تم نے مجھے اذیت سے نجات تو دی ہے۔''

''اگر تم کامیاب ہو جاتے،'' میں نے کہا، ''تو بادشاہ کا تختہ الٹ کر، خود بادشاہ بن کر وہی کچھ کرتے جو بادشاہ کر رہا ہے۔''

''نہیں!'' وہ چونک کر بولا۔ ''قطعی طور پر نہیں۔ اگر مجھے وہی کچھ کرنا ہوتا تو میں بغاوت کے لیے سازش ہی کیوں کرتا۔ قصرِ شاہی میں مجھے کس شے کی کمی تھی۔ آرام، آسائش، شراب، شباب... میں بادشاہ کے سبعہ الوان [13] پر اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا تھا۔ محل کی کوئی کنیز بھی... میں بادشاہ کی طرح شہوت پرست نہیں ہوں، لیکن خواہش کے پیدا ہونے پر کسی کنیز میں مجھے انکار کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ کون سی نعمت ہے جو مجھے میسر نہیں تھی۔ بس ایک روحانی سکون ہی ایسی شے ہے جس سے میں محروم تھا۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے رکا، پھر اس نے سر گھما کر مجھے دیکھا۔ ''لیکن میری یہ کاوش صرف میرے روحانی سکون ہی کے لیے نہ تھی۔ میری جد و جہد تو ملک و قوم کے لیے تھی، جسے بادشاہ ایک نہ ایک دن برباد کر دے گا۔''

قیدی کی اس بات پر مجھے ایک بار پھر اس خود فریبی کا خیال آیا جس کا میں ہمیشہ سے شکار ہوں۔ میں تو یہی سوچتا رہتا ہوں کہ میری خدمات ملک و قوم کے لیے ہیں لیکن میری ہر خدمت کا فائدہ تو بادشاہ ہی کو پہنچتا ہے۔

''تم ملک و قوم کے لیے کیا کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے قیدی کی سمت دیکھا۔

''اصلاحات،'' قیدی نے فوراً جواب دیا۔ ''میں اصلاحات کرنا چاہتا ہوں۔ میں موجودہ آئینِ شاہی ہی کا مخالف ہوں۔ تم نائب سالار ہو، تمھیں تو آئین کی وہ شق ہی یاد ہو گی کہ تمھاری جان، مال، خدمات سب بادشاہ کے لیے ہیں۔''

مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے قیدی نے مجھے طعنہ دیا ہو... زہریلا طعنہ۔

''میں تو یہی سمجھتا ہوں،'' میں نے جواب میں کہا، ''یہی کہ میری جان، مال اور خدمات، سب ملک و قوم کے لیے ہیں۔''

13۔ سبعہ الوان: سات قسم کے پر تکلف کھانے۔

Scanned with CamScanner

''یہی تو خودفریبی ہے!'' قیدی نے کہا۔ ''اسی خودفریبی میں وہ درباری بھی مبتلا ہیں جو سبعہ طوال ومعلقات [14] کو ہبل کے بلند مندر اور صحرائی معبد میں بطور نذر پیش کرتے ہیں لیکن بباطن ان کا یہ سپاس بادشاہ کے لیے ہی ہوتا ہے . . . اس شخص کے لیے جس میں دس عیوب موجود ہیں۔ ہر کوئی خودفریبی کا شکار ہے! میں آئین کو منسوخ کرتے ہوئے نیا آئین بناتا جو صرف ملک وقوم کے لیے ہوتا۔ کیا تم جانتے ہو کہ موجودہ آئینِ شاہی میں کیا کیا تحریر ہے؟''

''نہیں، میں نہیں جانتا،'' میں نے جواب دیا۔

''آئینِ شاہی کی ہر شق صرف اور صرف بادشاہ ہی کے مفادات کی محافظ ہے۔ چند شقیں سنا دیتا ہوں۔ ملک کی حاکمیتِ اعلیٰ بادشاہ کی ہے، اس کا ہر فیصلہ ہُبل دیوتا کا فیصلہ سمجھا جائے۔ ملک کا سارا خزانہ بادشاہ کی ملکیت ہے۔ رعایا کی جانیں بادشاہ کے لیے ہیں۔ ان کے مال و اسباب، جائیدادیں، سب بادشاہ کے لیے ہیں۔ ان کے گھروں کی عزتیں بادشاہ کے لیے ہیں۔ ان کی آمدنی کا نصف حصہ حق امیر ہے، یعنی بادشاہ کا حق ہے۔ بادشاہ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ جب اور جس وقت چاہے، رعایا کے کسی بھی فرد کو گرفتار کر سکتا ہے، وجہ بتائے بغیر اس کی جان لے سکتا ہے، جب اور جس وقت چاہے، کسی بھی فرد کے گھر، مال و اسباب اور عورتوں بچوں پر اپنی گرفت مضبوط کر سکتا ہے۔ بادشاہ کو اگر رعایا میں کوئی دوشیزہ پسند آجائے تو اسے اختیار ہے کہ اسے حرم میں داخل کرے یا کنیزوں میں شامل کرے۔ بادشاہ کو اگر کوئی بیاہتا عورت پسند آئے تو اس عورت کے خاوند پر لازم ہے کہ وہ اپنی عورت بخوشی بادشاہ کو پیش کر دے۔ دوسری صورت میں بادشاہ کو اختیار ہے کہ وہ پسندیدہ عورت کے شوہر کو زندگی سے محروم کر دے۔ بادشاہ کو اختیار ہے کہ وہ جسے چاہے، دربار میں منصب عطا کرے اور جسے چاہے وجہ بتائے بغیر معزول کر دے۔ بادشاہ قانون سے بالاتر ہے۔ بادشاہ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ جب چاہے، عساکر کو میدانِ جنگ میں لے جائے یا بھیج دے۔ عساکر کی جانیں، وفاداری اور خدمات بادشاہ کے لیے ہیں۔'' قیدی کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ''اور تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تمھاری جان، وفاداری اور خدمات ملک وقوم کے لیے ہیں . . . کیا یہ خودفریبی نہیں ہے؟ میں موجودہ آئینِ شاہی کو فسخ کرتے ہوئے ملک وقوم کو نیا آئین دینا چاہتا ہوں . . . ظلم وجبر کی اس سیاہ

14۔ سبعہ طوال ومعلقات: فصحائے عرب کے سات قصیدے، جو ازراہِ تفاخر کعبے کے دروازے پر لٹکائے جاتے تھے۔

رات کو ایک آفتابِ نو دکھانا چاہتا ہوں۔ میں نئے آئین میں بادشاہ کے سارے اختیارات کو محدود اور مشروط کرنا چاہتا ہوں۔ میں کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے ایک مجلسِ شوریٰ تشکیل دینا چاہتا ہوں جس میں کثرتِ رائے سے کیے ہوئے فیصلے کو ماننا بادشاہ کا فرضِ اولین ہو۔ اس مجلس میں میں زندگی کے ہر شعبے سے ماہرین کو نمائندگی دینا چاہتا ہوں۔ میں بادشاہ کی مطلق العنانیت کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ بادشاہ کی حیثیت حاکمِ اعلیٰ کی نہیں بلکہ خادمِ ملک وقوم کی ہو۔ میں ملک وقوم کی خوشحالی چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص کسی خوف کے بغیر زندگی گزارے، اور عام شخص تو کیا، خود بادشاہ بھی کسی الزام کے عائد کیے جانے پر دارالقضاۃ میں قاضی القضات کے سامنے جوابدہ ہو۔ بادشاہ کو بھی ملزموں کی طرح کھڑا ہونا پڑے۔ میں چاہتا ہوں کہ رعایا میں ہر فرد اپنی صلاحیت کے مطابق ترقی کرے اور کسی پر بھی ترقی کی راہ مسدود نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ملک میں ہر شخص کی عزت محفوظ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ مجلسِ شوریٰ کی اجازت کے بغیر بادشاہ عساکر کو میدان جنگ میں نہ بھیج سکے... لیکن شاید یہ مناۃ کو منظور نہیں تھا۔ اس نے میری تقدیر کا رخ پستی کی سمت موڑ دیا ہے۔"

قیدی خاموش ہو گیا۔ میں حیرت زدہ تھا کہ بدخصلت، بدطینت بادشاہ کا چچازاد اتنے اعلیٰ خیالات رکھتا ہے۔ میں ششدر تھا کہ انصاف کا خون کرنے والے بادشاہ کا چچازاد اس قدر انصاف پسند ہے... میں پریشان تھا کہ میں اس شخص کو جلادوں کے حوالے کرنے جا رہا ہوں جس کے دل میں ملک وقوم کی بھلائی پوشیدہ ہے۔

"تم یہ تو جانتے ہی ہو گے کہ بادشاہ بے حد حریص ہے۔ وہ ملک کی توسیع چاہتا ہے، ملک وقوم کی بھلائی کے لیے نہیں، ذاتی مفادات کے لیے۔" قیدی کی آواز رازدارانہ ہو گئی۔ "بادشاہ کے جاسوسوں نے اسے بتایا ہے کہ شمال مشرقی ممالک میں بے اندازہ دولت موجود ہے۔ ان کے معبد خالص سونے کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے دیوتاؤں کا ہر بت طلائی ہے جن پر بیش قیمت ہیرے جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ بادشاہوں کے خزانے دولت سے بھرپور ہیں، زروجواہر کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں... بادشاہ عنقریب شمال مشرقی ممالک پر حملے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

قیدی کی اس بات پر میرے سر نے جھٹکا کھایا۔ چند روز پہلے میرے والد نے مجھے کہا تھا کہ

Scanned with CamScanner

شاہی رسالے میں توسیع ناگریز ہے۔ ہمیں عنقریب کچھ مہمات درپیش ہوں گی۔ ہمیں سمندر پر سے بھی گزرنا ہوگا، ہمیں بادبانی جہازوں کی بھی ضرورت ہوگی۔ یہ مہمات طویل دورانیے کی ہوں گی...
میں نے والد کی بات پر کوئی خاص توجہ نہ دی تھی۔ اس انکشاف پر کہ بادشاہ شمال مشرقی ممالک پر حملہ کرنا چاہتا ہے، میرے حواس پوری طرح بیدار ہو گئے۔ میں بادشاہ کی نیت کے ساتھ، منصوبہ بندی بھی جاننا چاہتا تھا جو بادشاہ کے چچازاد کو معلوم ہوگی۔

''بادشاہ کا ارادہ بد ہے،'' اس نے پھر رازداری سے کہا۔ ''وہ ایک کے بعد ایک، تمام شمال مشرقی ممالک کو تاراج کرنا چاہتا ہے۔ وہ خفیہ منصوبہ بندی بھی کر چکا ہے جس سے سپہ سالار اور چند وزیر ہی واقف ہیں۔ خود مجھے بھی تفصیل معلوم نہیں، اتنا جانتا ہوں کہ وہ جلد ہی اپنی منصوبہ بندی پر عمل کرنے والا ہے۔ وہ ملک سے دور، اہل و عیال سے دور، ماں باپ بہن بھائیوں اور بیویوں سے دور، سینکڑوں سواروں، ہزاروں سپاہیوں کو اپنی ہوسِ ملک گیری کی خاطر خاک و خون میں ملانا چاہتا ہے...
میں یہ نہیں چاہتا، اسی لیے بادشاہ کا تختہ الٹنے کے لیے میں نے اپنا گروہ بنایا تھا لیکن سپہ سالار بادشاہ ہی کی طرح ہوس کا اسیر ہے، اس نے میرا منصوبہ خاک میں ملا دیا ہے۔'' قیدی نے گہرا سانس لیا۔ ''بادشاہ کو جاسوسوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ شمال مشرقی ممالک میں حسن و جمال کا بھی خزانہ موجود ہے، وہاں کی دوشیزائیں نہایت حسین وجمیل ہیں... بادشاہ انتہا کا شہوت پرست ہے۔ وہ خود کو زمین پر ہُبل کا روپ سمجھتا ہے اور جنسی تسکین کو عبادت کا درجہ دیتا ہے۔ نفسانی خواہشات کو ہُبل کی عطا کردہ خواہشات سمجھتا ہے اور ان خواہشات کی آسودگی کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ جاسوسوں نے اسے یہ بھی بتایا ہے کہ شمال مشرقی ممالک کی دوشیزائیں صحرائے عرب کی حوروں[15] سے زیادہ حسین ہیں۔ وہاں کی دوشیزائیں گداز بدن

15۔ حور: عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا لغوی مطلب سفیدی ہے۔ توریت کے باب استثنا میں ایک حوری قبیلے کا ذکر موجود ہے جو ابرہام (ابراہیم) کے دور میں یا اس سے بھی پہلے کوہ شعیر کے دامن میں رہتا تھا۔ اس قبیلے کی عورتیں بے حد خوبصورت تھیں۔ توریت ہی کے باب پیدائش کی آیات نمبر 6:14 میں تحریر ہے کہ کدرلاعمر نے اس قبیلے پر فتح حاصل کی تھی اور یعقوب یعنی اسرائیل کے بھائی عیسو کی آل اولاد نے حوریوں کو ان کی وادی سے نکال کر اس جگہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ عربی زبان میں 'حور' کا لغوی مفہوم سفید رنگ اور سیاہ چشم والی وحشی عورت ہے۔ پشتو زبان میں بھی حور کے معنی وحشی حسینہ کے ہیں۔ ایک قدیم سندرہ کے بول ہیں: یا حورا وحشی خبرا سینا... بی بی شرینے۔

Scanned with CamScanner

رکھتی ہیں اور ہماری عورتوں سے کہیں زیادہ باعثِ آسودگی ہیں، خصوصاً ساسانیوں کی شہزادیاں تو تصوراتی پریوں جیسی ہیں . . . بادشاہ اپنی ہوسِ نشاط کی خاطر ان شہزادیوں اور دوشیزاؤں کے خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ ہوسِ زروجواہر اور ہوسِ رجولیت کے لیے قوم کے ہزاروں نوجوانوں کو میدانِ جنگ میں کٹوانے پر آمادہ ہے۔ قوم کے ہزاروں جوان اس عربدہ جوئی کی نذر ہو جائیں گے۔ ان میں سے ایک تم بھی ہو . . . '' قیدی نے میری طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے لیکن آنکھوں میں چمک تھی۔

''میں . . . '' میرے ہونٹوں پر الفاظ میرے اس خیال کا ساتھ نہیں دے رہے تھے جسے میں بیان کرنا چاہتا تھا۔ ''میں بزدل نہیں ہوں، جنگجو ہوں۔'' میرے ذہن میں کشمکش سی تھی کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، کہوں کہ نہ کہوں۔ ''تم جانتے ہو، میں حصار شکن ہوں۔ میں میدان جنگ میں جانے سے نہیں ڈرتا،'' میں نے اپنے خیال کو زبان دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس قسم کی مہم جوئی کا بھی قائل نہیں ہوں جو فردِ واحد کے لیے ہو، کیونکہ میرے نزدیک جارحیت کے مقابلے پر ملک وقوم کا مضبوط دفاع زیادہ اہم ہے۔''

''یہی تو میں چاہتا ہوں،'' قیدی نے کہا۔ ''میں بھی ملکی دفاع کو اہم ترین سمجھتا ہوں تا کہ ملک خوشحال ہو سکے اور بیرونی جارحیت کا کوئی خطرہ ہی نہ رہے۔ ایسا جارح بننا تو مجھے کسی صورت بھی منظور نہیں جس میں ایک شخص کے مکروہ عزائم ہوس کی آلائش بن رہے ہوں۔''

خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی میں میرا ذہن تیزی سے خیالات کے دھارے پر فیصلے کا بند باندھنا چاہتا تھا۔ سہ پہر کا تاثر بھی زوال پذیر تھا۔ آفتاب مغرب کی سمت جا رہا تھا اور ابھی پہاڑی درّے کے درمیان بہنے والی ندی کے بائیں جانب قلعے کی سمت مڑنے میں چار فرسنگ اور تھے۔

''اب کیا ہو سکتا ہے!'' میں نے کہا۔ ''تم ناکام ہو چکے ہو۔ تمہارے ساتھی آرے سے چروا دیے گئے ہیں اور تم قلعے کی عقوبت گاہ میں جا رہے ہو . . . میں تم سے متفق ضرور ہوں لیکن میں بھی کیا کر سکتا ہوں۔''

قیدی خاموش ہو گیا اور یہ خاموشی طویل تھی۔ میں اپنے خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے بادشاہ سے نفرت تھی، ہے اور رہے گی . . . اگر یہ سب باتیں مجھے پہلے سے معلوم ہو جاتیں تو میں بادشاہ کے

Scanned with CamScanner

چچازاد کی حمایت ضرور کرتا۔ اگر مجھے ان معلومات سے کچھ دن پہلے آگاہی ہو جاتی، اگر میں ان معاملات کو جان جاتا، تو میں سپہ سالار کی گردن اڑا دیتا اور بادشاہ کو بھی ایک ہی وار میں دولخت کر دیتا۔۔۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟

ندی کا پاٹ بہت آہستگی سے، غیر محسوس انداز میں، چوڑا ہوتا جا رہا تھا۔

"اگر مجھے یہ سب کچھ۔۔۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "یہ سب کچھ پہلے معلوم ہوتا تو میں یقیناً تمھاری طرفداری کرتا۔ اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

قیدی کے اس جملے پر میرا سر جھٹکے سے اس کی جانب مڑا، وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ "اگر ارادہ ہو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"کیسے؟" یہ سوال کرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں باغی ہو رہا ہوں۔

"کیا میرا ساتھ دے سکتے ہو؟" قیدی نے کہا۔ "ہم اب بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے براہ راست اس کے ارادے پر سوال کیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔

"ہم اب بھی بدطینت بادشاہ سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔" قیدی کی آواز میں اعتماد تھا۔ "میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس ملک میں بادشاہ کا تختہ الٹنے کے لیے دوبارہ منصوبہ بندی ممکن نہیں ہے۔ تم بھی یہ جانتے ہو گے کہ یہ پہاڑی درّے کی ندی جب بائیں جانب مڑ کر قلعے کی سمت جائے گی، تو وہاں سے، ندی کے موڑ سے سیدھا جائیں تو سرحد دو فرسنگ دور ہے۔"

"کیا؟" میں گھبرا گیا۔ "تم فرار ہونا چاہتے ہو؟"

"اکیلا نہیں،" قیدی نے کہا، "تمھارے ساتھ۔۔۔ اگر ہم فرار ہو جائیں تو سرحد پار کے بادشاہ سے ملنا کوئی دشوار بات نہ ہوگی۔ سرحدی چوکی کا نگران مجھے جانتا ہے۔ میں ایک دو بار وفود کے ساتھ وہاں سے گزرا ہوں۔ وہ ہمیں اپنے بادشاہ کے دربار میں پہنچا دے گا۔ ہم وہاں بادشاہ کو تمام صورتحال سے آگاہ کر دیں گے اور پھر تمام شمال مشرقی ملکوں میں جا کر وہاں کے درباروں میں بادشاہوں کو خبردار کر دیں گے کہ ہمارے بدطینت بادشاہ کے عزائم جارحانہ ہیں۔ ہم کہیں گے کہ کوئی ایک ملک بادشاہ کی

یلغار کو نہیں روک سکے گا۔ اس کے لیے ایک وسیع اتحاد کی ضرورت ہو گی۔ سب مل کر ہماری مدد کریں تو ہم نہ صرف ان کے دفاع کے ضامن بن جائیں گے بلکہ بادشاہ کے ختم ہو جانے پر علاقائی امن کا باعث بھی بن جائیں گے۔ شمال مشرقی ممالک کی سلامتی ہماری سلامتی سے متصل ہو جائے گی۔ وہ ہماری سلامتی اور استحکام کو اپنی سلامتی اور استحکام کے لیے ناگزیر سمجھیں گے۔ بادشاہ کے زوال پر ہی ہم ملک وقوم کو نیا آئین دے پائیں گے... تمھاری کیا رائے ہے؟''

قیدی نے آخری سوال اس انداز میں کیا جیسے اسے یقین ہو چکا ہو کہ میں اس کا ساتھی بن چکا ہوں، اور میرا عندیہ بھی جان چکا ہو۔ ''کیا یہ ملک وقوم کے ساتھ غداری نہ ہو گی؟'' میں نے کہا۔ ''جنگ تو پھر بھی ہو گی۔ تم نے محل کا عیش و آرام ہی دیکھا ہے، میدان جنگ کی عقوبتوں سے ناآشنا ہو... جنگ ہوئی تو ہمارے ہزاروں جوان ہلاک ہو جائیں گے۔ کوئی بادشاہ لڑے بغیر تخت و تاج نہیں چھوڑا کرتا۔ پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ شمال مشرقی ممالک کے بادشاہ متحد ہو جائیں گے؟ ان کے آپس میں بھی تو اختلافات ہوں گے... ساسانیوں سے وہ ہمیشہ خوفزدہ رہتے ہیں۔ اتحاد برابری کی بنیاد پر ہوتا ہے، ساسانی برابری کی بنیاد پر اتحاد میں کبھی بھی شامل نہیں ہوں گے... اس بات کی بھی کیا ضمانت ہے کہ وہ ہماری مدد کریں گے؟''

قیدی نے آگے جھکتے ہوئے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ گھوڑے سنگریزوں پر قدم قدم چل رہے تھے۔

''ضمانت ان کی اپنی بقا ہے،'' قیدی نے کہا۔ ''وہ اپنی اپنی سلامتی کے لیے نہ صرف متحد ہو جائیں گے بلکہ ہماری مدد بھی کریں گے... نہ بھی کریں تو بھی انھیں اپنے دفاع کے لیے تو متحد ہونا ہی ہو گا۔ بادشاہ اپنے جارحانہ عزائم سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔ وہ بدخصلت اور حریص ہے۔ وہ جب کوئی ارادہ کر لیتا ہے تو اس کی دانش مر جاتی ہے۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ ساسانیوں کے سوا شمال مشرق کی کوئی ریاست تنہا اپنا دفاع نہیں کر سکتی، لیکن ساسانی بھی اتنی بات تو آسانی سے سمجھ لیں گے کہ اگر بادشاہ نے تمام جزیرہ نمائے عرب پر قبضہ کر لیا تو وہ اتنا بڑا اور ناقابلِ تسخیر لشکر تیار کرے گا جس کا مقابلہ ساسانی لشکر نہیں کر پائے گا۔ بادشاہ جزیرہ نمائے عرب پر اپنی فتوحات مکمل کرنے کے بعد ہی ساسانیوں پر حملہ کرے گا، جسے روکنا آذر جمشید جیسے بادشاہ کے لیے ممکن نہیں ہو گا۔ وہ صلح پسند

بادشاہ ہے۔" قیدی نے پہلی بار ساسانی بادشاہ کا نام لیا، آداب شاہانہ کے مطابق کسی بادشاہ کا نام لینا بے ادبی سمجھی جاتی ہے۔ "اگر ہم ساسانیوں سمیت تمام شمال مشرقی ریاستوں کو متحد کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمارا راستہ بھی صاف ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ کوئی بادشاہ بھی عربدہ جوئی کے بغیر تاج و تخت نہیں چھوڑتا، تو میں تمھاری اس بات کو مانتا ہوں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی بادشاہ کو اپنی شکست کا یقین ہو جائے تو وہ مصالحت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر تمام شمال مشرقی ممالک کی افواج ایک ساتھ ہو جائیں تو ہماری عسکری قوت سے کم از کم بیس گنا زیادہ قوت کے ساتھ ہماری سرحدوں پر جمع ہوں گی۔ بادشاہ عساکر کا یہ جم غفیر دیکھے گا تو اس کا حوصلہ ٹوٹ جائے گا، وہ مصالحت پر آمادہ ہوگا، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مصالحت کرنے والے بادشاہ کا زوال مصالحت کے ساتھ ہی شروع ہو جایا کرتا ہے۔ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ ہم جنگ کیے بغیر ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔" قیدی زین پر سیدھا بیٹھ گیا۔ "میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ بادشاہ بزدل ہے۔ اس کی خصلت کی یہی بزدلی اسے مصالحت پر آمادہ کرے گی۔" قیدی کا لہجہ پر اعتماد تھا۔

"میں یہ مانتا ہوں۔۔۔" میں نے کہا۔ "ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں ہے لیکن کیا تم اس بات کو جھٹلا سکتے ہو کہ دس عیوب ہونے کے باوجود وہ ایک کامیاب بادشاہ کیوں ہے؟ وہ بزدل ہی سہی، سپہ سالار تو بزدل نہیں ہے، نہ ہی عساکر میں بزدلی ہے۔ وہ تو دفاع کے لیے کٹ مرنے پر تیار ہو جائیں گی۔"

قیدی نے لمحہ بھر جیسے کچھ سوچا۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ بادشاہ مطلق العنان ہے؟ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ آئین کی ہر شق بادشاہ ہی کے لیے ہے۔ اگر وہ مصالحت پر آمادہ ہو جائے گا تو سپہ سالار بے بس ہو جائے گا۔ بادشاہ با اختیار ہے۔۔۔ اسے مصالحت پر آمادہ کرنا میرا کام ہوگا۔ میں تمھیں یہ بات بھی بتا دوں کہ اب بھی دربار میں میرے حامی موجود ہیں۔ میں ان سے خفیہ روابط استوار کروں گا اور وہی بادشاہ کو مصالحت پر آمادہ کریں گے۔۔۔ رہی رعایا، تو وہ پہلے ہی سے بادشاہ کی سنگدلی سے نالاں ہے۔"

لمحے بھر کے لیے میرے تصور میں اس درباری کا چہرہ اپنی جھلک دکھا گیا جس نے میرے باپ پر طعنہ زنی کی تھی کہ کیا حصار شکن کو بھی دستے کی ضرورت ہے۔ مجھے اس کے چہرے پر مکاری سی نظر آئی تھی اور اس کی آنکھوں میں عیارانہ چمک بھی دکھادی تھی۔ کیا بادشاہ کا چچازاد۔۔۔ میں نے سوچا،

Scanned with CamScanner

پہلے سے طے شدہ کسی منصوبہ بندی کے تحت میرے ساتھ فرار ہونا چاہتا ہے؟ میں تذبذب میں تھا۔

''ہم دونوں میں سے کوئی نہیں جانتا،'' میں نے قیدی کو کریدتے ہوئے کہا، ''سرحد پار کرنے کے بعد ہمارے ساتھ کیا ہوگا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ پڑوسی ملک کا بادشاہ مجھ جیسے حصار شکن کا سر کندھوں سے جدا کر دے کیونکہ میں نے پچیس سواروں میں سے جو پندرہ سوار قتل کیے تھے، پڑوسی ملک ہی کے تھے۔ اور کیا خبر، وہ تمھیں بھی اس کے ملک پر حملہ نہ کرنے کی شرط پر بادشاہ کے حوالے کر دے۔''

میری اس بات پر قیدی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو! بادشاہ ہی کے جاسوس شمال مشرقی ممالک میں سرگرم ہیں۔ ان کے جاسوس بھی ہمارے ملک میں ہوں گے جو پل پل کی خبر انھیں پہنچاتے ہوں گے۔ ان ممالک میں یہ خبر تو پہنچ ہی چکی ہوگی کہ میں نے بادشاہ کا تختہ الٹنے کی کوشش کی ہے، میرے ساتھی آرے سے چروا دیے گئے ہیں اور مجھے قلعے کے عقوبت خانے میں بھیجا گیا ہے۔ انھیں بادشاہ کے اس ارادے کی خبر نہ بھی ہو جس کے زیرِ اثر وہ ان کے ملک پر حملہ کرنا چاہتا ہے، تو بھی وہ بادشاہ کی خصلتِ بد سے تو آشنا ہیں کہ وہ قابلِ اعتماد نہیں ہے، عہد شکن ہے۔ وہ میری بغاوت کی اساس تک تو پہنچ ہی چکے ہوں گے... وہ تمھیں میرے ساتھ دیکھ کر گزشتہ تمام تلخیوں کو بھول جائیں گے۔ جب کوئی بڑا مقصد درپیش ہو تو انتقام جیسے چھوٹے چھوٹے مقاصد بے معنی ہو جایا کرتے ہیں۔ وہ مجھے اور تمھیں کبھی بھی، کسی قیمت پر بھی، بادشاہ کے حوالے نہیں کریں گے۔ وہ ہمیں اپنی بقا کا ضامن سمجھیں گے۔ تم اس گمان کو اپنے ذہن سے نکال دو، ہم محفوظ رہیں گے۔''

قیدی کے استدلال میں وزن تو تھا لیکن میرے شکوک برقرار تھے۔

''ایک اندیشہ تو ایسا ہے، جس سے تم بھی انکار نہیں کرو گے،'' میں نے کہا۔ ''میں شمال مشرق کی دوسری ریاستوں سے متعلق تو نہیں جانتا لیکن ساسانیوں سے متعلق میرا اندیشہ صداقت پر مبنی ہے۔ وہ ہوسِ ملک گیری سے مبرا تو نہیں ہوں گے۔ انھوں نے اپنے کئی پڑوسی ملکوں کو تاخت و تاراج کیا ہے۔ کیا وہ ہمارے ملک کی سرحد پر پہنچ کر آسانی سے واپس لوٹ جائیں گے؟ کیا وہ ہمارے ملک کو تاراج نہیں کریں گے؟''

''تم صرف ایک جنگجو ہو۔'' قیدی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی نمودار ہوئی۔ ''تم سب معاملات

Scanned with CamScanner

کو شمشیر و سناں کے اہداف پر ہی رکھتے ہو۔ تمھیں وہ ناوک چلانا نہیں آتا جسے سیاست کہا جاتا ہے۔ کیا میں اتنا بیوقوف ہوں کہ حفظِ ماتقدم کے بغیر ہی ساسان جیسی قوت کو اپنی سرحد پر لے آؤں گا؟ کیا میں کم عقل ہوں؟ کیا نہیں جانتا کہ ساسانی ہی وہ طاقت رکھتے ہیں جو ان پر حملہ آور کا منھ توڑ جواب دے سکتی ہے؟ وہ بہت مضبوط ہیں اور اپنے ملک کا دفاع کر سکتے ہیں، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اگر بادشاہ نے سارے جزیرہ نمائے عرب پر قبضہ کر لیا تو ساسانی بے بس ہو جائیں گے۔ وہ اتنا بڑا لشکر تیار کر لے گا جو ساسانیوں سے تیرہ گنا ہوگا۔ ساسانی اسے نہیں روک پائیں گے... میں ساسانی بادشاہ کو اسی اندیشے میں مبتلا کروں گا۔ عاقل ہے، سمجھ جائے گا کہ وہ اکیلا خطرے کا مقابلہ نہیں کر پائے گا اور خطرے کو وقت سے پہلے روکنا ہی دانشمندی ہے۔ میں نادان نہیں ہوں کہ کسی معاہدے کے بغیر ساسانیوں اور دیگر ممالک کے لشکر اپنی سرحد پر لے آؤں۔ میرا معاہدہ مشروط ہوگا اور شرط اول یہی ہوگی کہ بادشاہ کا اقتدار ختم ہونے پر تمام اتحادی ممالک ایک دوسرے کی آزادی اور خودمختاری کا احترام کریں گے، ایک دوسرے کے خلاف لشکر کشی نہیں کریں گے۔ اور یہ ضمانت اتحاد سے پہلے نہ صرف فراہم کی جائے گی بلکہ اتحادی دستاویز میں تحریر ہوگی۔ معاہدے میں طویل المیعاد امن کی یقین دہانی ہوگی۔ معاہدہ چمڑے کا ایک ٹکڑا نہیں ہوا کرتا، اس پر انگشتریوں کی مہریں ثبت کی جاتی ہیں۔''

قیدی نے سامنے دیکھا۔ ندی کا وہ موڑ جو بائیں جانب قلعے کی سمت مڑتا ہے، چمکتے ہوئے پانی کا مڑتا ہوا دھارا سا نظر آنے لگا تھا۔ میرے ذہن پر گمان کی مغلوبیت کا کہرا چھٹ رہا تھا لیکن ایک خیال ابھی بھی مجھے پریشان کر رہا تھا۔

''سپاہ کا کوچ...'' میں نے کہا، ''کسی سرحد پر اجتماع، ہتھیار، جنگی ساز و سامان، جنگی حکمت عملی... یہ سب کچھ دولت کے بغیر ممکن نہیں ہوا کرتا۔ اخراجات کی ادائیگی، اور وہ بھی کسی سودمندی کے بغیر... کون راضی ہوگا؟''

''یہ مجھ پر چھوڑو،'' قیدی نے کہا۔ ''معاہدے میں یہ شق شامل ہوگی کہ تمام لشکروں پر آنے والے اخراجات کا تخمینہ لگایا جائے گا، جسے تمام اتحادی ملک مل کر ادا کریں گے۔ اخراجات کی برداشت باہمی ہوگی۔ جب مستقبل میں سلامتی اور بقا کا مسئلہ درپیش ہو تو کوئی ملک بھی بخل سے کام

نہیں لیا کرتا کیونکہ ملکی اور قومی سلامتی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔''

ہم آہستہ آہستہ ندی کے اس موڑ کے قریب پہنچ رہے تھے جہاں سے وہ قلعے کی سمت مڑ جاتی ہے، ندی کا پاٹ چوڑا ہو جاتا ہے اور وہ پایاب نہیں رہتی۔ موڑ پر ندی پایاب تھی۔ ہم ندی کے دائیں جانب چل رہے تھے۔ اگر ہم اسی طرح ندی کے دائیں کنارے پر ہی چلتے رہتے تو ہمیں قلعے تک پہنچنے کے لیے ندی عبور کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ قلعہ ندی کے دائیں کنارے پر ہے۔ میں نے ندی کے بائیں کنارے پر جانے کے لیے گھوڑوں کو ندی کے پانی میں اتارا۔ اشہب ندی کے پایاب پانی میں بکھرے پتھروں پر سم جماتے ہوئے چھینٹے اڑانے لگا۔ اس کے پیچھے ابلق بھی چھپا کے اڑاتا چلا آرہا تھا۔ ہم ندی کے بائیں کنارے پر پہنچ گئے۔

''تو تم نے میری مدد کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا!'' قیدی نے خوشگواری سے کہا۔ خاصا زیرک تھا، سمجھ گیا کہ ندی کے بائیں کنارے پر آنے کا مطلب یہی ہے کہ ہم قلعے کی سمت نہیں، سرحد کی سمت جا رہے ہیں۔ ہم نے گھوڑوں کو پانی پلایا۔ میرے آبدان میں کافی پانی موجود تھا، میں نے اشہب پر بیٹھے بیٹھے آبدان کھولا۔

''پانی پیو گے؟'' میں نے قیدی سے پوچھا۔

''نہیں، ابھی نہیں،'' قیدی نے جواب دیا۔ ''مجھے پیاس نہیں ہے۔''

گھوڑوں کو پانی پلانے کے بعد ہم سرحد کی طرف چل دیے جو دو فرسنگ دور تھی۔ میں نے ابھی تک بادشاہ کے چچازاد کے بدن پر بندھی زنجیریں نہیں کھولی تھیں۔

''مجھے بادشاہ سے نفرت تھی، ہے اور رہے گی،'' میں نے کہا۔ ''اگر میں تمھاری تمام باتوں پر یقین کر لوں تو کوئی وجہ نہیں کہ میں تمھاری مدد نہ کروں، لیکن ایک اندیشے نے ابھی تک مجھے تمھارے آہنی بند کھولنے سے روکا ہوا ہے۔''

''تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو،'' قیدی نے کہا۔

''بات اعتماد کی نہیں ہے،'' میں نے کہا۔ ''اگر میں تمھارے بند کھول بھی دوں اور تم فرار ہونا چاہو، تو بھی تم ایسا نہیں کر پاؤ گے۔ میری گرفت سے نہ تم بچ سکتے ہو، نہ ہی میرے اشہب کی دوڑ سے تمھارا ابلق بچ سکتا ہے۔۔۔ میرا اندیشہ کچھ اور ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اگر میرا اندیشہ درست ہے تو مجھے

تمھیں واپس قلعے لے کر جانا ہوگا۔''

''میں جانتا ہوں،'' قیدی نے کہا۔ ''اگر میرے ہاتھ میں شمشیرِ آبدار بھی ہو، تو بھی میں حصار شکن سے بچ نہیں سکتا... کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ تم کیا سوچ رہے ہو؟''

''مجھے اپنے والد اور والدہ کا خیال آرہا ہے،'' میں نے کہا۔ ''میرے فرار ہو جانے پر وہ شاہی عتاب کا شکار نہ ہو جائیں۔ میری والدہ پیش دادیوں میں سے ہے۔ اس کے لیے کسی بھی عرب کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہ ہوگا... اور بادشاہ کے سینے میں تو دل ہی نہیں ہے۔''

''تمھارا اندیشہ تمھیں گمراہ کررہا ہے۔'' قیدی نے کہا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہوگا... اندیشہ تو مجھے ہونا چاہیے، میرا بوڑھا باپ اور عمر رسیدہ ماں ابھی تک محل ہی میں ہیں... خطرہ تو ان کی زندگیوں کو ہے۔ تمھارے والد تو بادشاہ کے پسندیدہ خواص میں شامل ہیں۔ پھر یہ کہ بادشاہ کو کیونکر پتا چلے گا کہ تم میرے ساتھ فرار ہو گئے ہو؟ دربار میں یہی خیال مستحکم ہوگا کہ میرے ساتھیوں نے حملہ آور ہو کر تمھیں مار کر مجھے چھڑا لیا ہے۔ رسالے کا دستہ تمھاری تلاش میں... تمھاری نعش کی تلاش میں نکلے گا اور آسمان پر کرگسوں کی اڑانیں دیکھ کر جنگل میں بھٹکے گا، اور وہ وزیر زیرِ عتاب ہوگا جس نے تمھارے والد کو طعنہ دیا تھا۔''

''میرے خیال میں درباری ایسا نہیں سوچیں گے،'' میں نے کہا۔ ''تم پھر یہ بھول گئے ہو کہ میں حصار شکن ہوں۔ چند حملہ آور میرا راستہ نہیں روک سکتے۔''

قیدی خاموش ہو گیا۔ گھوڑے سرحد کی سمت قدم قدم جا رہے تھے۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ رک جاؤں یا بادشاہ کے چچازاد کے ساتھ فرار ہو جاؤں۔

''میں یہ جانتا ہوں کہ دربار میں تم حصار شکن کے نام سے صرف جانے ہی نہیں جاتے، تم پر سب کو اعتماد بھی ہے،'' قیدی نے کہا۔ ''لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر بادشاہ کو پتا چل گیا کہ تم نے میرا ساتھ دیا ہے تو خود تمھارے والد بادشاہ سے تمھاری موت مانگیں گے۔''

میں نے قیدی کی طرف دیکھا جو دور سرحد کی سمت دیکھ رہا تھا جو چٹانوں اور گھنے درختوں کے پیچھے نگاہوں سے اوجھل تھی۔

''کیا یہ ایک بیٹے کے لیے صائب ہوگا کہ والد اس کی موت مانگے؟'' میں نے کہا۔ ''یا پھر...

Scanned with CamScanner

کیا یہ باپ کے لیے صائب ہوگا کہ وہ اپنی ذرّیت کو خود ہی معدوم کرنے کی خواہش کرے؟"
"دیکھو... " قیدی کی آواز بہت دھیمی ہوگئی۔ "ہم اپنی زندگی کی وہ عظیم جدوجہد کرنے والے ہیں جس سے ہمارے ملک کے ہزاروں فرزند اور والد سر اٹھا کر چلنے کا حوصلہ پائیں گے۔ ہماری مائیں اپنے بیٹوں کی کھالوں کو بادشاہ کے جوتوں کے نیچے غالیچے نہیں بننے دیں گی۔ والدین اپنی بیٹیوں کو بادشاہ کی ہوس پر قربان نہیں کریں گے... کسی نانا کو کمسن نواسی کے سامنے آرے سے نہیں چروایا جائے گا۔" قیدی نے پھر میرے دل کے اس نہاں گوشے میں میرے احساس کو جگایا جہاں چھپے ہوئے غم واندوہ کے سم آلود خاروں کی خلش میں ہمیشہ محسوس کرتا رہا ہوں۔ "والدین کا فکر صرف تمھیں ہی نہیں!" قیدی کی آواز قدرے بلند ہوگئی۔ "مجھے بھی اپنی بوڑھی والدہ اور عمر رسیدہ باپ کا فکر ہے۔ میں تو خوفزدہ بھی ہوں کہ میرے بوڑھے والد کو کہیں بادشاہ آرے سے نہ چروا دے۔ عزّیٰ میرے والدین کی حفاظت کرے... میری امید صرف میری دادی ہے۔ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہے۔ اگر بادشاہ نے اس کی بات مان کر میرے والدین کو اذیت سے نہ مروایا، تو بھی وہ باقی زندگی محل کے خادموں کی طرح ہی گزاریں گے۔ شاید میری بوڑھی والدہ کی باقی زندگی میں صرف ذلت ہی رہے گی... لیکن اگر ہم کامیاب ہو گئے تو ہمارے والدین کی طرح ہزاروں والدین کی اذیت دہ زندگی خوشحالی میں بدل جائے گی۔" قیدی نے ندی کی سمت مڑ کر دیکھا جو قلعے کی سمت مڑ گئی تھی۔ "میں تو یہ سوچ کر بھی غمزدہ ہوں کہ میرے بوڑھے والدین نے محل میں عالیشان زندگی گزاری ہے، وہ عقوبت اور ذلت کو کیسے سہہ پائیں گے، لیکن میں وقت کی روانی پر بھی یقین رکھتا ہوں۔ جو آج ہے، کل نہیں ہوگا۔ آج میں صرف رعایا سے متعلق سوچنا چاہتا ہوں، آنے والی نسلوں سے متعلق سوچنا چاہتا ہوں... تم بھی یہی سوچو — یہی رویہ اپناؤ! ہمیں جدوجہد کرنا ہے۔"

میں نے اشہب سے اتر کر، چابیاں نکال کر، بادشاہ کے چچازاد کو ابلق سے اتارا اور تمام آہنی بند کھول دیے۔ اس نے اپنی کلائیوں کو باری باری سہلایا، پھر اپنے بازوؤں کو کندھوں سے نیچے باری باری دبایا، پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بازو اٹھائے۔

"آؤ ہم اپنی جدوجہد کے آغاز کو اپنی دوستی کے ہمیشہ قائم رہنے والے رشتے سے باندھ دیں۔" بادشاہ کے چچازاد نے کہا اور ہم بغلگیر ہو گئے۔ دوبارہ سوار ہو کر ہم درختوں کے درمیان

Scanned with CamScanner

جھاڑ جھنکاڑ سے ڈھکے راستے پر مڑ گئے جو سرحد کی سمت جانے والے بڑے راستے کے متوازی جنگل سے گزرتا ہے۔ اب ہمارے گھوڑے پویہ چال میں تھے۔ سورج مغربی افق پر نارنجی شعاعیں پھیلا رہا تھا۔ جنگل کے درختوں پر پرندوں نے شور مچا رکھا تھا۔ پھر راستہ اس قدر تنگ ہو گیا کہ ہم پگڈنڈی نما آڑی ترچھی لکیروں پر قدم قدم جا رہے تھے۔ غروبِ آفتاب کے بعد درختوں پر پرندوں کا شور کم ہو چکا تھا۔

''اس وقت سرحد پار کرنا بہت خطرناک ہوگا،'' بادشاہ کے چچازاد نے کہا۔ ''سرحد کے قریب ہی چوکی ہے، جہاں سرحدی راستے کے محافظ رات کے وقت گھوڑوں پر گشت میں رہتے ہیں۔ تاریکی میں کسی استفسار کے بغیر ہی ہم تیروں کی زد پر ہوں گے۔''

''لیکن ہم اس جنگل میں بھی نہیں ٹھہر سکتے،'' میں نے کہا۔

''کیا تمھیں یہ اندیشہ ہے کہ تمھارے قلعے میں نہ پہنچنے پر وہ تلاش کرتے ہوئے ادھر آ سکتے ہیں؟'' بادشاہ کے چچازاد نے پوچھا۔

''قطعی نہیں،'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ کسی صورت بھی ہمیں تلاش کرتے ہوئے نہیں نکلیں گے کیونکہ انھیں اس بات کا علم ہی نہیں ہوگا کہ میں تمھیں ساتھ لے کر قلعے میں پہنچ رہا ہوں۔ میرے والد دارالحکومت میں ہیں۔ آج کی رات محفوظ ہے اور تمھارے متعلق شاہی فرمان میرے پاس ہے۔ خوف تو درندوں کا ہے جو اس جنگل میں ہمیں اور گھوڑوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

''کیا کہا تم نے؟'' بادشاہ کے چچازاد نے چونک کر کہا۔ ''شاہی فرمان؟ وہ تو ہمارے لیے بہت اہم دستاویز ہے۔ یہی دکھا کر ہم شمال مشرقی ممالک کے حکمرانوں کو اپنی سچائی کا یقین دلا سکیں گے... فرمان مجھے دے دو۔''

میں نے شاہی فرمان اسے دے دیا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے فرمان کو اپنے زندانی شلوکے کے اندر چھپا دیا۔ گھوڑے قدم قدم کبھی متوازی کبھی آگے پیچھے چل رہے تھے۔

''قلعے میں کسی کو میرا انتظار نہیں ہے،'' میں نے کہا۔ ''میں کون سی جنگ جیت کر جا رہا ہوں کہ دراب پر کنواریاں ہاتھوں میں پھول لیے اور سازکار دوشیزائیں جھانجھنیں اور بانسریاں لیے منتظر ہوں گی۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ نائب قلعہ دار کو دارالحکومت سے کوئی قاصد کبوتر بھیجا گیا ہو۔ آج رات ہم

Scanned with CamScanner

محفوظ ہیں۔ آج رات قلعے سے کوئی نہیں نکلے گا۔"

"پھر بھی،" بادشاہ کے چچازاد نے کہا، "ہمیں سرحد کے قریب کوئی محفوظ مقام تلاش کرنا ہوگا تاکہ کل صبح ہونے سے پہلے سرحد پار کر جائیں۔"

"ہاں یہی درست ہوگا،" میں نے کہا۔ "میرے خیال میں ان پہاڑیوں میں کوئی محفوظ جگہ مل جانا دشوار نہیں ہے۔" مجھے یاد آیا کہ ایک بار شکار کھیلتے ہوئے میں نے سرحد کے قریب چٹانوں میں کئی غاریں دیکھی تھیں۔ انھی میں سے کسی ایک میں ہمیں چھپنے کا موقع مل جائے گا... "کیا دربار میں کسی کو ہماری گمشدگی پر یہ شک ہوگا،" میں نے پوچھا، کہ ہم سرحد پار کر گئے ہیں؟"

"قیاس ہوگا،" بادشاہ کے چچازاد نے کہا، "یقین نہیں۔ پڑوسی ملک کے بادشاہ سے درباریوں کے اچھے تعلقات ہیں۔ بادشاہ بھی صلح کے بعد اچھے تعلقات کا ڈھونگ کرتا ہے لیکن اس کی حریص خصلت کسی کے لیے اچھا سوچ ہی نہیں سکتی۔"

سردیوں کی ابتدائی شام خنکی کا احساس دلایا ہی کرتی ہے۔ چہرے پر ہوا کے جھونکوں سے سردی کا احساس نمایاں تھا۔ رات کو خنکی بڑھ جانے پر مجھے تو کچھ نہ ہونا تھا لیکن مجھے فکر تھا کہ محل کے گرم کمروں میں آرام و آسائش کی زندگی گزارنے والا بادشاہ کا چچازاد میرے لیے رات کو پریشانی کا باعث ضرور بنے گا۔ میں تو سردی برداشت کرنے کا عادی ہوں لیکن اس نے تو زمستانی ہوا کا ایک تھپیڑا ابھی نہ کھایا ہوگا۔ میں ایسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھا جہاں ہم سرد ہوا کے جھونکوں سے محفوظ رہیں۔ ہم ندی کے چوڑے پاٹ سے دور جا چکے تھے۔

"ہم جیسے جیسے سرحد کے قریب پہنچیں گے،" بادشاہ کے چچازاد نے کہا، "گھنے درختوں کا سلسلہ کم ہوتا جائے گا۔ سرحد تو جھاڑیوں کے سلسلے میں ہے۔"

"میں کبھی سرحد کے پار تو نہیں گیا،" میں نے کہا، "لیکن سرحدی علاقہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ جھاڑیوں سے پہلے چھوٹے چھوٹے درختوں میں بہت چٹانیں ہیں۔ وہیں سے شمال مغرب کی سمت جاتا ہوا چٹانوں کا ایک سلسلہ ہے جس میں بہت غاریں ہیں۔ اگرچہ یہ درندوں کی پناہ گاہیں ہیں لیکن انھی میں ہمیں کوئی محفوظ جگہ مل جائے گی۔ بہر حال، ہمیں چوکس رہنا ہوگا۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ کسی درندے کی توجہ کا باعث بن سکتی ہے۔"

Scanned with CamScanner

''ٹھیک کہتے ہو،'' بادشاہ کے چچازاد نے کہا۔''ہم بہت تھک چکے ہیں۔ پناہ گاہ مل گئی تو باری باری سو لیں گے۔''

ہم ندی کے کشادہ پاٹ سے اتنی دور جا چکے تھے کہ اب مڑ کر دیکھنے پر بھی درختوں اور چٹانوں کے درمیان کہیں بھی گہری ہوتی ہوئی شام میں اس کی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ سرحد سے تقریباً ایک کوس پہلے ہمیں مطلوبہ پناہ گاہ مل گئی۔ جنگلی جھاڑیوں میں پتھریلی پگڈنڈی سے تین پیخس[16] اونچی ایک تودہ نما چٹان تھی، جس کے اوپر پہاڑی ہی کی ایک فطری سقف تھی جو چٹان پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ چھت تودہ نما چٹان کو بارش سے بچا سکتی تھی اور ہمیں شبنم سے۔ چٹان کے گرد جھاڑ جھنکاڑ تھا اور چند چھوٹے درخت بھی۔ ہم گھوڑے باندھ بھی سکتے تھے اور ان پر نظر بھی رکھ سکتے تھے۔ اس فطری پناہ گاہ کے قریب ہم اترے، گھوڑوں کو درختوں سے باندھا اور چٹان پر چڑھ گئے۔ اردگرد کا جائزہ لے کر ہم چٹان سے اترے۔ میں نے اپنا توشہ اتارا، زین اتاری، بادشاہ کے چچازاد نے بھی زین اتاری اور ہم چٹان پر چڑھ گئے۔ ہموار چٹان پر زینیں رکھتے ہوئے میرے اشہب کی زین سے بندھی آہنی زنجیریں جھنجھنا اٹھیں۔ درختوں کے پاس گھاس ابھی تک خزاں رسیدہ نہ ہوئی تھی، وہ گھوڑوں کا چارا بن گئی۔ میں نے توشہ دان سے آبریز[17] اور کھانا نکالا۔ پانی کو کاسے میں انڈیلا۔

''تمھیں بھوک لگی ہوگی،'' میں نے کہا،''ہم دونوں کے لیے بہت ہے۔ پھر نہ جانے کہاں ملے۔''

''چوکی کا نگران اگر وہی ہوا،'' بادشاہ کے چچازاد نے کہا،''جو مجھے جانتا ہے، تو وہ تواضع میں بخل سے کام نہیں لے گا۔''

ہم نے کھانا کھایا، پانی پیا، پھر ہموار چٹان پر دھری زینوں پر سروں کو رکھ کر لیٹ گئے۔ تھکن اس قدر تھی کہ سخت چٹان پر لیٹنا بھی اچھا لگا۔ میں تو ان سختیوں کا عادی تھا لیکن بادشاہ کے چچازاد کا برا

16۔ پیخس (Peekhas): یونانی زبان میں بلندی ناپنے کا پیمانہ ہے۔ ہر پیخس اکیس انچ کے مساوی ہوتا ہے۔ یہ لفظ پیمانے کے ساتھ مصر میں اس وقت پہنچا جب یونانیوں نے اسکندریہ میں دیوی ربۃ الافرودیت (Aphrodite) کا مندر بنایا تھا۔ مصر سے یہ پیمانہ عبرانی اور عبرانی سے عربی میں رائج ہوگیا۔

17۔ آبریز: چھاگل۔

حال تھا۔ وہ مخمل و سنجاب کے بستر پر سونے والا، چٹان پر بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر سوجن نمایاں تھی۔

''میں جاگتا ہوں،'' اس نے کہا، ''تم سو جاؤ۔''

''نہیں،'' میں نے کہا۔ ''مجھے تمھاری آنکھوں میں سوجن کے ساتھ نیند کی شدید خواہش بھی نظر آ رہی ہے۔ تم پہلے سو جاؤ۔ میں عادی ہوں، کئی کئی راتیں مسلسل بیدار رہ سکتا ہوں۔''

''بہتر ہے،'' بادشاہ کے چچازاد نے کہا۔ ''لیکن نصف شب ہونے پر مجھے جگا دینا۔ ہمیں زہرہ کے افق پر چمکنے سے پہلے کوچ کرنا ہوگا۔'' وہ زین پر سر رکھ کر اوپر پتھریلی سقف کو دیکھنے لگا۔ میں ایک خیال پر چونکا۔

''وہ تم نے کیا کہا تھا؟'' میں نے بادشاہ کے چچازاد کی سمت دیکھا۔ ''بادشاہ کے جاسوس شمال مشرقی ریاستوں میں موجود ہیں؟'' اس نے جھٹکے سے سر موڑ کر مجھے دیکھا۔

''کیا مطلب ہے تمھارا؟'' اس نے پریشانی سے کہا۔ ''وہاں کے درباروں میں ہم جاسوس نہیں کہلائیں گے۔ ہمارے پاس میری قید و بند کا شاہی فرمان ہے۔ یہی ہمارے فرار ہونے کا ثبوت ہوگا۔''

''میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔'' میں نے مغربی افق پر بڑھتی ہوئی تاریکی کی سمت دیکھا۔ ''ہم کب تک خود کو پوشیدہ رکھ پائیں گے؟ کیا بادشاہ کے جاسوس اسے یہ خبر نہ پہنچائیں گے کہ ہم فرار ہو چکے ہیں؟ کیا بادشاہ اپنی حکمت عملی کو بدل نہ دے گا؟''

بادشاہ کا چچازاد کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے گہرا سانس لیا۔

''ہمیں بھیس بدلنا ہوگا،'' اس نے تھکن کا احساس دلاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم نے اہم بات کی ہے۔ ہمیں سرحدی چوکی ہی سے بھیس بدل کر نکلنا ہوگا کیونکہ میرے خیال میں جاسوسوں کی رسائی دربار تک ہوگی۔'' وہ پھر سقف کو دیکھنے لگا۔ اس نے ایک دو بار سوجی ہوئی پیشانی کو انگلیوں سے سہلایا۔ ''تم غزی کے سچے پرستار ہو۔ بہت ذہین بھی ہو۔ مجھے قدم قدم پر تمھاری ضرورت ہوگی۔ ایک بار ہم بادشاہ کو عبرتناک انجام تک پہنچا دیں، پھر مجھے نیا آئین تشکیل دینا ہے، اصلاحات کرنی ہیں۔ مجھے تمھاری اشد ضرورت ہوگی۔''

Scanned with CamScanner

''میں عساکر سے ہوں،'' میں نے جواب دیا۔ ''میں نے تو یہی سیکھا ہے کہ میری ہر خواہش شمشیر وسناں کے حصار میں ہے...''

''اور تم حصار شکن بھی ہو،'' بادشاہ کے چچازاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی یہ بذلہ سنجی اچھی لگی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں،'' میں نے کہا۔ ''ہمیں یہی سکھایا جاتا ہے کہ ہمارا ہر اقدام شمشیر وسناں کے اہداف پر ہی مرکوز ہوتا ہے۔ مجھے اصلاحات سے کوئی غرض نہیں ہو گی۔''

''میں جانتا ہوں۔'' بادشاہ کے چچا کی آواز خواب آلود ہو چکی تھی۔ ''لیکن اصلاحات کے لیے مضبوط دفاع کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ذمے داری میں تمھیں ہی سونپوں گا۔''

''ہاں،'' میں نے کہا۔ ''میں دفاع کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔''

''درست کہہ رہے ہو...'' بادشاہ کا چچازاد جیسے نیند میں بول رہا تھا۔ ''تم سیاست سے نابلد ہو۔''

نہ میں ہوس ملک گیری کا اسیر تھا نہ ہی ذاتی جاہ واحتشام میرا مقصد تھا۔ میں تو یہی چاہتا تھا کہ منصوبہ کامیاب ہو جائے۔ ''اگر سب کچھ کامیابی سے ہو گیا،'' میں نے سوچا، ''تو ملک کا دفاع میری اولین ترجیح ہو گی۔ بادشاہ کا جبر وتشدد ختم ہو جانے پر ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گا اور اس زندگی کی حفاظت میری زندگی کا مقصد ہو گا۔''

خاموشی شبِ یلدا کی طرح طویل تھی۔ بادشاہ کا چچازاد سو چکا تھا۔ چٹان کے نیچے، درخت کے پاس سے کبھی کبھی گھوڑوں کے نتھنوں سے نکلتے سانس کی قدرے بلند آواز سنائی دیتی تھی۔ کبھی ان کے سموں کی آواز بھی ابھرتی تھی جب وہ ایک آدھ قدم آگے پیچھے ہوتے تھے۔ چٹان کے نیچے جھاڑیوں میں، ہوا کی خنکی بڑھ جانے پر، اپنے پروں کو سرعت سے جلا کر کوئی جھینگر مسلسل ریں ریں کر رہا تھا۔ ہوا میں تیزی نہیں تھی۔ رخ بھی ندی کی سمت تھا۔ چٹان اور فطری سقف نے ہمیں خنک ہوا کے جھونکوں سے محفوظ کر دیا تھا۔

''اگر سب کچھ کامیابی سے ہو گیا،'' میں نے پھر سوچا، ''تو ہمارے ملک میں کوئی ایک بھی ایسا گھر نہیں ہو گا جو زمستان میں آتشدان سے محروم ہو۔ رات کتنی بھی سرد کیوں نہ ہو، ہر گھر میں اہل خانہ

Scanned with CamScanner

آتشدانوں کے سامنے سکون کی نیند سویا کریں گے۔ ابھی تو دارالحکومت کے کئی گھروں میں لوگ بوریوں میں خود کو لپیٹے کپکپاتے رہتے ہیں... وہ دن ضرور آئے گا جب ہر سمت خوشحالی ہوگی، سب کی عزتیں محفوظ ہوں گی، وہ سب کچھ ہوگا جس کی انسانوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لیے ہمیں بہت محنت کرنا ہوگی۔''میں سخت چٹان پر لیٹا، زین پر سر رکھے، اوپر پھیلی پتھریلی سقف کو نہ جانے کتنی دیر دیکھتا رہا۔ شاید آدھی رات ہو چکی تھی جب مجھ پر دھیمی سی غنودگی چھانے لگی، لیکن مجھے اس سے لڑنا آتا تھا۔ میرا ارادہ بادشاہ کے چچازاد کو جگانے کا نہ تھا لیکن وہ خود ہی بیدار ہو گیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے انگڑائی لی۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔

''ابھی افق پر زہرہ کی چمک میں بہت دیر ہے،'' میں نے کہا۔ ''تم چاہو تو اور سو سکتے ہو۔''

''اب مجھے نیند نہیں آئے گی،'' بادشاہ کے چچازاد نے کہا۔ ''میری ہڈیاں دُکھ رہی ہیں۔ جتنا سونا تھا، سو چکا۔ اب تم سو جاؤ۔ میں تمھیں صبح کاذب سے پہلے جگا دوں گا۔''

''میں جانتا تھا،'' میں نے ہنس کر کہا، ''یہ پتھریلا بستر تمھیں سونے نہیں دے گا... بہتر ہے، مجھے وقت پر جگا دینا۔''

میں زین پر سر رکھے نہ جانے کتنی دیر خاموشی سے پتھریلی سقف کو دیکھتا رہا۔ میرے جسم میں تھکن نہیں تھی لیکن آنکھوں میں نیند کی خواہش تھی۔ پھر سب کچھ آہستہ آہستہ معدوم ہوتا چلا گیا... میری نیند بچپن ہی سے بہت گہری ہے لیکن عسکریت نے میرے ذہن کو بے حد چوکنا بھی بنا رکھا ہے۔ میدانِ جنگ میں ایستادہ خیام میں تو میں ہلکی سی آہٹ پر بھی اٹھ بیٹھتا رہا ہوں، لیکن یہاں میں میدان جنگ کے کسی خیمے میں نہ تھا۔ یہاں میں قدرے بے فکر تھا۔ رات محفوظ تھی۔

نہ جانے وہ خواب تھا یا نیم بیداری، یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنی والدہ کے سامنے کھڑا ہوں اور وہ دائیں بائیں سر ہلا ہلا کر جیسے مجھے کچھ کرنے سے منع کر رہی ہیں... پھر یوں لگا جیسے میں میدانِ جنگ میں ہوں۔ چاروں جانب شمشیریں چمک چمک کر ٹکرا رہی ہیں، جسموں میں پیوست ہو رہی ہیں، کندھوں سے سروں کو گرا رہی ہیں، خون کے چھینٹے اڑ رہے ہیں... پھر والدہ کا چہرہ سامنے آیا۔ وہ پھر سر کو دائیں بائیں جنبش دے رہی تھیں... پھر شور سا محسوس ہوا۔ میدان جنگ میں ہوا میں بلند ہوتے ہوئے ناوک ٹڈی دل کی طرح نظر آئے۔ ہر سمت چیخیں تھیں، آہ و بکا تھی، شور تھا۔ پھر یوں

Scanned with CamScanner

محسوس ہوا جیسے میرے قریب ہی گھوڑے ہنہنا رہے ہیں۔ پھر میں نے جیسے کسی گھوڑے کو الف ہو کر اگلے سم زمین پر مارتے سنا۔ پھر یوں لگا جیسے گھوڑوں میں بدحواسی سی ہے۔ پھر جیسے کسی نے گھوڑے پر اسی کی باگ کو زناٹے دار انداز میں مارا ہو۔۔۔ پھر یوں لگا جیسے آگے پیچھے گھوڑے بھاگ رہے ہیں۔ دور جاتی ہوئی ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی رہی، پھر خاموشی چھا گئی۔۔۔ سب کچھ دھندلا سا گیا۔

پرندوں کی آوازیں سن کر میری آنکھیں کھلیں۔ سقف کے نیچے تاریکی تھی لیکن کناروں کے اوپر آسمان پر نیلاہٹ سی نمایاں تھی۔ میں نے الٹے ہاتھوں سے آنکھوں کو ملا۔

''شاید ہمیں دیر ہو گئی ہے،'' میں نے بیٹھتے ہوئے کہا، لیکن بادشاہ کے چچا زاد نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو چٹان پر بادشاہ کا چچا زاد نہیں تھا۔ میں گھبرا کر اٹھا، چٹان پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ بے اختیار میں نے چٹان پر اِدھر اُدھر دوڑ کر چاروں طرف دیکھا۔۔۔ اندیشہ بجلی کی طرح کوندا۔ میری نگاہیں تیزی سے چٹان کے نیچے اس درخت کی سمت گئیں جہاں ہم نے گھوڑوں کو باندھا تھا۔ دونوں گھوڑے نہیں تھے۔ میں چیخ کر واپس مڑا۔ چٹان کی دھیمی روشنی میں وہ زین جس پر میرا سر تھا، آہنی زنجیریں اور ان کے قفل اور خودِ زندانی، سب سیاہ دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

قیدی فرار ہو چکا تھا۔۔۔ وہ میرا اشہب بھی لے گیا تھا۔

فریب خوردگی کے اذیت دہ احساس کے ساتھ اپنی حماقت کا احساس، بہت زہریلا تھا۔

''لعنت ہو تجھ پر اور تیری سیاست پر!'' میں چنگھاڑا۔ پچھتاوا ایک سنگین سقف کی مانند تھا جو میرے پورے وجود پر بے رحمی سے بوجھ ڈال رہا تھا۔ ندامت ایک چٹان کی مانند میرے دل پر گری۔

''یہ میں نے کیا کیا! اعتماد اور وہ بھی ایک فریبی پر!۔۔۔ یہ میں نے کیا کیا!''

میں چٹان سے چھلانگ لگا کر اترا۔ نیام میں میری شمشیر، جو رات بھر میری کمر سے بندھی رہی تھی، چھلانگ لگاتے ہوئے چٹان سے ٹکرائی تو مجھے اس کا احساس ہوا۔ مسلح ہونے کا احساس باعثِ حوصلہ ہوا لیکن صورت حال کی تلخی نے میرے ذہن میں شدید کھچاؤ پیدا کر دیا تھا۔ میں سیدھا سرحد کی سمت جانے والی پگڈنڈی پر دوڑا۔ صبح کی دھیمی روشنی پھیل رہی تھی۔ درختوں پر پرندوں

Scanned with CamScanner

کا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں خوفزدہ تھا۔ جانتا تھا کہ اگر قلعے میں میری گمشدگی کی خبر پہنچ چکی ہے تو میری تلاش میں سواروں کا دستہ نکل پڑا ہو گا۔ میں جتنا تیز بھی دوڑتا، چاشت تک ہی سرحد تک پہنچ سکتا تھا کیونکہ میں سرحد کی سمت جانے والے کشادہ رستے پر جانے کا خطرہ محسوس کر رہا تھا اور مجھے جھاڑیوں کے درمیان، آڑی ترچھی پگڈنڈیوں پر ہی دوڑنا تھا۔

''اشہب کے بغیر، زمین پر پاؤں جما کر میں ان سے نہیں لڑ سکوں گا،'' میں نے متوقع صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے سوچا۔'' کچھ بھی ہو، اگر وہ مجھ تک پہنچ ہی گئے، میں ان کو زندہ گرفتاری تو ہرگز نہیں دوں گا۔ وہ مجھے زندہ گرفتار نہیں کر سکیں گے۔ اس صورت حال میں میری موت یقینی ہو گی... اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو بہتر یہی ہے کہ میں مغرب کی سمت جنگل میں چلا جاؤں۔ وہاں بہت سی چٹانوں میں بہت سی غاریں ہیں۔ کسی ایک میں میں دن بھر چھپ جاؤں تو رات کے وقت سرحد پار کرنا مشکل نہیں ہو گا...''

میں نے سیدھی پگڈنڈی چھوڑ دی اور مغربی سمت گھنے درختوں والے جنگل کی سمت تیز تیز قدموں سے چل دیا۔ جھاڑیوں میں بھاگنا ناممکن تھا۔ مغربی سمت گھنے درختوں کے نیچے گھنی خاردار جھاڑیاں تھیں۔ تیز چلتے ہوئے ان کی شاخیں میرے بازوؤں سے ٹکرا رہی تھیں لیکن بازوؤں پر بندھے دھات والے چمڑے نے مجھے کانٹوں کی خراشوں سے بچا لیا۔ چٹانوں میں مجھے غاریں نظر آئیں۔ میں نے اپنی شمشیر نیام سے نکالی۔ مجھ پر کوئی درندہ بھی حملہ آور ہو سکتا تھا۔ صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ ایک غار کے دہانے کو بڑی سی خاردار جھاڑی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں سیدھا اسی کی سمت گیا۔ میں نے غار کے دہانے پر جھاڑی کی کچھ ٹہنیاں کاٹ کر اندر جھانکا۔ غار بہت چھوٹی تھی، کھوہ جیسی، مجھے چھپنے کے لیے بہترین محسوس ہوئی۔ میں جھاڑی میں سے بنائے ہوئے راستے سے غار میں داخل ہوا۔ غار اندر سے تنگ و تاریک تھی، اور ایک دم ترچھی، لیکن ترچھے رخ پر ٹانگیں پسارنے کی جگہ تھی۔ یہ غار کسی جانور کی چھوڑی ہوئی محسوس ہوئی۔ جگہ جگہ مکڑیوں کے جالے تھے۔ میں نے انھیں ہاتھوں سے ہٹایا۔ پھر دہانے کی سمت چہرہ گھما کر میں نے جھاڑی کی کٹی ہوئی شاخوں کو اس انداز میں غار کے منہ پر رکھ دیا جیسے وہ کبھی کاٹی ہی نہ گئی ہوں۔ غار کے فرش پر جانور کی گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ تعفن سے احساس ہوا کہ یہ غار کسی درندے کی نہیں تھی بلکہ کسی گھاس کھانے

والے جانور کی رہی ہوگی... غالباً کسی جنگلی سؤر کی جو غار چھوڑ چکا ہے۔
''وہ موٹا سؤر...'' میں نے تلخی سے سوچا،''وہ جنگلی سؤر اگر مجھے سرحد پار مل گیا تو میں اسے بتا دوں گا کہ فریبی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ میں اس کے دونوں پاؤں کاٹ کر اسے عمر بھر کے لیے زمین پر رینگنے کے لیے زندہ چھوڑ دوں گا۔'' بادشاہ کے چچازاد بھائی کے لیے میری نفرت اب بادشاہ سے بھی زیادہ تھی۔''وہ خود کو عزیٰ کا پرستار کہتا ہے لیکن وہ تو ہُبل کے پرستاروں سے بھی بدتر نکلا۔''
میں غار میں نیم دراز ہو گیا۔''اگر کوئی جانور آیا تو جھاڑیوں کی سرسراہٹ مجھے چوکنا کر دے گی۔'' اس خیال کے ساتھ مجھے اطمینان تو تھا لیکن تعفن پریشان کن تھا اور مجھے شام تک اسے برداشت بھی کرنا تھا۔ پھر مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوگئی جو نہ نیند تھی نہ بیداری۔ اسی کیفیت میں مجھے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں جو سرحد کی جانب سے آئیں اور قلعے کی سمت جاتی محسوس ہوئیں۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ٹاپوں ہی کی آواز تھی جو قلعے کے رخ پر ہی جا رہی تھی۔
''قلعے میں خبر ہو چکی ہے۔ لیکن گھوڑے قلعے کی سمت کیوں جا رہے ہیں؟ شاید وہ سیدھے سرحد کی طرف گئے ہوں گے اور کسی کو نہ پا کر واپس جا رہے ہوں گے۔'' اچانک ایک اندیشے سے میرا بدن کپکپایا۔''کیا انھوں نے رات ہی کو ناکہ بندی کر دی تھی؟ میں نے قلعے کی سمت جاتی ہوئی ٹاپوں کی آواز آج صبح سے اب تک نہیں سنی... کیا وہ رات کے اندھیرے میں سرحد پر پہنچ چکے تھے؟ لیکن آوازیں تو رات کو بھی سنائی نہیں دی تھیں... کیا انھوں نے بادشاہ کے چچازاد کو پھر گرفتار کر لیا ہے؟ ایسی صورت میں میری اذیت ناک موت ناگریز ہوگی... مجھے ہر حال میں یا تو سرحد پار کرنا ہے یا لڑ کر مر جانا ہے۔'' میں پھر غار میں نیم دراز ہو گیا۔ میرے سر کے اوپر عنکبوت کے تار لٹکے ہوئے تھے۔''اگر وہ میری تلاش میں نکلے تو وہ سیدھے رخ تو ہرگز نہیں جائیں گے۔ وہ مجھے اسی جنگل میں تلاش کریں گے۔ میرے لیے بہتر ہوگا کہ میں سرحد کی طرف جانے والے کشادہ رستے ہی سے سرحد پار کروں... لیکن اگر وہاں بھی ناکہ بندی ہوئی تو؟''
مجھ پر مایوسی سی اتری اور کچھ دیر بعد مجھ پر پھر وہی کیفیت طاری ہوگئی جس میں نہ خواب تھا نہ خیال۔ پھر شاید میں سو گیا، یا تعفن نے میرے ذہن کو ماؤف کر دیا۔ سب کچھ معدوم ہو گیا... دوبارہ آنکھ کھلی تو غار میں تاریکی کا احساس ہوا۔ سورج افق کی جانب جا چکا تھا اور اس کی ترچھی کرنیں دہانے

Scanned with CamScanner

کی جھاڑی پر ہوا کے جھونکوں سے تھرتھرا رہی تھیں۔ مجھے بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔ لیکن میرے ذہن پر شدید ترین دباؤ تھا جس میں ندامت بھی تھی، الم بھی۔ فریب خوردگی کا غم بہت اذیت دہ تھا جس میں زہر سا تھا، جو مجھے بار بار اپنی حماقت کے زہریلے خار چبھو رہا تھا۔ میں میدانِ جنگ میں کبھی بھی خوفزدہ نہیں ہوا تھا لیکن اس پُرتعفن غار میں چھپے ہوئے کسی جانور کی طرح خوفزدہ تھا جسے باہر خوں آشام درندوں کی موجودگی کا احساس ہو اور اس کے دل کی دھڑکن میں تیزی ہو۔ جیسے ہی افق پر شفق نے اپنی رنگین کرنوں کو پھیلانا شروع کیا، میں غار سے نکلا، شمشیر ہاتھ میں لی اور سرحد کی سمت کا اندازہ لگاتے ہوئے دوڑنا شروع کر دیا۔ آڑی ترچھی پگڈنڈیاں کبھی کبھی مجھے آہستہ چلنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ جھاڑیوں سے اٹی ہوئی پگڈنڈیاں ڈوبتے سورج کی ڈوبتی ہوئی روشنی میں سیاہ ہو چکی تھیں۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا، جھاڑ جھنکاڑ بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک جھاڑیاں کم ہونے لگیں اور درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور کچھ ہی دیر بعد میں کشادہ رستے پر تھا۔

''میں راستہ بھول گیا ہوں،'' اس خیال کے ساتھ ہی میرے قدم رکے اور مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ میں جہاں تھا وہ راستہ سرحد کی سمت نہیں جاتا تھا۔ اب میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا: ڈوبتے سورج سے مغرب کا تعین کر کے کشادہ رستے پر دوڑنا۔ اتنا تو میں جانتا ہی تھا کہ مشرق کی سمت قلعہ ہے۔ میں اس کشادہ رستے پر آ چکا تھا جس پر تمھاری یہ کٹیا ہے۔ غروبِ آفتاب کے بعد بہت جلد تاریکی پھیل جاتی ہے اور جنگل کے گھنے درختوں میں تو تاریکی بہت گہری ہوتی ہے۔ میں رکے بغیر مسلسل بھاگ رہا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی لیکن میرا لباس پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ میں لی ہوئی شمشیر نیام میں ڈال لی تا کہ مجھے بھاگتے ہوئے ذرا سے بھی بوجھ کا احساس نہ ہو اور میری رفتار تیز رہے۔ تھکن اس قدر تھی کہ رفتار تیز رکھنے کی کوشش کے باوجود ہر قدم شکستہ محسوس ہو رہا تھا۔ درختوں کی شاخیں بھی تاریک ہوتی جا رہی تھیں۔ اچانک مجھے پورے بدن میں سنسنی کا احساس ہوا۔ یوں محسوس ہوا جیسے درختوں کی شاخوں پر کوئی بیٹھا ہوا ہے۔

مجھ پر نیم بیہوشی سی طاری تھی۔ اسی کیفیت میں مجھے درختوں کی شاخوں پر ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے شاخوں کی طرف دیکھا تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑی۔ یوں لگا جیسے وہ تمام سالار، سوار اور سپاہی، جنھیں میں نے میدان جنگ میں ہلاک کیا تھا، درختوں کی شاخوں پر بیٹھے

ہوے ہیں۔ ان کی خوفناک آنکھیں چہروں سے باہر نکلی ہوئی ہیں، دانت بالشت بھر کے ہو کر ہونٹوں سے باہر نکل آئے ہیں، لمبے لمبے ناخن ٹیڑھے ہو چکے ہیں اور سر کے لمبے لمبے بال، ان کے کندھوں پر جھول رہے ہیں۔ وہ قہقہے لگا رہے ہیں، چیخ رہے ہیں۔

''عزی مجھے پناہ دے، مجھے امان دے!'' میں چیختا ہوا بھاگ رہا تھا، کندھے جھک چکے تھے۔ ہر قدم پر یوں لگتا تھا کہ میں اگلے قدم پر ہی گر جاؤں گا۔ جب اتفاق سے نظریں اوپر اٹھنے پر مجھے آسمان کے دھندلکوں کے پس منظر میں دھویں کی اٹھتی ہوئی لکیر نظر آئی تو میں بے اختیار سنبھلا اور تمھاری جھونپڑی کی سمت بھاگا۔ مجھے تمھاری جھونپڑی، عزی کی عطا کردہ پناہ گاہ، نظر آ چکی تھی۔

''جھونپڑی میں جو کوئی بھی ہوگا،'' میں نے سوچا، ''میں اس سے کہوں گا کہ تیری کٹیا میرے لیے عزی کی پناہ گاہ ہے۔ میں اس سے کہوں گا کہ میرا سر خاردار جھاڑی کی مانند ہے جس پر بھاری پتھر آن گرا ہے۔ میں کہوں گا کہ میرے کندھے بلوط کی شاخیں ہیں جن پر زمستاں کی برف پگھل رہی ہے۔ یہ پسینہ نہیں، زہر کے قطرے ہیں جو سرد مہر فریب کے اس اژدہے کے منہ سے ٹپک رہے ہیں جو بے مروتی کی چٹان پر کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ میں کہوں گا کہ میری کمر ٹوٹ چکی ہے اور میں سرنگوں ہوں . . . مجھ پر رحم کر، مجھے پناہ دے دے۔ میں کہوں گا کہ میں اس بھوکے پیاسے قیدی کی مانند ہوں جس کا ہر قدم ایک قنطار[18] کا ہے اور خوراک پچاس قدم دور ہے۔[19] میں کہوں گا، کل صبح کاذب تک مجھے پناہ دے دے۔''

اور میں گرتا پڑتا تم تک پہنچ گیا۔

18۔ قنطار (Qantar): وزن کا پیمانہ جو تیس کلوگرام کے مساوی ہوتا تھا۔

19۔ قدیم زمانے میں یہ ایک عقوبت تھی جو سزا یافتہ قیدی کو دی جاتی تھی۔ قیدی کو دو دن بھوکا اور ایک دن پیاسا رکھا جاتا تھا۔ پھر دونوں ٹخنوں میں لوہے کی زنجیریں باندھ دی جاتی تھیں۔ یہ زنجیریں دوسری جانب تیس کلوگرام (ایک قنطار) وزنی پتھروں سے باندھ دی جاتی تھیں، خوراک اور پانی پچاس قدم دور رکھ دیا جاتا تھا۔ قیدی کو خوراک اور پانی تک پہنچنے کے لیے ہر قدم پر پتھر کو گھسیٹنا پڑتا تھا جس سے اس کی ٹانگیں ٹخنوں کے قریب لہولہان ہو جاتی تھیں۔

3

بوڑھا خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بوڑھے کی بیٹی بھی غمزدہ تھی۔ اندوہ کی لہر میرے دل میں بھی اٹھی۔ ''جب وہ کٹیا میں داخل ہوا تھا تو میں خوفزدہ ہو گیا تھا،'' بوڑھے نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''وہ نڈھال سا ہو کر گر گیا تھا۔ پھر جب اٹھنے کے قابل ہوا تو میں نے اس کے بدن کو چمڑے کی زرہوں اور اسلحے کے بوجھ سے آزاد کیا۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا کہ مجھے پناہ دو، ایک رات کے لیے، صبح میں فرار ہو جاؤں گا۔ سرحد یہاں سے کتنی دور ہے؟ وہ نیم بیہوشی میں بول رہا تھا۔ آتشدان کی گرمی اور خوراک سے وہ ہوش میں آیا تھا۔ پھر اس نے یہیں، جہاں اب تم بیٹھی ہو، بیٹھ کر ہمیں اپنی داستان سنائی اور بار بار کٹیا کے دروازے کی سمت دیکھتا رہا۔ پھر وہ سو گیا۔ میں ساری رات سو نہ سکا۔ بار بار عزیٰ سے التجا کرتا رہا کہ صبح تک قلعے سے سواروں کا دستہ اسے تلاش کرتا ہوا ادھر نہ آئے تا کہ میں اسے فرار کرا سکوں۔ صبح ابھی افق پر دھندلاہٹ بھی نہ پھیلی تھی کہ میری بیٹی بیدار ہو گئی۔ میری بیٹی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نہ جانے یہ کیوں رو رہی تھی۔'' بوڑھے نے اپنی بیٹی کی سمت دیکھا جو بوریے پر نیم دراز تھی، آنکھیں بند تھیں، دن بھر کی تھکن نے اس پر نیند طاری کر دی تھی۔ ''یہ دیر تک روئی تھی، نہ جانے کیوں، فریب خوردہ جوان کے لیے... رعایا کے لیے، جس میں ہم بھی شامل ہیں لیکن ہماری روزی روٹی سرحد پار سے آتی ہے۔ اس سرحد پر نہ کوئی چوکی ہے نہ پہرہ... نہ جانے کیوں...''

''اس کی داستان ہی رلا دینے والی تھی،'' بوڑھے کی بیٹی نے خواب آلود آواز میں آہستہ سے کہا۔ آنکھیں بند تھیں۔

''ٹھیک ہے بیٹی...'' بوڑھے نے اس کی طرف دیکھا۔ ''لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تیرے آنسو خود تیرے لیے بھی تھے۔'' بوڑھے نے میری طرف دیکھا۔ ''جوانی قربان کر دی ہے اس نے مجھ بوڑھے کے لیے۔ ایسی بیٹی اس دنیا میں کہیں نہیں ہو گی۔ شاید اس کے آنسو اپنے سفید بالوں کے لیے بھی تھے، یا اپنے چہرے کی جھریوں کے لیے، جنھوں نے اسے عمر سے پہلے ہی بوڑھی بنا دیا ہے... اس نے میرے بڑھاپے کو اپنی جوانی نذر کر دی ہے۔ ایسی بیٹی کل عالم میں کہیں نہیں ہو گی... اور میں بدبخت، مرتا بھی نہیں ہوں۔''

Scanned with CamScanner

میں نے بوڑھے کی بیٹی کی سمت دیکھا۔ اس کی بند آنکھوں پر پلکیں تھر تھرا رہی تھیں۔ پلکوں کے کنارے نم آلود تھے۔

''میری بیٹی بہت تھک جاتی ہے،'' بوڑھے نے کہا۔ ''کھانا کھا کر سو جایا کرتی ہے۔ لیکن کل رات یہ شاید آنکھیں موندے لیٹی رہی تھی، سو نہیں پائی تھی۔ جب یہ اٹھی تو دیر تک حصار شکن کے چہرے کی سمت دیکھتی رہی۔ پھر خوفزدہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ 'بابا اسے جگاؤ... جلدی کرو!' وہ تقریباً چیخی۔ 'میں نے ٹاپوں کی آواز سنی ہے!' مجھ بوڑھے کی سماعت ناقص ہے۔ میں کچھ نہ سن پایا۔ میری بیٹی نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ 'وہ آ گئے ہیں!' میری بیٹی چیخی۔ 'وہ آ گئے ہیں؟ جلدی کرو، بھاگو، وہ آ گئے ہیں!'

''حصار شکن اچھل کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ شاید اس نے بھی ٹاپوں کی آواز سن لی تھی۔ اس نے نیام سے تلوار کھینچی۔ یوں محسوس ہوا کہ ٹاپوں کی آواز نے اس کی نیند کے ہر لمحے کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے ننگے پاؤں کٹیا سے نکلا۔ میں اور میری بیٹی بھی نکلے۔ مشرقی افق پر دھیمی دھیمی سی روشنی پھیل چکی تھی لیکن دائیں ہاتھ جنگل کے گھنے درختوں میں تاریکی تھی۔ اچانک گھنے درختوں کے پرندوں نے وقت سے پہلے ہی چیختے ہوئے اڑنا شروع کر دیا۔ کچھ سوار گھنے درختوں میں تھے۔ بدحواس پرندوں کی اڑان سے اندازہ ہوا کہ وہ سرحد کی سمت جا رہے ہیں، نیم دائرہ بنا کر، تاکہ سرحد کی سمت جانے والے راستے کو روک دیں۔ جھونپڑی کے پیچھے بھی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ وہ کٹیا کا محاصرہ کر رہے تھے، جیسے انھیں یقین ہو کہ مطلوبہ شخص کٹیا ہی میں ہے۔ حصار شکن کٹیا کے سامنے رک گیا۔ سمت الراس [20] کی طرف دیکھا۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ 'شکریہ بابا،' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ 'وہ مجھے حصار میں لے رہے ہیں۔ مجھے اب لڑنا ہوگا... تم نے مجھے پناہ دی، شکریہ...' اس نے میری بیٹی کی طرف دیکھا۔ 'وقت ضائع مت کرو!' میری بیٹی نے چیخ کر کہا۔ 'سیدھا بھاگو، یہ راستہ سرحد ہی کی سمت جاتا ہے۔ سرحد نصف فرسنگ سے بھی کم دور ہے۔ بھاگو... تم نکل سکتے ہو... دیر نہ کرو!' 'نہیں۔' اس کی آواز میں نہ جانے کیا تھا، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی، ہونٹوں پر تبسم۔ 'نہیں، اب نہیں... کیا تم ٹاپوں کی آوازیں نہیں سن رہی ہو؟

20۔ آسمان

وہ عقب پر ہی نہیں، سامنے بھی ہیں۔ میں محصور ہو چکا ہوں اور میرا اشہب بھی میرے نیچے نہیں ہے۔ عربدہ جوئی کے سوا اب میرے پاس کوئی راستہ نہیں۔ مجھے لڑنا ہی ہوگا۔ لیکن وہ مجھے زندہ گرفتار نہیں کر پائیں گے... کبھی نہیں!'

''اس کی آواز میں بے مثال حوصلہ تھا۔ وہ درست کہہ رہا تھا۔ شاہی رسالے کے سوار عقب ہی میں نہیں، سامنے بھی تھے۔ سامنے والے سواروں نے سرحدی راہ روک دی تھی۔ اسی لمحے عقب میں نیم دائرہ بناتے ہوئے پانچ سوار نظر آئے۔ 'وہ رہا!' ایک سوار وحشیانہ انداز میں چلّایا۔ 'ہاں، وہ رہا!'

''ایک سوار تیزی سے گھوڑا دوڑا کر ہماری سمت آیا۔ حصار شکن دوڑ کر جھونپڑی سے تیس قدم دور چلا گیا۔ سوار نے گھوڑے کو اسی کی سمت موڑا، حصار شکن سوار کے داہنے ہاتھ تھا۔ حملہ آور شمشیر لہرا کر اس کی جانب بڑھا۔ جیسے ہی اس کا گھوڑا حصار شکن کے پاس پہنچا، حصار شکن سرعت سے گھوڑے کے سامنے سے بائیں جانب کودا۔ اس سے پہلے کہ سوار عنان کھینچ کر شمشیر کو بائیں جانب لاتا، حصار شکن نے جست لگائی۔ بائیں ہاتھ سے زین پکڑ کر، داہنے ہاتھ سے چمکتی شمشیر کو حملہ آور کے کندھے کے قریب لاتے ہوئے، گردن پر پھیر دیا۔ حملہ آور اگلے ہی لمحے زمین پر اور حصار شکن گھوڑے پر نظر آیا۔ حملہ آور کے پیچھے آتے ہوئے دو سواروں نے اس پر شمشیروں سے وار کیے، جو وہ نہ صرف بچا گیا بلکہ اس کی شمشیر نے ایک حملہ آور کا سر کندھوں سے الگ کر دیا۔ دوسرے کی ران پر حصار شکن کی شمشیر اس انداز سے گری کہ ٹانگ کٹ گئی۔ وہ کربناک انداز سے چلّایا۔ گھوڑا نیم دائرے میں گھوما۔ شمشیر نے ٹانگ کے ساتھ زین کے تسمے بھی کاٹ دیے تھے۔ سوار ایک چیخ کے ساتھ الٹ کر گھوڑے سے گرا اور کٹی ہوئی ٹانگ کچھ دور تک رکاب میں پھنسی ہوئی گھوڑے کے ساتھ ساتھ گئی، پھر گر پڑی۔ کچھ دور جا کر گھوڑا بھی رک گیا۔ اسی دوران میں چوتھے سوار نے حصار شکن پر حملہ کیا۔ شمشیروں کے ٹکرانے کی دو بار ہی آواز آئی اور پھر سوار کی چیخ بلند ہوئی۔ حصار شکن کی شمشیر اس کا پہلو چیر گئی تھی۔ پانچواں سوار یہ دیکھ کر وحشیانہ انداز میں چنگھاڑا اور گھوڑے کو بھگا کر دور لے گیا۔ حصار شکن کے گھوڑے کا رخ سرحد کی سمت تھا۔ وہ ایڑ لگانے ہی والا تھا کہ سرحد کی سمت جانے والے راستے پر صبح کی روشنی میں دس سواروں کا دستہ جھونپڑی کی سمت آتا دکھائی دیا۔ وہ بھیانک عفریتوں کی

Scanned with CamScanner

طرح قدم قدم چلے آ رہے تھے۔ مجھ بوڑھے کی بصارت اگر چہ کمزور ہے لیکن میں نے ان میں ایک زنگی بھی دیکھا۔ وہ دستے سے الگ ہو کر گھنے جنگل کی سمت چلا گیا۔ نو سوار سامنے اور ایک عقب پر تھا۔ حصار شکن ٹھہر گیا۔ نو سواروں میں سے تین دائیں جانب اور تین بائیں جانب نیم دائرہ بناتے نظر آئے۔ عقبی سوار بھی اب حصار شکن کی جانب بڑھنے لگا اور انھوں نے حصار بنالیا۔ وہ حصار شکن سے تیس قدم دور رک گئے۔ حصار کے وسط میں بائیں باگ کھینچ کر حصار شکن نے گھوڑے کو ایک ہی جگہ گھمانا شروع کر دیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں شمشیر پر صبح کی دھیمی روشنی میں بھی ہلاک ہونے والوں کا خون نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ غضبناک تھا۔ ’اپنے آپ کو شاہی رسالے کے حوالے کر دو!‘ سرحد کی جانب سے آنے والے نو سواروں میں سے درمیان میں تین سواروں کے وسطی سوار نے بلند آواز میں کہا۔ وہ ادھیڑ عمر کا تھا۔ ’اب تم بچ نہیں سکتے۔‘ ’گیدڑ کے بیٹو!‘ حصار شکن نے چیخ کر کہا، ’دور کیوں کھڑے ہو؟ حملہ کرو۔ تمھیں پتا چل جائے گا کہ مجھے حصار شکن کیوں کہتے ہیں۔‘

’’حصار شکن کا گھوڑا وسط میں چکر کھا رہا تھا۔ کسی میں بھی اس کے قریب جانے کی جرأت نہ تھی۔ ’تم نہیں جانتے،‘ ادھیڑ عمر کے سوار نے کہا، ’دار الحکومت میں بھی تمھاری غداری کی خبر ہو چکی ہے۔ تم نے جس کو فرار کرانا چاہا تھا وہ اس وقت قلعے میں ہے۔ ہمیں کل سہ پہر ہی کو قاصد کبوتر کے ذریعے شاہی فرمان کے احکام مل گئے تھے۔ بیوقوف نہ بنو۔ دیکھو، ہم نے کل رات ہی سرحد کی ناکہ بندی کر لی تھی، اتنی ہوشیاری سے کہ تم لوگوں کو خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ صبح وہ ملعون تو گرفتار ہو گیا، اب ہمارے پاس تمھیں زندہ یا مردہ، دونوں صورتوں میں قلعے لے جانے کا حکم نامہ ہے جو خود تمھارے والد ہی کی طرف سے ہے۔ دیکھو، تم قلعہ دار کے بیٹے ہو، ہمارے نائب سالار ہو . . . احمق نہ بنو۔ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم کوئی بہانہ بنالیں گے۔ تمھارے بدن پر زخم لگا کر ہم تمھیں بچالیں گے۔ ہم کہہ دیں گے کہ تم باغیوں سے لڑتے ہوئے زخمی ہو کر گر گئے تھے . . . ہم تمھیں بچا سکتے ہیں۔ خود کو ہمارے حوالے کر دو . . .‘

’’حصار شکن نے وسط میں گھومتے ہوئے شمشیر لہرائی۔ ’بے بس قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر،‘ حصار شکن کی آواز بلند تھی، ’ان کا گوشت نوچنے والو کتو! تم سب کے سب جھوٹے مکار اور فریبی ہو . . . تم کیا سمجھتے ہو کہ مجھے گرفتار کر لو گے؟ آؤ، حملہ کرو، مجھے گرفتار کرو . . . کل اسی جگہ سمت الراس سے

کرگس اتر کر تمھارے مردہ جسموں کو خوراک بنائیں گے... آؤ، حملہ کرو!'

''ادھیڑ عمر والے سوار کے اشارے سے دائیں جانب والے تین سواروں نے عقبی سوار کے ساتھ مل کر گھوڑے آگے بڑھائے۔ وہ وحشیانہ انداز میں چیختے ہوئے، شمشیریں لہراتے ہوئے، حصار شکن پر حملہ آور ہوئے۔ مجھ بوڑھے نے ایسا منظر نہ کبھی دیکھا تھا، نہ پھر دیکھ پاؤں گا۔ یوں محسوس ہوا جیسے حصار شکن کے سر پر آگے پیچھے، دائیں بائیں، آٹھ آنکھیں ہیں۔ وہ جھکا، اٹھا، ترچھا ہوا، اس کی شمشیر برق آسا چمکی، کوندی... اس کا گھوڑا آگے پیچھے، دائیں بائیں قدم جماتے ہوئے، اٹھاتے ہوئے، غضبناک پلنگ کی طرح اچھل رہا تھا۔ وہ حصار شکن کا اشہب تو نہ تھا لیکن عنان کے ہر اشارے کو جنگی گھوڑے کی طرح سمجھ رہا تھا۔ برق سی چمکی... ایک، دو، تین... تین سر دھڑوں سے جدا ہو گئے۔ چوتھے سوار نے پوری قوت سے خدنگ پھینکا۔ حصار شکن اتنا جھکا کہ گھوڑے کی گردن پر دراز ہو گیا۔ خدنگِ جستہ اس کے بدن کے اوپر سے قضائے خطا کی مانند گزر گیا۔ اگلے ہی لمحے میں حصار شکن کی شمشیر نے نیزہ پھینکنے والے کا شکم کاٹ دیا۔ گھوڑے بدحواس ہو کر ایک سمت بھاگے اور کچھ دور جا کر کھڑے ہو گئے۔ میدان میں اب صرف سات سوار رہ گئے۔ تین سرحد کی جانب جانے والے راستے پر، تین بائیں جانب نیم دائرے میں اور ایک روپوش زنگی... ہولناک سی خاموشی چھا گئی۔ 'آؤ!' حصار شکن چنگھاڑا۔ 'آؤ، حملہ کرو!' اس کی آواز بازگشت کی طرح گونجتی محسوس ہوئی۔ 'آؤ!'

''بائیں جانب والے، نیم دائرہ بنانے والے سوار دہشت زدہ ہو کر سرحد کی سمت جانے والے راستے پر کھڑے ادھیڑ عمر والے سوار اور اس کے دو ساتھیوں کے پاس چلے گئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے حصار شکن کو دیکھ رہے تھے۔ 'میں تم سے وعدہ کرتا ہوں،' ادھیڑ عمر کے سوار نے بلند لیکن خوفزدہ آواز میں کہا، 'قول دیتا ہوں کہ تمھیں بے قصور ثابت کرنے میں ہم ہر ممکن مدد دیں گے۔ ہم کہیں گے کہ باغی گروہ نے ہم پر بھی حملہ کر دیا تھا... دیکھو، تم ہمارے نائب سالار ہو... ہم تم سے تو اس حماقت کی توقع نہیں رکھتے۔ تم نے اپنے ہی رسالے کے آٹھ سوار ہلاک کر دیے ہیں۔ یہ حماقت ہے، جنون ہے! تم کہو تو ہم اپنی شمشیریں نیاموں میں رکھ لیتے ہیں۔ لیکن تم ہمارے ساتھ قلعے چلو۔ ہمارا یقین کرو۔ دیکھو تم بہت طیش میں ہو۔ طیش باعثِ خطا ہے۔ میری بات مان لو، یہی تمھارے اور

Scanned with CamScanner

ہمارے حق میں بہتر ہے۔'

''وہ سب اپنے اپنے گھوڑوں کی عنانیں کھینچے بدحواس سے تھے۔'تمھاری والدہ یقیناً خصلتِ روباہ رکھتی ہوگی!' حصار شکن نے بلند اور پراعتماد آواز میں کہا۔'میں تمھاری باتوں میں نہیں آؤں گا۔تم سب ایک سے ہو . . . فریبی، کاذب، مردار خور . . . کیونکہ تمھارا بادشاہ اور اس کا سارا خاندان کرگسوں ہی کی اولاد ہے۔حملہ کرو، مردار خور گیدڑو، حملہ کرو!'

''وہ سب ساکت تھے۔کسی میں حملہ کرنے کی جرأت نہ تھی۔پھر ہولناک سی خاموشی چھا گئی۔'روک سکتے ہو تو روکو!' حصار شکن نے عناں گسستگی سے سامنے راستہ روکے چھ سواروں پر حملہ کر دیا۔شمشیریں چمکیں، حصار شکن کا گھوڑا ایڑ اور عنان کی ہر جنبش پر دائیں بائیں، آگے پیچھے اچھل رہا تھا۔چشم زدن میں دو سوار حصار شکن کی شمشیر زنی سے اپنے اپنے گھوڑے پر اوندھے ہو گئے۔حصار شکن کا گھوڑا گردباد کی طرح گردش میں آیا اور ایک سوار کے کاندھے پر سر ہی نہیں تھا۔ایک سوار نے دور سے خدنگ پھینکا۔حصار شکن گھوڑے کی گردن سے ایک بار پھر چمٹ گیا۔گھوڑے نے جست لگائی۔خدنگ حصار شکن کی پشت کے اوپر سے نکل کر سامنے گھوڑے پر سوار ایک حملہ آور کے پہلو میں اتر گیا۔کربناک چیخوں سے گھوڑے بدحواس تھے۔حصار شکن کا گھوڑا جست لگا کر ادھیڑ عمر کے سوار کی طرف بڑھا۔اسی لمحے ادھیڑ عمر کے سوار نے عناں دُزدی کی۔مراجعت کا انداز اپناتے ہوئے اس نے تیزی سے اپنے گھوڑے کا رخ سرحد کی سمت موڑا۔یوں لگا جیسے وہ بھاگنے والا ہے۔حصار شکن اس کے پیچھے گھوڑے کو ایڑ دینے ہی والا تھا کہ جنگل کے گھنے درختوں سے زنگی کا گھوڑا قضا کی طرح نکلا۔وہ حصار شکن کے عقب میں آیا۔اس کے ہاتھ میں جال تھا۔میں نے سن رکھا تھا کہ قلعے میں ایک جال پھینکنے کا ماہر بھی ہے۔جب میں قلعے میں لکڑیاں بیچنے جایا کرتا تھا، میں نے سنا تھا کہ اس نے بہت سے شاگردوں کو جال پھینکنے کا فن سکھا رکھا ہے۔زنگی کے ہاتھ میں جال دیکھ کر میں کانپا۔اس سے پہلے کہ حصار شکن کا گھوڑا ادھیڑ عمر کے سوار کا پیچھا کرنے کے لیے سرپٹ ہوتا، زنگی نے اس قدر سرعت اور مہارت سے جال پھینکا کہ وہ حصار شکن پر سائبان کی طرح گرا۔جال کے چاروں کناروں سے بندھی مضبوط رسیاں زنگی کے بائیں ہاتھ میں تھیں۔زنگی نے دائیں ہاتھ سے اپنے گھوڑے کی عنان اس قدر زور سے کھینچی کہ گھوڑا الف ہو گیا۔حصار شکن جال سمیت الٹ کر پیچھے ہوا میں اچھلا اور پھر رکابیں

Scanned with CamScanner

اٹھنے پر، ننگے پاؤں رکابوں سے نکل جانے پر وہ الٹی قلابازی کھا کر زمین پر گرا، لیکن سرعت سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شمشیر سے جال کے بند کاٹنے لگا۔ 'ماردو۔ ۔ ۔ ماردو!' زنگی دہشت سے چیخا اور ادھیڑ عمر کے سوار نے نیم دائرہ بنا کر حصار شکن کی سمت خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا۔ 'وہ جال کاٹ رہا ہے۔ نکل گیا تو ہمیں مار دے گا۔ ماردو! اسے ماردو!' زنگی دہشت زدہ آواز میں چلّا رہا تھا۔

''ادھیڑ عمر کے سوار نے اپنا خدنگ پوری قوت سے جال پر پھینکا۔ نیزہ جال میں پھنسے حصار شکن کی پسلی میں اتر گیا۔ حصار شکن کا جسم زمین سے جالگا۔ اس کی شمشیر ہاتھ سے چھوٹ کر جال میں الجھ گئی۔ اس کا چہرہ سمت الراس میں اٹھا، پھر پیچھے گر گیا۔ دوسرا سوار شمشیر تانے سیدھا حصار شکن کے قریب آیا اور دستے کو پکڑ کر شمشیر خدنگ کی طرح حصار شکن پر پھینکی جو دل کے قریب جسم میں اتر گئی۔ حصار شکن کا بدن تھوڑا سا اٹھا، اس کا ہاتھ سینے میں پیوست شمشیر پر تھا۔ 'عُزّیٰ!' وہ آخری بار چلّایا اور پیچھے کی سمت گر گیا۔

''میری بیٹی بیہوش ہوگئی۔ ۔ ۔ میں اسے سنبھالتے ہوئے جھونپڑی میں لایا۔ پھر باہر نکلا۔ سامنے تین سوار موجود تھے۔ ادھیڑ عمر کا سوار، زنگی اور دوسرا سوار، حصار شکن نے پندرہ سواروں میں سے دستے کے بارہ سوار ہلاک کر دیے تھے۔ بچنے والے تینوں سوار گھوڑوں سے اترے۔ انھوں نے حصار شکن کے بدن میں گڑا ہوا خدنگ اور تلوار نکالی، جال اتارا اور اس کے جسم کو ایک گھوڑے پر اوندھا لٹا دیا۔ اس میں زندگی کی رمق تھی یا وہ ختم ہو چکا تھا، میں نہیں جانتا، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کم بصارت کے باوجود مجھے اس کے ایک ہاتھ میں جنبش سی نظر آئی تھی۔ 'گھوڑوں کو پکڑ لاؤ!' ادھیڑ عمر کے سوار نے حکم دیا۔ 'مردہ ساتھیوں کے جسم ان پر باندھ دو۔' 'میں زندہ ہوں،' ایک کربناک آواز ابھری۔ یہ اس سوار کی آواز تھی جس کی ٹانگ حصار شکن کی شمشیر سے کٹ گئی تھی۔ ادھیڑ عمر کا سوار اس کے قریب گیا۔ 'میری مدد کرو،' زخمی نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ 'خون رس رہا ہے۔ میری ران کو کس کر باندھ دو۔ مجھے قلعے میں لے چلو۔'

''ادھیڑ عمر کا سوار کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پیش قبض نکالا اور زخمی کی چھاتی کے پاس گھٹنا ٹیک کر بیٹھ گیا۔ 'کیا کرنے لگے ہو؟' وہ خوف سے چیخا۔ 'اب زندہ رہ کر کیا کرو گے!' ادھیڑ عمر کے سوار نے بیدردی سے پیش قبض زخمی کی گردن پر پھیر دیا۔ ایک گھٹی ہوئی چیخ کے ساتھ ہی ہر سمت سناٹا

Scanned with CamScanner

سا چھا گیا۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ سماعت ختم ہو چکی ہے اور میں سناٹے میں ہوں۔۔۔

''زنگی اور دوسرا سوار گھوڑوں پر مردہ جسموں کو باندھتے رہے۔ پھر گھوڑوں کے قدم قدم چلنے کی آواز سے میری سماعت واپس پلٹی۔ تینوں سوار میرے قریب آ چکے تھے۔ 'کیا اسے بھی لے چلیں؟ اس کی عورت بھاگ گئی ہے،' زنگی نے کہا۔ 'وہ میری بیٹی ہے،' میں نے کانپتی آواز میں کہا۔ میں اپنی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ 'بیہوش ہو گئی ہے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ نہیں پائی۔ وہ بھاگی نہیں، جھونپڑی میں ہے۔' میں نے جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''صبح کی روشنی میں اب ہر شے نمایاں تھی۔ مشرقی افق پر پھیلے کہرے سے آفتاب اپنا چہرہ دکھا رہا تھا جو مجھے سیاہ محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا میں خنکی کے ساتھ کڑواہٹ کا احساس بھی تھا جو نتھنوں سے سینے میں اتر رہا تھا۔ 'تم نے اسے پناہ دی تھی!' حصار شکن کے سینے میں شمشیر اتارنے والے نے گرج کر کہا۔ 'میں نے پناہ نہیں دی تھی۔۔۔' میری آواز میں کپکپاہٹ بہت بڑھ چکی تھی۔ میرا بدن بھی تھرتھرا رہا تھا۔ 'مہمانداری کی تھی۔۔۔ اس نے کہا تھا کہ وہ رستہ بھول گیا ہے۔ اوپر چشمے پر۔۔۔' میں نے چشمے کی سمت اشارہ کیا۔ 'اس نے کہا تھا کہ اس کا گھوڑا کسی درندے سے بدک کر بھاگ گیا ہے۔ وہ شاہی رسالے کا افسر ہے۔۔۔ میں تو اپنی جگہ نادم تھا کہ شاہی رسالے کے عہدیدار کے شایانِ شان تواضع مجھ غریب کے اختیار میں نہیں ہے۔' میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ بولا۔

''ادھیڑ عمر کے سوار نے میری سمت غور سے دیکھا۔ 'تم وہی لکڑہارے ہو جو قلعے میں جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لایا کرتے تھے؟' اس نے پوچھا۔ 'ہاں ہاں،' میری آواز مسلسل کانپ رہی تھی۔ 'میں وہی ہوں۔' 'میں اسے جانتا ہوں،' ادھیڑ عمر والے سوار نے کہا۔ اس نے گھوڑے کو ایک دو قدم بڑھاتے ہوئے مجھے دیکھا۔ 'یہ ایک شریف لکڑہارا ہے۔ میرے خیال میں یہ درست کہہ رہا ہے۔ اس مردود باغی نے۔۔۔' اس نے حصار شکن کے مردہ جسم کی طرف دیکھا۔ 'اسے کچھ نہیں بتایا ہوگا۔' 'میں نے اسے کہا تھا۔۔۔' میری آواز کی کپکپاہٹ کچھ کم ہو گئی۔ 'میں نے یہی کہا تھا کہ میں اس جنگل کے ہر راستے کو جانتا ہوں۔ گھوڑا اگر درندے سے بچ گیا ہوگا تو جنگل ہی کے کسی راستے پر ہوگا۔ میں گھوڑے کو ڈھونڈ لوں گا۔' 'اسے پکڑ کر لے جانا بیکار ہے،' پہلے حملہ آور سوار نے ادھیڑ عمر والے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ 'اس کی بیٹی۔۔۔' زنگی نے کہا اور وہ گھوڑے سے اترا۔ میرا جسم پھر کانپا۔ وہ جھونپڑی

میں گیا اور پھر ناک سکوڑتا ہوا واپس آیا۔" اس کی بیٹی۔ . . امیر الملک تو کیا، اس کی بیٹی کو تو قصرِ شاہی کا دربان بھی دیکھنا پسند نہیں کرے گا۔'

"اس نے قہقہہ لگایا۔ وہ ہنستا ہوا دونوں سواروں کے پاس آیا۔ وہ لعین بھی ہنس رہے تھے۔ پھر انھوں نے گھوڑوں کو ایک دوسرے کے پیچھے باندھا اور چلے گئے۔ . . وہ چلے گئے لیکن ہمیں ایسے حزن میں چھوڑ گئے جس کا کوئی مداوا نہیں ہوا کرتا۔"

بوڑھا خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے ایک سوکھی لکڑی آتشدان میں پھینکی۔ "سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ . . " اس کی آواز میں الم انگیز مایوسی تھی۔ "وہ اس ملک کی آخری امید تھا۔ وہ اس تاریک شب میں صبح کے ستارے کی مانند تھا۔ اب شاید ہم کبھی بھی آزادی، عزت اور خوشحالی کے ساتھ طلوع ہونے والے سورج کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ وہی ہمیں دس عیوب والے بادشاہ سے نجات دلا سکتا تھا۔ اب کچھ بھی تبدیل نہ ہوگا۔ . . تم سو جاؤ۔ رات گہری ہو چکی ہے۔ میری بیٹی کے پہلو میں لیٹ جاؤ۔ سو جاؤ۔ . . میں اب بھی تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم کون ہو، کہاں سے آئی ہو، کہاں جاؤ گی۔ . . میں تمھاری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ دیکھ چکا ہوں۔ تم عزیٰ کی طرح رحمدل ہو۔ کیا خبر تم عزیٰ ہی ہو جو انسان کے روپ میں میرے اس کلبۂ مفلس میں آئی ہو۔ . . تم جو بھی ہو، کل صبح میری بیٹی کے ساتھ سرحد پار کر جاؤ۔ اگر یہاں تمھیں کسی نے دیکھ لیا تو تم بدہیئت، بدصورت، بدخصلت، فاسق اور فاجر بادشاہ کی ہوس کا شکار ہو جاؤ گی۔ میں نے اگرچہ تم سے تمھارے متعلق کچھ دریافت نہیں کیا لیکن ایک سوال میرے ذہن میں اب بھی الجھاؤ پیدا کر رہا ہے کہ کہیں تم حصار شکن ہی کو تلاش کرتے ہوئے یہاں۔ . . '

"نہیں بابا!" میں نے بوڑھے کی بات کاٹ دی۔ "مجھے اس کی تلاش نہیں ہے۔ میں تو اس انسان کی تلاش میں ہوں جو انسانی معاشروں میں قوتِ شر کے بھیانک مظاہر کو کشت و خون سے نہیں، دانش و فراست سے معدوم کرنے پر یقین رکھتا ہو، کیونکہ کشت و خون تو بجو د تقاضائے قوتِ شر ہے۔ میں تو اس انقلاب کو چاہتی ہوں جو دانش سے برپا ہو، ایسی دانش سے جسے کوئی فریب نہ دے سکے؛ ایسی فراست سے ظہور پذیر ہو جسے منفی جبلتیں آلودہ نہ کر سکیں۔ انسانی معاشروں میں کوئی انقلاب کشت و خون سے دوام حاصل نہیں کر سکتا۔ خون کے قطرے مٹی میں گرانے والا انقلاب خود اپنے ہی

Scanned with CamScanner

وجود کو بنیاد فراہم کر دیتا ہے۔ ہر وہ انقلاب جس کے وجود کو خون کے قطروں نے نمودار کیا ہو، وہ کشت و خون ہی کو اساس فراہم کر دیتا ہے... کیا تم نے گلاب کے پودے کو نہیں دیکھا جس کے سر سبز پتوں کے ساتھ شاخوں پر نوکیلے، درد دینے والے خار بھی ہوتے ہیں؟ جس کے پھولوں کی مہک کے ساتھ خاروں سے اٹھنے والی ٹیسیں بھی ہوتی ہیں؟ کیا تم نہیں جانتے کہ خوشنما کھلے ہوئے خوشبودار گلاب میں درد دینے والے خار بھی پنہاں ہوتے ہیں؟''

بوڑھے کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟'' اس نے کہا۔ ''پھول میں کانٹا... میں سمجھا نہیں۔ پھول میں صرف مہک ہوتی ہے، رنگ ہوتا ہے، خلش نہیں ہوتی۔''

''گلاب کا پودا اپنی شاخوں پر ہمیشہ گلوں کو نہیں دیکھا کرتا،'' میں نے کہا۔ ''گل مرجھا جاتے ہیں بابا، ان کی پتیاں سوکھ جاتی ہیں، سیاہی مائل ہو جاتی ہیں۔ پھر ہر پھول میں بیج بنتا ہے جو خشک پتیوں کے جھڑ جانے پر نیچے خاک میں گرتا ہے۔ پھر تخم ریزی کے بعد مٹی کی نمی اسے ریشگی دیتی ہے۔ مٹی سے زمردیں سوئی سی نکلتی ہے، تنا بنتا ہے، شاخیں نکلتی ہیں اور ان پر سبز پتوں کے ساتھ خار بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ وہ خار تخم ہی میں ہوا کرتے ہیں اور تخم گل کے اندر نمو پاتا ہے۔ ہر وہ انقلاب جس کی اساس کشت و خون پر ہو، گلاب کے پھول کی مانند ہوتا ہے... دلکش، خوشنما، مہکتا ہوا، سکون بخش۔ لیکن اسی کے اندر وہ تخم بھی نمو پاتا ہے جس میں خار بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو انقلابیوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں، انھی کی آل اولاد، انھی کی نسلیں، انقلاب کے دلکش، خوشنما، مہکتے ہوئے پودے کی شاخوں پر خار بن کر نمودار ہو جاتی ہیں۔ ایک اور خونیں انقلاب کا تخم مٹی میں گر جاتا ہے، اور کشت و خون کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔''

بوڑھے نے اپنی سفید پلکیں ایک دوبار جھپکیں۔

''تمھارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم سرحد پار چلی جاؤ،'' اس نے کہا۔ ''وہ لوگ امن پسند ہیں۔ وہاں طبقاتی کشمکش تو موجود ہے لیکن اخلاقی گراوٹ نہیں ہے۔ میری بیٹی اٹھارہ برس کی تھی جب اس نے سرحد پار کے قصبے میں، شیخ کے محل میں، ملازمہ کی حیثیت سے رسائی حاصل کی تھی۔ وہ آج بھی باعصمت ہے۔ شیخ کی بیٹیوں کو دیکھ دیکھ کر اسے اپنی عسرت کا احساس کئی بار ہوا ہوگا۔ محل کی عشرت دیکھ کر اسے بھی طبقاتی امتیاز کے اذیت دہ احساس نے ستایا ہوگا۔ لیکن اس کی جانب کسی نے بھی

Scanned with CamScanner

ہوسناک نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ یہ۔۔۔ ''بوڑھے نے اپنی سوئی ہوئی بیٹی کی سمت دیکھا۔'' یہ کسی کی ہوس کی کا شکار نہیں ہوئی ہے۔ یہاں اگر بادشاہ کے کسی ملازم کے بھی ہاتھ لگ جاتی تو اپنی تار تار عصمت کے ساتھ قصرِ شاہی میں یہی کچھ کر رہی ہوتی جو سرحد پار شیخ کے گھر میں کر رہی ہے: برتن صاف کرنا، فراشی، ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود خشک آنکھوں کے ساتھ کام میں مصروف رہنا۔ لیکن اس کی عصمت آج بھی محفوظ ہے۔ تو سرحد پار چلی جانا۔۔۔ اب سوجا۔۔۔ نیند کو آنکھوں میں آنے دے۔۔۔ تجھے ابھی نہ جانے کیا کیا دیکھنا ہے۔۔۔''

بوڑھے کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ پلکیں اس بوجھ کو ملفوف کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''رہی بات انقلاب کی۔۔۔ '' وہ خواب آلود آواز میں بہت دھیمے لہجے میں بولا۔ ''میں کوئی دانشور تو نہیں ہوں۔ زندگی نے جو تجربہ دیا ہے، اسی کے اکتساب کی اساس پر اتنی بات ضرور سمجھتا ہوں کہ جو انقلاب عجلت میں برپا ہوتا ہے، وہ اپنے ساتھ کشت و خون ہی کو لایا کرتا ہے۔ تم جس انقلاب کی خواہش رکھتی ہو، وہ اپنے ساتھ بقول تمھارے دانش، فراست اور تحمل کا بھی متقاضی ہوگا۔ لیکن آج تک ایسا ہوا نہیں ہے۔ انقلاب سے بہرہ ور ہونے کی خواہش ہمیشہ عجلت کو لاتی ہے، اور عجلت ہمیشہ خونیں انقلاب ہی لایا کرتی ہے۔۔۔ سو جاؤ۔۔۔ ہم تو عجلت اور تاخیر، دونوں ہی سے مایوس ہیں۔۔۔ سو جاؤ!''

4

سرحد پار کرنے کے بعد میں بوڑھے کی بیٹی سے جدا ہو گئی۔ میں گھنے درختوں کے درمیان پگڈنڈیوں پر، خزاں رسیدہ خشک پتوں سے اٹی پگڈنڈیوں پر چل دی۔

''سفر کی بے سبی خوبصورت شے ہے۔۔۔ ''مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

''ہر شے اپنی اصل کی سمت لوٹ جاتی ہے۔ خزاں رسیدگی سے خشک، مٹیالے، جھڑے ہوئے پتے سرِّ بہاراں ہی کو فاش کیا کرتے ہیں۔ زندگی کہیں پر بھی جامد نہیں ہے۔ میرے اٹھتے ہوئے قدم وقت کے گزرتے لمحوں کی مانند ہیں۔ میں خود زندگی کی مانند ہوں۔۔۔ چلتی رہوں گی، چلتی رہوں گی۔ میں اس زندگی کی تمثیل ہوں جس کا احساس اصل حیات و ممات سے بھی بلند ہے۔ یہ جسم،

یہ مادی اظہارِ حرکت... اس سے بلند بھی ایک اظہارِ حرکت ہے جو لافانی ہے، جاوداں ہے۔ وہی تو میں ہوں... وہی تو تیری حقیقت ہے... تو ایک ڈھانچہ ہی سہی، میرے وجود سے پیوستہ ہے، میری مانند اصل حیات و ممات سے بھی بلند ہے۔ میں تیرے مادی وجود کو کیوں تلاش کر رہی ہوں؟ شاید اس لیے کہ میں اپنے ہونے کا احساس، اپنے وجود کا ادراک، تجھ سے حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میں تجھے تلاش کرتی رہوں گی۔ تیری تلاش ہی میرا یہ اظہارِ حرکت ہے، یہ اظہار جو ارفع ہے، جاوداں ہے، جسے زوال نہیں ہے...''

❊❊

Scanned with CamScanner

خالد طور

ایراوتی

1

لاہور شہر میں کرشنا مندر صدیوں پرانا ہے۔ نہ جانے کتنی بار تاراج ہوا، کتنی بار منہدم ہوا، لیکن ہر بار اس کی بنیادوں پر پھر سے دیواریں کھڑی کر دی گئیں۔ دیواروں پر پھر سے کلس نمودار ہو گیا۔ ہر بار اس مندر کی تاریخ بدلتی رہی لیکن اس کی بنیادیں، اپنی قدیم تاریخ کے ساتھ نہ تاراج ہو پائیں نہ منہدم۔ کبھی یہ مندر دریائے ایراوتی [1] کے کنارے پر تھا اور دریا کی موجیں اس کی سیڑھیوں سے ٹکرا کر گزرا کرتی تھیں۔ پھر وقت کی طرح دریا نے بھی رخ بدلا اور مندر کی سیڑھیوں سے دور ہوتا چلا گیا۔

اب قدیم دریا کے صرف آثار ہی باقی ہیں۔ دو دہائیاں پہلے لاہور کے قلعے کے قریب سے گزرنے والے دریا کو 'بڈھا راوی' کہا جاتا تھا، اور اب اس بڈھے کو بھی گھیر کر ایک بڑے سے تالاب کی قبر میں سلا دیا گیا ہے۔ ایک روایت کے مطابق سید علی ہجویری جب دریاے ایراوتی عبور کر کے لاہور

1۔ ایراوتی: پنجاب کے دریاے راوی کا قدیم سنسکرت نام۔ یہ دریا کشمیر کی وادیوں سے نکل کر میدانی علاقے میں آتا ہے۔ لاہور شہر اسی دریا کے کنارے آباد ہے۔ لاہور کے قریب سے گزر کر یہ جنوب کی سمت میں چلا جاتا ہے۔ اساطیرِ ہند میں 'ایراوت' اس ہاتھی کا نام ہے جس پر اندر دیوتا سواری کرتا ہے۔ دراصل سیاہ اور سرمئی بادلوں کو صدیوں سے ہاتھیوں سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے، اور اندر دیوتا، میگھ دیوتا بھی کہلاتا ہے، یعنی اندر دیوتا سیاہ اور سرمئی بادلوں پر سواری کرتا ہے۔ سنسکرت زبان میں ایراوت قوسِ قزح کو بھی کہا جاتا ہے، یعنی 'اندر دھنش'۔ ماضی میں دریا کی بپھری ہوئی موجوں اور تیز دھاروں کو دیکھ کر کسی رشی یا منی نے اس کا نام 'ایراوتی' رکھا ہوگا، جو وقت کے ساتھ لہجے کی تبدیلی سے 'راوی' ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

کے نواح میں پہنچے تھے تو انھوں نے کرشا مندر ہی کے قریب ایک درخت کے نیچے بوریا بچھایا تھا تا کہ سفر کی تھکان مٹا سکیں۔

کرشا مندر اب لاہور کی راوی روڈ سے گزرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ مندر کے چاروں جانب عمارتیں بن چکی ہیں۔ مندر کے بیرونی دروازے تک پہنچنے کے لیے گلیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کرشا مندر پر سارا سال بیوگی چھائی رہتی ہے۔ سفید ڈسٹمپر سے لپی دیواریں اور کلس اداس اداس سا نظر آتا ہے۔ جنم اشٹمی پر یہاں نرت (رقص) نہیں ہوتا۔ دسہرے پر راون کا بت نہیں جلایا جاتا۔ دیوالی پر اس انداز میں دیے جلائے جاتے ہیں کہ وہ راوی روڈ سے گزرنے والوں کو نظر نہ آئیں کیونکہ تخریب کاری خارج از امکان نہیں ہوتی۔ پھاگن میں جب ہولی آتی ہے تو مندر بے رنگ رہتا ہے۔ نہ پچکاریاں چلتی ہیں نہ رنگ کے چھینٹوں سے چہروں پر گل افشانی ہوتی ہے، نہ رقص ہوتا ہے نہ موج مستی؛ بس انگلی سے ایک دوسرے کے ہاتھوں پر گلال لگا دیا جاتا ہے اور دھیمی سی آواز میں ''ہولی ہے!'' کہہ کر ہولی منائی جاتی ہے۔ آوازیں سہمی رہتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مندر میں ہولی کا تہوار منانے والے کسی ایسے عفریت سے خوفزدہ رہتے ہیں جو دیواروں کی دوسری جانب، آگ اگلنے والے ڈریگن کی طرح، گھات لگائے بیٹھا ہو۔

ابتدا ہی سے میری پوسٹنگ لاہور ریڈیو اسٹیشن پر ہو گئی تھی۔ بہت جلد ہی ریڈیو کے افسرانِ بالا کو معلوم ہو گیا کہ میرے قلب و ذہن میں کسی مذہب کے لیے بھی نفرت موجود نہیں ہے۔ تمام مذاہب کے تہواروں کی کوریج میری ذمے داری بنا دی گئی۔ میں ہر سال میلاد پر ٹیپ ریکارڈ لے کر دلی دروازے کے قریب مسجد وزیر خاں پہنچ جاتا تھا جہاں سے چغال چھنیے[2] باندھے، عربی لباس پہنے مقامی مولوی حضرات، کندھوں پر روضۂ رسول اٹھائے، جلوس کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اسی جلوس میں کندھوں پر مسجد نبوی کو بھی اٹھایا جاتا ہے۔ یہ جلوس مسجد وزیر خاں سے شروع ہو کر داتا دربار پر ختم ہوتا ہے۔ جلوس کے آگے نعت خوانوں کی ٹولیاں چلتی ہیں۔ ان میں اکثر فلمی گانوں کی دھنوں میں موزوں کی ہوئی نعتیں پڑھی جاتی ہیں۔

ہر محرم کی دسویں تاریخ کو میری ڈیوٹی چوک رنگ محل میں لگتی تھی جہاں نمازِ عصر کے بعد اس قدر

2۔ سر پر باندھا جانے والا کپڑا اور موٹی رسیاں۔ اساطیری دنیائے عرب میں موٹی سیاہ رسیوں کو افعی کی علامت اور خوش بختی سمجھا جاتا تھا۔

شدت سے زنجیر زنی ہوتی ہے کہ عزاداروں کی سفید شلواریں خون سے سرخ ہو جاتی ہیں اور سیاہ عمامے باندھے ہوے ذاکر بلند آواز میں کہتے جاتے ہیں کہ مومنو، آج اتنا خون بہاؤ کہ ہمارے دشمن اس میں ڈوب جائیں۔

گڈ فرائی ڈے، ایسٹر اور کرسمس پر میں ٹیپ ریکارڈ اٹھائے گرجا گھروں میں پہنچ جایا کرتا تھا۔ ریگل سینما کے پاس گرجا گھر میں کوائرز (choirs) ریکارڈ کرنا مجھے دلچسپ کام لگتا تھا، ایک کوائر کی دھن اور بول مجھے ابھی تک یاد ہیں: ''آیا یسوع یار ساہڈے پاس...''

سکھ یاتریوں کی ذمے داری اگرچہ پنجابی دربار پروگرام کے پروڈیوسر کے ذمے ہوتی تھی لیکن واہگہ بارڈر پر سکھ یاتریوں کا استقبال کرنے میں ہی جایا کرتا تھا اور بادشاہی مسجد کے قریب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی پر شبد کیرتن میں ہی ریکارڈ کیا کرتا تھا۔ ایک نوجوان سکھ لڑکی کی بلند آواز اور شبد مجھے ابھی تک یاد ہیں: ''پرتھم بھگوتی سِمرَ کے...''

جنم اشٹمی، والمیکی جنم، دسہرہ، دیوالی اور ہولی کے تہواروں پر میرے ہندو دوست مجھے کرشنا مندر میں بلایا کرتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سب مجھے بھول گئے۔ میرے گھٹنوں میں بھی اتنی قوت نہیں رہی کہ خود جا سکوں۔ اخباروں میں چھوٹی چھوٹی خبریں پڑھ لیتا ہوں۔ ہر خبر میں کسی حکومتی نمائندے کا بیان شامل ہوتا ہے کہ ملک میں اقلیتوں کو مکمل آزادی حاصل ہے، مکمل مذہبی آزادی!

2

ریڈیو اسٹیشن پر میرے کمرے میں، میرے پاس مسٹر اینڈ مسز ملک بیٹھے تھے۔ میرے ہندو دوست آئے اور مجھے ہولی کا نیوتا (دعوت) دے کر فوراً ہی کسی ضروری کام کی وجہ سے چلے بھی گئے۔

''ہم بھی جائیں گے،'' ملک نے میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوے کہا۔ ''تم تو جانتے ہی ہو، ہم سیکولر ہیں۔''

میں نے ملک اور مسز ملک کو بتایا کہ وہ جس ہولی کا تصور لے کر کرشنا مندر جانا چاہتے ہیں، وہ اب صرف دوردرشن پر دکھائی جانے والی فلموں ہی میں سرحد کے اُس پار دکھائی دیتی ہے۔ 'رنگ برسے بھیگے چنرِ والی، رنگ برسے...' کرشنا مندر میں نہ رنگ برستے ہیں نہ کوئی چنری والی بھیگتی ہے۔''

Scanned with CamScanner

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے!'' ملک نے کہا۔ ''آئین میں تو اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔''

''یقین نہیں تو چل کر دیکھ لینا،'' میں نے کہا۔

مسٹر اینڈ مسز ملک برسوں پہلے میرے یونیورسٹی کے دوستوں میں شامل تھے۔ 1971 کی جنگ کے بعد شکست خوردگی کے احساس نے پورے ملک میں مایوسی پھیلادی تھی۔ ایک شام یونیورسٹی کے پندرہ بیس پروگریسو اسٹوڈنٹس نے کینٹین میں بیٹھ کر عہد کیا کہ ہم میں سے کوئی بھی نظام کی خدمت نہیں کرے گا، کیونکہ نظام ہی ملک میں سیاسی ابتری اور معاشرتی بربادیوں کا باعث بنا ہوا ہے۔ ہم رائج نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر نیا نظام لائیں گے۔ ملک اور مسز ملک وہاں موجود تھے۔ انھوں نے فوراً ہی خاندانی نظام سے بغاوت کا اعلان کیا۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے بھی تھے۔ دونوں نے وہیں شادی کا فیصلہ کیا اور والدین کی مرضی کے خلاف جا کر شادی بھی کر لی۔ مسز ملک اکیلی تھیں، نہ بہن نہ بھائی۔ ماں باپ نے خاموشی اختیار کر لی۔ ملک کے خاندان والوں نے اسے سب رشتے ناتوں سے بے دخل کر دیا۔ نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کی ہماری خواہش خود فریبی میں بدل گئی اور ہم سب خود اپنی ہی جڑوں سے اکھڑ گئے۔ یونیورسٹی کے وہ طالب علم اور طالبات جو ہمارے پیچھے صف دوم کے اسٹوڈنٹس کہلاتے تھے، انھوں نے سی ایس ایس کا امتحان دیا۔ پاس ہونے والے بیوروکریٹ بن کر اونچے عہدوں پر پہنچ گئے۔ اب وہ ہم پر حکم چلاتے تھے اور اکثر دھمکیاں بھی دیتے تھے۔

ملک نے سرکاری ملازمت نہیں کی تھی، کوئی کاروبار بھی نہ تھا، اس لیے عسرت زدہ زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی خصلت میں زبردست تضاد پیدا ہو چکا تھا۔ کبھی وہ مارکسزم پر لیکچر دینے لگتا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ پوری دنیا میں اس سے بڑھ کر کارل مارکس کو سمجھنے والا اور کوئی نہ ہوگا۔ تین چار دن بعد ہی وہ مذہب اسلام اور سوشلزم کو جوڑ کر قرآنی حوالہ جات دینے لگتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا، ''پیغمبرِ اسلام میرے آئیڈیل ہیں۔ پوچھو کیوں؟ اس لیے کہ ان کی ساری زندگی مردانگی کی علامت ہے۔''

3

اگلی شام مسٹر اینڈ مسز ملک اور میں لاہور کے ریلوے اسٹیشن سے ایک تانگے پر بیٹھ کر کرشنا مندر پہنچے۔ مندر کے قریب میں ہمیشہ محو سا ہو جایا کرتا تھا۔ مجھے مندر کی سیڑھیوں سے ٹکراتے

Scanned with CamScanner

ہوے ایراوتی کے دھاروں کی دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دینے لگتی تھی۔ دور دریا کے وسط میں بہتی کشتی پر سے کسی ملاح کا لوگ گیت مندر تک آتا محسوس ہوتا تھا۔ اسی کیفیت میں میں نے ایک شعر بھی کہا تھا:

یہ بات یاد رکھنا، رہتا تھا تیرا خالد
ایراوتی کے تٹ پر، لاہو[3] کے اس نگر میں

ہمیشہ کی طرح ہندو دوست پر تپاک انداز میں ملے۔ مسٹر اینڈ مسز ملک کو دیکھ کر بہت خوش ہوے۔ مندر میں ہولی کا تہوار منانے والوں کی تعداد بیس سے زیادہ نہ تھی۔ ان میں بچے بھی تھے۔ پھر تین چار سکھ بھی آ گئے۔ سب کے ہاتھوں پر گلال لگایا گیا۔ پھر سب ایک اندرونی کمرے میں چلے گئے۔

گنیش دیوتا کی استوتی (پوجا کا بھجن) گانے کے بعد بھجن شروع ہوے۔ کرشنا مندر میں ایک مورتی بھی نہیں ہے، صرف فریم کی ہوئی دیوی دیوتاؤں کی تصاویر ہیں، جنھیں مصوروں نے بڑی شردھا (عقیدت) سے بنایا ہوگا۔ یہ تصاویر اندرونی کمرے میں ہیں جہاں مورتیاں نہ ہونے کی وجہ سے آرتی کے تھال بھی نظر نہیں آتے؛ بس ایک گھنٹی ہے جو اندرونی کمرے کے دروازے پر لٹکی رہتی ہے۔ کمرے میں اگر بتیاں نہیں جلائی جاتیں۔ انھیں تصاویر میں ایک تصویر پر میری نظر ٹھہر سی گئی۔ اس تصویر میں ہولیکا ننھے پرہلاد کو گودی میں اٹھائے چتا پر بیٹھی دکھائی گئی ہے۔[4] بھجنوں کے بعد چھوٹی

3۔ لاہو:۔ راجہ رام چندر کا بیٹا، جس نے ایراوتی کے کنارے، لاہور شہر بسایا تھا۔

4۔ اساطیرِ ہند کے مطابق ہرن کشیپ دیوتاؤں کا دشمن ایک راجہ تھا۔ اس کے گھر ایک لڑکے پرہلاد نے جنم لیا جو ماں کی کوکھ ہی میں دیوتاؤں کا بھگت بن گیا تھا۔ اس کے باپ نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ دیوتاؤں کی بھگتی چھوڑ دے۔ جیسے جیسے بچہ بڑھا ہوا، اسے خوف دلایا گیا، لالچ دی گئی، لیکن وہ اپنی بھگتی پر قائم رہا۔ طیش میں آ کر ہرن کشیپ نے اپنے بیٹے کو مار ڈالنے کا ارادہ کیا لیکن اسے قتل کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں اور وہ چٹان سے پھینکے جانے، ہاتھیوں کے پیروں تلے کچلے جانے، سانپوں سے ڈسوائے جانے اور سپاہیوں کے حملہ آور ہونے کے باوجود زندہ رہا۔ ہرن کشیپ کی بہن ہولیکا کو دیوتاؤں کی طرف یہ وردان حاصل تھا کہ آگ اس پر اثر نہیں کرتی تھی۔ اس نے کہا، ''میں پرہلاد کو گود میں لے کر چتا پر بیٹھ جاتی ہوں۔ پرہلاد جل جائے گا، میں بچ جاؤں گی۔'' چتا بنوائی گئی اور ہولیکا ننھے پرہلاد کو گود میں لے کر چتا پر بیٹھ گئی۔ چتا کو آگ دی گئی۔ شعلے باہر ہوے تو ہولیکا نے چیخنا شروع کر دیا۔ پرہلاد محفوظ رہا اور ہولیکا جل گئی۔ مہادیو (شو) نے برہما جی کی طرف سے یہ پیغام دیا کہ وردان خیر کے لیے ہوتا ہے، شر کے لیے نہیں۔

Scanned with CamScanner

چھوٹی تھالیوں میں پرساد (تبرک) بانٹا گیا۔ یہ پرساد سوجی کا حلوہ تھا۔ ہر سال کی طرح پرساد بہت لذیذ تھا۔ میں پوری تھالی چٹ کر گیا۔ مسٹر اینڈ مسز ملک کے سامنے تھالیاں پڑی تھیں اور وہ دونوں پریشان سے نظر آرہے تھے۔ میرے ہندو دوست نے معاملہ فہمی سے ملک اور مسز ملک کا پرساد ایک پولیتھین کے لفافے میں ڈال دیا۔ شاید وہ یہی سوچ رہے تھے کہ مسٹر اینڈ مسز ملک مندر میں بیٹھ کر پرساد کھانے سے جھجک رہے ہیں۔

واپسی پر جب تانگا شاہ عالمی دروازے کے پاس پہنچا تو ملک نے بیوی کے ہاتھ سے پرساد کا لفافہ لیا، اِدھر اُدھر دیکھا، اور تانگے کے گھومتے چرچراتے پہیے کی سمت ہاتھ لے جاکر پرساد سڑک پر پھینک دیا۔ ملک کے چہرے پر ناگواری سی تھی۔ اسٹیشن پر جہاں تانگا رکا وہاں ایک نلکا بھی تھا۔ ملک نے نلکے پر چار پانچ مرتبہ ہاتھ دھوئے، بیوی کو بھی حکم دیا کہ چار پانچ بار ہاتھ دھولے، پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

''تمھیں تو ہاتھ دھونے کی ضرورت نہیں!'' ملک کے لہجے میں طنز تھا۔ ''تم تو مجھے پیدائشی ہندو لگتے ہو۔ کتنے مزے سے حلوے کی پوری تھالی کھا گئے تھے!''

''تم تو...'' میں نے کہا، ''تم تو خود کو ہر قسم کی نفرت سے بلند کہا کرتے ہو... تم تو خود کو سیکولر...''

''سیکولر ہونا اور بات ہے،'' ملک نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا، اور ''ہندنیوں کے ہاتھ کا حلوہ کھانا اور بات ہے۔ تم نہیں جانتے۔ تمھارا معدہ پلید ہو چکا ہے۔ اگر تمھارے رشتے داروں کے گھروں میں آبِ زمزم موجود ہو تو منگوا کر ایک گھونٹ پی لینا۔ نہ ملے تو سورۂ اخلاص سات مرتبہ پڑھ کر پانی کے گلاس پر پھونک کر ایک ہی سانس میں پانی پی لینا۔ پاک صاف ہو جاؤ گے۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایراوتی کے دھارے کرشنا مندر کی سیڑھیوں سے ٹکرا کر پیچھے ہٹے ہیں تو ہٹتے ہی چلے گئے ہیں۔ پھر وہ سکڑ کر نالی بن گئے ہیں۔ پھر نالی بھی سوکھ گئی ہے اور دریا میں پھیلی ہوئی خشک ریت کے سوا کچھ نہیں رہا۔

اس رات میں دیر تک سو نہ سکا۔ بچپن سے جوانی تک، اسکولوں کالجوں میں یہی بتایا جاتا رہا تھا کہ ہندو بہت تنگ نظر اور متعصب ہوتے ہیں۔ اگر ان کے کھانے کے برتن کو کوئی مسلمان چھو لے تو وہ برتن ہی پھینک دیتے ہیں۔ ہندو عورتیں اپنی رسوئی میں گنگا جل چھڑکتی رہتی ہیں، اپنے علاوہ سب کو

Scanned with CamScanner

نجس سمجھتی ہیں۔ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان بہت فراخ نظر اور غیر متعصب ہوتے ہیں۔ مسلمان بہت کھلے دل کے ہوتے ہیں، سب کو گلے سے لگاتے ہیں اور کسی سے نفرت نہیں کرتے۔

''حقیقت کیا ہے؟ حقیقت کی سمت دیکھنا بھی کسی کو گوارا نہیں،'' میں نے سوچا۔ ''یہ ایک ناقابلِ تردید سچائی ہے کہ اس دنیا میں ہر مذہب کسی نہ کسی صورت میں نفرت ضرور سکھاتا ہے، کیونکہ ہر مذہب خوف اور خودغرضی کی بنیادوں پر قائم ہے، اور جہاں خوف ہوگا وہاں تعصب ضرور ہوگا؛ جہاں خودغرضی ہوگی وہاں نفرت ضرور ہوگی۔''

ملک کے منافقانہ رویے سے میں دل برداشتہ تھا۔

''اگر خود کو روشن خیال کہنے والے نام نہاد پروگریسو لوگوں کا یہ حال ہے تو انتہا پسند مولویوں، پیروں اور ان کے زیرِ اثر لاکھوں لوگوں کی نفرت کا کیا عالم ہوگا!''

4

اگلے روز میں سات منٹ دورانیے کی ہولی ڈے رپورٹ تیار کر رہا تھا کہ میرے ہندو دوست اسٹوڈیو ہی میں آ گئے۔

''کل پرساد کا حلوہ بہت لذیذ تھا،'' انھیں دیکھتے ہی میں نے بے ساختہ کہا۔ ''جی چاہتا تھا، ایک تھالی اور مانگ لوں۔''

میرے ہندو دوست نے قہقہہ لگایا۔

''لذیذ کیوں نہ ہو!'' انھوں نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ''ہم ہر سال امرتسریوں کی دکان سے خصوصی طور پر بنواتے ہیں۔''

امرتسریوں کی دکان لاہور شہر میں امرتسر کے مشہور مسلمان حلوائیوں کی دکان ہے جو 1947 میں سرحد کے اس پار آ گئے تھے۔

میرے تصور میں ایراوتی کی سوکھی ریت، پھر سے نم آلود ہونا شروع ہو گئی۔

جیسے ریت سے کوئی چشمہ پھوٹ رہا ہو...

❋❋

سٹی پریس میں دستیاب اردو رسائل وجرائد

سہ ماہی نقاط، فیصل آباد
مدیر: قاسم یعقوب
قیمت: 150 روپے

سہ ماہی دنیازاد، کراچی
مدیر: آصف فرخی
قیمت: 160 روپے

سہ ماہی آئندہ، کراچی
مدیر: محمود واجد
قیمت: 80 روپے

بادبان، کراچی
مدیر: ناصر بغدادی
قیمت: 200 روپے

سہ ماہی ارتقا، کراچی
ترتیب: راحت سعید؍ڈاکٹر محمد علی صدیقی
قیمت: 100 روپے

سہ ماہی روشنائی، کراچی
مدیر: احمد زین الدین
قیمت: 250 روپے

سہ ماہی سمبل، راولپنڈی
مدیر: محمد علی فرشی
قیمت: 150 روپے

کتابی سلسلہ اجرا، کراچی
مدیر: احسن سلیم
قیمت: 250 روپے

کتابی سلسلہ مکالمہ، کراچی
مدیر: مبین مرزا
قیمت: 350 روپے

شعر وحکمت، حیدرآباد دکن
مدیر: شہریار، مغنی تبسم
قیمت: ضخامت کے اعتبار سے

سہ ماہی نیا ورق، ممبئی
مدیر: ساجد رشید
قیمت: 120

سہ ماہی اردو، کراچی
مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان
قیمت: 100

ماہنامہ قومی زبان، کراچی
مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان
قیمت: 15 روپے

ماہنامہ الحمراء، لاہور
مدیر: شاہد علی خاں
قیمت: 50 روپے

ماہنامہ نیا زمانہ، لاہور
مدیر: محمد شعیب عادل
قیمت: 20 روپے

Scanned with CamScanner

دوسرا رخ

(منتخب کالم)

ارشد محمود

Scanned with CamScanner

اگلے صفحات میں ارشد محمود کے اخباری کالموں کا ایک انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے ارشد محمود اسلام آباد میں مقیم ہے اور پیشے کے لحاظ سے صنعت کار اور تاجر ہیں۔ لیکن ان کی وجہ شہرت ان کی تین کتابیں تصورِ خدا، **ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ اور تعلیم اور ہماری قومی الجھنیں** ہیں۔ اخباروں اور رسالوں میں کالم اور مضامین لکھنا انھوں نے کچھ عرصہ پہلے ہی شروع کیا ہے۔

ان کے اخباری کالم کا مستقل عنوان ''دوسرا رخ'' ہے، جو ان تحریروں میں اختیار کردہ نقطۂ نظر کے اعتبار سے بالکل مناسب لگتا ہے۔ اپنی تینوں کتابوں کی طرح ان تحریروں میں بھی ارشد محمود نے ہمارے گونا گوں قومی مسئلوں کو، مروجہ طور پر پیش کیے جانے والے فرسودہ نقطۂ نظر کے بجائے، ایک مختلف اور زیادہ بامعنی رخ سے دیکھا ہے اور اپنے مخصوص اسلوب میں ان کا روشن خیال تجزیہ پیش کیا ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ انھوں نے اپنی بات کہنے کے لیے جس سادہ اور راست اسلوب کا انتخاب کیا ہے وہ بھی ان کے موضوعات اور نقطۂ نظر سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ یہ اسلوب اردو نثر نگاری کی اسی روایت سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے جس کی ابتدا کرنے والوں میں سرسید، حالی اور ان کے ہم عصر اور ہم خیال دیگر ادیب شامل تھے جن کا خیال تھا کہ سماجی معاملات پر فکر انگیز اظہار خیال کے لیے داستانی اور نام نہاد شاعرانہ اسلوب نامناسب ہے۔ پڑھنے والوں کے دماغوں سے فرسودہ خیالات اور ازکار رفتہ روایات کے جالے دور کرنے کے لیے عقلی تجزیے پر مبنی سادہ نگاری ہی کا اسلوب استعمال کیا جاتا رہا ہے، اگرچہ 'ادب برائے ادب' اور نام نہاد 'جدیدیت' کے حامی نقاد اس رجحان کی متواتر مزاحمت کرتے آئے ہیں۔ اسی طرح کا ناپسندیدگی کا رویہ ان ادیبوں کے ساتھ بھی اختیار کیا جاتا رہا ہے جو اپنے اردگرد کی انسانی زندگی کی پیچیدہ صورت حال پر غور کرنے کو اپنے دائرۂ عمل سے باہر نہیں سمجھتے۔ ادبی رسالوں سے بھی عموماً یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ معاشرتی تجزیے جیسے گھٹیا کام سے خود کو آلودہ نہ کریں۔ تاہم آج میں 'معاشرتی' کہے جانے والے موضوعات پر 'صحافتی' قرار دی جانے والی قابل قدر تحریروں کی اشاعت کوئی نئی بات نہیں۔ اس سلسلے کو آئندہ بھی جاری رکھا جائے گا۔

ارشد محمود

پاکستان: ایٹمی طاقت یا ایٹمی المیہ؟

پاکستان کو ایٹمی طاقت دیکھنے کا خواب ذوالفقار علی بھٹو کا تھا۔ انھوں نے 1972 میں اس منصوبے پر خفیہ طریقے سے کام شروع کروایا۔ اس دوران بھٹو "ایک ہزار سال تک لڑنے" اور قوم کو "گھاس کھلانے" کے عزم کا اظہار کر چکے تھے۔ اس سے قبل مغربی بازو سے تعلق رکھنے والی ہماری عسکری اور سویلین سیاسی قیادت کی ملی بھگت سے پاکستان کو دولخت کیا جا چکا تھا اور ہم بھارت سے ذلت آمیز فوجی شکست کھا چکے تھے۔

دنیا میں صرف ان قوموں نے ترقی کی ہے جنھوں نے کھرے اور ٹھوس ذہن کے ساتھ وقت کے تقاضوں کے مطابق یک سو چلنے کا عزم کیا ہے، معاملات اور نظریات کو مکس اپ نہیں کیا۔ جو ٹھیک ہے سو ٹھیک ہے۔ جو غلط ہے، ترقی میں رکاوٹ ہے، وہ نامنظور ہے، اور اسے انھوں نے زندگی سے علیحدہ کر دیا۔ ہم مسلمانوں کی سیاسی، ثقافتی، علمی اور ذہنی قیادت کا المیہ یہ رہا ہے کہ ہم نے ہمیشہ بارہ مسالے کی چاٹ بنانے کی کوشش کی ہے؛ دنیا اور زندگی کو سیدھے، صاف اور شفاف طریقے سے دیکھنے کی کبھی جرأت نہیں کی۔ ماضی بھی ٹھیک ہے، جدید بھی ٹھیک ہے؛ جہالت بھی ٹھیک ہے، علم بھی ٹھیک ہے؛ اسلام بھی ٹھیک ہے، سائنس بھی ٹھیک ہے؛ آمریت بھی ٹھیک ہے، جمہوریت بھی ٹھیک ہے؛ جاگیرداری بھی ٹھیک ہے، سوشلزم بھی ٹھیک ہے؛ مولوی بھی ٹھیک ہے، عقل بھی ٹھیک ہے؛ جنگ بھی ٹھیک ہے، امن بھی ٹھیک ہے؛ فوج بھی ٹھیک ہے، عوام بھی ٹھیک ہے؛ انڈیا کے ساتھ دشمنی

بھی ٹھیک ہے، امن بھی ٹھیک ہے؛ امریکہ اور یورپ کی بھیک اور امداد بھی ٹھیک ہے، قومی غیرت بھی ٹھیک ہے؛ غلامی بھی ٹھیک ہے، خودی بھی ٹھیک ہے۔ ہم مسلمانوں کی بربادی کی داستان اس فکری کھچڑی کی وجہ سے ہے۔ بھٹو بھی کچھ اسی طرح کی چیز تھے۔ سماجی انصاف، مساوات اور ترقی کے سب نعرے جلد ان کی ذات اور منشور سے رخصت ہو گئے۔ فوج کی 'عزت' کی بحالی، دفاعی اور سلامتی کی اسٹیبلشمنٹ کی تعمیرِ نو، ایٹمی قوت بننے کے اندھے پراجیکٹس، اور شدید قسم کا مولویانہ اسلام قوم کو دے کر وہ انھیں قوتوں کے ہاتھوں اللہ میاں کو پیارے کر دیے گئے جن کی طاقت میں وہ اضافہ اور جن کی عزت بحال کر رہے تھے۔

1975 میں ڈاکٹر عبدالقدیر اس منظرنامے میں سامنے آتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر جرمنی کے تعلیم یافتہ اور ماہر دھات کار (metallurgist) تھے، ان کے پاس سینٹری فیوج ٹیکنالوجی کا علم تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہالینڈ کی کسی لیبارٹری سے یورینیم کی افزودگی (enrich کرنے) کے بارے بقول مغربی ذرائع تکنیکی خفیہ کاغذات چوری کر کے لے آئے تھے۔ چنانچہ 1976 میں کہوٹہ لیبارٹری میں انھیں سربراہ بنا کر ذمے داری سونپ دی گئی۔ اس کے ساتھ ہمارے پاس پاکستان اٹامک انرجی کمیشن بھی اس سے ملتے جلتے کام میں مصروف تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر کو بے پناہ پیسہ اور بے حساب اختیارات کے ساتھ کام کرنے کے مواقع دے دیے گئے۔ وہ اپنے دائرۂ کار میں انتظامی اور سائنسی معاملات میں سیاہ سفید کے مالک تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کام ان کو سونپا گیا تھا وہ انھوں نے کامیابی سے تکمیل تک پہنچایا، لیکن انتظامی سطح پر بے شمار کہانیاں بھی گردش کرتی رہیں۔ وہ اپنے احباب کو نوازنے میں بڑا دل رکھتے تھے، اس کے لیے میرٹ کا خیال کوئی ضروری نہیں تھا۔ ان کی نجی زندگی کے 'معاملات' بھی ان کے محکمے اور اسلام آباد میں گردش کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی ذات کے لیے پرتعیش پروٹوکول مخصوص کیے رکھا۔ اسلام آباد میں ان کی بے شمار قیمتی جائیدادوں اور مختلف کاروبار میں حصے دار ہونے کے قصے سینہ گزٹ اور میڈیا کا حصہ رہے۔ قوم کا مال خرچ کرنے میں انھیں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا، چنانچہ وہ اسے دیے گئے 'کام' پر بھی لگاتے رہے، اور ساتھ ہی اپنی ذات کے لیے مال و متاع اور عیش و آرام کے لیے بھی صرف کرتے رہے۔

اسی دوران ان کو اپنے 'ہیرو' اور 'نجات دہندہ' ہونے کا خیال پیدا ہوا۔ ہم ہیرو پسند قوم ہیں۔

Scanned with CamScanner

ہم اپنا قومی احساس کمتری ہیرو بنا کر دور کرتے ہیں، خواہ وہ ہیرو صاحب دوسرے دن چاروں شانے چت کیوں نہ پڑے ہوں۔ پھر ہم کسی اگلے ہیرو کی امید میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ کو بھی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ قوم کو کسی نہ کسی ہیرو کا لالی پاپ دیے رکھے اور قسمت کے مارے اٹھارہ کروڑ لوگ ہزار سالہ غلامی اور تریسٹھ سالہ بدحالی کو بھول کر اپنے ہیرو کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر قدیر 'اسلامی بم' کے بانی کی حیثیت سے پوری مسلم دنیا کے ہیرو بننے چل نکلے۔ انھوں نے دائیں بازو کے سیاست دانوں، مذہبی جماعتوں اور رائے عامہ کو اپنے پیچھے لگالیا۔ اب وہ صرف ایک سائنس دان کی ہی نہیں، پوری مسلم دنیا کے محافظ اور یہود و ہنود و نصاریٰ کو منہ توڑ جواب کی حیثیت رکھتے تھے۔ پاکستان ''محفوظ'' ہو چکا تھا۔ ہندوستان کو اپنے وجود کے لالے پڑ چکے تھے۔

خاں صاحب ازمنۂ وسطیٰ کے افغان، ترک جہادی مسلم حملہ آوروں غوری، غزنوی سے بہت متاثر تھے۔ بلکہ ان کا ایک کارنامہ آثارِ قدیمہ کی تلاش کے حوالے سے بھی ہے۔ انھوں نے بڑی کاوش سے پاکستان میں محمد شہاب الدین غوری کی قبر تلاش کی اور وہاں کثیر سرمائے سے مقبرہ تعمیر کروایا، جہاں شاید ہی ان کے بعد کبھی کوئی شخص گیا ہو۔ تمام میزائلوں کے نام ہندوستان دشمنی میں ان مسلم حملہ آوروں کے نام پر رکھے جو ہندوستان کی تاریخ میں خصوصی طور پر ہندوؤں کے مذہب اور مندروں پر حملہ آور ہوئے تھے۔ گویا ہندوستان کو فتح کرنے کا ایجنڈا ہماری اسٹیبلشمنٹ کا مطمحِ نظر رہا ہے۔ چنانچہ پاکستان کے میزائلوں کے نام ان لوگوں کے نام پر نہ رکھے گئے جنھوں نے اس سرزمین کا دفاع کیا تھا۔ یا ایسے بھی نام رکھے جاسکتے تھے جن میں اشتعال انگیزی اور جارحیت کا پہلو نہ ہوتا۔ شاید نفرت کو ترویج دینا ان کے مفاد میں ہے اور امن ان کی ترجیح نہیں۔ پاکستان کے ہتھیاروں کے نام افغانوں، ترکوں اور عربوں سے متعلق کیوں ہوں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کی سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کا نیشنلسٹ کردار اور قومی سوچ نہیں بن پائی۔ انھوں نے اپنے ہتھیاروں کے غیر جارحانہ نام نہیں رکھے جن میں اس قوم کی حفاظت اور امن پسندی کا جذبہ ایک ساتھ نظر آتا۔ ہم ہندو مسلم جہاد کی کسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہیں۔ کیا پاکستان کو ہندو مسلم جہاد کے لیے بنایا گیا تھا؟ یا پاکستان کے بننے کا مقصد مستقل انڈیا کے ساتھ لڑنا، مرنا اور عسکری مقابلہ بازی ہے؟

پھر ایک وقت ایسا آیا جب ہماری اسٹیبلشمنٹ اور اس وقت کے آرمی چیف نے اسی قومی

Scanned with CamScanner

ہیرو کو ایک ذلت آمیز منظر نامے میں پوری دنیا کے سامنے اپنے 'جرائم' کو تسلیم کرنے اور معافی مانگنے پر مجبور کیا۔ کہانی کا یہ حصہ بڑا سبق آموز اور دلچسپ ہے۔ اگرچہ خاں صاحب کو اپنے دائرۂ کار میں 'پرفارم' کرنے کی بڑی حد تک آزادی تھی، لیکن ان کا محکمہ مکمل طور پر ہمارے دفاعی، سکیورٹی کے اداروں اور خفیہ ایجنسیوں کے سخت کنٹرول میں تھا۔ ان کی مرضی کے بغیر وہاں چڑیا پر نہیں مار سکتی تھی، حتیٰ کہ ملک کی منتخب وزیر اعظم اور عوامی قائد بے نظیر کو 'سکیورٹی رسک' سمجھ کر خان ریسرچ لیبارٹری کہوٹہ میں نہیں لے جایا گیا۔ مذکورہ محکمے میں بے شمار باوردی اور ریٹائرڈ فوجی سویلین اسٹاف کے ساتھ کام کرتے تھے۔ ڈاکٹر قدیر کے آس پاس اور اوپر جرنلوں کا کنٹرول تھا۔ ظاہر ہے، وہ کوئی بھی اسٹریٹیجک قسم کا فیصلہ سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ گویا ٹیکنالوجی ٹرانسفر پر شمالی کوریا اور ایران کے ساتھ جو بھی خفیہ معاملات چل رہے تھے وہ ظاہری طور پر فوجی اسٹیبلشمنٹ کے علم اور مرضی کے بغیر ممکن نہ تھے۔ ایکیوپمنٹ جب ٹرنکوں میں بھر بھر کر جہازوں میں لے جایا جاتا تھا، اور ظاہر ہے، اس سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر پیسے کا بھی لین دین ہو رہا ہو گا، تو ہماری دفاعی اور سکیورٹی کی اسٹیبلشمنٹ کہاں تھی؟ اور اگر قدیر سولو فلائٹ ہی کر رہے تھے، جو ممکن نہیں ہے، تو اس کو روکا کیوں نہ گیا؟ لیکن اس طرح کے سوال اور اعتراض اٹھانا اس ملک میں جرم ہے جن کا رخ ہماری اسٹیبلشمنٹ کی طرف ہو۔ وہاں مقدس خاکی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ ملک ٹوٹ جائے، جنگوں میں شکستیں کھائی جائیں، ملک کو انتہا پسند جنونی مذہب پرستوں کے حوالے کر دیا جائے، سب سویلین ادارے برباد کر دیے جائیں، خودساختہ نظریاتی سرحدیں بنا کر خود کو محافظ قرار دے دیں، قوم کی جانب سے ان کے احترام میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیے۔ قائد اعظم، لیاقت علی، بھٹو، بے نظیر، نواز شریف کس کھیت کی مولی تھے، اور اس بلڈی سویلین سائنس دان کی اوقات ہی کیا تھی؛ بڑا سائنس دان اور قوم کا ہیرو اور نجات دہندہ خود کو سمجھتا پھرتا تھا! سارے مذہبی اور رائٹ ونگ اس کے پیچھے تھے۔ وہ بے چارہ دل و جان سے سراسر اسٹیبلشمنٹ کا خدمتگار آدمی تھا، لیکن بڑے آقا (امریکہ) کے سامنے اسے قربانی کا بکرا بنانے میں ذرا دیر اور تحمل نہ کیا گیا اور اسے خاک میں ملا دیا گیا۔ اب وہ ہر روز 'آزاد' عدلیہ سے کسی دوست اور عزیز کو ملنے کی درخواستیں کرتا پھرتا ہے۔ اس جنگل میں صرف شیر ہی اپنی چمک دمک اور آن بان شان سے زندہ رہ سکتا ہے، باقی سب اس کے خدمتگار تو

ہو سکتے ہیں لیکن، کسی کو اپنی ذات پر کوئی گھمنڈ نہیں ہونا چاہیے، چاہے وہ عوام کا بڑا ہیرو اور مقبول عام لیڈر ہی کیوں نہ ہو۔ سب کو سویلین ہونے کی اپنی آخری اوقات یاد رکھنی چاہیے۔ چاہے کسی نے اس پاکستانی ریاست کی کتنی ہی خدمت کیوں نہ کی ہو، یہ سب ایک چٹکی کی مار ہیں۔ بے نظیر کا تازہ واقعہ دیکھ لیں، سب نے مل کر کتنی بڑی لیڈر کو کتنی آسانی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت کرا دیا۔

کہا جاتا ہے، ایٹم بم بنانے میں تقریباً پچیس ارب ڈالر خرچ ہوئے۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق پاکستان کے پاس 70 سے لے کر 190 تک ایٹم بم ہیں۔ یورینیم کے بعد ہم پلوٹونیم کی افزودگی میں مشغول ہیں۔ وقت کی ستم ظریفی دیکھیے، ایٹم بم کا جو دیوتا ہم نے اپنی حفاظت کے لیے بنایا تھا وہ ہماری حفاظت نہیں کر رہا، ہم اس کی حفاظت میں مشغول ہیں! اور، خاکم بدہن، اس نے ہمارے قومی انجام میں بھی اہم کردار ادا کرنا ہے۔ ہمارا ایٹم بم ایک المناک کہانی کو جنم دے رہا ہے۔

پاکستان کے عوام کو اندھے جذبات سے باہر آنے اور ہوشیار ہونے کی بہت ضرورت ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں جو قوم کے دیکھنے کے لیے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی ریاست کی سلامتی کی یقین دہانی سب سے پہلا کام ہوتا ہے، لیکن جب سب کچھ ہی ہمیشہ کے لیے سلامتی پر قربان کر دیا جائے تو اسے مالیخولیا ہی کہا جا سکتا ہے، یا پھر انتہا درجے کی کوتاہ بینی اور حماقت۔

ایٹم بم کے جتنے فائدے گنوائے جاتے تھے، وہ سب سراب ثابت ہوئے ہیں۔ شروع زمانے میں ایٹم بم کا ایک فائدہ یہ گنوایا جاتا تھا کہ جب پاکستان کے پاس ایٹم بم ہو جائے گا، ہمیں اتنی زیادہ روایتی فوج اور جنگی ساز و سامان رکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور ہم اپنے روز افزوں دفاعی خرچے میں کمی کر سکیں گے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہماری دفاعی ضروریات بے لگام ہیں اور ان میں کمی کے کوئی امکانات نہیں۔ دفاع کا بجٹ لامتناہی طور پر بڑھتا جا رہا ہے۔ ہم تو پہلے ہی اس دنیا کی 'بہترین' فوج رکھتے تھے جو دشمن کو منہ توڑ جواب دینے اور دانت کھٹے کرنے کے لیے کافی تھی۔ ہمارا ایمان سے لبریز ایک ایک فوجی سو سو ہندو کافروں پر بھاری تھا! بلکہ اسرائیل دور بیٹھا ہم سے کانپ رہا تھا! اول تو ہمیں ایٹم بم کی ضرورت کیا تھی، اور جب بنا لیا ہے تو یہ ستر ایٹم بم کس مرض کی دوا ہیں؟ منطقی بات ہے، ایٹم بم ہونے کے بعد ہم اپنی روایتی دفاعی فورس کو کم کیوں نہیں کر رہے؟ ہماری سلامتی کی ضمانت ایٹم بم ہے، جبکہ 'دشمن' نے تریسٹھ سال میں ہمارے ملک پر کبھی پہلے حملہ بھی نہیں کیا۔ اب

Scanned with CamScanner

معاملہ یہ ہے، یک نہ شک دو شد؛ ایک فوج نہیں، دو فوجوں کے برابر ہمیں پیسہ درکار ہے۔ ایک روایتی فوج کے لیے، دوسری ہماری اسٹریٹیجک فورس کے لیے۔ چنانچہ ہماری فوجی اسٹیبلشمنٹ کے اب دو حصے کام کر رہے ہیں۔ میزائل ٹیکنالوجی اور دیگر ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد اور کوالٹی میں مسلسل اضافہ کیا جارہا ہے۔ اٹامک انرجی، کے آر ایل اور نیس کام جیسے اداروں میں ہزاروں سائنسدان اور انجینئر اس کام میں مشغول ہیں جنھیں ہماری اسٹریٹیجک کمانڈ کنٹرول کرتی ہے، جس کے لیے اربوں ڈالر کا بجٹ الگ سے درکار ہے۔

دوسرا فائدہ یہ بتایا جاتا تھا کہ ایٹم بم ہماری حفاظت کرے گا۔ ساری دنیا جانتی ہے، ہم خود اور ساری دنیا اس ایٹم بم کی حفاظت کی تشویش میں مبتلا ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ کب بڑی طاقت یا طاقتیں اسے اٹھانے اور اپنی حفاظت میں لینے آجائیں! ساری دنیا کے لیے ہم اعلان شدہ خطرناک ملک ہیں۔ پاکستان غیر مستحکم، سیاسی لحاظ سے انتشار زدہ اور مالی لحاظ سے دیوالیہ ملک ہے، جہاں اسلامی انتہا پسند ایک بڑی طاقت کے طور پر موجود ہیں، اور یہ ایٹم بم ان کے ہاتھ لگ سکتے ہیں۔ گویا ہم کشکول بردار ایٹمی ملک کی ایک زندہ تصویر ہیں۔ ایٹم بم، جس نے ہمیں ہمارے تحفظ کی ضمانت دینی تھی، خدانخواستہ کبھی بھی پاکستانی ریاست کے خلاف کسی بھی بین الاقوامی سازش کی صورت میں یہ ایشو ان کے ہاتھ میں بہت بڑا ہتھیار ہوگا۔ سلامتی کونسل کے مینڈیٹ کے ساتھ کسی وقت بھی غیر ملکی فوجیں اتریں گی، یہ کہتے ہوے کہ دنیا کو خطرہ ہے، لہٰذا ہم اسے اٹھانے آئے ہیں۔

اب ہم ایٹم بم کے استعمال اور عدم استعمال کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہماری دفاعی اسٹیبلشمنٹ اتنی سمجھدار ضرور ہے کہ وہ خودکشی نہیں کرے گی۔ اس قوم کو یہ سمجھ لینا چاہیے: ہم کبھی بھی اور کسی بھی قسم کے حالات میں ایٹم بم کو استعمال نہیں کر سکتے۔ یہ بچوں کا کھیل ہے اور نہ ہوگا۔ ہم اس کے ردعمل اور عواقب کو برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ یہ پاکستان کی طرف سے سراسر خودکش حملہ ہوگا۔ دوسری طرف سے پھول نہیں آئیں گے، ہمارے سب شہروں پر ایٹمی برسات ہوگی۔ انڈیا اتنا بڑا ہے کہ ہمارے کسی بھی ایٹمی حملے میں وہ کافی سارا بچ جائے گا، جبکہ ہمارے سائز کے ملک پر ایٹمی حملہ ہمیں اس دنیا سے نابود کر دے گا۔ تو ہم کیا حاصل کرنے کے لیے انڈیا پر ایٹمی حملہ کریں گے؟ ہمارے پاس تو کسی بڑی بلڈنگ کو آگ لگنے کی صورت میں سیڑھی تک نہیں ہوتی اور کسی

Scanned with CamScanner

بھی آفت کے وقت ہم دنیا سے بھیک اور مدد کی دہائی ڈال دیتے ہیں۔ ہمارے اوپر ہوئے ایٹمی حملے کے بعد کی صورت حال میں ہم کیا کر پائیں گے؟ سارے، شہر ایک قیامت خیز زلزلے کا منظر پیش کریں گے اور تابکاری کسی بھی حیاتیاتی شکل کو ہمیشہ کے لیے مٹا دے گی۔

گویا ہم ایٹم بم استعمال کرنے والے ہی نہیں ہیں، تو پھر اس پر مسلسل اربوں ڈالر کے خرچ کیا معنی رکھتے ہیں؟ ایٹم بموں کے مواد، تعداد اور ان کی استعداد بڑھانے کے چکر میں کچھ ہزار لوگ پلتے رہیں گے، اسلحے کے انبار جمع ہوتے رہیں گے۔ ملک اور عوام کسی ترقی اور خوشحالی کے عمل اور امکانات سے باہر رہیں گے۔ گویا ہماری ساری دفاعی اسٹریٹجی ایک سراب اور دھوکا ہے، پوری قوم اور وطن کو ہمیشہ کے لیے ایک بند گلی میں دھکیل دینے کا عمل ہے۔ ہماری سکیورٹی اور دفاعی اسٹیبلشمنٹ کو اپنی پالیسیوں پر نظرِ ثانی کرنے کی شدید ضرورت ہے، کیونکہ جاری پالیسی اس ملک کے وسیع تر مفادات کے خلاف اور سخت نقصان دہ ہے۔ ہمیں انڈیا سے مقابلے بازی سے باہر آ جانا چاہیے۔ وہ ایسی گراؤنڈ ہے جہاں مات ہمارا مقدر ہے۔ ہم دس گنا چھوٹے ملک ہیں۔ صرف انڈیا کو سامنے رکھ کر بنائی جانے والی دفاعی پالیسیوں نے ہمیں نقصان ہی پہنچایا ہے۔ ہم اس سے کچھ حاصل کرنا تو دور کی بات، خود کو تباہ کر رہے ہیں اور حیرانگی کی بات ہے کہ کوئی سبق نہیں سیکھ رہے۔ شاید کسی ایٹمی جنگ میں مرنا پاکستانی قوم کا مقدر ٹھہر گیا ہے، یا پھر ہم گھٹ گھٹ کر اندر سے ہی ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ پوری قوم کو بیدار ہونے کی ضرورت ہے اور اپنی عسکری قیادت کو قائل کرنے کی ضرورت ہے، کہ وہ انڈیا کے obsession سے باہر آ جائیں، اگر ہمیں واقعی اپنے ملک کی بقا اور فلاح عزیز ہے۔

’حالتِ جنگ‘ کب ختم ہو گی؟

جناب وزیر اعظم گیلانی سے پوچھا گیا، ہم دفاعی اخراجات میں کمی کیوں نہیں کرتے؟ ان کا کہنا تھا، ایسا ممکن نہیں، پاکستان جنگ کے درمیان سے گزر رہا ہے۔ ویسے تو اللہ کے فضل سے پاکستان اپنے جنم دن

سے ہی حالتِ جنگ میں ہے؛ یہی ایک کام ہے جو ساری قوم نے پوری دل جمعی کے ساتھ کیا ہے، اور یہی ایک کام ہے جس پر ساری قوم کو کبھی کوئی اعتراض نہیں رہا۔ ہم نے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا، ارے، ہم کیوں ہمیشہ سے حالتِ جنگ میں ہیں؟ یہ جنگ اور جنگی کیفیت اس ملک سے ختم کیوں نہیں ہوتی؟ ایسا لگتا ہے، ساری قوم نے قبول کر رکھا ہے، ''جنگ (غم) تو اپنا ساتھی ہے...'' عام فہم میں جنگ اور جنگی کیفیت ایک اضطراری عمل ہوتا ہے۔ ذاتی یا قوموں کی زندگی میں جھگڑے، لڑائیاں، جنگیں کبھی کبھار وارد ہوتے ہیں، اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد زندگی واپس اپنی نارمل پُرامن حالت میں آجاتی ہے اور نارمل ڈگر میں چلنے لگتی ہے۔ عمومی طور پر لڑائی جھگڑے، مار اماری ناگوار عمل ہے۔ یہ کوئی خوش کن عمل تو ہے نہیں جس میں ساری زندگی بسر کر دی جائے۔ لیکن حیرت ہے اپنی قوم پر، اس نے کبھی حالتِ جنگ سے بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔ ہم برباد ہو گئے ہیں، برباد ہو رہے ہیں، لیکن کہیں سے بھی، کوئی بھی یہ سوال نہیں کرتا کہ اس ملک سے جنگ ختم کب ہو گی اور یہ کیا تماشا ہے۔ سارے ملک کے وسائل، سارے ملک کی بہترین صلاحیتیں، سارے ملک کی توجہ جنگ کے لیے ہے۔ ملک کی تمام داخلی اور خارجی پالیسیاں صرف اور صرف حالتِ جنگ کو سامنے رکھ کر بنائی جاتی ہیں۔ سکیورٹی، دفاع، دفاع، سکیورٹی، سب سے ٹاپ پر، سب سے مقدم، اسے چھوا نہیں جا سکتا، اس پر بات نہیں ہو سکتی، اس کی طرف دیکھا نہیں جا سکتا، اس پر کوئی سوال نہیں اٹھ سکتا، اسے بدلا نہیں جا سکتا، کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ جب دفاع یا سکیورٹی کا لفظ آتا ہے، عوام، حکومت، سرکار، سیاست، میڈیا، عدلیہ، بیوروکریسی، دانشور، سب آگے لیٹ جاتے ہیں، اور یہ کیفیت بغیر کسی وقفے کے پچھلے تریسٹھ سال سے ہے۔ پاکستانی قوم کی زندگی ہی جنگ سے عبارت ہے۔ ہمارے اعصاب پر، سائیکی اور لاشعور میں ہر وقت جنگ سوار ہے۔ ہم نے سمجھ رکھا ہے، جنگ تو ہے ہی ہے، وہ تو مستقل حالت ہے، اب طے یہ کرنا ہے کہ ہم نے کیسے رہنا ہے اور پوری قومی اور ذاتی زندگیوں کو اس کے مطابق کیسے موڑنا ہے۔

ظاہر ہے، مستقل حالت جنگ میں رہنے والی قوم کبھی پھل پھول نہیں سکتی۔ چنانچہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کتوں کی طرح لڑ رہے ہیں، ایک دوسرے پر الزام دھرتے ہیں: فلاں کی حرامزدگی سے اس ملک کے مسائل حل نہیں ہو رہے، فلاں وجہ سے ترقی اور عوام کی خوشحالی رکی ہوئی ہے۔ حالانکہ اس ملک کے سارے مسائل اس ملک پر نافذ جنگی حالت اور ہماری جنگ پسندی کی وجہ سے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ ہمیں من حیث القوم امن نام کی چیز اور امن سے زندہ رہنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ حیرت کی بات ہے! امن کو ہمارے ٹاپ ایجنڈے پر ہونا چاہیے، امن ہماری اعلیٰ ترین ترجیح ہونی چاہیے، کہ فطری طور پر زندگی کا مقصد ہی امن سے زندہ رہنا ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے بجٹ میں جنگی اداروں اور جنگی سازوسامان کو اعلیٰ ترین جگہ حاصل ہے اور ہر حکومت اور ہر حکمران پر لازم ہے کہ سارا سال گا ہے بگا ہے کہتے رہیں: دفاع کو بجٹ کے علاوہ بھی ضرورت ہو تو اس کے لیے مالی وسائل دینے کو تیار ہیں، ملک کی سکیورٹی پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ یہ بات نہیں کریں گے تو ان کی حب الوطنی مشکوک ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ ڈر کے مارے ہر وقت ضمانتیں دیتے رہتے ہیں، تاکہ حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ اور اقتدار کا تحفظ حاصل رہے، اور یہ دونوں چیزیں سویلین کو پھر بھی کبھی حاصل نہیں ہوتیں، لیکن ان کی عبادت گزاری پر شاباش دی جاسکتی ہے۔ کیا ہم ایک طرح کے سفاک چکر میں نہیں پھنس چکے؟ ہماری دفاعی ضروریات، سکیورٹی ارادے، اسٹریٹجک منصوبے اور اپنے سے دس گنا بڑے ملک سے اسلحہ کی دوڑ، جس کو ہم پیار سے ''کم از کم رکاوٹ'' (Minimum Deterrance) برقرار رکھنا کہتے ہیں۔ عملاً یہ خود فریبی کے سوا کچھ نہیں؛ ہم باقاعدہ اسلحے کی دوڑ میں شریک ہیں۔ ہمیں 'دشمن' کے مطابق مقدار اور معیار بڑھانے پر مسلسل کام کرنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہو رہا ہے تو پھر 'دوڑ' اور کس چڑیا کا نام ہوتا ہے جس سے ہم انکار کرتے ہیں؟ ہم حقیقتوں سے آنکھیں چار کیوں نہیں کرتے تاکہ ہم حقیقی دنیا میں واپس آجائیں اور اپنی اور اس ملک کی زندگی کو بہتر شکل دے سکیں؟ لیکن ایسا ممکن نہیں، نہ اس کی اجازت ہے۔ ہم نے اپنے قدم زمین پر نہیں رکھنے، خیالی دنیا میں رہنا ہے۔ خیالی احساسِ تفاخر، خیالی خطرات، خیالی نظریات، خیالی کردار۔ اندر سے کھوکھلے، باہر سے چمک دمک۔ اندر سے بے حد خودغرض اور باہر سے نیک پروین۔ اندر سے چمچہ گیر، باہر سے گردن تنی ہوئی۔ ہماری ایلیٹ حکمران کلاس ایک خیالستان میں رہتی ہے۔ اس ملک اور قوم کی شکل اور حالت کیا ہے، اس سے آنکھیں بند۔

ہماری قوم کی جنگ پسند سائیکی پر ضرور اکیڈیمک سطح پر کوئی تحقیق ہونی چاہیے۔ ہمیں پر امن اور نارمل حالات سے دلچسپی کیوں نہیں ہے؟ کیا کسی کو یاد ہے، ہم 'تازہ' جنگ کے بیچ میں پچھلے دس سال سے ہیں؟ اور قرائن کہہ رہے ہیں، مذکورہ حالتِ جنگ کے ختم ہونے کے دور دور تک کوئی امکانات نہیں، حالانکہ یہ ساری جنگ خود اپنی سرزمین پر لڑی جارہی ہے۔ کسی دشمن کا علاقہ نہیں،

Scanned with CamScanner

سامنے مقابل کوئی ملک نہیں، اور دوسرا فریق بھی زیادہ تر اپنے ہی لوگوں پر مشتمل ہے۔ اتنی بڑی اور دنیا کی 'اعلیٰ ترین' مہارت والی فوج، اپنے سائز اور معیار کے لحاظ سے ہمارے دیگر سکیورٹی کے ادارے جن کا ساری دنیا پر رعب اور نام ہے۔ اپنا ہی ملک، اپنی زمین، کوئی لاجسٹک اور سپلائی کا مسئلہ نہیں۔ کسی بھی طرح کے آپریشن سے کوئی روکنے والا نہیں جس پر ساری قوم کا اتفاق ہے، ساری سیاسی قوتیں اور سول ایڈمنسٹریشن سب ساتھ ہیں۔ کہنے کو سامنے 'دشمن' بھی چند ہزار لوگوں پر ہی مشتمل ہے۔ ایک سادہ لوح سویلین ہونے کے ناتے اس بات کی سمجھ نہیں آتی، اتنے طاقتور ریاستی اداروں کے سامنے یہ چند افراد پر مشتمل ٹولہ ختم ہونے کا نام تو دور کی بات ہے، اس میں ذرا سی کمی واقع نہیں ہو رہی۔ نہ ان کو کوئی تنظیمی نقصان ہو رہا ہے، نہ ان کو پیسے اور اسلحے کی کوئی کمی آ رہی ہے، نہ ان کے آپریشن کی صلاحیت کم ہو رہی ہے۔ وہ جب اور جہاں چاہتے ہیں، کامیاب حملہ کرتے ہیں۔ ان کے ارادوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ ان کا وجود آج بھی پاکستان کے لیے، امریکہ کے لیے، افغانستان کے لیے خطرہ ہے۔ دال میں بہرحال بہت سارا کالا ہے۔ دل مانتا ہے نہ ذہن کہ اگر واقعی ان مذہبی شدت پسند قوتوں کو ختم کرنا مقصد ہوتا تو یہ اتنی دیر کی بات کیسے ہو سکتی تھی۔ نہ کوئی علاقہ کماحقہ کلیئر ہوا، نہ کسی جگہ کوئی ترقیاتی کام ہوا۔ ایک جگہ تھوڑی دیر کے لیے خالی کروائی، انھیں اِدھر اُدھر ہمسایہ محفوظ جگہ میں دھکیل دیا۔ نہ کسی کا تنظیمی ڈھانچہ ختم ہوا، نہ کوئی لیڈرشپ پکڑی گئی۔ انتہاپسندی کی ذہنی پنیریاں ہر گلی محلے میں جوں کی توں ہیں۔ کہا جاتا ہے، کچھ اِدھر کے، کچھ اُدھر کے طالبان ہمارے اسٹریٹیجک اثاثے ہیں؛ کل کو افغانستان میں انڈین اثر ورسوخ کو روکنا ہے۔ گویا دس سال پہلے والی کہانی پھر دہرائی جاتی ہے؛ کابل پر پھر پاکستان کے حمایتی طالبان بٹھانے ہیں۔ ہے کوئی اس ملک پر رحم کرنے والا؟ طالبان اور مذہبی انتہاپسند دراصل ہمارا مسئلہ ہی نہیں ہیں۔ انھیں بس ہماری سکیورٹی کے اداروں کے ماتحت رہنا چاہیے، خودسر نہیں ہونا چاہیے۔ کیا اس فکر کے ساتھ کبھی یہ مسئلہ حل ہو پائے گا؟ سکیورٹی اور جنگ میں اربوں ڈالر کی آنیاں جانیاں ہیں۔ فوجی مر رہے ہیں، عوام مر رہے ہیں، معیشت تباہ حال ہے، ملک مقروض اور دیوالیہ ہے، پاکستان اور پاکستانی قوم پوری دنیا میں بدنام ہیں، ملک کے سب شہر قلعوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ کسی بھلے دور کی شہری زندگی اب خواب ہو چکی ہے۔ پہلے تو پاکستان صرف سکیورٹی ریاست تھی، اب ماشااللہ اس ملک کی ہر سڑک، ہر عمارت، ہر ادارے، ہر فرد کو

Scanned with CamScanner

'سکیورٹی' ہو چکی ہے۔ سکیورٹی... سکیورٹی... سکیورٹی زندہ باد۔ میرا وطن پائندہ باد۔

آنکھیں بند!

وکی لیکس انکشافات کے سلسلے میں کابینہ کی دفاعی کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا جس میں اعلیٰ ترین سویلین اور عسکری قیادت نے شرکت کی۔ اجلاس کی جو کارروائی میڈیا میں چھپی ہے وہ بالکل ہمارے بچوں کو پڑھائے جانے والے 'مطالعۂ پاکستان' کی طرز پر، رٹے رٹائے الفاظ پر مشتمل ہے۔ اجلاس میں جہاں ایک طرف قومی مفادات کے تحفظ، انسدادِ دہشت گردی، کشمیریوں کی حمایت جاری رکھنے، فوج کی روایتی اور ایٹمی صلاحیتوں کو مضبوط کرنے کا عزم کیا گیا، وہاں وکی لیکس کی دستاویز کے بارے ایک دلچسپ فیصلہ بھی کیا گیا: پاکستان کے بارے میں وکی لیکس میں جو کچھ کہا گیا ہے، حکومتِ پاکستان اسے مسترد کرتی ہے! کیا یہ عجیب بات نہیں؟ ہم کون ہوتے ہیں مسترد کرنے والے؟ انھیں مسترد امریکہ کرے یا امریکہ کے وہ سفیر جن کے نام سے یہ سرکاری اور سفارتی مکتوبات ہیں۔ وہ کہیں کہ ان میں جو کچھ لکھا یا بتایا گیا ہے وہ جعلی ہے۔ جبکہ امریکی حکام نے، جن میں رچرڈ ہالبروک سرفہرست ہیں، واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ یہ دستاویزات صداقت پر مبنی ہیں اور امریکہ کے کمپیوٹر ریکارڈ سے چوری ہوئی ہیں۔ لگتا یہ ہے، اجلاس میں ایک دوسرے کے ساتھ آنکھیں ملانا ذرا مشکل ہو گیا ہوگا، لہٰذا آسان ترین رستہ یہی سمجھا گیا کہ اسے پاکستانی اسٹائل میں 'مسترد' کر دیا جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ سازش تھیوری بھی کیا چیز ہے! جب حقائق سے آنکھیں بند کرنی ہوں تو فراریت اور ذمے داری سے بھاگنے کا یہ بڑا مجرب نسخہ ہے۔ لیکن قوم یہ کیسے بھول جائے گی کہ یہ بانس ہمارا نہیں، امریکہ کا ہے۔ ہمارے پاس کیا جواز اور ثبوت ہے ان کو مسترد کرنے کا؟

ہماری ہیئتِ حاکمہ کا مسئلہ یہ ہے کہ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ اب دیکھیں نا، اسی اجلاس میں مسئلۂ کشمیر کو 'اقوام متحدہ کی قراردادوں' کے ذریعے حل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ ویسے یہ ہم پاکستانیوں کا حوصلہ ہے کہ سامنے ننگی حقیقتیں نظر آنے کے باوجود اپنے 'اصولی موقف' سے ٹس سے مس نہیں

Scanned with CamScanner

ہوتے۔ زمانے بدل گئے، دنیا بدل گئی، سیاستیں بدل گئیں۔ پاکستان وہ پاکستان نہیں، ہندوستان میں نہرو کو مرے کئی دہائیاں گزر گئیں۔ اقوام متحدہ خود ان قراردادوں کو بھول چکی بلکہ کچرے کے ڈبے میں پھینک چکی۔ ہماری وہاں کوئی حمایت کرنے والا نہیں۔ پورے اقوام متحدہ اور سکیورٹی کونسل میں ہماری اکیلی آواز ہے، اسے کوئی سننے والا نہیں۔ لیکن داد دینی چاہیے ہماری وزارتِ خارجہ کو اور وزارتِ خارجہ کے پیچھے مخصوص طاقتور گروہ کو۔ ہم اس دوران اپنا آدھا ملک گنوا چکے ہیں، بھیک اور قرض پر ملک چلا رہے ہیں، انتشار اور عدم استحکام کی زندہ تصویر ہیں، اپنے سب سے بڑے صوبے بلوچستان میں کسی تعلیمی ادارے میں پاکستانی جھنڈے کو تلاش کرنا مشکل ہے، لیکن پھر بھی کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے خواب دیکھتے ہیں، حالانکہ کشمیری رائے عامہ کے کئی جائزوں میں واضح اشارے مل چکے ہیں کہ بھارتی کشمیر کے عوام آزادی تو چاہتے ہیں لیکن پاکستان کے ساتھ الحاق نہیں۔ ہمارے خوابوں کی داد دینی چاہیے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ امریکہ یا دیگر عالمی طاقتیں اور ہندوستان مذہب کی بنیاد پر دنیا میں ایک اور تقسیم پاکستان کے حق میں کروائیں گے! اصل میں مسئلہ ہمارے 'اصولی موقف' کا نہیں۔ ہم نے اپنی قوم اور ملک کو مسائل سے آزاد ہونے ہی نہیں دینا کہ ہم اور ہمارا وطن بھی دنیا کی طرح ترقی اور خوشحالی کی طرف بڑھ سکے۔ ساری دنیا بشمول امریکہ اور چین بھی اس بات پر مصر ہے کہ اگر کشمیر نامی کوئی مسئلہ ہے تو اسے پاکستان اور ہندوستان آپس میں مل کر حل کریں، باقی دنیا کو اس مسئلے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اس دردسری میں شرکت سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا صاف کہنا ہے، یہ دردِسر آپ کا اپنا پالا ہوا ہے، اس سے خود ہی نبٹ لیں۔ اور ہمارے پاس اس سے نبٹنے کے لیے 'مرید کے برانڈ جہادی نسخہ ہے۔ لیکن یہ خطے میں مزید بدمزگی تو پیدا کرسکتا ہے، حاصل کچھ نہیں کرسکتا، نہ حالات کو مزید بگاڑنا پاکستانی ریاست افورڈ کرسکتی ہے۔ چنانچہ مروجہ پالیسی کا صرف ایک ہی مقصد باقی رہ جاتا ہے کہ مسئلے کو مسئلہ بنائے رکھو، کیونکہ اس سے دور دور تک بے شمار مفادات وابستہ ہیں۔ اس خطے میں 'نہ جنگ اور نہ امن' کی صورت حال برقرار رہے، اس پالیسی میں نہ کشمیریوں کا بھلا ہونے والا ہے اور نہ پاکستان کے عوام کو سکون میسر ہونے والا ہے۔ ہاں، اس ملک کی اقتصادی ترقی اور عوام کی خوشحالی ضرور یرغمال بنی رہے گی۔

اجلاس میں مزید کہا گیا ہے کہ کشمیر کے حل کے بغیر جنوبی ایشیا میں پائیدار امن نہیں ہوسکتا۔

Scanned with CamScanner

اور ظاہر ہے، امن نہیں، ہماری ترجیح مسئلۂ کشمیر ہے، خواہ اسے کئی صدیاں اور لگ جائیں۔ کبھی نہ کبھی امریکہ کا ہم پر دل آجائے گا اور وہ مسئلۂ کشمیر کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کردے گا۔ ہم مسلمان ہیں، قیامت تک کا انتظار تو ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم ویسے بھی زندگی قیامت کے انتظار میں ہی تو گزار رہے ہیں! انتظار کی ان صدیوں کے دوران ہم جی ڈی پی کا نو فیصد تک (جو دفاعی خرچے کی دنیا کی بلند ترین سطح ہے) اپنی ایٹمی اور روایتی صلاحیتوں پر خرچ کرتے رہیں گے۔ جو مزہ میزائلوں پر تیل کی مالش کرتے رہنے میں ہے، وہ کسی اور سرگرمی میں کہاں! جنگی تیاری ویسے بھی ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ ادھر ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ حکومت کو پبلک ہیلتھ کی کوئی پروا نہیں۔ بجٹ میں وفاقی اسپتالوں کے لیے 13 ارب روپے مختص تھے۔ نصف سال سے گزر جانے تک صرف ساڑھے تین ارب دیے گئے ہیں۔ یہی حال وفاقی یونیورسٹیوں کے بجٹ کا تھا۔ 30 ارب سے کٹوتی کر کے 15 ارب کا وعدہ ہوا، جس میں ابھی تک تین چار ارب روپے ہی ادا ہو سکے۔

ہم خود کیوں نہیں بدلتے؟

ہم اگر اپنی قیادت اور پاکستانی عوام کے رویوں کو دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ہم نے اپنے سیاسی، سماجی، انفرادی، معاشی حالات کی بہتری کے لیے کبھی خود سے کوئی قدم نہیں اٹھایا، جب تک خارجی حالات یا کسی بیرونی طاقت یا اداروں نے ایسا کرنے کے لیے ہمیں مجبور نہ کیا ہو۔ ہم جدھر چل رہے ہوتے ہیں، بس آنکھیں بند کیے چلتے رہتے ہیں، خواہ اس سے کتنے ہی بحران جنم لے رہے ہوں، ہمارا کتنا ہی نقصان یا ہماری آنے والی نسلوں کے لیے کتنے ہی مصائب کھڑے ہو رہے ہوں۔ ہم عذاب جھیلتے رہیں گے، مشکلات سہتے رہیں گے، ہمیں یہ بھی احساس ہوگا کہ ہم اچھے حالات یا کسی اچھے نظام میں نہیں رہ رہے، ان کا گلہ بھی کریں گے، ایک دوسرے کو کوستے بھی رہیں گے، اور اگر حل سوچیں گے بھی تو وہ بھی اس دائرے کے اندر رہ کر سوچیں گے، دائرے سے باہر نکل کر نہیں۔ ہم اپنے ارد گرد پہلے ایک جال یا دائرہ بناتے ہیں اور یہ دائرہ پھر ہمارے لیے ہماری زندگی سے بھی عزیز تر ہو جاتا ہے۔ ہم

Scanned with CamScanner

دائروں سے باہر نہیں نکلتے: مذہب کا دائرہ، حب الوطنی کا دائرہ، آمریت کا دائرہ، جمہوریت کا دائرہ، اخلاقیات کا دائرہ، حرام حلال کا دائرہ۔۔۔ حالانکہ انسان زندگی میں جتنے بھی دائرے بناتا ہے، آپ انھیں بنیادی اصول قانون کہہ لیں، ان کا محور و مرکز انسان اور انسانی زندگی ہوتے ہیں نہ کہ انسانی زندگی ان کے لیے۔ لہٰذا دنیا کا کوئی بھی قانون یا اصول ہو، وہ انسانی فائدے یا اس کی ترقی سے مشروط ہے، ورنہ سیدھی سی منطق بنتی ہے کہ اگر کوئی قانون یا اصول خود انسان یا انسانوں کی زندگی کو ہی اجیرن کرنے کا باعث بن جاتا ہے تو پھر انسان کو اسے چھوڑ کر کوئی اور قاعدہ وضابطہ تخلیق کرنا ہوتا ہے، تاکہ اس کی زندگی سہولت سے گزر سکے۔ قوانین انسانوں کے لیے ہوتے ہیں، انسان قوانین کے لیے نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ جن قوانین کو ہم آسمانی یا خدائی سمجھتے ہیں، وہ بھی انسانوں کے ہی توسط سے متعارف ہوئے تھے اور انسانوں ہی کی کسی فلاح اور سہولت کے لیے تھے۔ زمانہ بدلنے پر پھر نئے ضوابط، نئے فیصلے، نئے اصول اور نئی پالیسیاں بنانا ہوتی ہیں۔ فرد اور معاشرے کو بنے بنائے سانچے سے باہر آ کر سوچنا ہوتا ہے۔ نظریات بھی اشیا کی طرح ہوتی ہیں۔ زمانے بدلنے پر نئی مشینیں، نئے اوزار، نئی سائنس تخلیق کرنی ہوتی ہے اور نئی ضروریات کے مطابق نئی چیزیں بنانی ہوتی ہیں، اور یوں زندگی آگے بڑھتی ہے۔ ہم چیزوں کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔ انسان چھوٹا ہو جاتا ہے اور نظریے، اصول، قاعدے انسان سے اونچے قرار پاتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک دھوکا پوشیدہ ہوتا ہے۔ وقت سے پیچھے رہ جانے والے نظریات سے کچھ بااثر لوگوں کی روٹی روزی وابستہ ہوتی ہے، مفادات جڑے ہوتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان مفادات کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔ وہ انھیں ابدی اور غیر متبدل حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، اے انسانو، تم چھوٹے ہو، تم ان نظریات کے محتاج ہو، یہ نہیں بدل سکتے۔ حالانکہ وقت گزر چکا ہوتا ہے، حالات بدل چکے ہوتے ہیں، ان نظریات کی طاقت ختم ہو چکی ہوتی ہے اور اب وہ انسان اور معاشروں کو کچھ نہیں دے سکتے، لیکن اشرافیہ، سیاستدان، مولوی اور عسکری اسٹیبلشمنٹ عوام پر متروک نظریات اور مردہ پالیسیاں مسلط کیے رکھتے ہیں۔ عوام بیچارے کبھی مذہب کی چاہت میں، کبھی وطن کی محبت میں اور کبھی شرافت اور نیکی کے نام پر ان بوسیدہ نظریات سے چمٹے رہتے ہیں۔ یہ سارا نظام خوف کی بنیاد پر رکھا ہوتا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ عوام سے کہتی ہے کہ ان نظریات، اصولوں اور پالیسیوں سے روگردانی غداری ہے۔ مولوی اسے

Scanned with CamScanner

آسمانی غیر مرئی قوت کے غضب کو دعوت دینا کہتا ہے۔ یوں ریاست پر قابض طبقات اور مذہبی پیشوائی کے کھانے پینے کا بندوبست چلتا رہتا ہے، لیکن اس کی قیمت انسانیت کا بھاری حصہ اپنی پسماندہ اور کمتر درجے کی، مشکلات بھری زندگی گزار کر ادا کرتا ہے۔ عام لوگوں کی نسل در نسل بربادی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

چنانچہ ایک فرد کا معاملہ ہو یا کسی قوم کا، ہمیں ہر اس اصول، قانون، نظریے اور پالیسی کو بدل دینے کا مطالبہ کرنا چاہیے جو ہماری زندگیوں کے لیے مشکلات کا باعث ہو، جو ہماری زندگی میں خوشی اور خوشحالی کو آنے سے روکے، جو ہمارے ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ اور ہمارے معاشرے میں فساد کا باعث بنے، جو ہمارے ذہنوں کو کشادہ کرنے کی بجائے تنگ کرے، جو ہمیں خود کے ساتھ اور دوسرے کے ساتھ محبت سے روکے۔ ہر انسان کو سمجھنا چاہیے کہ زندگی اس کے لیے بنی ہے، اس سے عظیم تر چیز اور کوئی نہیں۔ ہمیں اپنے درمیان بے وقوف بنانے والے لوگوں کو جرأت کے ساتھ مسترد کرنا ہوگا۔ ہمیں ایسے خیالات کی پرستش کرنے کی ضرورت نہیں ہے جن کے باعث خود انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی جہنم زار ہو جائے۔ انسان کی خوشی سے بڑھ کر کوئی اور چیز مقدس نہیں ہو سکتی۔ تمام اخلاقی نظام انسانوں کے خدمت کے لیے تھے۔ اسی طرح قومی پالیسیاں جو بھی ہوں، وہ بالآخر عام شہری کی خوشی اور خوشحالی پر منتج ہونی چاہییں۔ لیکن ہمارے یہاں معاملہ الٹا ہے۔ عوام جہنم میں جائیں، ہم اس طرح کی روایات اور سلامتی کے چکروں میں ملک کے وسائل کو وقف کیے ہوئے ہیں جو طاقتور بالائی طبقات نے اپنے عیش و آرام اور بالادستی کو برقرار رکھنے کے لیے گھڑ رکھے ہیں۔

ہم سب کا فرض ہے کہ ہم ان تمام نام نہاد اصولوں، نظریات اور پالیسیوں کی نشاندہی کریں جو ہماری ذاتی اور اجتماعی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں، جنھوں نے پاکستان کے عام شہری کو بے قیمت کر رکھا ہے اور جو ہمارے حکمرانوں کو پاکستان کے شہریوں کی بہبود سے زیادہ عزیز ہیں۔ انھیں کروڑوں لوگوں کی افلاس زدہ زندگی سے کوئی دکھ نہیں ہوتا، نہ انھیں ان کی حالت کی پروا ہے، لیکن اپنے من پسند مسئلے کو زندہ رکھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

کسی نئے میثاقِ پاکستان کی ضرورت

آج کل جناب نواز شریف کی طرف سے ایک تجویز کا ذکر ہو رہا ہے کہ پاکستان کی ریاست کو چلانے والی تمام قابلِ ذکر طاقتیں اور حصے دار مل کر بیٹھیں اور پاکستان کے لیے کم از کم اگلے پچیس سال کے لیے کوئی متفقہ لائحۂ عمل تیار کریں۔ ہمارے خیال میں آج یہ بہت ضروری ہے کہ پوری قوم پیچھے مڑ کر اپنی بیلنس شیٹ دیکھے کہ موجودہ طے شدہ داخلی اور خارجی ریاستی پالیسیوں سے ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ ان تمام اسٹیک ہولڈرز کے سامنے سب سے پہلا سوال تو یہ ہونا چاہیے کہ ہم پاکستان اور پاکستانی عوام کو کس طرح کا دیکھنا چاہتے ہیں۔ آج پاکستان کا ہر شہری اپنے ملک کی موجودہ حالت پر تشویش کا شکار ہے اور اس کا اپنے ملک کے مستقبل سے اعتماد اٹھ رہا ہے۔ ہماری قومی اور سماجی زندگی کا کوئی بھی حصہ قابلِ فخر حالت میں نہیں ہے۔ ہم نے ترقی سے بری طرح اغماض برتا ہے۔ اقتصادی ترقی سے ہی خوشحالی اور اعتدالی رویوں کو فروغ مل سکتا تھا۔ اگر ہم ایک قوم کی حیثیت سے ترقی کو اپنا مشن بناتے تو آج تک جن بحرانوں اور مسائل کا ہم شکار رہے ہیں وہ کبھی پیدا نہ ہوتے۔ پاکستان میں آبادی اور غربت میں بے لگام طریقے سے اضافہ ہو رہا ہے۔ وسائل کی اس لیے قلت ہے کہ ہم نے انسانی اور قدرتی وسائل کی ترقی پر سرمایہ کاری نہیں کی، جبکہ ہمارا ملک ان وسائل کے خام مال سے لبریز ہے۔ ان کو ترقی دینا ہماری ریاست کے ترجیحی مقاصد میں شامل ہی نہ ہوا۔ ہماری اشرافیہ اپنے مذہب اور ملک کے بارے میں عدم سلامتی کے احساس کا شکار ہو گئے۔ جہاں تک ہماری اسلامی حیثیت کی سلامتی کا سوال تھا، یہ مکمل طور پر بے جا اور غیر منطقی خوف تھا۔ ریاست ایک مخصوص جغرافیائی خطے کے لوگوں کے درمیان باہمی شناخت اور انتظام و انصرام کا ایک سوشل کنٹریکٹ ہوتا ہے۔ پاکستان کے عوام کی اکثریت مسلمان تھی، ظاہر ہے انھوں نے سدا مسلمان اور اپنے اسلامی ثقافتی ماحول میں ہی رہنا تھا۔ مذہب کو اگر ریاست اور سیاست میں لائیں گے تو ایک پنڈورا باکس کھل جائے گا۔ ضرورت سے زیادہ اسلام پر زور دے کر ہم مضبوط نہیں ہوئے، کمزور اور تقسیم در تقسیم ہوئے ہیں۔ اس سے نہ ہمارے ذاتی کیریکٹر میں اضافہ ہوا ہے نہ ہم نے کوئی علمی ترقی کی ہے، نہ سماجی امن

Scanned with CamScanner

نصیب ہوا ہے اور نہ ہماری سرحدیں محفوظ ہوئی ہیں، بلکہ پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی سے سارے ہمسایہ ملک اور دنیا کی ترقی یافتہ قومیں غیر محفوظ ہو گئے ہیں۔ سماجی لحاظ سے ہم ماضی پرستی اور قدامت پسندی کی طرف تیزی سے گامزن ہیں۔ ترقی کے حوالے سے کسی قوم کے لیے یہ بڑے خطرناک رجحانات ہیں۔ ہمیں جذبات اور مصلحتوں سے ہٹ کر قوم کے پستی کی طرف سے جانے کو روکنا ہوگا، اور یہ جتنا جلدی کریں گے اتنا ہی ہماری اپنی زندگی اور آنے والی نسلوں کے لیے بہتر ہوگا۔ انسان اپنے زمانے اور اس کے تقاضوں کے ساتھ چل کر ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔

پاکستان کی ریاست کا دوسرا خوف اس کی جغرافیائی سلامتی کا ہے۔ ہم نے اپنے تمام مالی، مادی اور ذہنی وسائل اس طرف لگا لیے۔ اس دوڑ میں بھی ہم نے پایا کم اور کھویا زیادہ ہے۔ پاکستان دنیا کا تسلیم شدہ ملک ہے۔ یہ اٹھارہ کروڑ لوگوں کا وطن ہے جو اس سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیں قومی سلامتی کے بارے خواہ مخواہ کے خوف سے باہر آنا ہوگا۔ قومی سلامتی کے ہمارے پاس ضروری بندوبست موجود ہیں، اور دنیا میں کوئی لوٹ مار نہیں مچی ہوئی۔ ملک اندر سے کھوکھلے ہو کر ٹوٹتے ہیں، انھیں کوئی اٹھا کر نہیں لے جاتا۔ نہ یہ قبضے کرنے کا زمانہ ہے اور نہ قوموں کے درمیان ساری زندگی کے لیے تنازعے، جھگڑے، نفرتیں رکھی جا سکتی ہیں۔ انڈیا کے ساتھ معاملات سیاسی سطح پر باہمی مفادات کا تحفظ رکھتے ہوئے طے کیے جا سکتے ہیں، اگر ہماری سلامتی کی اسٹیبلشمنٹ حوصلے سے کام لے، دونوں ملکوں کے سیاست دانوں اور عوام کو ملنے اور معاملات کو طے کرنے دے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انڈیا نے از خود پاکستان پر کبھی جارحیت نہیں کی۔ پاکستان کا وجود خود انڈیا کے مفاد میں ہے۔ کوئی بھی علاقائی یا بین الاقوامی طاقت اس خطے میں ...م استحکام کو گوارا نہیں کر سکتی۔ یہ معاشیات اور سائنس کی دنیا ہے؛ جس نے جس کو فتح کرنا ہے، انھیں میدانوں میں کرنا ہے۔ ہماری اسٹیبلشمنٹ کا وطن کی سلامتی و دفاع کے بارے میں حساس ہونا بڑی اچھی بات ہے لیکن ماہرین نفسیات کے مطابق ضرورت سے زیادہ حساسیت اور تشویش الٹ... ن میں چلی جاتی ہے کیونکہ زندگی کی بقا اور ترقی کے لیے جو خرد کا توازن چاہیے وہ قائم نہیں رہتا۔ صرف سلامتی رہے اور ملک کی ترقی نہ ہو تو قوم کے لیے زندگی اور آزادی کا مطلب کیا رہ جاتا ہے؟ انڈیا کے ساتھ ایک ابدی نظریاتی چپقلش ہمارے قومی مفاد اور ترقیاتی عمل کے لیے نقصان دہ ہے۔ کشمیر کا مسئلہ کشمیر کے عوام طے کریں اور اسی طرح انڈیا پاکستان کے تعلقات دونوں

Scanned with CamScanner

ملکوں کے عوام طے کریں۔ ہماری سیکورٹی اسٹیبلشمنٹ کو اپنے عوام اور سیاسی قیادت کی حب الوطنی پر اعتماد کرنا چاہیے۔

ہمارے خیال میں جناب نواز شریف کی مذکورہ تجویز نہایت احسن ہے۔ پاکستان کے تمام اہم ذمے دار فریقوں کو مل کر پاکستان کی ترقی کے سوال پر اگلے پچیس سال کا لائحۂ عمل طے کرنا چاہیے۔ ہمیں ایک ترقی کرتا ہوا، باوقار، پرامن پاکستان چاہیے۔ پرانے مائنڈ سیٹ کے ساتھ ایسا ممکن نہیں، نہ ہیئتِ مقتدرہ کے پاس اس کا کوئی متبادل ہے۔ اب ہمارا اعلیٰ ترین قومی مشن صرف پاکستان کی ترقی ہونا چاہیے۔ اسی طرح ہمیں پاکستان کو مسلم شناخت کی اعتدال پسند اور جدید ریاست بنانے کا عزم کرنا چاہیے تا کہ اس کے ماتھے سے ناکام ریاست، عسکریت پسند یا مذہبی انتہا پسندانہ قوم کا لیبل اتر سکے۔ پاکستان کی ہیئت کو بدلنے کی سب سے زیادہ ذمے داری ہماری عسکری اسٹیبلشمنٹ پر آتی ہے چنانچہ انھیں آگے بڑھ کر ملک کی سیاسی قیادت کا ساتھ دینا چاہیے۔

جناب! دہشت گردوں کا مذہب ہے

ہمارے ہاں اکثر اربابِ اقتدار کی طرف سے اس طرح کے بیانات دیے جانے لگے ہیں: ''دہشت گردوں کا کوئی مذہب نہیں''، یا ''دہشت گرد مسلمان نہیں''۔ یہ ذمے داری سے آسانی سے جان چھڑانے والی بات ہے۔ اسے سادہ لوحی بھی کہا جا سکتا ہے اور خود فریبی بھی؛ اس کا مطلب محض کڑوی اور ننگی سچائی سے منھ پھیرنے کے سوا کچھ نہیں۔ آنکھیں بند کرنے سے مسائل کبھی حل نہیں ہوتے بلکہ اس کا مطلب ہوگا، ہم مسائل کو حل کرنا نہیں چاہتے خواہ وہ کتنے ہی سنجیدہ ہوں اور ہمارے ملک کے لیے تباہ کن ثابت ہو رہے ہوں۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ دہشت گرد کلمہ گو مسلمان ہیں اور ان کا مذہب پر شدت سے ایمان ہے، بلکہ وہ یہ سب کچھ مذہبی اثرات اور ان کو دی گئی انتہا پسندانہ مذہبی تعلیم کے زیر اثر ہی کر رہے ہیں۔ عام دیکھنے میں یہ آیا ہے، جن کا مذہب نہیں ہوتا وہ تو بے حد نرم خو، انسانیت نواز اور خلیق

Scanned with CamScanner

ہوتے ہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے، ظلم اور تشدد یا تو سیاست کے نام پر ہوا ہے، یا مذہب کے نام پر۔ مذہب کے معاملے میں ہم 'میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو' نہیں کر سکتے۔ اگر دہشت گردی سے ہم سچ مچ جان چھڑانا چاہتے ہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ دہشت گردی کی نظریاتی مذہبی بنیادیں ہیں۔ جب ہم ان جہادیوں اور دہشت گردوں کو مذہب کی شدت پسندانہ تعلیمات دے کر سیاسی مقاصد کے لیے افغانستان اور کشمیر میں ایکسپورٹ کر رہے تھے، اس وقت تو یہ دہشت گرد 'صاحب ایمان' اور 'مجاہد' تھے؛ جب ہمارا خود اپنا گھر جلنے لگا ہے تو ان کا 'کوئی مذہب نہیں' رہا اور یہ مسلمان نہیں رہے! یہ بڑی زیادتی کی بات ہے۔ ہمیں خرابی کی جڑ تک پہنچنا اور سمجھنا ہوگا۔

اُس وقت اس ملک کے سب محب وطن گاڈ فادرز نشے کی حالت میں تھے جب وہ اس ملک میں فرقہ پرست مذہبی انتہاپسندانہ مدرسوں کا جال پھیلانے کی اجازت اور مدد دے رہے تھے، جب وہ اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دے رہے تھے، جب وہ اس ملک کے اسکولوں میں کفر اور نفرت کی بنیاد پر اسلامیات پڑھوا رہے تھے اور سارے تعلیمی نصاب کو سیاسی اسلام سے بھر رہے تھے اور اس سے عقل پسندی کو باہر نکال رہے تھے۔ یہ دہشت گردی جہادی مذہب کے اسی بوئے ہوئے بیج کا پھل ہے۔ اب اس ملک میں مذہبی انتہاپسندی کے باغات اور فصلیں اُگ چکی ہیں۔ اب اس کے پھل سے جناب کیوں خوفزدہ ہیں اور ریت میں کیوں منھ چھپا رہے ہیں؟

اس ملک میں مذہب کو پالا گیا ہے۔ مذہب کے علاوہ اس قوم کو تمام حیات بخش اور صحتمندانہ سرگرمیوں سے محروم کیا گیا ہے۔ اس قوم پر مذہب کی بھرمار کر کے اس کو انسانیت نواز خیالات سے اور انسانوں کے طور پر سوچنے سے محروم کر دیا گیا ہے۔ آج ہماری ہر بات، ہر حوالہ اور ہر سرگرمی مذہب سے شروع اور مذہب پر ختم ہوتی ہے۔ ہمارا انسانی حصہ مکمل طور پر مفلوج ہو چکا ہے۔ ہم ایک ایسے مریض کی مانند ہو گئے ہیں جسے ضرورت سے زیادہ 'دوا' کی خوراکیں دے کر مار ڈالا گیا ہو۔ حیرت کی بات ہے، اس ملک کے وہ طاقتور 'ڈاکٹر' آج بھی ریاست پر قابض ہیں اور انھیں اپنے کیے پر کوئی شرمندگی نہیں۔ جن کی بنائی ہوئی پالیسیوں کی وجہ سے اس ساری بربادی کا قوم کو سامنا ہے وہ آج بھی اس ملک کے اصل علاج کی طرف واپس نہیں آنے دے رہے۔

جس چیز کی ہم نے اس ملک میں ابتدا کی تھی، یہ دہشت گردی اُسی کی انتہائی شکل کا نام ہے۔

Scanned with CamScanner

یہ ایسا ہی ہونا تھا۔ اب ہم ایک قوم کی حیثیت سے مذہبی تعصب، انتہا پسندی، تفرقہ بازی، عقیدہ پرستی اور ملائیت میں مکمل طور پر پھنس چکے ہیں۔ اسلام کبھی رواداری، انسانیت، رحمت العالمین اور صوفیائے کرام کے انسانیت نواز نظریات پر مشتمل تھا؛ اب ان سب کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ہم سرسید، اقبال اور قائداعظم کے لبرل جدت پسند نظریات سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ پاکستان کے عوام چاروں طرف سے ہر طرح کے مذہبی افکار کی زد میں ہیں۔ ہمارے یہاں بطور انسان خود کو اور دنیا کو دیکھنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ اگر ہم اب بھی آنے والی نسلوں کو اور پاکستان کو ایک قوم اور ریاست کی حیثیت سے فروغ پاتا دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مذہب کے ریاستی اور سیاسی کردار کے خاتمے پر سوچنا ہوگا۔

مذہب اور مذہبی لوگوں کو سرحد پار کے تنازعوں میں استعمال کرنے کی پالیسی فوری چھوڑنی چاہیے۔ نصابِ تعلیم میں فوراً جدید سائنسی تعلیمات کے نظریات کے مطابق تبدیلیاں لانی چاہییں۔ اسلام کو ایک روادار اور صلح کل مذہب کے طور پر پڑھایا جائے، دنیا بھر کے دوسرے مذاہب اور قوموں کا احترام سکھایا جائے اور مولویوں کی سرپرستی کرنے اور ان کی بلیک میلنگ میں آنے سے انکار کیا جائے۔ قانون کی حکمرانی، اس کی رٹ، اور جدید تمدنی اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے۔ پاکستان کو ایک جدید ترقی پسند فلاحی ریاست بنانے کا عزم کیا جائے۔ یاد رکھیے، یہ موقع ہم تیزی سے کھو رہے ہیں۔

پاکستان اور اقلیتیں

شیخوپورہ کے قریب ایک گاؤں میں عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والی پانچ بچیوں کی ایک غریب ماں 45 سالہ آسیہ بی بی کو عدالت نے 295 سی قانون کے تحت سزائے موت دے دی ہے۔ ذرا منظر سامنے لائیں: ایک پسماندہ گاؤں کی غریب اور ان پڑھ خاتون جسے خود اپنے مذہب کے بارے میں بس واجبی معلومات ہوں گی، وہ پانی لینے جاتی ہے۔ وہاں اس کا دیگر خواتین سے برتنوں کی پاکی ناپاکی پر جھگڑا ہو جاتا ہے اور پھر اس واقعے کو یوں رپورٹ کر دیا جاتا ہے کہ اس نے خدانخواستہ رسول پاک

Scanned with CamScanner

کی توہین کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے کوئی مفاد ہوگا۔ کوئی انتہا پسند اور تنگ نظر لوگ ہوں گے جنھوں نے ایک معمولی واقعے کو بنیاد بنا کر ایک غیر مسلم خاتون کی زندگی تباہ کر دی۔ مذکورہ قانون ایک ایسا آسان ترین پھانسی کا پھندا ہے جسے کوئی بھی کسی وقت کسی بھی غیر مسلم پاکستانی کے گلے میں ڈال سکتا ہے۔ اس قانون کے خلاف انسانی حقوق کے اداروں، جمہوری قوتوں، لبرل تنظیموں اور پاکستان کی تمام اقلیتوں نے ہمیشہ احتجاج کیا ہے۔ یہ قانون جسے بدنام زمانہ جنرل ضیا نے اپنی آمرانہ حکمرانی کے دوران نافذ کیا تھا، مہذب دنیا میں پاکستان کی روسیاہی کا باعث ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ پولیس اور ماتحت عدالتیں بھی مذہبی انتہا پسندوں کے دباؤ میں آ کر انصاف نہیں دے پاتیں۔ انتہا پسند جوشیلے مذہبی لوگ تھانوں اور عدالتوں میں جا کر دھمکیوں سے مطلوبہ فیصلہ حاصل کر لیتے ہیں۔

پاکستان ابہام، انتشار اور المیوں کا دوسرا نام بن چکا ہے۔ برصغیر میں مسلمان اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی ہندوستان میں ایک وسیع غیر مسلم اکثریت پر ہزار سال تک مطلق العنان بادشاہت کرتے رہے، لیکن آج مطلق اکثریت میں ہونے کے باوجود چند فیصد غیر مسلم پاکستانیوں کو باوقار زندگی اور مساوی شہری حقوق دینے کو تیار نہیں۔ پھر کون نہیں جانتا کہ قائد اعظم نے 11 اگست 1947 کی تقریر میں ریاست کی نظر میں مذہبی امتیاز کی سختی سے تردید کی تھی۔ فروری 1948 میں امریکی ریڈیو کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا: ”پاکستان مذہبی ریاست نہیں ہوگا۔ ہمارے ہاں بہت سے غیر مسلم ہیں۔ انھیں وہی حقوق اور مراعات میسر ہوں گی جو کسی دوسرے شہری کو ملیں گی۔“ پہلی کابینہ میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نظر نہیں آتی۔ اگر قائد اعظم کے وژن کو سامنے رکھا جاتا تو آج ریاست کی نظر میں اقلیت اور اکثریت کے الگ الگ وجود ہی نہ ہوتے۔ عقیدے کا تعلق ہر شہری کے اپنے ضمیر سے ہوتا۔ کوئی اسلامی نظریاتی کونسل، کوئی شرعی کورٹ اور نہ کوئی شرعی قوانین ہوتے۔ پاکستان مسلم اکثریت کی حامل ایک جدید ریاست ہوتا۔

اس ملک کو ترقی، امن اور سماجی انصاف کے راستے سے ہٹانے کے لیے دو ریڈی میڈ ہتھیار استعمال ہوئے: مذہب کا نام اور بھارت دشمنی۔ جان کی امان چاہیے یا حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ، اسلام کی رٹ اور ہمسایہ ملک کے ساتھ نفرت کرنا لازمی ٹھہر گیا۔ اس کے بعد حکمران طبقے کو عوام کو شرکتِ اقتدار سے محروم رکھنے اور پاکستان کے مقدر کے ساتھ من مانی کرنے کی کھلی چھوٹ مل گئی۔ اسلام جب ریاستی ایجنڈا بنا تو ضروری قرار پایا کہ عوام کو مذہب زدہ کیا جائے تاکہ وہ زندگی کے حقیقی

Scanned with CamScanner

شعور ہی سے محروم ہو جائیں۔ خود شاندار رہائشی علاقوں میں رہیں، بیرون ملک دولت جمع کریں، اپنی اولادوں کو امریکہ اور یورپ کی شہریت دلوائیں، لیکن عوام بعد از موت کی فکر میں پڑے رہیں۔ پاکستان کے عوام بے حد مذہبی، رجعتی اور قدامت پرست بنائے جا چکے ہیں۔ ریاستی مدد اور سرپرستی میں لاتعداد مذہبی اور نیم مذہبی جماعتوں اور درجنوں مذہبی چینلوں نے عوام کا محاصرہ کر رکھا ہے۔

پاکستان میں اکثریت اور اقلیت کے مسائل آپس میں گڈمڈ ہو چکے ہیں۔ یہاں تو سارا منشا اور منصوبہ ہی عوام کو حق حکمرانی سے محروم کرنا اور انھیں ذہنی طور پر مفلوج بنانا تھا۔ اس ملک کے عوام کو ہر سطح پر دوسرے مذاہب کے لوگوں سے نفرت سکھائی گئی ہے۔ بظاہر اقلیتوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کو بھی انسان سمجھا جائے، لیکن جب اکثریت خود انسان ہو گی تو دوسروں کو انسان سمجھے گی۔ ہم نے پاکستانی مسلمانوں کو کبھی انسان بن کر سوچنا سکھایا ہی نہیں، حالانکہ کچھ بھی ہو، انسانیت تمام عقائد پر مقدم ہے۔ اقلیتوں کے ساتھ بطور انسان اس وقت تک سلوک نہیں ہو سکتا جب تک اکثریت خود اپنے کو سب سے پہلے انسان نہ سمجھے۔ عقائد اور مذاہب انسان کو پیدا ہونے کے بعد ملتے ہیں۔ ہم نے تمام دیگر اقوام کو مذہب کی عینک سے دیکھا ہے۔ اپنے ملک کے مسائل پر توجہ دینے کی بجائے کبھی دہلی کے لال قلعے پر سبز پرچم لہرانے میں، کبھی کشمیر، کبھی فلسطین، کبھی عراق اور کبھی افغانستان میں الجھائے رکھا ہے۔ اکثریت اور اقلیت کا سوال طاقتور اور کمزور میں بدل جاتا ہے، چنانچہ طاقتور کمزور کا استحصال بھی کرے گا اور ظلم و ناانصافی بھی۔ یہ سچ ہے کہ اکثریت کا اقلیت پر حملہ آور ہونا صرف پاکستان ہی کی کہانی نہیں؛ ایسا ہر قوم اور ہر مذہب میں ہوتا آیا ہے۔ انسان کبھی کبھی موقع ملنے پر اپنے اندر کی درندگی کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ انسان کی اس پوشیدہ درندہ جبلت کو ذہنی و مادی ترقی اور معاشرے میں عمومی خوشحالی قائم کر کے ہی روکا جا سکتا ہے، جس کے لیے انصاف پر مبنی ایک جمہوری سیکولر معاشرے کا قیام ضروری ہے۔ عقیدہ و نسل کے اختلافات زندگی کے باغ میں رنگا رنگ پھول ہیں۔ پارلیمنٹ میں موجود ساری جمہوری قوتوں کو مل کر مذکورہ قانون کی تنسیخ یا اس میں ایسی تبدیلی کرنی چاہیے کہ کوئی اسے آسانی سے انتقامی کارروائی کے لیے استعمال نہ کر سکے۔ مذہب زدگی سے مذہبی انتہا پسندی اور پھر مذہبی دہشت گردی تک کا سفر پاکستان اور اس کے عوام کو لے ڈوبا ہے۔

پروین شاکر نے اس وطن کے بارے میں ایک بار کیا خوب کہا تھا:

Scanned with CamScanner

اے مری گل زمیں تجھے چاہ تھی اک کتاب کی
اہلِ کتاب نے مگر کیا ترا حال کر دیا

'ناموسِ رسالت' سے 'ناموسِ وطن' تک

ملاؤں اور میڈیا نے اس حکومت کو کچھ دن پہلے تک 'ناموسِ رسالت' قانون میں بری طرح پھنسا کر رکھا ہوا تھا۔ بیچارے معافیاں مانگتے اور تردیدیں کرتے کرتے تھک گئے لیکن ملاؤں نے جب دیکھا کہ یہ حکومت اپنا گورنر شہید کروانے کے بعد بھی دیوار کے ساتھ لگ رہی ہے تو انھوں نے اسے زیادہ سے زیادہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کے لیے ناموس رسالت قانون کے ایشو پر جلسے جلوس نکالنے کا سلسلہ بند نہ کیا۔ برائے نام ترقی پسند سیاسی جماعت نے مصلحت پسندی اور لنگڑے لولے اقتدار کی ہوس میں سلمان تاثیر کو تنہا کر دیا تھا۔ اس قانون میں ترمیم کی بات ہمیشہ پارٹی کرتی رہی۔ سلمان تاثیر نے بیان دینے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا تو حکومت اور پارٹی کی حمایت غائب تھی۔ ایوان صدر اور وزیر اعظم ہاؤس کی عین ناک کے نیچے تنہا سلمان تاثیر پر قادری سرکاری یونیفارم میں سرکاری گن سے گولیاں برساتا دکھائی دیا۔ حکومت کی طرف سے ملاؤں کی منت سماجت کرنے کے علاوہ وزارتوں کی آفر کا سلسلہ جاری تھا تاکہ ان بیچاروں کی اس ایشو سے جان چھوٹے۔ ہمارے ہاں تو وہ شہید پارٹی اثاثہ بنتے ہیں جن کے نام کے نعرے لگا کر ووٹ ملتے ہوں، چنانچہ آہستہ آہستہ سلمان تاثیر پیپلز پارٹی کے لیے بھولی ہوئی داستان بنتے جائیں گے۔ حکومت کسی سرکاری وکیل تک کا بندوبست نہیں کر سکی جو عدالت کے سامنے استغاثہ کی طرف سے پیش ہو سکے۔ مولوی اس موقعے کا ابھی کچھ دیر اور استعمال جاری رکھنا چاہتے تھے کہ قدرت نے ان کو 'ناموسِ وطن' کے نام پر ریمنڈ ڈیوس کے مسئلے پر تحریک اور دباؤ کا موقع فراہم کر دیا۔ بزدلی، مصلحت پسندی، اقتدار پرستی جب طرزِ سیاست ٹھہرے تب یہی ہوتا ہے جو حکومتِ وقت کی حالت ہے۔ حکومت کسی نہ کسی طرح ناموسِ رسالت قانون پر برپا ہنگامے سے جان چھڑا رہی تھی، اب ناموسِ وطن کے نام پر انھی لوگوں کے سامنے پھر سے تازہ نشانہ بن بیٹھی ہے۔

اس مسئلے پر حکومت نے وہی مبہم موقف، معذرت خواہی، سچائی کے اظہار سے گریز کا وہی

Scanned with CamScanner

اسٹائل اپنایا جو ناموسِ رسالت قانون کے سلسلے میں کیا تھا۔ جب سیاست سے اصول پسندی، دیانتداری اور سچائی کی راہ کھو دی جائے تو یہی حشر ہوتا ہے۔ پیپلز پارٹی نے مشکل وقت اور مشکل فیصلوں کی گھڑی میں دانشمندی سے کم ہی کام لیا ہے۔ یہ گھبرا کر بزدلی کی راہ پکڑ لیتی ہے تا کہ شارٹ کٹ سے کرسی کو بچالیا جائے، اور ہوتا یہ رہا کہ کرسی بھی نہ بچی۔ قیادت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بھٹو کو جب پھانسی کا حکم ہوا، پارٹی کی قیادت نے بجائے کوئی مزاحمتی تحریک چلانے کے اپنے ورکروں کو قرآن پاک پڑھنے کی ہدایات جاری کی تھیں۔ اس طرح موقع پرستوں اور مصلحت پرستوں کی بن آتی رہی۔ خیر سے اب تو پارٹی ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ ہر بار بحران سے گزرنے کے باوجود یہ پارٹی احساس نہیں کرتی کہ اس نے موقع پرستی سے کھویا زیادہ اور پایا کم ہے۔ ہم یہ سوچتے عمر گزار چلے ہیں کہ یہ پارٹی کبھی تو اصولی بات پر ڈٹ جائے اور اپنے سیاسی دشمنوں کو حیران کر دے کہ ان کو اقتدار نہیں، عوام کا بہتر مستقبل اور ملک کی حقیقی بھلائی عزیز ہے۔ ریمنڈ ڈیوس کے واقعے پر حکومت کی حالتِ زار ملاحظہ ہو۔ ایک طرف امریکہ ہے جو ہمارے حکمرانوں اور ہیئتِ مقتدرہ کا مائی باپ ہے۔ اس کے ڈالروں اور دفاعی ساز وسامان سے یہ ملک چلتا ہے۔ اگر وہ ہمارے سر سے اپنا ہاتھ اٹھالے تو ہماری سیاسی اور سلامتی بقا ہی خطر میں پڑ سکتی ہے۔ مالیاتی اور معاشی طور پر ہم فوراً دیوالیہ ہو جائیں گے۔ پھر ایک بین الاقوامی قانون ہے۔ ہماری ریاست کے امریکہ کے ساتھ دوطرفہ معاہدات اور باہمی حکومتی مفاہمت کا سلسلہ ہے۔ اس حکومت نے نہ ناموسِ رسالت پر قانون کی حکمرانی کی بات کی اور نہ جرأت مندانہ موقف اختیار کیا۔ اس مسئلے پر بھی بھیگی بلی کی طرح چھپتے پھر رہے ہیں۔ آئیں بائیں شائیں جاری ہے، عوام کو کچھ بتا نہیں رہے، اندر امریکہ سے معافیاں اور مہلت مانگ رہے ہیں، مولوی اور جہادی میڈیا کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں۔ عوام کو تکالیف کے سوا تین سال سے کچھ دیا نہیں چنانچہ عوام سے خوفزدہ ہیں۔ ادھر عوام کی مایوسی کسی چنگاری کی راہ تک رہی ہے، جس سے مولوی، دایاں بازو اور خفیہ طاقتیں فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ یہ سوال الگ ہے کہ ریمنڈ ڈیوس عام سفارتی ذمے داریاں ادا کرنے نہیں آیا ہوا، بلکہ وہ ایک جاسوس تھا، اور وہ یہاں اکیلا نہیں، شاید سینکڑوں اور ہیں۔ حکومت کیوں سچ نہیں بول رہی کہ اس طرح کے لوگ پاکستان میں محض زرداری کی آشیر باد سے نہیں آئے ہوئے؛ اس طرح کے فیصلوں میں سلامتی کی ہیئتِ مقتدرہ بھی شامل ہے۔ اس شخص کے ویزے کی کلیئرنس آئی ایس آئی نے دی تھی۔ کیا ان کو نہیں پتا تھا کہ یہ شخص کس لیے آرہا ہے اور یہ کون ہے؟ اگر

Scanned with CamScanner

انھیں نہیں پتا تھا تو انھوں نے اس کی کلیئرنس کس حساب سے دی؟ اس طرح کے لوگوں کے وجود اور سرگرمیوں سے ہمارے دفاع اور سلامتی کے ادارے کیا بے خبر ہیں؟ یہ پاکستان کی ریاست، حکومت اور عوام کو الگ سے طے کرنا ہے کہ امریکہ کو اس طرح کی سرگرمیوں کی اجازت دی جائے یا نہ دی جائے۔ جہاں تک لاہور میں ہونے والے واقعے کا تعلق ہے، اس کا جذبات اور حب الوطنی سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ایک قانونی واقعہ ہے۔ ڈیوس کو ان لڑکوں سے کون سی دشمنی تھی؟ ظاہر ہے، اس نے ان کو اپنے لیے خطرہ سمجھا اور دفاع میں قتل کیا۔ سوال یہ ہے، ان لڑکوں نے اس کی کار کا پیچھا کیوں کیا؟ انھوں نے اپنی پستول کو کیوں باہر نکالا؟ فرض کیا میں سڑک پر موٹر سائیکل پر جا رہا ہوں اور میری نظر ایک ایسی کار پر پڑتی ہے جسے کوئی گورا چلا رہا ہے، اور میں یہ بھی دیکھ لیتا ہوں کہ اس کی گاڑی میں کوئی اسلحہ بھی ہے۔ اب مجھے کیا تکلیف ہے کہ میں عام شریف شہری کی حیثیت سے ازخود اس کا پیچھا کرنے کا ذمہ لے لوں؟ میں نے تو گاڑی ڈرائیور کرتے ہوئے کبھی دیکھا بھی نہیں کہ میرے آگے پیچھے دائیں بائیں کون جا رہا ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، حکومت جانے، متعلقہ ادارے جانیں۔ مجھے اس سے کیا! آ بیل مجھے مار والا معاملہ میں کیوں کروں گا؟ اس وقت درجنوں راہگیر اور موٹر سائیکل سوار اور بھی ہوں گے، ڈیوس نے ان پر فائر کیوں نہ کھولا؟ ظاہر ہے، یہ لڑکے یا لوٹنے کے چکر میں تھے یا پھر کوئی 'خفیہ ذمہ داری' نبھا رہے تھے۔ بین الاقوامی قانون کہتا ہے، ڈپلومیٹ کا اسٹیٹس بھیجنے والا ملک متعین کرتا ہے، اور ہمارے ملک کا قانون کہتا ہے کہ ہماری وزارتِ خارجہ یہ طے کرے گی کہ کوئی ڈپلومیٹ ہے یا نہیں۔ کوئی مولوی، کسی چینل کا اینکر پرسن اور نہ کسی اخبار کا کالم نگار اس کے اسٹیٹس کو متعین کرے گا۔ ڈیوس کا بیان ہے، اس نے سیلف ڈیفنس میں ان کو گولی ماری ہے۔ حالات وواقعات سے بھی ایسا ہی لگتا ہے، ورنہ وہ پاگل ہوتا تو وہاں موجود سب لوگوں پر فائر کھولتا۔ امریکہ کہتا ہے، وہ ڈپلومیٹ ہے۔ ہماری وزارتِ خارجہ خاموش ہے۔ جرأت نہیں کچھ کہنے کی۔ بزدلی اور مصلحت کوشی ہی سیاسی قیادت کا وطیرہ ہے جو 'حب الوطنی' میں ریاستی اداروں کے گناہ بھی اپنے سر لے لیتی ہے اور اف تک نہیں کرتی تاکہ کچھ اور دن ایوان اقتدار کی لطافتوں میں گزر سکیں۔

یہ ہماری ریاست اور سیاست کا دیوالیہ پن ہے۔ عوام کو حقائق سے بے خبر رکھا جاتا ہے۔ حکمران طبقات باہمی چپقلشوں میں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر کوئی شطرنج کی بازی سامنے رکھے ہوئے ہے، دوسرے کو مات دینا چاہتا ہے، جن کے بیچ عوام اور ملک کا تیاپانچا ہو رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

شریعت بمقابلہ پارلیمنٹ

قرائن بتا رہے ہیں، پیپلز پارٹی کی حکومت کو بلیک میل کرنے کے لیے 1970 کی دہائی کی طرز پر اسلام کے نام پر سیاسی تحریک چلانے کے بہانے تراشے جا رہے ہیں۔ وہ علما جن کی توندوں کے سائز سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ علم دین کی کتنی بڑی تجوری اٹھائے ہوئے ہیں، وزارتیں کھونے کے بعد اپنی سیاست چمکانے اور پیپلز پارٹی کی قیادت پر دباؤ بڑھانے کے لیے 'ناموسِ رسالت' کے نام پر جلسے جلوس نکال رہے ہیں، جبکہ ساری قوم کے درمیان ناموسِ رسالت پر کوئی تنازعہ موجود ہی نہیں، مسلم اور غیر مسلم سب کا اس پر اتفاق ہے۔ مسئلہ قانون کے ناجائز اور ظالمانہ استعمال کا ہے۔ ان ملّاؤں کو انصاف عزیز ہے نہ انسانیت اور نہ ہی دنیا میں اسلام کی عزت۔ ان کے نزدیک اسلام اقتدار اور دولت کے حصول کا نام ہے۔ ان لوگوں کو پیچھے سے 'خفیہ' اور میڈیا میں بیٹھے جہاد پسندوں کی حمایت حاصل ہے۔ ایک طرف سیاسی ملاؤں کے اتحاد ایم ایم اے کو بحال کرنے کی باتیں ہونے لگی ہیں، تو دوسری طرف وفاقی شرعی عدالت نے تحفظِ حقوقِ نسواں کی کچھ دفعات کو ''آئین اور اسلام سے متصادم'' قرار دے کر مذکورہ ایجنڈے کو بڑھانے میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ گویا پارلیمنٹ، جو آئین ساز ہے اور سب قوانین بنانے کی اعلیٰ ترین مجاز اتھارٹی ہے، مذہبی عدالت کے مطابق وہ نہ 'آئین' کو سمجھتی ہے اور نہ 'اسلام' کو۔ اور یہ وہ 'عدالت' ہے جو نظامِ عدل میں بدنام زمانہ آمر کا رائج کیا ہوا متنازعہ اور غیر ضروری پیوند ہے۔ آج کی دنیا کے کسی بھی مہذب سماج کی طرح ملک میں ایک معقول اور آئینی نظامِ عدل موجود ہے جو ہر طرح کے جرائم پر انصاف مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ غیر ضروری، ملّا برانڈ عدالت بنانے کا مقصد ایک ہی تھا، کہ ملک اور قوم کو آگے نہ بڑھنے دیا جائے، انھیں بیکار کی نظریاتی الجھنوں میں باندھ دیا جائے، قوم تہذیب اور سماجی ترقی کی راہ پر ایک قدم آگے بڑھے تو اسے دس قدم پیچھے لے جایا جائے۔ ہم آپس میں لڑتے رہیں، بحثیں کرتے رہیں، تقسیم ہوتے رہیں، جگ ہنسائی کا شکار رہیں۔

عام قوانین کی ایک متعین فہرست ہوتی ہے جس میں ہر جرم اور انصاف کے طریق کار کو صراحت

Scanned with CamScanner

کے ساتھ بیان کیا گیا ہوتا ہے، ہر جرم کی نوعیت اور سزا واضح ہوتی ہے۔ ملک کی مجاز اتھارٹی سے قانون بننے کے بعد ساری قوم نے اس پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ عدالتیں طے شدہ طریق کار اور قوانین کے مطابق اپنا فیصلہ سنا دیتی ہیں۔ اگر وقت گزرنے کے ساتھ یہ محسوس کیا جائے کہ حالات تبدیل ہو گئے ہیں تو قانون ساز عوام کا منتخب ادارہ قوانین میں تبدیلی کا بھی مجاز ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ مہذب انداز جو ساری دنیا نے اپنایا ہوا ہے اور جو پاکستان میں بھی رائج ہے۔ جبکہ 'شرعی' نام کا نظامِ عدل اپنی مربوط شکل میں کہیں موجود ہی نہیں۔ قدیم زمانے میں مختلف حالات میں مختلف لوگوں نے اپنے اپنے حساب اور سمجھ کے مطابق سزائیں مقرر کر دیں، جن پر مسلمان امہ کے مختلف مکاتبِ فکر کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ کس جرم کی کیا سزا ہے، کن حالات میں دینی ہے، زیادہ یا کم دینی ہے، یا جسے جرم کہا جا رہا ہے وہ جرم ہے بھی یا نہیں؟ ہر فرقے اور ہر فقہ کی اپنی اپنی شریعت اور اپنی اپنی وضاحتیں ہیں، اور ان کے اندر بھی بے شمار ضمنی اختلافات ہیں۔ جسے شریعت کہتے ہیں اس میں واضح اور متفقہ شکل میں کچھ بھی موجود نہیں۔ شرعی نظامِ عدل منتشر، متضاد اور قدیم روایات کا پلندا ہے۔ قرونِ وسطٰی کے عہد کی یادگاریں قوم کے پاؤں کی وہ بیڑیاں ہیں جو ہمیں شاید کبھی دنیا کے ساتھ نہ جینے دیں گی اور نہ چلنے دیں گی۔ یہ وہ 'عالمِ دین' ہیں جو پاکستان کی اعلیٰ عدالت کے مشہورِ عام جسٹس منیر کیس میں اسلام کی متفقہ تعریف پیش نہیں کر سکے تھے۔ یہ مولوی سب سے پہلے ایک متفقہ شریعت لے کر آئیں۔ ان کی ساری شریعت کمزور طبقوں، عورتوں اور غیر مسلموں کو دبا کر رکھنے پر ہی خرچ ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ عوام کے ووٹوں سے جیت کر نہیں آ سکتے، لہٰذا یہ اسلام کے نام کو اقتدار کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔ پاکستان میں جس طرح جرنلوں اور ججوں کا کبھی احتساب نہیں ہوا، اسی طرح پیروں، گدی نشین صاحبزادوں، عمامہ اور جبہ و دستار والوں کے وسائل دولت کا بھی احتساب نہیں ہوا۔ کون سا عالمِ دین کتنا انکم ٹیکس دیتا ہے، حکومت کو اس کی فہرست شائع کرنی چاہیے، اور یہ تفصیل کہ زکوٰۃ، خیرات کی تقسیم اور دینی مدرسوں میں کتنی کرپشن ہو رہی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حج اور حاجیوں کو بیچ کھاتے ہیں۔ کس سیاسی مذہبی جماعت کو بیرونی اور خفیہ ذرائع سے کتنی فنڈنگ ہوتی ہے، اس کا حساب لیا جانا چاہیے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیپلز پارٹی کی حکومت کیا رویہ اختیار کرے۔ کیا وہ پھر ملائیت کی خوشنودی کی پالیسی اپنائے، جس طرح بھٹو نے کیا تھا؟ کیا اس طرح بھٹو کا اقتدار بچ گیا تھا؟ کیا اس

کے بھیانک نتائج قوم اور پارٹی نے نہیں بھگتے؟ کیا ہیئتِ حاکمہ اور ملائیت کی خوشنودی کی پالیسی رکھ کر پارٹی عوام کے اندر اعتبار اور طاقت قائم رکھ سکتی ہے؟ تاریخ نے ثابت کیا ہے، ہیئتِ حاکمہ اور ملا کبھی اس سے خوش نہیں ہو سکتے۔ ان کو جب بھی موقع ملے گا، پیپلز پارٹی کے خلاف سازش اور اسے بدنام کریں گے۔ آج بین الاقوامی حالات ایسے ہیں کہ پارٹی کو جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان مولویوں کے سامنے ڈٹ جانا چاہیے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب امریکہ اور مغرب ان مذہبی جماعتوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ آج ترقی یافتہ دنیا کی خواہش ہے کہ ہمارے ملک سے مذہبی انتہا پسندی کا خاتمہ ہو۔ چنانچہ آج سمجھوتے اور سیاسی مصلحتوں کے نام پر پارٹی کے مولویوں کے سامنے جھکنے کا کوئی مطلب نہیں، ورنہ وہ اسی طرح دیوار کے ساتھ لگ جائے گی جس طرح بھٹو کے ساتھ ہوا تھا۔ محض مجہول اقتدار کو اولیت حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ اقتدار کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ وہ ہے اپنے ووٹ بینک کی خوشنودی، منشور پر عمل، عوام کی خدمت۔ اگر ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے، صرف جیسے تیسے کر کے اپنے پانچ سال مکمل کرنے ہیں، تو اس سے عوام میں مایوسی پھیلے گی اور پارٹی بھی کمزور ہوگی۔

ملّائیت کے فروغ میں بزنس کمیونٹی کا کردار

سندھ کے وزیر داخلہ نے کراچی کے چیمبر آف کامرس میں خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ بزنس کمیونٹی ہی ہے جو شدت پسند اور فرقہ واریت پر یقین رکھنے والی مذہبی جماعتوں کو سب سے زیادہ چندہ دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستانی معاشرے میں ملّائیت اور انتہا پسند مذہبی گروہوں کو معاشی طور پر پالنے والا ہمارا تاجر اور صنعتی طبقہ ہی ہے۔ انسانی معاشروں کی سماجی ترقی کی تاریخ بتاتی ہے کہ کسی بھی معاشرے کے سماجی، معاشی اور فکری ترقی کی راہ میں بزنس اور صنعتی طبقے نے ہراول طبقے کے طور پر کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے یورپ میں صنعتی انقلاب آیا تو اس کے سماجی اور فکری ارتقا میں تجارتی اور صنعتی ترقی کا ہی بڑا ہاتھ تھا۔ انھوں نے اپنے سماج کو پاپائیت سے آزاد کرانے میں ان دانشوروں کا ساتھ دیا جو معاشرے کو چرچ سے آزاد کرا رہے تھے، کیونکہ جدید سیکولر اور سائنسی خیالات

Scanned with CamScanner

بزنس کمیونٹی کے مفادات کو بڑھانے میں معاون ہو رہے تھے۔ وہاں کا ابھرتا ہوا کاروباری اور صنعتی طبقہ سمجھتا تھا کہ ملائیت کے ہوتے ہوئے معاشرے ترقی کی طرف گامزن نہیں ہو سکتے۔ ملائیت کا کام سماج کی ترقی میں رکاوٹ بنتا ہوتا ہے۔ وہ معاشروں کو ماضی میں باندھے رکھتے ہیں۔ اگر معاشرے پرانے قبائلی اور جاگیردارانہ قدروں کے ساتھ قائم رہیں تو کاروبار، صنعت، سائنس ترقی نہیں کر سکتی، تعلیم اور تحقیقی عمل فروغ نہیں پا سکتا۔ مذہب سوال اور تنقیدی کلچر کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے۔ مولوی کا فکری نظام ماضی کے ساتھ منجمد ہوتا ہے۔ اس کو پتا ہے، عقل اور سائنس اس کو اڑا کر لے جائے گی۔ لیکن دنیا میں تجارت اور صنعت کا فروغ عقل، سائنس اور جدید تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ عقل اور سائنس سے ہی نئی چیزیں ایجاد ہوں گی۔ نئی چیزوں سے نئی نئی مارکیٹیں وجود میں آتی ہیں اور سماج میں دولت بننے کے عمل میں اضافہ ہوتا ہے، اور یوں تجارتی سرگرمیوں سے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کا منافع اور سرمایہ بڑھتا ہے۔ تجارت کے ساتھ صنعت اور صنعت کے ساتھ تجارت فروغ پاتی ہے، اشیائے صرف میں تنوع پیدا ہوتا ہے، نئی اشیا اور نئے میٹریل ایجاد ہوتے ہیں جس سے معاشرے خوشحال ہوتے ہیں، اور معاشرے خوشحال ہوں تو تجارتی سرگرمیاں تیز ہوتی ہیں۔

منطقی طور پر کاروباری آدمی کے لیے اس کا سرمایہ، منافع اور اس کے کاروبار یا صنعت میں ترقی سب سے افضل ہونی چاہیے۔ کاروبار، تجارت اور صنعتی ترقی کے لیے امن بے حد ضروری ہے۔ کسی پرامن اور ترقی کی خواہش رکھنے والے معاشرے میں ہی کاروباری سرگرمیاں ترقی پا سکتی ہیں، جبکہ ملائیت فی سبیل اللہ فساد کے لیے مشہور ہے۔ مولوی کا کام لوگوں کے ذہنوں کو ماضی اور خیالی دنیا میں منجمد کرنا ہوتا ہے۔ ملائیت اور مذہبیت کو فروغ دینے کا مطلب ہے، ہم معاشرے کو تفرقے اور بدامنی کی طرف لے کر جا رہے ہیں، معاشرے کو پیچھے کی طرف دھکیل رہے ہیں، کیونکہ لامحالہ مولوی حضرات سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ اس ملک میں لاتعداد مذہبی گروہ بن چکے ہیں، جن کے لاکھوں کے حساب سے پیروکار ہیں، جن میں شامل ہونے والوں کی غالب تعداد جاہل، نیم خواندہ اور معاشی طور پر پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والوں پر مشتمل ہوتی ہے، اور بالائی سطح پر ہمارے معاشرے کے امیر لوگ ان مذہبی فرقہ پرستوں اور انتہا پسندوں کو مذہبی عقیدت میں، یا بھیڑ چال میں، یا دباؤ میں آ کر مالی طور پر پال رہے ہیں۔

Scanned with CamScanner

ریاستی اور حکومتی ادارے مولویوں کے آگے بے بس ہوتے چلے گئے اور وہ قانون کی بالادستی اور حکومتی رٹ کو قائم نہ رکھ سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مولوی حضرات اس ملک میں جس طرح کا برتاؤ کریں اور جیسے بھی انتہا پسند متشدد نظریات پھیلائیں، ان پر کوئی کنٹرول نہیں۔ انھیں کھلی چھوٹ ہے، جس گلی اور سڑک کو چاہیں کسی مذہبی اجتماع کے لیے بند کر دیں، جہاں چاہیں ناجائز زمین یا قوانین کے برخلاف مسجد اور مدرسہ بنالیں۔ لاؤڈ سپیکر کے لولے لنگڑے قانون پر مقامی انتظامیہ عمل نہیں کرواتی، اس لیے کہ یہ مان لیا گیا ہے کہ مذہبی لوگوں کو کچھ نہیں کہنا، حتیٰ کہ عام سول قوانین، تہذیبی اصولوں کی پاسداری بھی نہیں کروانی۔ نئی نئی مذہبی جماعتوں اور مذہبی گروہوں کا جنم ہو رہا ہے۔ نئے سے نئے فرقے ایجاد ہو رہے ہیں اور ان کے لاکھوں پیروکار بن رہے ہیں۔ اس سارے عمل میں ریاستی ادارے ان کی مدد اور سہولتیں فراہم کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ سرکاری عملے کی 'خدمات' ہیں جو کسی اور سماجی یا ثقافتی اور تعلیمی تنظیموں کو میسر نہیں ہوتیں، بلکہ ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں؛ وہ بیچارے مہذبانہ طریقے سے متعلقہ حکام سے اجازت مانگتے ہیں جو اکثر اوقات مسترد کر دی جاتی ہے۔ لیکن اگر سوال مذہبی اجتماع کا ہو، خواہ وہ کتنا ہی متشدد اور فرقہ وارانہ گروہ کا ہو، وہاں سب ادارے اور عام عوام تعاون کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بدمعاشی، زور آوری کا کلچر فروغ پا رہا ہے۔ مذہبی گروہ کسی بھی قانون، اصول اور سماجی ذمے داریوں سے ماورا ہو جاتے ہیں۔ مذہبیت کے فروغ سے ہم کوئی اچھے انسان نہیں بن رہے۔ منافقت، کاہلی اور جہالت پھیل رہی ہے۔ ہم تہذیب کے ارتقائی عمل کو کھو رہے ہیں اور جنگل کے قانون کو فروغ دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں تجارتی سرگرمیوں، غیر ملکی سرمایہ کاری اور صنعتی ترقی کا عمل رک گیا ہے۔

آج ہمارا ملک جس طرح دہشت گردی، پسماندگی اور معاشی بحرانوں کا شکار ہے، اس کی بہت سی ذمے داری ہمارے تجارتی اور صنعتی طبقے پر بھی آتی ہے۔ ان کو مذہبی گروہوں کی سرپرستی ترک کر دینی چاہیے۔ پاکستان تبھی حالیہ بحران سے نجات پا سکتا ہے کہ ہمارا دولت مند طبقہ اپنے تاریخی شعور سے کام لے۔ اسے سوچنا ہوگا کہ اس ملک کی معاشی بربادی میں خود اس کا کتنا ہاتھ ہے۔

Scanned with CamScanner

1965: ایک روشن باب؟

وزیراعظم گیلانی نے قوم کے نام اپنی 17 اکتوبر کی تقریر میں 1965 کو قوم کے ایک روشن باب سے تعبیر کیا۔ یہ بات سمجھ سے بالا ہے کہ اس تقریر کے سیاق وسباق اور موجود سیاسی تناظر میں 1965 کا کیا تک تھا؟ ہمارے مقتدر رہنماؤں کے ہاں بھی کیسے کیسے جید تقریر نویس بھرتی ہوتے ہیں! تقریر کا موقع محل کیا تھا، زیر نظر مسائل کیا تھے، لیکن سارے تناظر کے علی الرغم 1965 کا ایک بے تکا حوالہ ڈال دیا اور اسے قوم کا 'روشن باب' بھی کہہ دیا۔ معاف کیجیے گا، ہم نے پہلے ہی نصابی کتابوں میں تاریخ کو مسخ کر رکھا ہے اور اس کے بھیانک نتائج بھی دیکھ رہے ہیں۔ قومیں سچ کو مسخ کر کے ترقی نہیں کر سکتیں۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ ہماری قوم نسل در نسل مسخ شدہ حقائق لے کر جوان ہوتی ہے، چنانچہ وہ زندگی اور دنیا کو اپنی اصل صورت میں سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ ہیئت مقدرہ کے مفادات کی خاطر قوم کی یادداشت بدلنے میں ہم نے کمال درک پایا ہے۔

1965 کو قوم کا 'روشن باب' نہیں کہہ سکتے۔ وہ تو ایک جنرل نے تاحیات قوم کا صدر رہنے کے لیے احمقانہ عسکری مہم جوئی کی تھی۔ اس کے نتیجے میں قوم اور ملک پر ایک بہت بڑا المیہ نازل ہوا۔ میں اس وقت سیالکوٹ میں چھٹی کلاس میں پڑھنے والا بچہ تھا۔ میرے جیسے اس ملک کے کروڑوں معصوم بچے دہشت اور خوف سے آشنا ہوئے۔ دن رات لڑاکا طیاروں کی گڑگڑاہٹ، گرمیوں کی راتیں اور اس پر بلیک آؤٹ، رضا کاروں کی ٹولیاں، گھروں کے اندر اور باہر کھلی جگہوں میں خندقوں کی کھدائی، قریبی سرحدی علاقوں سے کوندتی چمک اور بھاری توپوں کی خوفناک گونجوں سے، ہم واقف ہوئے۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب ہمارے پورے محلے کے مرد بچوں اور عورتوں نے کئی راتیں قریبی پارک میں کھلے آسمان تلے گزاریں۔ ہر لمحے موت کا خوف اور سیالکوٹ پر دشمن کے قبضے کا ڈر۔ دشمن کے جہاز آتے، سائرن تو بجا دیے جاتے لیکن دشمن کے طیارے بڑے اطمینان سے بم پھینک کر واپس چلے جاتے، اور بہت دیر بعد ہمارے طیارے نمودار ہوتے۔ لاہور اور سیالکوٹ کے سرحدی علاقوں کے لاکھوں بے گناہ لوگوں کو اپنے گھر، کھیت اور فصلیں چھوڑنا پڑیں۔ ان لٹے پٹے لوگوں کے نہ ختم ہونے والے قافلے بیل گاڑیوں میں شہروں کی طرف آتے تھے۔ پھر ایک دن سارا سیالکوٹ شہر

Scanned with CamScanner

خالی ہو گیا۔ ساری سرکاری انتظامیہ بھاگ گئی۔ ہندوستان کی فوج شہر کے قریب پہنچ چکی تھی۔ شہر کے لاکھوں لوگ کیسے شہر کو خالی کر کے کن رشتے داروں کے پاس جا کر ٹھہرے ہوں گے؟ سیالکوٹ کے عین مرکز میں پانچ سو پاؤنڈ وزنی بم پھینکا گیا۔ اُدھر لاہور کا یہی عالم تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہنستا بستا ملک صرف ایک جنرل کی وجہ سے خوفناک جنگ میں جھونک دیا گیا تھا۔ پاکستان کے چار ہزار فوجی شہید ہوئے۔ انھوں نے وطن کی خاطر اپنی جانیں بڑی دلیری سے وار دیں۔

یہ سوال ابھی تشنۂ جواب ہیں کہ پاکستانی قوم کے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا؛ بیٹھے بٹھائے قوم کو ایک خطرناک جنگ میں کیوں جھونک دیا گیا؛ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے کشمیر فتح کرنے کا منصوبہ بنایا؛ اس مہم جوئی کا مطلب کیا تھا؟ پاکستان کی معیشت کے کلیدی اشاریے مثبت جا رہے تھے۔ سیاسی مسائل ضرور تھے لیکن پاکستان ترقی بھی کر رہا تھا۔ ایک ترقی پذیر اور پرامن ملک کو اچانک جنگ میں جھونک دینے کا فیصلہ کس کا تھا؟ وہ فوجی کمانڈر کون تھے جنھوں نے ناقص جنگی پلان تیار کیے؟ عین لڑائی کے دوران سیالکوٹ کے ایک ایسے کمانڈر کو جو نامساعد حالات کے باوجود اچھی حکمت عملی سے لڑ رہا تھا، اچانک واپس کیوں بلایا گیا؟ ان امور کا تفصیلی تذکرہ اس وقت کے فوجی افسران نے اپنی سوانح عمریوں میں کیا ہے۔ آخر ہماری قیادت یہ کیسے سمجھ بیٹھی کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد پار کر کے پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا؟ لاہور اور سیالکوٹ کے دفاع کا کوئی بندوبست کیوں نہیں کیا گیا؟ اچانک کشمیر جہاد کس نے شروع کیا اور کیوں؟ اس مہم جوئی سے ہمیں کیا ملا؟

افسوس کا مقام یہ ہے کہ قوم اور عسکری قیادت نے اپنی غلطیوں کا تنقیدی جائزہ لینے کے بجائے اس واقعے سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اس قومی سانحے کو ذرائع ابلاغ اور نصابی کتابوں میں فتح کی علامت اور قوم کا 'روشن باب' بنا دیا گیا۔ کسی قوم کے روشن باب کیا ایسے ہوتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ 1965 کی جنگ ایک ایسا واقعہ تھا جیسے پاکستان کو کسی نے پہاڑ کی اونچائی سے لڑھکا دیا ہو۔ پھر پاکستان معاشی اور سیاسی طور پر نیچے ہی نیچے جاتا رہا۔ 65 کی جنگ نے بھارت دشمنی میں اضافہ کیا چنانچہ ہمیں ہندو دشمنی کے جذبات کو بروئے کار لانا پڑا۔ رواداری اور پرامن اسلام کا تصور ہمارے ملک سے رخصت ہو گیا، چنانچہ تعصب اور مذہبی شدت پسندی کو فروغ دیا گیا جس نے ملک کو تعلیمی، معاشی، صنعتی ترقی کے راستے سے اچانک موڑ کر جنگ میں جھونک دیا۔ ملک سیاسی بحرانوں کی منجدھار میں پھنس گیا۔ ایک اور مارشل لا لگا۔ سیاسی افراتفری میں اضافہ ہوا۔۔۔ اور پھر مشرقی پاکستان

Scanned with CamScanner

ہم سے جدا ہو گیا۔ ہمارے حکمرانوں کی حماقتوں اور استحصالی پالیسیوں کے ساتھ ہندوستان نے بھی اس میں اپنا حصہ ڈالا۔ اگر ہم نے بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے ہوتے تو انڈیا وہ کردار ادا نہ کر سکتا جو اس نے 1971 میں ادا کیا۔

65 اور 71 کی جنگوں نے ہماری ملک کو فلاحی ریاست سے سکیورٹی ریاست میں بدل دیا۔ اس کے بعد ہم قوم کو ہر وقت ٹینکوں، توپوں، میزائلوں اور راکٹوں کی کہانیاں سناتے رہے۔ اب حال یہ ہے کہ ہماری قوم مجموعی طور پر جنگی جنونیت کے ساتھ مذہبی جنونیت کی طرف سفر کر چکی ہے۔ بہتر ہو گا کہ اب اس ملک کو سچائی کی طرف واپس لایا جائے، خواہ سچائی کا ذائقہ کیسا ہی کڑوا کیوں نہ ہو۔ اگر ہمیں واقعی اس ملک سے محبت ہے تو ہمیں مفروضہ 'قومی مفاد' میں جھوٹ بولنا بند کرنا چاہیے۔ قوم کو جعلی 'روشن باب' کے قصے سنا کر نئی نسل کو گمراہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

پاکستان کے آدھا ہونے کا دن

کچھ برس پہلے مجھے انڈیا جانے کا اتفاق ہوا۔ بیرونی ممالک میں میوزیم اور آرٹس گیلریاں دیکھنے کا شوق ہے۔ اسی شوق تلے نئی دہلی کے ایک میوزیم میں چلا گیا۔ اس کے مختلف کمروں میں ہندوستان کی تہذیب اور تاریخ کی کہانی کو تجسس اور دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک ہال میرے سامنے آ گیا جو پاک بھارت کی 1971 کی جنگ میں ہماری شکستِ فاش اور ہمارے فوجیوں کے ہتھیار پھینکنے سے متعلق تھا۔ میرا دل بیٹھ گیا اور رنگ فق ہو گیا۔ 'دشمن' ملک کے اندر میرے ہی وطن کی شرمناک کہانی میرے سامنے ہو گی، میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے پشیمانی کے عالم میں، دیگر لوگوں سے نظریں چرائے، ہال کو دیکھنا شروع کیا کہ کہیں کسی کو پتا نہ چلے کہ میں پاکستانی ہوں۔ بھارت نے اپنی فتح اور برتری کے نقطہ نظر سے اس سارے واقعے کو بیان کیا ہوا تھا۔ وہاں ہمارے 'شیر' جنرل نیازی کے بھارتی جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار پھینکنے کی رسم کی دیواری سائز کی تصویر لگی تھی اور سرنڈر معاہدے کا متن لکھا ہوا تھا۔

Scanned with CamScanner

ہم سب پاکستانیوں کے لیے وہ واقعہ بڑا المناک تھا۔ تاریخ بتاتی ہے، جب ایسے بڑے سانحے کسی قوم پر واقع ہوں تو وہ قوموں کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ لیکن ہماری قوم اور ہماری ہیئتِ حاکمہ 'پتھر ہضم لکڑ ہضم' قسم کے واقع ہوے ہیں۔ حرام ہے جو انھوں نے کچھ سیکھا ہو یا اپنی آنے والی نسلوں کو کسی سیاسی خامی، کرداری کمی، ناقص فوجی مہمات، اپنی اقتدار اور دولت کی ہوس کی بھنک پڑنے دی ہو۔ سارا الزام مشرقی پاکستان کے عوام کی نسلی خرابی (کیونکہ وہ اچھے غلام ثابت نہ ہوے) اور مجیب الرحمان کی غداری، مکتی باہنی، بھارتی فوجی مداخلت اور عالمی سازش کے سر منڈھ دیا۔ لہٰذا (مغربی) پاکستان آبِ زم زم سے نہا گیا۔ 'مطالعۂ پاکستان' بڑی کام کی چیز ہے۔ تاریخ کو اپنی مرضی منشا کے مطابق بیان کرتے جاؤ، آنے والی نسلوں سے جھوٹ بولتے جاؤ، انھیں ایک جعلی تاریخ پڑھاتے جاؤ۔ چنانچہ ہیئتِ حاکمہ کا وہی موج میلہ ہے اور اس کی وہی آن بان ہے۔

گنز بک آف ورلڈ ریکارڈز کے مطابق بیسویں صدی کے پانچ سب سے بڑے نسل کشی اور قتل عام کے واقعات میں **1971** کا مغربی پاکستان کی آرمی کا آپریشن شامل ہے۔ 25 مارچ، آپریشن کی پہلی رات، ڈھاکہ میں کم از کم سات ہزار لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ ڈھاکہ کی یونیورسٹی طلبا کی لاشوں سے پٹ گئی۔ چند دنوں میں تیس ہزار لوگ صرف ڈھاکہ میں قتل ہوے، اور شہر کی آدھی سے زیادہ آبادی شہر چھوڑ کر چلی گئی۔ ایک مہینے کے اندر تین کروڑ بنگالی اپنے ہی وطن میں بے گھر ہو چکے تھے، جن میں ایک کروڑ لوگ ہندوستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے جس کے نتیجے میں مغربی پاکستان کے خونی حکمرانوں سے اپنے ملک کی آزادی کے لیے 'مکتی باہنی' تشکیل پاتی ہے۔ قتل عام کا آغاز ایسٹ پاکستان رجمنٹ، ایسٹ بنگال رائفل، پولیس، دیگر پیرا ملٹری فورسز اور باغی سویلین عناصر سے ہوا۔ پاک آرمی میں تمام بنگالی فوجیوں سے ہتھیار واپس لے لیے گئے۔ سب سے بڑی سیاسی پارٹی عوامی لیگ جو پاکستان کے ایک منصفانہ الیکشن میں اکثریتی پارٹی بن کر ابھری تھی، اس کے تمام عہدیدار، پارٹی ورکر، یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبا اور طالبات غدار قرار پائے۔ آخری دنوں میں اس قتل عام کا نشانہ مشرقی پاکستان کے بنگالی دانشوروں، ادیبوں، سائنس دانوں، پروفیسروں اور اساتذہ کو بنایا گیا۔ ہماری آرمی کو پالیسی ہدایات دی گئیں کہ بنگالی ناقابلِ اعتبار اور کمتر نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان پر مغربی پاکستان کے لوگوں کی حکمرانی ہونی چاہیے۔ 'فتح' کے بعد ان کو 'اسلامی

Scanned with CamScanner

تعلیمات' دی جائیں، 'اسلامائزیشن' کا عمل شروع کیا جائے تاکہ یہ قوم پرستی اور اپنے حقوق کو بھول جائیں اور مغربی پاکستان کے ساتھ 'اسلامی اخوت' کے جذبے سے جڑے رہیں۔ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کو قتل کر دیا جائے یا انھیں بھارت جانے پر مجبور کر دیا جائے۔ ان کے چھوڑے ہوئے 'مالِ غنیمت' کو بطورِ رشوت ان لوئر مڈل کلاس بنگالیوں میں بانٹ دیا جائے جو خریدے جاسکتے ہوں، تاکہ مغربی پاکستان نواز ایک حصہ بنا کر انتظامی معاملات میں ان سے مدد لی جائے۔ بنگلہ دیشی حکام کے مطابق تیس لاکھ لوگ قتل ہوئے، جبکہ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے مطابق باسٹھ ہزار لوگ قتل کیے گئے، لیکن غیر جانبدار اعداد کے مطابق کم از کم دس لاکھ بنگالیوں کو قتل کیا گیا اور ان گنت عورتوں کو ریپ کرنے کا الزام اس وقت کی ہماری آرمی پر ہے۔ اس کی تصدیق دنیا بھر کی خبر رساں ایجنسیاں، فرانس، یورپ، برطانیہ اور امریکہ کے اس وقت کے اخبارات اور جرائد کرتے ہیں اور وہ کتابیں بھی جو اس موضوع پر یورپ میں لکھی گئیں۔ جنرل یحییٰ خان کی مارشل لا حکومت میں دنیا کی ایک مسلمان فوج نے مسلمان عوام کے ساتھ وہ کچھ کیا جس کے مقابلے میں تقسیم ہند کے خونریز واقعات ہیچ نظر آتے ہیں، اس لیے کہ وہ ہنگامے بے ہنگم اور از خود ہوئے تھے، جبکہ یہاں سب کچھ سوچی سمجھی پالیسی کے تحت، ایک منظم آرمی کی طرف سے اپنے ہی عوام کے ساتھ کیا گیا۔ جنرل نیازی نے کہا کہ "یہ زمین بھی نشیبی ہے، اور اس کے باسی بھی نچلی فطرت کے ہیں؛" لہٰذا اس قابل ہیں کہ انھیں مار دیا جائے اور ان پر بزور حکمرانی کی جائے۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے مطابق عورتوں کو ریپ کیا گیا۔ ہمارے فوجی شرابیں پی کر بنگالی عورتوں کو اپنی تفریح کا سامان بناتے تھے۔ کمیشن نے سفارش کی کہ فوج کے اعلیٰ ملوث کمانڈروں کو کورٹ مارشل کیا جائے، جو کبھی نہ ہو سکا۔ رپورٹ غائب کر دی گئی۔ جنرل یحییٰ اور جنرل نیازی کو فوجی اعزازات کے ساتھ دفن کیا گیا۔ اس سارے المیے کے دوران ہمارے آرمی چیف جنرل یحییٰ خان نے شراب نوشی اور زناکاری کے ریکارڈ قائم کیے، اور جماعت اسلامی کے ساتھ مل کر وہ قوم کو 'اسلامی نظام' اور 'نظریۂ پاکستان' بھی پڑھوا رہے تھے۔ ہم پاکستانیوں نے بنگالی عوام کو کبھی اپنا نہ سمجھا، انھیں شرکتِ اقتدار میں شامل نہ ہونے دیا۔ اس ملک کو فوجی مداخلت، ضرورت سے زیادہ اسلام پر زور اور مرکزیت تباہ کر گئی ہے۔ مطالعۂ پاکستان کے ذریعے اس ملک کی آنے والی نسلوں کو گمراہ مت کیجیے، ورنہ تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرانے کے سوا کچھ نہ کرے گی۔

Scanned with CamScanner

'اصلی' بلوچستان پیکیج سامنے آ گیا!

ہماری جمہوری حکومت کے وزیر داخلہ نے ایجنسیوں کی پے در پے رپورٹوں کے زیر اثر بلوچستان پر ایک ایسا آپریشن کرنے کا نعرہ مستانہ لگا دیا ہے، جس طرح سوات کے طالبان کو قابو پانے کے لیے کیا گیا تھا۔ انھیں بلوچستان کے عوام اور طالبان میں فرق ہی نظر نہیں آیا۔ کئی سال پہلے اسی طرح کی ایک کاوش 'باغی' اور 'غدار' مشرقی پاکستان کے عوام کے خلاف بھی کی گئی تھی اور نتیجہ یہ ہوا کہ نقشے سے آدھا پاکستان غائب تھا! موجودہ حکومت نے بڑے دھوم دھڑکے کے ساتھ 'آغازِ حقوقِ بلوچستان' کے بینر تلے ایک 'بلوچستان پیکیج' کا پچھلے سال اعلان کیا تھا۔ ہمارے کئی دوست تھے جنھوں نے 'آغازِ حقوقِ بلوچستان' ٹائٹل پر بہت سر دھنا۔ واہ! سویلین جمہوری حکومت نے کیا الفاظ استعمال کیے ہیں اور کیا معرکہ مار دیا ہے! گویا اب بلوچ عوام کی تریسٹھ سالہ محرومی اور قومی جبر کے خاتمے کی ایک ریاستی اور حکومتی کوشش شروع ہو گئی ہے۔ پاکستان فیڈریشن کا ایک اور مسئلہ حل ہونے لگا ہے۔ لیکن کچھ دوست تھے جنھوں نے اس پیکیج پر فقط معنی خیز سی مسکراہٹ دے دی۔ سوال یہ تھا، کیا کوئی نیا پاکستان بننے والا ہے؟ کیا کوئی نیا سوشل کنٹریکٹ تشکیل دیا جانے والا ہے؟ کیا ہماری سلامتی اور ایجنسیوں کی اسٹیبلشمنٹ کی کوئی کایا پلٹ ہو گئی ہے؟ کیا فیصلے کرنے کے اختیارات عوام کو سچ مچ منتقل کیے جا رہے ہیں؟

جہاں تک 'آغازِ حقوقِ بلوچستان' کی خوبصورت لفظ گری کی بات تھی، ہماری بیوروکریسی میں بڑے کمال کے فنکار بیٹھے ہوئے ہیں، اس طرح کی لفاظی اور اس طرح کے چمکتے دمکتے ڈاکومنٹ تشکیل دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ وہ کسی بھی باس کے لیے اس کا من پسند ڈرافٹ تحریر کر سکتے ہیں۔ آخر یہ فر فر انگریزی بولنے والے بابو بڑے بڑے گریڈ اور اعلیٰ مراعات کس لیے لیتے ہیں! اور جہاں تک مذکورہ پیکیج پر عملدرآمد اور اس سے کسی طرح کے مثبت نتائج نکلنے کی امید تھی، وہ اسی وقت ٹھس ہو گئی تھی جب خود وزیر اعظم بیچارے اس پیکیج پر بڑی دیر تک عملدرآمد کی اپیلیں کرتے نظر آئے، اور جب بلوچ رہنماؤں نے کھل کے کہہ دیا کہ یہ پیکج اس وقت تک فضول ہے جب تک فیڈریشن کی طرف سے

Scanned with CamScanner

'حقوق' کے پیکٹ میں 'بھیک' دیتی فکر کارفرما رہتی ہے۔ بلوچستان میں بنیادی لڑائی بلوچستان کے وسائل پر بلوچ عوام کو اختیار دینا اور ان کا سب سے پہلا فائدہ بلوچ عوام کے لیے مختص کرنا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان ایک نام کی فیڈریشن ہے۔ اس کو کنٹرول کرنے والی ہیئتِ مقتدرہ کو فیڈریشن کے معنی ہی نہیں آتے، یا وہ اپنے مفادات کے لیے اسے سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ اور مزید بدقسمتی کی بات ہے، انھوں نے غلط پروپیگنڈے کے زور پر پنجاب کے عام آدمی کے ذہن کو اپنے ساتھ ملا لیا ہوا ہے۔ ہماری حکمران ایلیٹ بنیادی طور پر آمرانہ ذہنیت کی حامل ہے، جو مرکز سے 'قبضہ اور کنٹرول' پر یقین رکھتی ہے۔ وہ عوام کو جاہل اور بے وقوف سمجھتی ہے اور ان کی حب الوطنی پر بھروسا کرنے کو کبھی تیار نہیں ہوئی۔ وہ حکمرانی میں عوام کی شرکت کو بغاوت خیال کرتی ہے۔ انھیں اس میں 'خطرہ' نظر آتا ہے، کہ اس طرح ملک انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔ وہ ملکی انتظام بھی فوجی طرز کے 'کمانڈ اینڈ کنٹرول' سے رکھنا چاہتے ہیں اور اسے قومی اتحاد اور یک جہتی کی علامت سمجھتے ہیں، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان کی اس سوچ کی وجہ سے مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوا تھا، اور اسی سوچ کی وجہ سے ملک ایک بار پھر ہر طرح کے انتشار اور افتراق کا شکار ہے اور اوپر سے لے کر نیچے تک سب پاکستان کے ایک ملک کے طور پر برقرار رہنے میں تشویش کا شکار ہو چکے ہیں۔ حیرت کی بات ہے، ہماری ہیئتِ مقتدرہ ڈھٹائی کے ساتھ اپنی رائج شدہ اور طے شدہ پالیسیوں کے دیوالیہ پن کو نہیں دیکھ پا رہی۔ نہ یہ قوم کے سامنے شرمندہ ہیں اور نہ یہ اپنی کارکردگی کی بیلنس شیٹ دیکھتے ہیں۔ مسائل اس وقت تک حل ہونے والے نہیں جب تک ہم مسائل پر مختصر گروہ کے مفادات کی بجائے ملک اور قوم کے وسیع تر مفادات سے نہیں سوچیں گے۔ ہمیں بنیادی طور پر اپنے اندر سے تبدیل ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ 'پاکستان' پہلے تھا، یا پہلے ہے، اور صوبے یا فیڈرل یونٹس بعد میں۔ پاکستان نے یہ صوبے نہیں بنائے؛ ان صوبوں نے پاکستان کو بنایا تھا، اور بنایا ہوا ہے۔ 'پاکستان' ایک تجرید کا نام ہے، وہ ٹھوس حالت میں کہیں نہیں پایا جاتا، جبکہ صوبے اپنا ٹھوس، دکھائی دینے والا وجود رکھتے ہیں۔ یہ بلوچستان ہے، یہ پختونخوا ہے، یہ پنجاب ہے، یہ سندھ ہے۔ کوئی 'پاکستان' کو یوں نہیں دکھا سکتا۔ جب آپ کسی کو پاکستان دکھائیں گے تو آپ چاروں میں سے کسی ایک صوبے کو دکھا رہے ہوں گے۔ وہ اول و آخر حقیقت ہیں۔ چنانچہ ہمیں اس ننگی حقیقت کی طرف لوٹ آنا چاہیے کہ صوبوں نے پاکستان بنایا ہوا

Scanned with CamScanner

ہے اور صوبوں کے مشترک ہونے کا نام پاکستان ہے۔ پاکستان 'دیتا' نہیں، 'لیتا' ہے، اور اس کو فیڈرل یونٹس کی مرضی کے مطابق ہی لینا چاہیے۔ بلوچستان کی قیادت اور بلوچ نوجوان نسل کہتی ہے، ہمیں خیرات دینا بند کریں۔ انھی کے وسائل پر قبضہ کر کے ان کی طرف چند سکے پھینک دینا اب انھیں مزید قبول نہیں۔ وہ پاکستانی ریاست کے خلاف نہیں ہیں لیکن ہم اپنے رویے کی وجہ سے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر رہے ہیں، جیسے ہم نے مشرقی بنگال کے عوام کے ساتھ کیا تھا۔ بھٹو دور میں پیپلز پارٹی کی حکومت بلوچستان پر بمباری کروا چکی ہے۔ اسے اب کسی ریاستی ادارے کے ورغلانے میں نہیں آنا چاہیے، ورنہ یہ کسی بھی جمہوری کہلوانے والی حکومت کے اپنا منھ ہی کالا کرنے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ پاکستان کو قائم رکھنا ہے تو بلوچستان کے عوام کے بلا مشروط فوری مطالبے تسلیم کیے جائیں۔ ورنہ وقت کی تعزیریں بڑی سخت ہوتی ہیں۔

بلوچستان کا ساتھ دو

میری عمر کے لوگوں کا تعلق اس نسل سے ہے جس نے پاکستان کو دولخت ہوتے دیکھا ہے۔ اور وہ واقعہ اس وقت ہوا تھا جب عساکرِ پاکستان اس ملک کی سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔ ہماری دفاعی صلاحیتوں کے ناقابلِ تسخیر ہونے کی آواز میری نسل کو پیدا ہوتے ہی کان میں ڈال دی گئی تھی لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے پاکستان کا ایک بڑا حصہ خونریز ڈرامے کے بعد الگ ہو گیا۔ ہماری 'محبِ وطن، بے مثال اہلیت رکھنے والی، دیانت و کردار کی پیکر، ناقابلِ شکست سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ' نہ پاکستان کے اتحاد کو قائم رکھ سکی، نہ امن دے سکی اور نہ ترقی۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے انکشافات ہمارے چہرے پر ایک بدنما داغ کی صورت میں موجود ہیں، لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ کا یہ المناک پہلو جاری و ساری ہے۔ پاکستان کی دفاعی اور سلامتی کی اسٹیبلشمنٹ کو سب سے زیادہ سمجھدار، محبِ وطن اور محافظِ وطن ہونے کا زعم رہا ہے، لہٰذا اسلامتی کے نام پر اپنے مینڈیٹ سے بڑھ کر اس نے وہ ذمے داریاں بھی لے لیں جنھیں عوام اور ان کی سیاسی قیادت کے حصے میں آنا چاہیے تھا۔ جغرافیائی سرحدوں

Scanned with CamScanner

کے ساتھ نظریاتی اور سیاسی 'ورچوئل سرحدیں' بھی جنرلوں کے پاس چلی گئیں۔ عوام کی سیاسی قیادت کو عام طور پر کرپٹ، نااہل، غیر محب وطن اور غدار کہہ کر تذلیل کی جاتی رہی ہے۔ بنگالی پاکستانی فوج کو 'پنجابی فوج' اور پاکستان کو 'پنجابیوں کا پاکستان' کہا کرتے تھے۔ بلوچستان میں آج تک جو ہوتا آیا ہے اور جو ہو رہا ہے، میری نسل کے لوگوں کو مشرقی پاکستان سے مشابہ کہانی اور واقعات کی فلم دہرائے جانے کا گماں ہو رہا ہے۔ آج بلوچستان میں پاک فوج کا مطلب پنجابی فوج ہے۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والے اساتذہ، ڈاکٹروں، کاروباری لوگوں اور دیگر ملازمین کو مارا جا رہا ہے۔ وہ اپنے گھر بار اونے پونے داموں بیچ کر پنجاب واپس آ رہے ہیں۔ کوئٹہ میں کئی دہائیوں سے رہنے والے پنجابیوں کی جان مال محفوظ نہیں رہی۔ بلوچستان ایک چھاؤنی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ہماری سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کے پاس وہی پرانا علاج ہے کہ بلوچستان میں چھاؤنیوں کا جال پھیلا دیا جائے اور فوجی طاقت کے ذریعے ان بھٹکے ہوئے بلوچوں کو سیدھا کیا جائے۔ ظاہر ہے، فوجی ذہن توپ اور بندوق سے آگے سوچ نہیں سکتا۔ سمجھا جا رہا ہے کہ فوج میں کچھ ہزار بلوچی بھرتی کرنے سے ملک کی یک جہتی قائم رکھی جا سکے گی، لیکن بغاوت کے وقت ایسٹ بنگال رجمنٹ کے ساتھ جو ہوا تھا وہ ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔ چنانچہ عرصے سے بلوچستان میں ہر طرح کی سکیورٹی ایجنسیوں کا راج ہے۔ اُدھر ایران، افغانستان، امریکہ، ہندوستان، طالبان، سبھی بلوچستان میں اپنے اپنے مفادات کے کھیل کھیل رہے ہیں۔ بلوچ نوجوان نسل پاکستان سے اپنی مایوسی کا برملا اظہار کرتی ہے۔ جس تعلیمی مدرسے میں پاکستان کا جھنڈا اور ترانہ گایا جائے، اسے دھمکی کے خط آ جاتے ہیں اور متعلقہ اساتذہ کو قتل بھی کیا گیا ہے۔ بلوچ عوام کو شدت سے شعور ہے کہ ان کا دیس معدنیات کی دولت سے مالا مال ہے اور وہ اپنے اوپر ایک نو آبادتی جبر کی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ بلوچستان کے عوام انتہائی پسماندگی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

چند دن پہلے شاہ زین بگٹی کو جس کہانی کے ساتھ اور جس طرح گرفتار کرتے دکھایا گیا ہے، چاہے الزام سچ بھی ہو، بلوچستان کے تناظر میں اس کارروائی کو کوئی قبول نہیں کرے گا، جبکہ شاہ زین کے بیان کے مطابق یہ ویسے ہی ایجنسیوں کی خود ساختہ کارروائی ہے۔ یہ ملک اس طرح کے اسلحے سے بھرا ہوا ہے، اور کون نہیں جانتا، اس طرح کے اسلحے ان جیسے طاقتور سیاسی خانوادوں کے پاس ویسے ہی ہوتے ہیں۔ اس طرح کے ریاستی اداروں کی 'کارروائیوں' سے بلوچستان میں کئی اور عجیب

الرحمٰن بننے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مشرقی پاکستان کے ساتھ اسی مغربی پاکستان نے جو کچھ کیا تھا، اس سے پنجاب کے عوام نے مجرمانہ غفلت برتی تھی اور اپنی سلامتی کی اسٹیبلشمنٹ کا ساتھ دیا تھا جس کا نتیجہ مشرقی پاکستان میں پنجابیوں کے قتل عام اور ملک کے ٹوٹنے کی صورت میں ہوا۔ ہمارا ایک 'محب وطن' جنرل، اکبر بگٹی کو کھلے عام قتل کی دھمکی دے کر، اس پر عمل کروا کر، ملک سے بھاگ چکا ہے۔ اکبر بگٹی کا قتل ایک غدار کا قتل نہیں تھا، وہ اس ملک کی یک جہتی کا قتل تھا۔ اس بار خصوصی طور پر پنجاب کے عوام کو اپنی آنکھیں کھلی اور کان ہوشیار رکھنے ہوں گے، ورنہ تاریخ کی ساری غلاظت پنجاب کے اوپر گرنے والی ہے۔ پنجابیوں کو پاکستان ہمیشہ سے بڑا پیارا رہا ہے۔ یہی پاکستان کے سب سے بڑے دعوے دار رہے ہیں۔ کراچی کی اردو بولنے والی ایلیٹ کے ساتھ پنجابی ہی پاکستان کی بقا اور سلامتی 'ایک دین اور ایک زبان' کے فارمولے پر رکھتے رہے ہیں۔ وقت نے ثابت کیا، یہ سب بیکار کے ڈھکوسلے تھے۔ ہم خود کو اور مغلوب قومیتوں کو دھوکا دے رہے تھے۔ پاکستان حکمران ایلیٹ کے ایک پرانے حصے دار کی نمائندہ قیادت جناب الطاف حسین نے برملا اس واقعے کی مذمت کر دی ہے اور شاہ زین کو فوراً رہا کرنے کو کہا ہے۔ گویا سکیورٹی ایجنسیوں اور دفاعی اسٹیبلشمنٹ کی بلوچستان میں جاری پالیسیوں میں اب صرف پنجاب ہی اکیلا حصہ دار رہ گیا ہے۔

پنجاب کے عوام اور پنجاب کی دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں، پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نون، کو بلوچستان کے معاملات کو فوری طور پر سیاسی قوتوں کے ہاتھ میں دینے کی حمایت کرنی چاہیے۔ اس ملک کو چھاؤنیوں سے نہ قائم رکھا جا سکتا ہے نہ کبھی یوں اس ملک کی ترقی ہو پائے گی۔ دفاعی اسٹیبلشمنٹ کا صرف اتنا کردار ہونا چاہیے جو آئین کے مطابق ہے اور جو ہر مہذب ملک میں ہوتا ہے۔ 'حب الوطنی اور یک جہتی' کے شوق جنوں میں پاکستان کو ایک بار کسی بڑے سانحے کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ 'بیرونی مداخلت' کا ورد بند ہونا چاہیے۔ ہمیں ماننا چاہیے، ہم خود ہی سب سے پہلے اپنے ملک کو برباد کرنے کے ذمے دار ہیں، اور سب سے زیادہ اسی کی ذمے داری بنتی ہے جو سب سے زیادہ طاقتور تھا، جس کی پالیسیوں کے بنانے اور نفاذ میں سب سے زیادہ مداخلت رہی ہے۔ پنجابیوں کو بلوچستان کے عوام کے ساتھ اپنی یک جہتی میں اٹھ کھڑے ہونا چاہیے۔ ہماری اسٹیبلشمنٹ نے مشرقی پاکستان کے ساتھ جو کیا تھا، وہ اب کسی اور پاکستانی قومیت کے ساتھ دہرانے نہیں دیں گے۔

Scanned with CamScanner

بلوچستان مسئلے کے کچھ اور پہلو

کچھ روز پہلے میرے کالم ''بلوچستان کا ساتھ دو'' شائع ہونے پر کچھ ایسے پہلوؤں کی طرف قارئین نے اشارہ کیا ہے جن پر میرے خیال میں مزید وضاحت سے بات کرنی ضروری ہے۔ ہمارے ہاں ایک متھ بڑی مشہور ہے کہ بلوچستان میں ترقی کے عمل میں بلوچ سردار رکاوٹ ہیں؛ وہ اپنے علاقوں میں سڑکیں، اسکول، اسپتال اور فیکٹریاں وغیرہ بننے نہیں دیتے، تاکہ ان کے زیرِ نگیں لوگ ان کی غلامی سے نکل نہ جائیں۔ سابقہ مشرقی پاکستان کے بنگالی عوام کے بارے میں بھی ہمارے ہاں پنجابیوں میں اسی طرح کا پروپیگنڈا مقبول تھا۔ مشرقی پاکستان بوجھ ہے، یہ سیلابوں اور قدرتی آفات کا مارا علاقہ ہے۔ انھیں تو نمک تک مغربی پاکستان سے دینا پڑتا ہے، یہ دھوتیاں پہنے چھوٹے قد اور کالے رنگ کے کم ذہین لوگ بنگالی ہندوؤں اور بھارتی پروپیگنڈے سے متاثر ہیں، وغیرہ۔ جبکہ دوسری طرف پاکستان کے پہلے چودہ سال میں کل ملا کر مشرقی پاکستان کے لیے صرف 172 کروڑ روپے رکھے گئے تھے، اور ان کو آبادی کی بنیاد پر بڑا ہونے کے سیاسی حق سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔

ہماری سلامتی کی حاکم اشرافیہ کے پیدا کردہ اس طرح کے پروپیگنڈے کو پنجاب کے عوام بڑی آسانی سے قبول کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سردار اور جاگیر دار اپنے رجعت پسندانہ طبقاتی کردار کی وجہ سے اپنے عوام کی ترقی میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھ سکتے، لیکن وقت نے آگے بڑھنا ہوتا ہے، وہ کبھی کسی کے روکے نہیں رکتا، اور اگر ریاست سچ مچ کسی علاقے کی ترقی کا عزم کر لے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس پروپیگنڈے کا مقصد ایک تیر سے دو شکار کرنا ہے: قوم پرست سرداروں کے خلاف نفرت پیدا کی جائے اور ریاست اپنے عوام کو پسماندہ ترین حالت میں رکھنے کی جو مجرمانہ غفلت کر رہی ہے، اس پر پردہ ڈالا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان میں درجنوں سردار ہیں جن میں 'باغی' صرف تین چار ہی رہے ہیں۔ ان سرداروں نے حکومت کے اس پروپیگنڈے کی ہمیشہ تردید کی ہے اور حکومت کو ثبوت پیش کرنے کا چیلنج دیا ہے۔ دوسری طرف مرکزی حکومت اور ریاستی اداروں نے ان سب سرداروں کو

Scanned with CamScanner

اپنے لیے استعمال بھی کیا ہے اور انھیں شریکِ اقتدار بھی رکھا ہے۔ وہ سردار جو 'باغی' نہیں رہے، کیا بلوچستان میں اُن کے علاقوں میں کوئی ترقیاتی کام ہوا ہے؟ پھر کئی علاقے ایسے ہیں جہاں عام فہم معنوں میں سردار نہیں ہیں، مثلاً مکران کا علاقہ۔ کیا وہاں کے لوگوں کی حالت بدلی ہے؟ جو لوگ کراچی سے گوادر تک سفر کر چکے ہیں ان کا کہنا ہے کہ وہاں کے لوگوں کے لیے 'پسماندگی' اور 'افلاس' کے لفظ بہت چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پنجاب کے وسیع دیہاتی علاقوں میں ترقی کیوں نظر نہیں آتی؟ وہاں تریسٹھ سال سے ترقی کرنے سے کس نے روکا ہوا ہے؟ الیکشن کے دنوں میں ان بیچاروں کا مطالبہ سڑکیں، بجلی، گیس، گندے پانی کے نکاس، اسکول، اسپتال ہی بنانے کا ہوتا ہے۔ اسلام آباد سے آزاد کشمیر کے شہروں کی طرف جانے والی مین سڑکیں کیوں ٹوٹی پھوٹی ہیں؟ انھیں کس نے روکا ہوا ہے؟ میں نے طالبان کے آنے سے پہلے سوات کا سفر کیا تھا۔ مینگورہ شہر سے کالام جانے والی ٹورزم کی نہایت اہم سڑک کی وہ خستہ حالت تھی کہ الامان اور افسوس کے سوا کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ تریسٹھ سال میں تفریحی علاقوں کی طرف جانے والی اہم اور مین سڑکیں کیوں نہیں بن سکیں؟ وہ کن سرداروں نے روک رکھی ہیں؟ پاکستان عمومی طور پر غربت زدہ اور پسماندگی میں ڈوبا ہوا ملک ہے، اور پروپیگنڈا یہ ہے کہ سردار، جاگیردار اور سیاسی اثر رسوخ رکھنے والے لوگ اپنے علاقوں میں ترقی نہیں ہونے دیتے، جیسے ریاست کے کرتا دھرتا ترقی کے لیے پاگل ہوئے جا رہے ہیں اور ترقی کے لیے بے حساب روپیہ مختص کرتے ہیں! ہم اسٹیبلشمنٹ کے پھیلائے ہوئے دھوکے میں کیوں اتنی آسانی سے آجاتے ہیں؟ اصل مسئلہ یہ ہے، ترقی ہماری ریاست کی ترجیح ہی نہیں۔ ترقی نے ہونا کہاں سے ہے! ترقی جو نہیں ہوئی یا نہایت سست رو ہے، اس کی وجہ مالی وسائل نہایت محدود رکھنا ہے۔ ہماری ریاست کا ایجنڈا ترقی نہیں، 'دفاع، سلامتی اور مذہب کا پھیلاؤ' رہا ہے، اور ان تینوں چیزوں نے ہمارے ہاں خوب ترقی کی ہے! اپنے مفاد اور مقاصد کے لیے اسٹیبلشمنٹ سرداروں کو خرید سکتی ہے، انھیں مار سکتی ہے، چھاؤنیاں بنا سکتی ہے، قبائل کو آپس میں لڑا سکتی ہے، انھیں اپنے علاقوں سے دربدر کر سکتی ہے، لوگوں کو 'غائب' کر سکتی ہے، لیکن سڑک، اسکول، کالج، اسپتال یا فیکٹریاں نہیں بنوا سکتی... کیونکہ سردار نہیں مانتے!

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سرحد میں طالبان جب ہتھیار اٹھاتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ملک کی رٹ

بحال کی جائے، جب بلوچستان میں کچھ لوگ ہتھیار اٹھاتے ہیں اور وہ شورش اور سرکشی پر آمادہ ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ ہمدردی کی بات کی جاتی ہے۔ ہم نہ جانے کیوں حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور صرف ابہام کی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔ بلوچستان کے عوام کے حقوق اور طالبان کا معاملہ بالکل دو الگ چیزیں ہیں۔ بلوچستان کے لوگ صرف اپنے علاقے کے وسائل پر حق مانگ رہے ہیں اور پاکستانی ریاست میں باعزت اور برابری کی جگہ چاہتے ہیں۔ وہ کسی نظریے کی بنیاد پر کوئی سیاسی انقلاب برپا کرنا اور نہ ہی اسلام آباد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، جبکہ ان کے برعکس طالبان ہماری ریاست پر بزورِ طاقت قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور بزور اپنا نظریاتی پروگرام مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا ایجنڈا عالمی ہے۔ وہ ہمسایہ ملکوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتے ہیں، بلکہ ساری ترقی یافتہ دنیا کو برباد کرنے کا عزم رکھتے ہیں، جبکہ اس کے مقابلے میں بلوچ پاکستانی ریاست کے ایک حصے دار کے طور پر اپنی جائز شراکت مانگتے رہے ہیں۔ وہ صرف سیاسی اور معاشی حقوق کا مطالبہ کرتے رہے ہیں جنھیں ہم پچھلے تریسٹھ سال سے نہ صرف نظر انداز کر رہے ہیں بلکہ ان کو کچلنے کے لیے گاہے بگاہے فوجی آپریشن بھی کرتے رہے ہیں۔ بلوچستان کا سوال نوآبادیاتی جبر کا ہے۔ بلوچستان کے عوام کو حقوق دے کر حقیقی فیڈریشن کے نظریے کو مضبوط کرنا مقصود ہے، جبکہ طالبان پاکستان پر ہی نہیں، پورے خطے پر اپنے مخصوص نظریاتی ایجنڈے کے تحت جبراً قبضہ کرنا چاہتے ہیں، جس کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔

کیا یہ خوشی کی بات ہے؟

ہمارے ہاں یہ بات اکثر دہرائی جاتی ہے کہ پاکستان میں صرف ایک ہی منظم ترین اور طاقتور ادارہ ہے، اور وہ ہے فوج۔ فوج سے متعلق افراد بھی اس بات کا فخر اور خوشی سے ذکر کرتے ہیں۔ اس میں ان کا اعتماد بھی جھلکتا ہے کہ وہ پوری قوم، ریاست اور تمدنی اداروں کے مقابلے میں زیادہ طاقتور اور منظم ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات زمینی حقائق کے تناظر میں درست ہے۔

ہمیں من حیث القوم یہ سوچنا چاہیے کہ کیا یہ ہمارے لیے خوشی اور اطمینان کی بات ہے؟ یہ تو

Scanned with CamScanner

پوری قوم اور خود دفاعی ادارے کے لیے تشویش اور فکر مندی کی بات ہونی چاہیے۔ ریاست اور قوم ایک جسم کی مانند ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ جسم کا 20 فیصد حصہ تو صحت مند ہو اور بقیہ 80 فیصد حصہ مہلک امراض کا شکار ہو کر رفتہ رفتہ زندگی کے آثار کھو رہا ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے میں گھر کا سربراہ ہوں اور میں نے اپنی صحت تو ٹھیک رکھی ہو اور میرے دیگر اہلِ خانہ بیماری کے ہاتھوں موت کے کنارے پر ہوں، اور میں فخر سے کہتا پھروں کہ میں اس گھر کا سب سے صحت مند شخص ہوں۔ اس پر طرہ یہ کہ میری صحت کا راز پچھلے تریسٹھ برس سے گھرانے کی آمدنی کا سب سے زیادہ حصہ اپنی ذات پر خرچ کرنے میں پنہاں ہو۔ ظاہر ہے کہ میں اپنی ذات کو ترجیح دینے کی ترغیب پر کچھ قابو پاؤں تو گھر کے دوسرے افراد میں بھی 'صحت' کے آثار نمودار ہوں۔ چنانچہ یہ کوئی فخر کی بات نہیں کہ دفاع کے مقابلے میں ہماری سیاسی، سماجی، اقتصادی، مالی، تعلیمی، علمی، اخلاقی اور ثقافتی حالت بے حد پتلی ہے۔ یہ تو بحران کی نشانی ہے جس پر پوری قوم کو سخت فکر لاحق ہونی چاہیے تاکہ اس غیر صحت مند کیفیت کو جلد از جلد دور کیا جاسکے۔ یہ بات دفاع سے منسلک افراد کے لیے بھی پریشان کن ہونی چاہیے کہ وہ جس درخت کی ایک سرسبز و شاداب شاخ ہیں، وہ درخت تیزی سے کھوکھلا ہو رہا ہے۔ ہمیں فوراً اس قومی بحران پر توجہ دیتے ہوئے اپنے معاملات درست کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر بانس ہی نہیں رہے گا تو بانسری کہاں رہے گی۔

یہ کہنا بھی درست نہیں کہ یہ صورتحال قوم کے سویلین حصے کی نالائقی اور بدعنوانی کا نتیجہ ہے۔ دفاع سے متعلق افراد بھی اسی قوم کا حصہ ہیں اور ہم سب ایک جیسی صلاحیتیں اور مزاج رکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ مسئلہ فرشتہ ہونے یا نہ ہونے کا نہیں۔ جس پر وسائل صرف ہوں گے، جسے ترجیح دی جائے گی، وہ ادارہ اور وہ شعبہ ترقی کے بہتر مدارج کو چھو لے گا۔ ہماری قوم جب کسی شعبے پر توجہ دے اور اس کے لیے ضروری وسائل میسر ہوں تو یہ قوم ضرور کامیابی سے ہم کنار ہوتی ہے۔ یہ غلط بات ہے کہ ہم اپنے آپ کو نکما اور بدعنوان کہہ کر خود کو عزتِ نفس سے محروم کرتے ہیں۔ یہ بھی غلط سوچ ہے کہ اسی قوم کے بیس فیصد حصے کو اہلیت اور کردار کی اعلیٰ سطح پر دیکھا جائے۔ پاکستان کے کسی بھی دوسرے ادارے پر دفاع کی طرح پیسے اور توجہ دیں، یقیناً وہ ادارہ کچھ عرصے بعد اسی طرح اپنا آپ منوانے لگے گا۔

اس ملک کی سویلین آبادی بھی صلاحیتوں کی اتنی ہی حامل ہے جتنے ہمارے دفاع کے افراد۔ بنیادی فرق سرمایہ کاری کا ہے: پیسے، توجہ اور ترجیح کی سرمایہ کاری۔۔۔ جو کہیں اور کبھی نہیں ہوئی۔ ایٹم بم

بھی اسی لیے بنا تھا کہ کھلا پیسہ، پوری توجہ اور اعلیٰ ترجیح دی گئی، ورنہ پیسے کا زیاں، اقربا پروری اور بدعنوانی وہاں پر بھی کوئی کم نہیں ہوئی تھی۔ انسان فرشتے نہیں ہوتے۔ کسی کو فرشتہ کہہ کر ہم خود کو اور دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں۔ دنیا بھر کی ترقی یافتہ قوموں نے کرپشن کی اسی فطرت کو رکھتے ہوئے ترقی کی ہے۔ چنانچہ نہ وردی والے لوگ فرشتہ ہوتے ہیں اور نہ کسی دوسرے سے یہ امید رکھنی چاہیے۔ ہاں، ترقی اور تہذیب کے سفر تیز، انسان کا کردار بھی بالآخر بلند اور شفاف ہوتا جاتا ہے۔

پاکستان نے ترقی اس لیے نہیں کی کہ ہم نے کبھی انسانی ترقی کو اپنا مشن بنایا ہی نہیں۔ ہم 'سلامتی' کی کھونٹی سے اتریں گے تو کسی اور طرف دھیان ہو سکے گا، اور بدقسمتی سے وہاں سے اترنے کی کسی تدبیر بلکہ اس خیال کو بھی ناپاک سمجھا جاتا ہے۔ یہ ہے ہماری بنیادی دلدل۔ پوری قوم اور خاص طور پر ہمارے دفاعی اداروں کو اسے سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے۔ اگر باقی ملک بوسیدگی، پسماندگی، جہالت اور غربت کی دلدل میں ہو تو وہ خوشحالی، ترقی اور جدید ساز و سامان سے لیس ایک ادارے کے طور پر کب تک اپنا معیار قائم رکھ سکتے ہیں؟ ہمیں اب اپنا ذہن تبدیل کرنا چاہیے۔ ہم ماضی جیسے رویوں کے ساتھ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ سلامتی اور دفاع کے معاملات کو پاکستان کی منتخب قیادت پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ خارجہ تعلقات میں مناسب تبدیلیوں کے ذریعے ہمارے اوپر سلامتی کا دباؤ کم ہو، اور ہم اپنے وسائل سویلین اداروں کی ترقی کی جانب موڑ سکیں۔ ہمیں اب 'دشمنی' کے جال سے باہر نکل کر اپنے ملک کی ترقی اور قوم کی خوشحالی کو اولین ترجیح دینا ہوگی۔

آئی ایس آئی کی رپورٹ میں یہ بات صحیح کہی گئی ہے کہ ہمیں انڈیا سے نہیں، مذہبی انتہا پسندی سے زیادہ خطرہ ہے۔ ہمیں یکطرفہ نہیں، قومی سطح پر متحد ہو کر سوچنا چاہیے۔ قومی سلامتی کو یقینی بنانے کے ایک سے زیادہ راستے موجود ہیں۔ فقط جنگی ساز و سامان کی بے محابا اور مسلسل خریداری سے سلامتی کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ جنگ کسی مسئلے کا حل ہوتی ہی نہیں۔ یہ تو ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ اس ذہنیت کے ساتھ جنگی ساز و سامان کی ضرورتیں تو کبھی کم نہیں ہوں گی۔ لیکن ایک قرض زدہ اور تیزی سے غربت کا شکار ہوتے ملک کی ترقی کو نظر انداز کرنا قومی خودکشی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ ہمیں اس مجرمانہ غفلت کے بارے میں بحیثیت قوم فوراً غور کرنا چاہیے۔

Scanned with CamScanner

پاکستانی سکیورٹی اداروں پر تنقید کیوں؟

کچھ حلقوں کی طرف سے سوال کیا جانے لگا ہے کہ پاکستان شاید واحد ملک ہے جس کے سکیورٹی اداروں کو اپنے ملک کے پریس، میڈیا اور دانشور حلقوں میں شدید تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے جبکہ بہر حال سکیورٹی ادارے کسی ملک اور ریاست کے ہراول محافظ دستے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بات کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ اسرائیل میں موساد، بھارت میں را اور امریکہ میں سی آئی اے کو اپنے ہم وطن کیا یوں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جیسے ہمارے ہاں آئی ایس آئی کے خلاف لکھا اور بولا جانے لگا ہے؟ اس سے کچھ محبِ وطن لوگ پریشان ہوں گے۔ ظاہر ہے، وہ ادارے جن کا کام ہی پاکستان کی سرحدوں اور مفادات کی سلامتی کا خیال کرنا ہے، ان کے اعمال کو نشانۂ تنقید بنایا جائے تو پاکستان کی سلامتی کا ذمے دار کون رہے گا؟

ہم سب سے پہلے اس بات کو صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ دفاع اور سلامتی کے ادارے جدید ریاست کا لازمی اور نہایت اہم حصہ ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم ریاستی ہیئت کی تشکیل کے تاریخی وجود کے ذکر میں نہیں جانا چاہتے۔ ریاست ہے تو اندرونی اور بیرونی سلامتی کے لیے فوج بھی ہوگی، پولیس بھی، اندرونی اور بیرونی جاسوسی کے ادارے بھی ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی محبِ وطن شہری کے لیے ان اداروں کا احترام واجب ہونا چاہیے، کیونکہ سلامتی کے ادارے ہیں تو ریاست محفوظ ہے تاکہ اس کے اندر اس کے شہری اپنی مرضی کی زندگی گزار سکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستانی معاشرہ دو حصوں میں بٹ چکا ہے: ایک حصہ سلامتی کے اداروں کا حمایتی کہا جاسکتا ہے، اور دوسرا ان اداروں کے رول اور قائدین کے بارے میں شدید تحفظات کا شکار ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بات بالکل غلط ہے کہ جو لوگ پاکستانی سلامتی کے اداروں اور ان کے کمانڈروں پر تنقید کرتے ہیں وہ ان اداروں کے وجود کے خلاف ہیں یا وہ حب الوطنی میں کسی سے بھی کم ہیں۔ اصل میں ہم فطری طور پر جذبات کی قوم ہیں، ہوش اور خرد کی نہیں۔ لہٰذا ہم سوچتے بھی جذبات سے ہیں اور دوسروں کے بارے میں رائے بھی جذبات سے قائم کرتے ہیں۔ جذبات حیوانی اور سادہ چیز ہیں۔

Scanned with CamScanner

جبکہ خرد ترقی یافتہ انسانی ساختہ عمل ہے۔ دلیل اور منطق محنت طلب اور صبر آزما ہوتی ہے۔ اسے ٹھنڈے دل اور دماغ سے ہی دیکھا جا سکتا ہے جبکہ جذبات فوری عمل پیرا ہوتے ہیں اور انسان کو فوری ردعمل کی ترغیب دیتے ہیں۔ چونکہ ہم ناخواندہ، نیم خواندہ قوم ہیں، تھوڑے سے لوگ پڑھ لکھ گئے ہیں لیکن ان کی تعلیمی اور ذہنی تربیت ابھی حال ہی کا واقعہ ہے، لہٰذا ہمارے پڑھے لکھے لوگ بھی خرد سے کم، جذبات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ ابھی ہمیں تعلیم و تربیت کی کچھ اور نسلوں سے گزرنا ہوگا، تب خود کو تہذیب یافتہ کہلوا سکنے کے قابل ہوں گے۔ چنانچہ ہمارے ہاں مخالف رائے رکھنے والوں کو بڑی جلدی میں دشمن سمجھ لیا جاتا ہے۔ آپ مذہبی بات پر کسی سے اختلاف کریں، آپ کو فوراً مرتد، کافر، دوسرے فرقے کا قرار دے دیا جائے گا۔ آپ سیاسی اختلاف کریں، آپ کو پارٹی کا دشمن سمجھ لیا جائے گا۔ آپ وطن اور ریاستی امور کے بارے میں اختلاف کریں، آپ کو غدار، وطن دشمن، اور اسرائیل، بھارت، امریکہ کا ایجنٹ سمجھ لیا جائے گا۔ مختلف بلاگز میں سیاسی اور نظریاتی موضوعات پر پاکستانی باشندوں کی آرا ملاحظہ کریں۔ اپنے مخالف رائے رکھنے والے ہم وطنوں کے بارے میں گندی زبان استعمال کر رہے ہوں گے، ماں بہن کی گالیاں دے رہے ہوں گے۔ انھیں کافر، ہندو، سکھ، عیسائی، مرزائی، یہودی کہہ رہے ہوں گے۔ یہ ہے سارے پاکستانیوں کا رویہ اور مزاج، جو پاکستان کی محبت کے دعوے داروں اور اسلام کے شیدائیوں کا خاصہ ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے، ہماری سلامتی کے ادارے اپنی قوم کی نیم خواندگی، سادہ لوحی اور ان کے جذباتی رویوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ ریاست کا کام اپنی عوام کی ذہنی تربیت کرنا ہوتا ہے، انھیں سادگی سے ترقی کی طرف لے جانا ہوتا ہے۔ جبکہ عوام کی ناخواندگی، جہالت، جذباتی کیفیت، مذہبی نعرہ گوئی ہماری سلامتی کے اداروں کے اہم اثاثے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو ریاستی سرپرستی سے نوازتے ہیں، ان کا تحفظ کرتے ہیں، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر بٹھاتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے، اس ملک میں جہالت پھیلانے اور جہالت کا کاروبار کرنے پر کوئی پابندی نہیں جبکہ سائنسی اور سیکولر پیشوں پر تمام جدید ضابطے لاگو ہوتے ہیں!

اسرائیل، بھارت اور امریکہ میں ان کی ایجنسیوں اور سلامتی کے اداروں پر اس طرح تنقید کیوں نہیں ہوتی جو پاکستان کے اندر دیکھنے میں آ رہی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے دیکھا

Scanned with CamScanner

جائے، کیا ہمارے دفاعی اور سلامتی کے اداروں کی وہی حیثیت، رویہ، اور کردار ہے جو ایک جدید جمہوری ریاست میں ہوتا ہے، یا جو ان مذکورہ ملکوں میں ہے؟ اگر تو ان کا کردار، رویہ وہی ہے، تو پھر پاکستان میں ناقد حلقوں کا احتساب کیا جائے یا ان پر غداری کا الزام لگایا جائے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم بھی اپنی افواج اور سلامتی کے اداروں سے محبت کرتے ہیں، احترام بھی اور ان کے وجود کو تسلیم بھی۔ تنقید اور اختلاف ان کے مستقل تاریخ مزاج، رویے اور کردار پر ہے جو وہ پاکستان میں ادا کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔

اسرائیل، بھارت اور امریکہ میں کتنی بار فوج نے سویلین حکومتوں کے تخت الٹے ہیں؟ کیا اسرائیل، بھارت اور امریکہ کی طرح ہمارے جرنیل اور سلامتی کے ادارے پارلیمنٹ کے ماتحت اور ان کو جواب دہ ہیں؟ کیا ہمارے جرنلوں کو جمہوری حکومت برطرف کر سکتی ہے؟ کیا ہمارے جنرل پارلیمنٹ، سینٹ کمیٹیوں کو اسی طرح جواب دہ ہوتے ہیں جس طرح مذکورہ ملکوں میں روایت ہے؟ کیا عوام کے منتخب جمہوری حکمران ہمارے جرنلوں کو ڈکٹیٹ کر سکتے ہیں، یا ہمارے جنرل آئینی جمہوری حکمرانوں کو ڈکٹیٹ کرتے ہیں؟ کیا آئینی حکومت کے کسی فیصلے یا بین الاقوامی معاہدے پر ان ملکوں میں کور کمانڈرز کی میٹنگ طلب کر لی جاتی ہے اور فوج کی طرف سے احتجاج ریکارڈ کروایا جاتا ہے؟ بھارت، اسرائیل اور امریکہ میں کتنے وزیر اعظم ہوئے ہیں جن کو وزیر اعظم ہاؤس میں کسی کیپٹن یا میجر نے ہتھکڑیاں پہنائی ہوں اور جنھیں جہاز کی سیٹوں کے ساتھ ہاتھ باندھ کر لے جایا گیا ہو؟ ان ملکوں میں کتنے وزیر اعظم ہیں فوجی ڈکٹیٹر نے جن کی عدالتی پھانسی کا بندوبست کیا ہو؟ کتنے ملک ہیں جن میں فوجی عدالتوں نے طالب علموں، صحافیوں، دانشوروں، وکیلوں، پروفیسروں کو سر عام کوڑے مارنے کی سزائیں دی ہوں، ان کو قیدِ تنہائی میں رکھا ہو؟ کتنے ملک ہیں جن کی افواج وسیع پیمانے پر صنعتی، کاروباری، رئیل اسٹیٹ کا کاروبار کرتی ہوں، شادی ہال کرائے پر دیتی ہوں اور تکے کباب تل کر پیش کر رہی ہوں؟ کیا بھارت، امریکہ اور اسرائیل کی افواج ملک کی آدھی کمائی اپنے بجٹ میں ڈال لیتی ہیں؟ کیا ان ملکوں کی افواج دعویٰ کرتی ہیں کہ وہ جغرافیائی سرحدوں کے ساتھ ان کی نظریاتی سرحدوں کے بھی محافظ ہیں، یا نظریاتی اور سیاسی مباحث ان قوموں کی پارلیمنٹ کا اختیار ہے؟ کیا ان ملکوں میں خارجہ پالیسی اور ہمسایہ ملکوں سے تعلقات متعین کرنے کا اختیار فوج کو حاصل ہے؟ کیا ان

میں سے کسی بھی ملک میں مذہبی انتہا پسند تنظیمیں بنا کر انھیں ہمسایہ ملکوں میں استعمال کیا جاتا ہے جس میں اپنے ملک کی سیاسی انتظامیہ کا کوئی دخل نہ ہو؟ کیا ان ملکوں کی افواج کے سربراہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا ملک یہودیت کا، ہندومت کا، عیسائیت کا قلعہ ہے؟ ہمارا آرمی چیف ہر چند دن کے بعد پاکستانی قوم کو یاد کرواتا ہے کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ کیا کوئی اور اسلامی یا عرب ملک کی فوج کا سربراہ یہ الفاظ دہراتا ہے؟

اگر ایسا نہیں ہے تو پھر دنیا کے مروجہ اصولوں اور ضوابط کا حوالہ دے کر یہ کیوں کہا جائے کہ پاکستانی سلامتی کے اداروں پر خود پاکستانی شہری اتنی زیادہ تنقید کیوں کرتے ہیں؟ کتنے ملک دنیا میں ایسے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہو کہ وہ فوج کے لیے ہیں؟ کیا پاکستان کی سلامتی کے اداروں نے ایک سیاسی پارٹی کی طرح اپنا نظریاتی اور سیاسی ایجنڈا نہیں بنایا اور پوری قوم کو مجبور نہیں کیا کہ وہ اس پر عمل پیرا ہو؟ کیا کسی دیگر ملک میں فوج کے افسران خود کو قانون سے بالا تصور کرتے ہیں؟ کیا وہ ذاتی معاملات نمٹانے کے لیے اپنے فوجی ہونے کی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ساری سول انتظامیہ ان سے ڈرتی ہے؟ یہاں تو فوجی گاڑیاں آ کر تھانے پر حملہ کر کے ملزم چھڑوا کر لے جاتی ہیں اور ڈیوٹی پولیس کی چھترول کر جاتی ہیں، اور وہ بھی کسی فوجی افسر کے ذاتی جھگڑے میں۔ یہ کلچر کیا بھارت، اسرائیل اور امریکہ میں قابلِ قبول ہے؟

ہمارے جنرل قومی اداروں کے سامنے جواب دہی کے لیے نہیں آتے۔ آڈیٹر جنرل آف پاکستان اور پارلیمنٹ کی اکاؤنٹس کمیٹی کی رپورٹیں پڑھ لیں۔ تریسٹھ سال میں خود اپنے ہی بحران کی وجہ سے پہلی بار پارلیمنٹ کے سامنے تشریف لائے تو ''پہلی بار آئے!''، ''پہلی بار آئے!'' کا شور مچ گیا لیکن وہاں بھی اپنا محاسبہ کرانے کی بجائے پارلیمنٹ پر رعب ڈال کر چلے گئے۔ کسی کو یہ کہہ گئے، ''ہمیں پتا ہے، تم ہمارے خلاف کیوں اتنا زیادہ بولتے ہو۔ میں نے تمھارا وہ ذاتی کام نہیں کیا تھا۔'' دوسرے کو کہا، ''ہمیں پتا ہے، کون کون باہر سے فنڈ لیتا ہے۔'' پھر معصوم بن کر کہا کہ پارلیمنٹ ہمیں ''حکم'' دے تو ڈرون طیارے گرا دیں۔ اپنی واہ واہ کروانے کے لیے استعفے کی آفر کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے، پارلیمنٹ میں اتنی جرأت کہاں، اور ساری پارلیمنٹ تالیاں بجاتے ان کو رخصت کرتی ہے۔ اس طرح کا ڈراما کس مہذب ملک میں ہوتا ہے؟ پارلیمنٹ انکوائری کمیشن بناتی ہے، ان کا کیا حشر ہوتا

Scanned with CamScanner

ہے؟ اسرائیل، بھارت اور امریکہ میں سیاسی سربراہ کھڑے کھڑے جرنلوں کو برطرف کر دیتے ہیں۔ یہاں تو جرنل کے اردلی کو کوئی برطرف نہیں کرسکتا۔ نواز شریف نے اپنا آئینی حق استعمال کیا تھا، اسے وزیراعظم ہاؤس سے سیدھا سانپوں سے بھری کوٹھری لے جا کر بند کر دیا گیا۔ کیا بھارت، اسرائیل اور امریکہ میں ان کی جاسوسی کی ایجنسیاں خود اپنے ہی ملک کے سیاسی نظام میں اس طرح کی مداخلت کرتی ہیں؟ ہمارے ملک میں نت نئے شوشے اور شورشوں کے پیچھے مبینہ طور پر ایجنسیوں کے ہاتھ کا ذکر ہوتا ہے۔ کس ملک کی ایجنسیاں الیکشن لڑنے والے امیدواروں کو چھاؤنیوں میں حاضر ہونے کا حکم دیتی ہیں، اور کون کس حلقے سے لڑے گا، اس کا تعین کرتی ہیں؟ کس ملک کی ایجنسی کو آرڈر ہوتے ہیں کہ تم نے صدارتی ریفرنڈم میں ڈبے بھرنے ہیں؟ یہ صرف پاکستان میں ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے، جو لوگ بظاہر سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ پر تنقید کرتے ہیں وہی اس ملک اور سلامتی کے اداروں کے سچے خیر خواہ ہیں۔ ہم پاکستان کی 'غیر طبعی' صورت کو تبدیل کرنا، اسے تہذیب، قاعدے، قانون اور آئین کے دائرے میں لانا چاہتے ہیں۔ تب پاکستان، اس کے عوام اور ریاست کی سلامتی کے اداروں کے درمیان ہم آہنگی اور قومی یکجہتی پیدا ہوگی، ورنہ پاکستانی ریاست اور معاشرہ متصادم، متضاد گروہوں میں منقسم رہے گا۔ یہاں بدمعاشی، زورآوری، فاشزم کا رواج غالب رہے گا اور یہ ملک کبھی ترقی کر سکے گا نہ مہذب بن سکے گا، بلکہ مذکورہ پالیسیوں کے نتیجے میں ملک کے وجود کو لالے پڑے ہوئے ہیں۔ یا سارے اصول اپنائے جائیں، یا پھر کوئی اصول باقی نہیں رہتا۔ سلامتی کے اداروں کی عزت ضرور ہونی چاہیے۔ وہ کسی بھی ریاست کا فخر ہوتے ہیں، اگر وہ غیر جانبدار رہیں اور ملک کی خدمت اور حفاظت ہی ان کا مطمحِ نظر ہو۔ ریاست اور حکومت کو کیسے چلانا ہے، وہ عوام کا کام ہے۔ ہماری سلامتی کے اداروں کو چاہیے کہ وہ آئین اور قانون کے پابند ہو جائیں۔ ریاستی نظریات اور دیگر ملکوں سے تعلقات کا تعین ان کی ذمے داری نہیں ہے۔ اسی میں پاکستان کی عزت بھی ہے اور استحکام بھی۔

Scanned with CamScanner

فاش غلطیوں سے بھری ہماری تاریخ

اسامہ کے امریکی آپریشن نے ایک اہم سوال ساری دنیا اور پاکستان کے عوام کے لیے چھوڑ دیا: کیا ہماری سکیورٹی ایجنسیاں ملوث تھیں یا نالائق؟ سوال بڑا سخت تھا۔ ہمارے متعلقہ حلقوں نے 'نالائق' ہونے کی چوائس پر 'ٹِک' کرنا سود مند جانا۔ یہ صورتحال کچھ ایسی ہی تھی جیسے سو پیاز کھانے ہیں یا جوتے... ہم نے فی الحال پیاز کو ترجیح دے دی ہے۔ آگے دیکھیں، کیا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کیس اتنا ننگم ننگا تھا کہ بچنے کی کوئی راہ نہ تھی، لہٰذا عالمی دباؤ بھی ویسا ہی آیا۔ پاکستان کی تاریخ ہماری ہیئتِ مقتدرہ کی فاش غلطیوں سے بھری ہوئی ہے جنھوں نے اس ملک کو برباد کر کے رکھ دیا لیکن خود مقدس کے مقدس رہے۔ ان لوگوں کا کبھی کسی نے محاکمہ اور احتساب نہ کیا، نہ کسی میں ایسا کرنے کی جرأت پیدا ہو سکی۔ چنانچہ پاکستان میں یہ طے پا گیا کہ طاقتور لوگ کچھ بھی کریں، اس ملک کو کتنا ہی لوٹ لیں، اس ملک کی بربادی میں کتنا ہی اپنا حصہ ڈال لیں، اس ملک کی قسمت کے ساتھ کتنا ہی کھیل لیں، وہ محبِ وطن کے محبِ وطن رہیں گے، ان کا کردار شک وشبہ سے ماورا اور مستثنیٰ رہے گا، کیونکہ وہ ایک ایسے ادارے سے تعلق رکھتے ہیں جس کا تعلق اس ملک کی سلامتی اور دفاع سے ہے۔ ہاں، البتہ اگر عوام کے منتخب کردہ سیاسی لوگ ہیں، ان کو پھانسیاں بھی ہوں گی، قید وبند کی صعوبتوں، جلاوطنیوں اور ذلت آمیز سلوک سے بھی نوازا جاتا رہے گا۔

پالیسی یہ ہے کہ اپنے ہر کرتوت سے انکار کر دیا جائے، یا اس کا ملبہ کمزور، نہتے سویلین حکمرانوں کے سر منڈھ دیا جائے جنھیں اپنی کرسی بچانے اور کھانے پینے کے سوا کچھ آتا بھی نہیں اور اس کے علاوہ ان کو کچھ کرنے کی اجازت بھی نہیں۔ جھوٹے پروپیگنڈے سے حقائق کو توڑ موڑ دیا جائے اور ساری صورت حال کو اپنی تعریف وتوصیف میں لگا دیا جائے۔ مثال کے طور پر 1965 کی جنگ معاشی، عسکری، سیاسی، اسٹرٹیجک فاش غلطی تھی لیکن اپنی آغاز کردہ جنگ کو انڈیا کے 'حملے' سے تعبیر کر دیا،

Scanned with CamScanner

بے نتیجہ اور ہاری ہوئی جنگ کو 'فتح' کا نام دے دیا۔ اس جنگ سے بربادی کے سوا پاکستان کے ہاتھ کچھ نہ آیا تھا۔ کسی جنرل، کسی فوجی کا محاکمہ نہ ہوا۔ 1971 کی جنگ بھی ہماری سیاسی اور عسکری فاش غلطیوں پر مشتمل تھی۔ اس کا سارا ملبہ 'غدار بنگالیوں' اور انڈیا کے سر منڈھ دیا۔ جنرل یحییٰ کو مرنے کے بعد سپریم کورٹ نے غاصب قرار دیا! ایک آرمی چیف جنرل ضیا نے بھٹو کا عدالتی قتل کیا۔ اس نے سارے ملک کو مذہبی انتہا پسندی، فرقہ پرستی، ہیروئن، کلاشنکوف اور جہادی کلچر سے متعفن کر دیا۔ آرمی چیف جنرل مشرف نے کارگل کی فاش غلطی کی۔ پاکستان کے عوام، سیاسی قیادت، بھارت اور دنیا کو بیوقوف بنانے کی کوشش میں منہ کی کھائی۔ بتایا گیا، کارگل کی چوٹیوں پر پاکستان آرمی نہیں، کشمیری مجاہدین کارروائی کر رہے ہیں۔ پھر ایک دن سارا جھوٹ ساری دنیا کے سامنے کھلا۔ کسی کا کوئی احتساب نہ ہو سکا۔ الٹا عوام کے منتخب وزیر اعظم کو ذلت اور پھر جان بچانے کے لیے جلاوطنی اختیار کرنی پڑی۔ 'سب سے پہلے پاکستان' کہنے والا 'عالمی ضمانتوں' کے ساتھ 'سب سے پہلے انگلستان' بھاگ گیا۔ اس کے پاس پاکستان، دبئی اور انگلینڈ میں کئی سو کروڑ کے اثاثے ہیں۔ ہمارے دفاع اور سکیورٹی کے ذمے داروں نے لاتعداد شدت پسند اور دہشت گرد لوگوں کو عسکری تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ جہادی ماہر اور عسکریت پسند خصوصی مولوی تیار کیے گئے۔ ساری دنیا کے دہشت گردوں کو اس ملک میں پناہ دی۔ مذہبی انتہا پسندی کی تعلیم دینے والے گلی گلی مدرسے کھلوائے گئے اور ان کی سرکاری سرپرستی کی گئی۔ سرکاری اسکولوں میں اسلامیات کے نام سے مذہبی شدت پسندی اور 'مطالعہ پاکستان' کے نام سے مسخ شدہ تاریخ پڑھائی گئی اور دوسری قوموں کو کافر اور مسلمانوں کا دشمن قرار دیا گیا۔ گویا یہ ضمانت حاصل کی گئی کہ پاکستان کی سب آنے والی نوجوان نسلیں 'قادری' ذہنیت کی حامل ہوں۔ پاکستانی عوام کو اسلحہ اور ہتھیاروں سے محبت سکھلائی گئی اور ان کو جنگ پسند اور جذباتی بنایا گیا۔ شاہراہوں کی تزئین ٹینکوں، توپوں، جنگی جہازوں اور میزائلوں سے کی گئی۔ نتیجہ: آج کا پاکستان، قرضوں کا مارا بھکاری ملک، ناخواندہ اور مفلس اور انتہا پسند ذہن رکھنے والے شہریوں کا ملک، نااہل، کرپٹ اور عیاش حکمرانوں کا ملک، معیار زندگی کے تمام پیمانوں میں دنیا کے گھٹیا ترین اقوام کی لسٹ میں شامل لیکن ایٹم بم رکھنے والا

Scanned with CamScanner

ملک۔ سلامتی سے متعلقہ اداروں نے ملک میں جعلی سیاسی اتحاد بنوائے، جعلی الیکشن اور جعلی ریفرنڈم کرواتے رہے، لیکن بغیر کسی احتساب کے سب جنرل اندرونی اور عالمی ضمانتیں لے کر چلتے بنے اور پیچھے اپنے جیسے لوگ چھوڑ گئے۔

تازہ ترین دفاعی نالائقی اور ڈبل گیم میں ملوث ہونے کے الزامات کے باوجود انشاء اللہ کسی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ سب طاقتور لوگ اپنے عہدوں پر جوں کے توں باعزت طریقے سے کام کرتے رہیں گے، بلکہ وہ سب کچھ بھی کرتے رہیں گے جو آج تک کرتے آئے ہیں۔ اس ملک کی قسمت بدلنے والی نہیں ہے۔ یہاں کچھ بھی بدلنے والا نہیں ہے۔ ہم نے بحیثیت قوم ایک ہی چیز سیکھی ہے، کہ ہم نے وقت، حالات اور تاریخ سے کچھ نہیں سیکھنا۔ عوام کی برین واشنگ کے لیے انھوں نے سارا 'آزاد' میڈیا خرید لیا ہے۔ ہماری ہیئتِ مقتدرہ جب چاہے، جس طور چاہے، عوام کو اپنے من چاہے رستے پر لگا سکتی ہے۔ اگر نہیں لگنے دینا تو ترقی کی راہ پر، تہذیب کی راہ پر، عقل کی راہ پر، امن کی راہ پر، صلح جوئی کی راہ پر لگنے نہیں دینا۔ عوام کو کنفیوزڈ رکھو۔ ان کو کچھ پتا نہ چلنے دو، سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے۔ ان نیم خواندہ لوگوں میں جعلی تفاخر قائم کیے رکھو۔ امریکہ کو کہہ دیا ہے: "اب کے مار کے دیکھ!" اور بھارت تو ویسے ہی ہمارے آگے کچھ نہیں، اس کو تو ہم نے ہمیشہ ہی شکست فاش دی ہے۔ ہیئتِ مقتدرہ کی چمک دمک اور خوش باشی کا یہی راز ہے۔

خارجہ پالیسی اور قومی مفادات

خارجہ امور کی پارلیمانی کمیٹی نے اسفند یار ولی کی سربراہی میں کہا ہے کہ حکومت خارجہ پالیسی کو 'قومی مفادات' کے مطابق تشکیل دے۔ اسفند یار صاحب نے سوچا ہوگا، بری خبروں کے دنوں میں کچھ تھوڑا مذاق بھی ہو جائے۔ ورنہ یہ کسے معلوم نہیں، ہم نے کچھ وزارتیں کچھ 'خاص' لوگوں کو تفویض کر رکھی ہیں۔ دنیا اِدھر کی اُدھر اور پاکستان کا حلیہ کچھ کا کچھ ہو سکتا ہے، ان وزارتوں کی طے شدہ پالیسیوں اور ان وزارتوں کے 'مالکوں' کے حقِ ملکیت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ وزارتِ خارجہ اور وزارتِ دفاع

Scanned with CamScanner

پاکستانی ریاستی تناظر میں 'وزارتیں' نہیں ہیں، بلکہ 'کسی اور' کے ماتحت محکمے ہیں۔ ان بیچاروں کو خودمختاری کے ساتھ اپنی پالیسی وضع کرنے کی اجازت ہی نہیں، نہ یہ عوامی سیاسی قیادت کی کسی خواہش یا پالیسی کو نافذ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ وزارتِ دفاع بھی پوسٹ مین ہے، اور وزارتِ خارجہ بھی۔ ویسے تو ہمارے بدترین استحصال سے نہ کوئی نظریہ بچا ہے اور نہ کوئی لفظ، لیکن جن لفظوں کا بے دریغ استحصال ہوا ہے ان میں ایک 'قومی مفاد' ہے۔ اللہ جانے یہ کس بلا کا نام ہے۔ اس ملک میں آج تک جو کچھ بھی ہوا ہے اور جس کسی نے جو بھی کیا ہے، وہ 'قومی مفاد' میں کیا ہے۔ اب اگر اس کا فائدہ مند نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا اور ملک ڈوبتا چلا گیا ہے تو بیچارے حکمرانوں کا کیا قصور ہے؟

عوام کو اس لفظ سے نفرت کا اظہار کرنا چاہیے کیونکہ اس ملک کو 'قومی مفاد' کے نام پر لوٹ لیا گیا ہے۔ نہ عوام کو کچھ ملا نہ ملک کی کوئی بھلائی ہوئی۔ نہ استحکام ملا نہ ترقی۔ قومی مفاد نہیں، ہمیں 'عوامی مفاد' کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ جو کچھ ہو، جو بھی پالیسی بنے، وہ براہ راست پاکستانی عوام کے مفاد میں ہو۔ اس کے ثمرات اور اثرات براہ راست عوام کی حالت بدلنے کے لیے ہوں۔ اگر پالیسی سے عوام کی حالت بہتر ہوتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ قومی مفاد ڈھونگ ہے۔ ہر وہ پالیسی جو ملک کو ترقی سے روکے، امن نہ ہونے دے اور کشیدگی میں رکھے، اسے مسترد ہونا چاہیے۔ اس وقت 'قومی مفاد' سے مراد مخصوص طبقوں کے مفاد کے سوا کچھ نہیں۔ ملک کی معاشی ترقی ہی اصل 'قومی مفاد' ہے۔ ہر وہ کام ہو جس سے ترقی کا عمل تیز ہو۔ ہماری خارجہ پالیسی ایک نقطے پر یرغمال ہو چکی ہے: وہ ہے بھارت سے مخاصمانہ مقابلے بازی اور کشمیر کا مسئلہ۔ اس سے آگے وزارت کو کچھ سوچنے اور کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ رٹے رٹائے بیانات ہیں۔ ہم اس کی بھی تردید کر رہے ہوتے ہیں جہاں ہم خود اپنی نظروں میں ننگے ہوتے ہیں اور حقیقی صورت حال سے ساری دنیا بھی باخبر ہوتی ہے۔

کل خارجہ پالیسی دو چار فقروں پر مشتمل ہے۔ خارجہ سیکرٹری بدلتے ہیں، حکومتیں بدلتی ہیں، یہ مخصوص فقرے نہیں بدلتے۔ ''کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کی قرادادوں کے مطابق حل کیا جائے، پاکستان کشمیر پر سمجھوتہ نہیں کرے گا، پاکستان کی سرزمین دہشت گردی کے لیے استعمال نہیں ہو رہی، ہم کشمیریوں کی 'اخلاقی' امداد نہیں چھوڑیں گے، کشمیر کا مسئلہ حل ہونے تک اس خطے میں امن نہیں ہو سکتا...'' گویا ہم کہہ رہے ہوتے ہیں: امن نہ ہو، پاکستان کو پروا نہیں۔ یہ خارجہ پالیسی کا دیوالیہ پن نہیں تو کیا ہے؟ بین الاقوامی سطح پر جہاں، جس جگہ اور کسی بھی نوعیت کا فورم ہو، پاکستانی نمائندے

Scanned with CamScanner

نے کشمیر پر بھارتی مظالم کا ذکر کرنا اور بھارت مخالف تقریر جھاڑ دینی ہوتی ہے، خواہ اس فورم کا تعلق مچھر مارنے سے ہو۔ چنانچہ ہم عالمی شرکا کو بور کر کے خوشی خوشی 'کامیاب' دورے سے گھر لوٹ آتے ہیں۔ اس سے ہمارے جہادی میڈیا اور سلامتی اسٹیبلشمنٹ میں بیٹھے لوگوں کی انا کی تسلی ہو جاتی ہے۔ ہم نے منھ ریت میں گھسیڑا ہوا ہے۔ یہ دیکھ ہی نہیں رہے کہ 1947 کو گزرے تریسٹھ سال ہو چکے ہیں اور اس دوران پاکستان آدھا ہو کر منھ کے بل گر چکا ہے۔ یہ معاشی، صنعتی اور تعلیمی ترقی کا زمانہ ہے اور ان میدانوں میں ہم انڈیا سے منھ کی کھا چکے ہیں۔ انڈیا نہ صرف علاقے کی بڑی طاقت ہے بلکہ چین کے بعد دنیا کی ابھرتی ہوئی عالمی معیشت۔ وہ بین الاقوامی برادری کا ایک باعزت رکن ہے، اور ہم ایک بھک منگی، انتشار زدہ قوم اور ترقی یافتہ دنیا کے لیے باعث شرم ہونے کے سوا کچھ نہیں رہ گئے جس کے حکمران اشرافیہ بے شرم، کوتاہ نظر، نااہل اور زر پرست ہیں۔ کشمیر کا رونا رونے سے پہلے اپنے گھر کو دیکھ لیں۔ بلوچستان جل رہا ہے۔ پاکستان کی انڈسٹری اور بزنس کا مرکز کراچی جل رہا ہے۔ سرحد تباہ ہو چکا ہے۔ سندھ، پنجاب اندر سے کھوکھلے ہو رہے ہیں۔ بجلی گیس کا نہ ختم ہونے والا بحران رہی سہی معیشت کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ دنیا میں ہماری کوئی باوقار پوزیشن نہیں۔ وہ صرف اس خوف سے ہمارا خیال کیے ہوئے ہیں کہ یہ ملک بکھر گیا تو کیا ہوگا۔ لیکن وزارتِ خارجہ 'انڈیا سنٹرک' ہونے کے سوا کچھ نہیں جانتی۔ وزارت اور سفارت خانے ایک سفید ہاتھی کی مانند ہیں۔ کچھ لوگ پل کر موٹے ہو رہے ہیں۔ پچھلی چھ دہائی سے لکھے ہوئے ایک ہی 'ڈرافٹ' پر ساری وزارت کا گزارہ ہو رہا ہے۔ دنیا بھر کے مہذب ملکوں میں ساری مسلح افواج اپنی وزارتِ دفاع کے ماتحت ہوتی ہیں، لیکن یہاں سب جانتے ہیں پاکستان میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

ہمیں 'ترقی سنٹرک' خارجہ پالیسی کی ضرورت ہے۔ رٹا لگائی ہوئی بیوروکریسی کو باہر پھینکنا ہو گا۔ ہمارے ہاں امن، معاشی ترقی اور ملک میں سرمایہ کاری کے فروغ کی راہ جس سے بھی کھلتی ہو، اس راہ سے سب رکاوٹیں ہٹا دینی چاہیے۔ خارجہ پالیسی معاشی ترقی اور سرمایہ کاری کو سامنے رکھ کر ہو۔ جو قومیں تازہ اصول نہیں بناتی اور 'اصولوں' پر سودا نہ کرنے کا نعرہ مارتی ہیں وہ بوسیدہ ہو جاتی ہیں، شکست کا ان مقدر ہوتا ہے۔ پاکستان کی ترقی انڈیا کے ساتھ نارمل تعلقات سے مشروط ہو چکی ہے۔ لیکن سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کی زود پشیمانی ایسا کرنے نہیں دیتی۔ اسے سرحد پر جھنڈا اتارنے کی رسم بھی جارحیت دکھائے بغیر منظور نہیں، مبادا پاکستان کے عوام انڈیا سے نفرت کرنا ہی بھول جائیں۔ ہم

وہ بدنصیب قوم ہیں جس نے خود کو پنجرے میں بند کر کے اندر سے تالہ لگا لیا ہے۔

سیاسی حکومت بدنام کیوں؟

اس ملک کے بجٹ کے بھاری حصے، میلوں پر پھیلے زمینوں کے رقبے، ہر طرح کے کمرشل اور صنعتی کاروبار پر قبضہ کرنے کے بعد بالآخر اس ملک کے 'آزاد میڈیا' کے مالکوں اور اینکروں کو بھی خرید لیا گیا تاکہ قوم کو اپنی مرضی کا سنایا اور دکھایا جائے، واقعات کو توڑا موڑا جائے، لوگوں کی توجہ اصل مسئلے اور اصل نکتے سے ہٹا کر کسی اور طرف لگائی جائے، اپنی فاش غلطیوں اور ان کے خطرناک نتائج سے قوم کی توجہ کو بھٹکایا جائے، سلامتی اور دفاع کا واسطہ دے کر الٹا ان کی تعریف وتوصیف کی طرف لگا دیا جائے، 'قومی وقار' اور 'غیرت' کے نام پر حقائق سے چشم پوشی کی جائے اور خود فریبانہ عظمت کی ریت میں منہ گاڑ دیا جائے۔ یہ ٹھیک ہے، دنیا کی ہر سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کے پاس دشمن کے ساتھ نفسیاتی جنگ لڑنے کے ماہرین ہوتے ہیں، لیکن یہ ہمارا عجیب ملک ہے، یہاں نفسیاتی جنگ کے سب توپوں کا رخ ہمیشہ اپنی ہی قوم کی طرف ہوتا ہے۔ جھوٹ بولنا، حقائق سے گمراہ کرنا شاید انسانی زندگی اور معاشرت کی کوئی اضطراری اور وقتی ضرورت ہو، لیکن ہمارے ہاں اس کو ایک دائمی پالیسی کے طور پر، اپنی ہی قوم اور اپنے ہی ملک کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ ساری زندگی اور ساری تاریخ جھوٹ پر نہیں چل سکتی، اس کے نتائج تباہ کن ہو جاتے ہیں، لیکن یہ ہمارے مقدس گاڈ فادرز عقل سلیم (کامن سنس) کو بھی اپنی انا اور وقار کے سامنے آنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں ہیں۔ وطن اور حب الوطنی پر ان کی اجارہ داری ہو گئی ہے۔ قوم سے ہی تنخواہیں لیتے ہیں، قوم نے ان کو ملازم رکھا ہوا ہے، لیکن قوم کو بولنے کی اجازت نہیں۔ جو بھی چلے گی صرف ان کی چلے گی۔ قوم ان کا تحفظ اور احترام کرتی رہے، خواہ قوم اور ملک زخم زخم ہوتا رہے۔ عجب اندھیری سرنگ میں ہمیں لے آیا گیا ہے۔

میڈیا کے واسطے سے عجیب واردات ڈالی جا رہی ہے۔ جیسے سورج کا ہونا ایک ناقابل تردید حقیقت ہے، اسی طرح پاکستانی ریاست اور سیاسی منظر نامے میں یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں دفاع، سکیورٹی اور خارجہ امور کے معاملات کلی طور پر سیاسی حکمرانوں کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں۔

Scanned with CamScanner

اور جب کبھی انھوں نے ان پر اپنی 'رٹ' قائم کرنے کی کوشش کی، ان کے خلاف سازش کر کے جہنم رسید کر دیا گیا۔ یہ تریسٹھ سال کی کہانی ہے۔ غداری کے فتوے، پھانسیاں، قید و بند اور جلاوطنی کی ذلتیں برداشت کرنے والے ان سویلین سیاست دانوں کی کیا مجال ہے کہ وہ گرم جگہ پر اپنا پاؤں رکھ سکیں۔ ہم دور نہیں جاتے، اسی زرداری حکومت کو لے لیتے ہیں۔ اس نے آتے ہی آرمی چیف کو کہہ دیا کہ دہشت گردی کے خلاف جو بھی جنگ کا سلسلہ ہے اس کو آپ اپنی صوابدید سے چلائیں، حکومت آپ کو سپورٹ کرے گی۔ اگر سیاسی حکومت کی یہ بات غلط تھی تو آرمی والوں کو کہنا چاہیے تھا، حضور، آئین کے تحت اس ملک کے سب فیصلے کرنے اور پالیسیوں کو بنانے کا اختیار آپ کے پاس ہے، ہم تو آپ کے حکم کے تابع ہیں۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس دوران زرداری حکومت نے 'ممنوعہ علاقوں' کے بارے میں کچھ فیصلے کرنے کی سعی بھی کی تو اسے ہماری سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے نہ صرف بری طرح رد کیا گیا بلکہ زرداری کے خلاف پروپیگنڈا بھی تیز تر کر دیا گیا۔ حکومت کا مذاق اڑایا گیا اور اندر خانے دھمکی بھی دی گئی۔ آپ کو یاد ہوگا، آئی ایس آئی کو وزارتِ داخلہ کے ماتحت کرنے کی کوشش کی گئی۔ تب کیا ہوا؟ بھارت کے غصے اور عالمی دباؤ کو کم کرنے اور حقائق صاف کرنے کے لیے آئی ایس آئی کے چیف کو انڈیا بھیجنے کا عندیہ دیا گیا، تب ایک شور برپا کر دیا گیا۔ ہمارے آئی ایس آئی چیف اگر بھارت چلے بھی جاتے تو خدانخواستہ کیا قیامت آجانی تھی؟ انھوں نے وہاں پاکستان کا دفاع ہی کرنا تھا۔ اور اگر اسے سیاسی حکومت کا غلط فیصلہ بھی مان لیا جائے جس پر قیامت برپا کر دی گئی، تو سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کے ان درجنوں فیصلوں کا کیا کیا جائے جن کی وجہ سے پاکستان پر قیامتیں بیت گئیں اور قوم نے اف نہ کیا؟ اسامہ کے ایبٹ آباد میں پچھلے چار سال سے قیام کو ہی لے لیں۔ کیا بتایا جا سکتا ہے کہ اس واقعے سے پاکستان کا دنیا بھر میں کتنا وقار بڑھا ہے؟ اور اگر یہ سچ ہماری لاعلمی ہے تو اس عظیم سکیورٹی خطا اور غفلت پر کسی کو ذمے دار ٹھہرایا جائے گا؟ نہیں، کبھی نہیں۔ صرف سیاست دانوں کی خطائیں معاف نہیں کی جا سکتیں۔ کیری لوگر بل پر جو امریکی حکومت نے خود لکھا، ہمارا اس کے ساتھ کوئی تعلق بھی نہیں، ہو بھی نہیں سکتا، امریکہ کی کانگریس زرداری کی غلام نہیں ہے، لیکن ہماری سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ نے آئینی حدود سے تجاوز کر کے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ اس ملک کے چیف ایگزیکٹو اور صدرِ مملکت کچھ نہ بول سکے۔ امریکی قوانین پاکستانی سول حکمرانوں کی مرضی سے لکھے جا سکتے ہیں؟ ہماری سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کو اپنی یہ غلط فہمی دور کر لینی چاہیے کہ دنیا ان

کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ امریکہ تو روزِ اول سے ہمارا گھر کا بھیدی ہے۔

ستم ظریفی دیکھیے، میڈیا کے کچھ جانے پہچانے چہرے جو ایجنسیوں کے ساتھ رابطے میں ہونے بلکہ ان کا ماؤتھ پیس ہونے کی شہرت رکھتے ہیں، انھوں نے اسامہ کے امریکی آپریشن پر حکومت کو خواہ مخواہ بدنام کرنے کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ 'ہم' امریکہ کے ڈالروں اور اس کے ہتھیاروں کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے لیکن جماعت اسلامی، عمران خان، فرقہ وارانہ شدت پسند ملاؤں اور چینلوں کے اینکروں کو استعمال کر کے امریکہ کے خلاف ملک بھر میں نفرت کے جذبات بھی ابھارتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف ہر وقت سیاسی حکمرانوں کو بدنام کرواتے رہنا اور اپنی 'عزت بچاؤ' مہم چلوانا اس ملک کے ساتھ محبت کا اظہار نہیں، خطرناک بدبختی کا کھیل ہے۔ امریکہ کے خلاف اور اپنے جمہوری حکمرانوں (نکمے ہی سہی) کے خلاف مہم جوئی کو اپنی تعریفوں کے لیے استعمال کرنا ملک کے مسائل کو مزید گنجلک کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ ایک ہی راہِ نجات ہے: سچ کا سامنا کرو، جھوٹ بولنا بند کرو۔ تریسٹھ سال ہو گئے اس قوم کو جھوٹ کی زہر خوراکی دیتے۔ اب اس میں تھوڑی سی ہی جان باقی رہ گئی ہے۔ سازشی طرزِ عمل شاید مزید آپ کے لیے بھی اچھا نہ ہو۔ ہمیں خود سے ہی برسرِ پیکار نہیں رہنا، مل کر امن اور اس ملک کی تعمیر کی طرف آنا چاہیے۔

پاک سعودی تعلقات اور اس کے اثرات

ہمارے ہاں بہت سی پاک اور مقدس گائیں ہیں جن کی جانب انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ ان میں شخصیات، ادارے، نظریے اور بعض ممالک شامل ہیں۔ ان سب کے بارے میں سچ بولنا شجرِ ممنوعہ ہے۔ کسی کو مقدس بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے حق میں ہر وقت بڑھا چڑھا کر خوب پروپیگنڈا کیا جائے۔ لوگوں کو ذہنی غلام اسی طرح بنایا جا سکتا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی افسوسناک زوال زدہ سیاسی تاریخ میں سعودی عرب کے حکمران ایک بڑے حصے دار کے طور پر شامل رہے ہیں۔

سعودی عرب اور اس کے خاندان کی بہت سی خصوصیات ہیں۔ سعودی عرب تیل کی دولت سے مالا مال ملک ہے، آبادی تھوڑی ہے اور رقبے کے لحاظ سے بڑا ملک، زیادہ تر حصہ صحرائی ہے۔

پاکستان کے مسلم عوام کے نقطۂ نظر سے یہ بات بڑی اہم ہے کہ سعودی عرب وہابی عقیدے کا ملک ہے۔ وہاں پر موجود اسلام کے دو مقدس ترین مقامات کی وجہ سے سعودی عرب اور اس کا حکمران خاندان اپنے اس چہرے کو کیموفلاژ کر دیتے ہیں۔ ان کا حکومتی، سیاسی اور ذاتی کردار اسلام کے صریحاً خلاف ہونے کے باوجود وہ 'خادمِ حرمین شریفین' کا مقدس چولا اپنے اوپر پہن کر عالم اسلام کے اندر اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پیسہ، تقدیس، بادشاہت جب ایک ہو جائیں تو تاریخ بتاتی ہے، پھر کیا حشر برپا ہوتا ہے۔ سعودی عرب اس کی زندہ مثال ہے۔

ہمارے ہاں سادہ لوح عوام کو یہ باور کرایا گیا ہے کہ سعودی عرب 'اسلامی نظام' رکھنے والا ملک ہے، حالانکہ اس کا حکومتی اور ریاستی نظام صریحاً اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام میں خاندانی بادشاہت کا کوئی تصور نہیں۔ جب کسی ملک کا بالاترین ریاستی ڈھانچہ ہی غیر اسلامی ہو، وہ ملک خود اسلامی نظام کا حامل کیسے کہلوا سکتا ہے؟ لیکن پیسے اور تقدیس کے زور پر وہ مسلم عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب ہیں۔ پاکستان میں موجود وہابیوں سے سوال پوچھنا چاہیے کہ یہ کس طرح کا اسلامی نظام ہے جس کا طرزِ حکومت ہی غیر اسلامی ہے؟ سب سے پہلی درستی تو اوپر سے شروع ہونی چاہیے، جبکہ یہاں سب سے پہلی خرابی ہی اوپر سے شروع ہو رہی ہے۔ سعودی بادشاہت صریحاً ایک سخت آمرانہ دقیانوسی سماجی نظام پر مشتمل ہے جس کے ساتھ وہابی ملاؤں کا قدامت پرست سخت گیر ٹولا اس نظام کا حصے دار ہے۔ گویا اکیسویں صدی میں سعودی عرب کا سیاسی اور حکومتی نظام ازمنۂ وسطیٰ کے ان ادوار کا چربہ ہے جب یورپ میں بادشاہ چرچ کے پادریوں کے ساتھ مل کر حکمرانی کیا کرتا تھا۔ تاریخ اسے تاریک دور (Dark Ages) سے تعبیر کرتی ہے۔

یہ ساری اندھیر نگری تیل کی دولت چمک دمک اور امریکہ کی آشیر باد کی وجہ سے قائم ہے۔ عوام کو ذہنی اور جسمانی کنٹرول کرنے کے لیے طالبانی طرز پر ملاؤں کے ٹولے ڈنڈے پکڑے ہر وقت بازاروں گلیوں میں گھومتے رہتے ہیں جو راہ چلتے مرد و زن کو باقاعدہ ڈنڈے مار کر طالبان طرز پر 'شرعی احکامات' پر عمل درآمد کرنے پر مجبور کرتے ہیں، لیکن یہ 'شرعی احکامات' شاہی خاندان پر لاگو نہیں ہوتے۔ ملاؤں کو اُس طرف دیکھنے کی بھی اجازت نہیں۔ سارا 'اسلام' عام لوگوں کے لیے ہے حتیٰ کہ خود اپنے سعودی ہم وطنوں کے لیے بھی نہیں۔ سعودی عرب میں بوڑھے مردوں کا چھوٹی چھوٹی بچیوں سے نکاح عام ہے۔ ایک سے زیادہ شادیوں کا رواج ہے۔ نکاح اور طلاق، طلاق اور نکاح کے

Scanned with CamScanner

ساتھ بیویاں بدلتی رہتی ہیں۔ گھریلو تشدد کے واقعات بھی عام ملتے ہیں۔ غریب ملکوں سے آئے محنت کشوں کو کوئی حقوق حاصل نہیں۔ زیادہ تر ملاؤں کے شرعی احکامات بذریعۂ ڈنڈا انھی غریب ملکوں سے آئے محنت کش خواتین وحضرات پر لاگو کیے جاتے ہیں۔ جمعے کے روز چوکوں پر پبلک کے سامنے انھی ملکوں سے تعلق رکھنے والے ملزموں کی گردنیں کاٹنا معمول کا 'انصاف' ہے جس میں انصاف کم اور دہشت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔

کسی پاکستانی سے جو سعودی عرب میں رہتا ہے، اس کی تصدیق کی جاسکتی ہے کہ سعودی عرب میں کس قدر اسٹریٹ کرائم بڑھ چکا ہے۔ ہم جو میڈیا میں امریکہ ویورپ کے کالے لوگوں کے بارے پڑھتے ہیں، وطنی سعودی نوجوان کسی طرح ان سے کم نہیں۔ راقم اپنی کئی عزیز خواتین سے اس طرح کے قصے سن چکا ہے جب ان سے سرِراہ سعودی نوجوان پرس چھین کر بھاگ گیا۔ وہاں ہماری پاکستانی عورتیں ہر وقت، حتیٰ کہ گھروں میں بھی سہمی رہتی ہیں۔ اگر وہ بلڈنگ میں اکیلی ہیں تو ہر وقت خوف دامن گیر رہتا ہے۔ کوئی سعودی نوجوان ان کی عزت پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ وہاں عورتیں خود کو اپنی عزت اور مال کے لحاظ سے ہر وقت غیر محفوظ سمجھتی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس 'شرعی اور اسلامی معاشرے' میں انصاف کے لیے کوئی دادرسی نہیں۔ سب سے پہلے تو کوئی جرأت ہی نہیں کرتا کہ سعودی شہری کے خلاف رپورٹ کرے۔ اگر کر بھی دی جائے تو کوئی اتھارٹی اس کا نوٹس ہی نہیں لیتی۔ مثلاً سرراہ کسی خاتون سے اس کا پرس چھینے جانے کی صورت میں اگر قریب کھڑے کسی سعودی پولیس والے سے شکایت کریں گے تو وہ مسکرا کر کہے گا: ''کوئی بات نہیں، بچے ہیں...'' غریب ملکوں سے تعلق رکھنے والے افراد میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے کسی سعودی نوجوان سے گالیاں، بدزبانی اور اپنی توہین نہ کروائی ہو، جنھیں گھٹیا اور کم تر اور فقیر نہ کہا گیا ہو۔ سعودی بچوں کو غیر ملکی کی لوگوں کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آنے پر والدین بھی کچھ نہیں کہتے۔ فلپائن، سری لنکا، بنگلہ دیش وغیرہ سے تعلق رکھنے والے گھریلو ملازمین کے ساتھ تشدد اور ان کے حقوق پر ڈاکا عام سی شکایات ہیں۔ خواتین گھریلو ملازمین کے ساتھ جنسی زبردستی بھی عام ہے۔

یہ وہ ننگے حقائق ہیں جو ہمارے ہاں سعودی عرب کے بارے میں چھپائے جاتے ہیں۔ سعودی نوجوان نسل کا اخلاقی کردار تباہ کیا جا چکا ہے۔ وہ آوارہ ہو چکے ہیں۔ امیروں اور حکمران خاندان کے بچے ہر طرح کے غیر شرعی کاموں میں ملوث ہیں اور نچلے طبقات سے تعلق رکھنے والوں

Scanned with CamScanner

کے بچے اسٹریٹ کرائم میں مصروف ہیں۔ سعودی عرب کے نوجوانوں کا ایک حصہ اپنے حکمرانوں کی عیاشیوں، امریکہ کی کاسہ لیسیوں کی وجہ سے منحرف ہو کر دہشت گرد باغی اسلامی تنظیموں میں شامل ہو گیا ہے۔ القاعدہ اور بن لادن اس کی مثال ہے۔

نو گیارہ کے واقعے میں اکثریتی نوجوانوں کا تعلق سعودی عرب سے تھا۔ سعودی عرب کے باشندوں میں آپ کو شرفِ انسانیت نام کی چیز کم ہی نظر آئے گی۔ وہ یا تو قومی تکبر کا شکار ہوگا، یا اخلاقیات سے گرا ہوا۔ خاص طور پر جب سامنے والا کسی کمتر قوم اور ملک سے تعلق رکھتا ہو۔ لیکن سامنے امریکی اور یورپی آجائے تو اس کے سامنے بچھ جائیں گے۔ اپنے سے نیچے والوں کو گھٹیا سمجھو اور اپنے سے زور آور کے پاؤں پکڑ لو، یہ ہے سعودی معیارِ اخلاق جس کے اسلامی نظام کی ہمارے ہاں دھوم مچائی جاتی ہے۔ مذہب کے نام سے انسانوں کو دھوکا دینا بڑا پرانا ہتھیار رہا ہے۔

ہمارے پاکستانی حکمران خود کاسہ لیسی اور چاپلوسی میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ یہ سدا کے وہ انٹرنیشنل فقیر ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنے ملک کے وسائل اور عوام کو بے تحاشا لوٹا ہے بلکہ اس ملک کے نام پر حاصل کی ہوئی بیرونی امداد اور قرضوں کی رقم بھی کھا جاتے ہیں۔ یہ 'دہاڑیاں' لگانے آتے ہیں۔ قومی عزتِ نفس اور ملک کے دوررس مفادات سے ان کو کوئی غرض نہیں ہوتی۔ چنانچہ جہاں کچھ ڈالر اور درہم و دینار مل جائیں، یہ خود بھی ان کے پاؤں میں گر جاتے ہیں اور ملک کو بھی ان کے پاؤں کی جوتی بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ گلف کی تمام ریاستوں کے حکمرانوں کو پاکستان میں خصوصی حیثیت اور تکریم حاصل رہی ہے۔ ان کے مشغلوں کے لیے تمام ملکی قوانین پس پشت ڈال دیے جاتے ہیں۔ جب کوئی قوم معاشی غلام ہو اور چمچہ گیر بھی، تو پھر فقط معاشی غلامی ہی نہیں ہوتی، سیاسی غلامی کا طوق بھی پہننا پڑتا ہے۔ چنانچہ سعودی عرب ہو یا امارات، وہ ہمارے اندرونی سیاسی معاملات میں بھی مداخلت کرنے لگے اور پاکستان کی خارجہ پالیسی کو بھی کنٹرول کرتے ہیں۔ اب ہم امریکہ بہادر کے علاقائی چمچوں کے چیچے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے ہاں سیاسی اتھل پتھل، کسی حاکم کے آنے اور جانے میں مذکورہ عرب ریاستیں کھلم کھلا مداخلت کرتی ہیں۔ سعودی عرب کی مداخلت کی جرأت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ سعودی انٹیلی جنس کا چیف بذاتِ خود ہمارے سابق وزیر اعظم نواز شریف کو 'لینے' (گرفتار کرنے) آتا ہے۔ ہمارے اندرونی سیاسی اور حکومتی فیصلے اب ریاض، دبئی اور ابوظہبی میں ہوتے ہیں۔ سعودی عرب جس کو چاہے، سرکاری 'عمرے' پر لے جائے، اور وہ 'عمرہ' آٹھ دس سال تک طویل

بھی ہوسکتا ہے!

سعودی حکمران خاندان اپنی عیاشانہ طرزِ زندگی کے لحاظ سے عالمی شہرت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں بے حد وحساب مواد کتابوں، رسالوں، مغربی میڈیا میں مل جاتا ہے۔ یہ لوگ جب یورپ جاتے ہیں تو وہاں 'انسانی گوشت' کی منڈیوں کے بھاؤ میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی یوٹیوب میں جا کر ان لوگوں کے اصل چہرے دیکھ سکتا ہے۔ تیل کی وہ دولت جو خود ان کے اپنے عوام پر اور امتِ مسلمہ کی ترقی اور خوشحالی کے لیے لگنی چاہیے تھی وہ ان چند سو یا ہزار افراد پر مشتمل حکمران خاندان کی ایک ایسی عیاش زندگی پر خرچ ہو رہی ہے جس کا عام مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا۔ ان کی ذاتی زندگی تمام اسلامی اور انسانی اخلاقیات سے مبرا ہے۔ ایک ایک بندے کے پاس دنیا بھر میں قیمتی محلات، قیمتی گاڑیوں کے بیڑے، قیمتی کروز، پرائیویٹ انتہائی قیمتی بڑے بڑے جہاز ہیں۔ یورپ والے اس قیمت کی چیزیں صرف ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں۔ آس پاس نوجوان خوبصورت لڑکیوں کی فراوانی، لاس ویگاس کے کیسینو ان سے آباد۔ سعودی عرب نے ہمیں کوئی صنعت لگا کر نہیں دی، کوئی سائنسی ریسرچ ادارہ، کوئی انجینئرنگ یونیورسٹی بنا کر نہیں دی؛ انتہا پسند مولوی اور جہادی بنانے والے مذہبی مدرسے یا مسجدیں دے دی ہیں۔ سعودی عرب دنیا بھر میں، خاص کر یورپ اور امریکہ میں، سب سے زیادہ مسجدیں بنانے والا ملک ہے! یہ صرف عام مسلمان کو دھوکا دینے کا عمل ہے تاکہ عام مسلمان کو جاہل رکھا جا سکے، دنیا کے مسلمان ترقی نہ کر سکیں۔ یورپ اور امریکہ کی ہر ڈوبتی کمپنی اور صنعت کو یہ لوگ خرید لیتے ہیں۔ سرمایہ داری نظام جب بھی ڈولنے لگتا ہے، یہ لوگ اس میں ڈالر لگا دیتے ہیں تاکہ اسے پھر زندگی مل جائے۔

دوسری طرف عام مسلمانوں کے حج اور عمرے پر روز بروز ٹیکس لگائے جاتے ہیں اور اسے مہنگا کیے جا رہے ہیں۔ سعودی باشندوں نے حج اور عمرے کے دوران دی گئی خدمات کے بدلے کمائی کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ حالانکہ حج اور عمرہ مفت ہونا چاہیے، ان کو دولت کی کوئی کمی نہیں۔ انھوں نے مقدس مقامات کو ساری دنیا کے غریب ملکوں کے مسلمانوں کو لوٹنے کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایران کی اس تجویز پر زور دینا چاہیے کہ مکہ اور مدینہ کو تمام دنیا کے مسلمانوں کے اجتماعی انتظام و انصرام میں دے دیا جائے۔ مکہ اور مدینہ پر دنیا بھر کے سب مسلمانوں کا مساوی حق ہے، چنانچہ ان کو مسلمانوں کے بین الاقوامی شہر قرار دینا چاہیے۔

Scanned with CamScanner

سعودی عرب نے ہم پر جو مہربانیاں کی ہیں، اس میں ہمارے ملک میں انتہا پسند، شدت پسند جہادیوں کی نرسریوں اور فیکٹریوں کا قیام ہے۔ آج ہمارا ملک دہشت گردی کی جس قبیح صورت حال سے دو چار ہے، سعودی عرب کا اس کی تشکیل اور تعمیر میں بہت بڑا ہاتھ ہے۔ امریکہ کا اسلحہ تھا، سعودی کے پیٹرو ڈالر۔ ایک طرف جہادیوں کی فوری تیاری کے لیے ٹریننگ کیمپ لگائے گئے، دوسرے ان کی نسل در نسل آمد کے سلسلے کو یقینی بنانے کے لیے ملک بھر میں وہابی اور دیوبندی مسلک کے مدرسے شہر، شہر، گاؤں، گاؤں، گلی گلی کھلوائے گے۔ وہابی انتہا پسند مسلک کا فروغ پاکستان میں سعودی حکمرانوں کا ایجنڈا ہے۔ سالہا سال سے ڈالروں اور ریالوں کی بارش کا سلسلہ جاری ہے۔

پاکستان کی اکثریتی آبادی سنی حنفی متعدل مسلک کی تھی۔ یہ خلق خدا سے بلاتفریق محبت کرنے والے صوفیوں کی سرزمین ہے۔ بہت تھوڑے سے مذہبی مدرسے ہوا کرتے تھے، جن سے ضرورت کے مطابق ائمہ کرام اور علما بن جایا کرتے تھے۔ سعودی پلان اور اسکیم کے تحت پاکستان میں وہابی مسجدوں، سلفی مدرسوں کا جال پھیلا دیا گیا۔ سنی حنفی فرقے سے یا تو مسجدیں قبضے میں لے لی گئیں یا ہر نئی مسجد وہابی فرقے کی بنا دی گئی اور ساتھ مدرسہ کھول دیا گیا۔ ہمارے حکمران اور بیوروکریٹ اپنی آرام پرست زندگی میں مست تھے اور ملک کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کیا جا رہا تھا۔ جب ہزاروں وہابی اور دیوبندی مدرسوں سے فارغ التحصیل ہو کر لاکھوں کے حساب سے نوجوان مولوی نکلنے شروع ہوئے تو چند سالوں میں اس ملک کا بنیادی مذہبی ڈھانچہ تبدیل ہو گیا۔ اس ملک کا اکثریتی مسلم فرقہ اب کمزور ہو کر اقلیت میں جانے والا ہے۔ اب ہر دوسرا فرد بھاری بھرکم ڈاڑھی رکھے، سر پر ٹوپی پہنے اور شلوار ٹخنوں سے اٹھائے نظر آئے گا۔ تین دہائی پہلے یہ ہمارا پاکستان نہیں تھا۔ پاکستان کے مسلمان اس طرح کے نہیں تھے۔ وہ تو بڑے مرنجاں مرنج لوگ تھے۔

ہم اپنے بچپن میں تمام اسلامی تہوار بڑے ثقافتی انداز سے منایا کرتے تھے۔ ایک رونق ہوتی تھی، جس میں خوشی کا عنصر ہوتا تھا۔ یہ جارحانہ اور متشدد قسم کا اسلام تو پاکستانی نہیں۔ پاکستان کے مسلمان مذہب اور دنیا کو ساتھ ساتھ رکھنے والے تھے۔ ہمارے تمام سیاسی، علمی اور ادبی قائدین بڑے اعتدال والے اور دین اور دنیا کو ساتھ ساتھ چلانے والے تھے۔ ہم محمد علی جناح، اقبال اور سرسید کی میراث ہیں۔ ان کا اسلام تو ان وہابیوں جیسا نہیں تھا۔ یہ ہمیں مذہب کے نام پر برباد کرنے والے کہاں سے آ گئے ہیں جنھوں نے اس صوفیا اور اولیاء اللہ کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے؟ یہ سعودی برانڈ

Scanned with CamScanner

اسلام ہمارا نہیں ہے۔ یہ تو برطانوی سامراج نے ایک سازش کے تحت ایک قبائلی سردار ابن سعود کو ایک انتہا پسند ملا عبدالوہاب کی شراکت سے اپنے جال میں پھانسا تھا۔ مطلب ترکی کی خلافت کو کمزور کرنا اور ان علاقوں پر قبضہ کرنا تھا۔

آج پاکستان کی یونیورسٹیوں سے اتنے طلبا ڈاکٹر، انجینئر نہیں نکل رہے جتنے ان مذہبی مدرسوں سے نکل رہے ہیں جنھیں ایک اور مسجد اور مدرسہ بنانے کے سوا کوئی اور کام نہیں ہوتا۔ اب یہ سارا نظام ایک مافیا کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ مسجدیں باقاعدہ فروخت ہوتی ہیں۔ ان کے سودے ہوتے ہیں۔ نئی مسجدیں بنانے کے لیے دباؤ ڈالے جاتے ہیں یا غیر قانونی طور پر سرکاری یا خالی زمینوں پر قبضہ کیا جاتا ہے۔

پوری قوم بلیک میل ہو چکی ہے، مذہب اور مذہبی گروہ ایک خوف کی علامت بن چکے ہیں جن کے سامنے کسی شرافت، قانون، اخلاق، اصول کی بات نہیں کی جا سکتی۔ یہ ہے سعودی برانڈ مذہب کا وہ شاخسانہ جو پاکستان کو تہذیبی لحاظ سے پتھر کے وحشیانہ دور میں پھینک رہا ہے اور اپنے ملک میں اس سعودی برانڈ مذہب کو درآمد کرنے والے وطن فروش حکمران طبقے حاصل کردہ ڈالروں میں مست ہیں۔

بسنت کا ماتم

ہم نے اپنے ماحول اور انفرادی زندگی کو اس حد تک جامد، خشک، بے کیف اور حسن اور لطف سے عاری کر رکھا ہے کہ بحیثیت حیوان جن جبلی خوشیوں پر ہمارا حق ہو سکتا تھا، یہ کہہ کر کہ ہم حیوان نہیں انسان ہیں، ان سے خود کو محروم کر لیا، اور انسان ہونے کے ناتے جن خوشیوں پر حق ہو سکتا تھا انھیں یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہم انسان نہیں مسلمان ہیں . . . وہ بھی پاکستانی! یہ ہے ہمارا ثقافتی المیہ۔ دنیا کی شاید ہی کوئی قوم اور ملک ہو جو اپنے اپنے ڈھنگ سے موسمی تہوار نہ مناتی ہو، خاص طور پر موسم بہار۔ لفظ بہار صرف لبوں پر آتے ہی انسان خوشبوؤں اور رنگوں سے بھرے پھولوں کی طرح کھل اٹھتا ہے۔ ہم برصغیر جنوبی ایشیا کے باشندے ہیں جہاں ہندو سکھ عیسائی مسلمان سب مل کر رہتے ہیں۔ دنیا کی ہر قوم میں، اپنے اپنے مذہبی رنگ کے ساتھ، تہواروں کا تعلق موافق موسموں کے آنے اور فصلوں کی کٹائی

سے تھا۔ انسانی زندگی کی بنیاد معاشیات کے ذریعے حیات کی گارنٹی کا حصول اور پھر اپنے وجود کے 'ہونے' کا مزہ لینا ہے۔ اپنی سانسوں اور زندگی کو خراج دینا ہے: کچھ جھوم کر، کچھ گا کر، کچھ کھیل کر، کچھ ناچ کر۔ باقی تہذیب اور تقدیس کے نام پر سب سلسلے اس کی نفسیاتی الجھنوں کا شاخسانہ ہیں جنھوں نے بالآخر انسان کو مسخ کر دیا ہے۔ ہم پاکستانی تو اس کے سخت گھیرے میں آ چکے ہیں۔ انسان سے خوش ہونے کے حق کو چھیننا ایسے ہی ہے جیسے کسی تر و تازہ پھول کو مسل دینا۔ سو وحشت، دہشت اور کرختگی نے ہماری سماجی فکر کو گھیر لیا ہے۔ تقدیس کے نام پر کسی میٹنگ اور مجمعے میں قتل کرنے کے لیے اکسایا جائے تو مجمع تالیاں بجانا شروع کر دیتا ہے۔ فلاں کو سرِعام پھانسی دے دو، لاش کو لٹکا دو، مار دو، جلا دو، دشمن کو تباہ کر دو، ایٹم بم چلا دو، دیکھنے والی میلی آنکھ نکال دو ۔ ۔ ۔ یہ ہمارے ہاں کے مقبولِ عام خطیبانہ فقرے ہیں۔ ان وحشیانہ فقروں پر ہجوم کی باچھیں کھل جاتی ہیں، ان کے اندر ایسی انرجی آ جاتی ہے جو تباہی لا سکتی ہے، تعمیر نہیں کر سکتی۔

ہمارے ہاں تاریکی پسند قوتوں کی طرف سے بسنت پر بہت عرصے سے حملے ہو رہے تھے۔ اس کا پرزور سلسلہ جنرل ضیا کے دورِ سیاہ میں شروع ہوا تھا جب بسنت کو ہندوؤں کا تہوار کہا جانے لگا اور اس کی مخالفت ہونے لگی۔ لیکن یہ لاہوریوں کی سخت جانی تھی کہ انھوں نے بسنت تہوار کو زندہ رکھا۔ دن بدن یہ مزید مقبول ہونے اور پرجوش طریقے سے منایا جانے لگا بلکہ عالمی شہرت اختیار کر گیا۔ اسلام آباد میں غیر ملکی سفارت کاروں نے بھی خاص طور پر بسنت کے موقعے پر لاہور آنا شروع کر دیا، گویا بسنت کا تہوار پاکستان کے 'سافٹ امیج' میں اضافے کا بھی باعث تھا۔ لیکن مولویوں اور دائیں بازو کے لوگوں کو یہ دن ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ یہ لوگ عوام کو خوشیوں میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے۔ وہ جسمانی اور روحانی طور پر عوام کو ہر دم اپنا مطیع بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ ملائیت کو لوگوں کی زندگیوں پر کنٹرول چاہیے، انسان کو اس کی اپنی زندگی پر اختیار نہ رہے۔ اسی لیے وہ لہو و لعب کے خلاف ہوتے ہیں کیونکہ اس طرح لوگ ان کے کنٹرول سے باہر ہو جاتے ہیں۔ لوگ اپنی زندگیوں سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں، یوں وہ مولویوں کے جال سے نکل سکتے ہیں۔ ملائیت کا مقصد انسان کو اپنی زندگی کے اوپر اختیار سے محروم کرنا اور اسے کسی ماورائی چکر میں ڈال دینا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے ہم اجتماعی طور پر حسن کے احساس اور خوشیوں کی لذت سے غیر آشنا بلکہ ان کے بیری

Scanned with CamScanner

بن چکے ہیں۔ سنجیدگی کا مارا، تاریکی پسند اور جمالیاتی حسوں سے محروم انبوہ کثیر عالمی تہذیبِ نو سے اپنی ثقافتی، سیاسی اور معاشی دشمنی میں اضافہ کیے چلا جار ہا ہے۔ ہم پاکستانی بربادی اور موت کی علامتوں سے اپنی شاہراہوں کو سجانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ خود ساختہ اخلاقیات اور منافقانہ پارسائی کے خبط نے ماحول میں گھٹن اور بے کیفی اس حد تک بڑھا دی ہے کہ ہمارے اندر زندگی اور دنیا کو خوبصورت بنانے یا اسے ترقی دینے کی لگن اور دلچسپی کا عنصر ہی ختم ہو گیا ہے۔ جب بسنت کو ہندوانہ تہوار کہنے سے بھی لوگ اسے منانے سے باز نہ آئے تو اس بسنت کے تہوار کو دیگر بھونڈے الزامات سے بدنام کرنا شروع کر دیا۔ میڈیا کے ذریعے گلے کٹنے کا ایک ہنگامہ اور شور برپا کر دیا گیا، دہائی ڈال دی گئی، جیسے بسنت کی وجہ سے کوئی کربلا کا میدان لگ گیا ہے۔ چنانچہ بسنت پر شب خون مارنے کا ایک بہانہ تخلیق کیا گیا۔ دنیا میں کہیں نہیں ہوتا، اور یہ عقل اور منطق کے خلاف ہے، کہ کسی حادثے کی وجہ سے انسان اپنی سرگرمی ہی چھوڑ دے۔ شارٹ سرکٹ سے آگ لگ جاتی ہے، انسان مر جاتے ہیں، بے پناہ مالی نقصان ہو جاتا ہے۔ کیا انسان بجلی کا استعمال بند کر دے؟ ہوائی جہاز گر جاتے ہیں۔ کیا انسان جہاز کی سروس ترک کر دے؟ سڑکوں پر ٹریفک کے حادثے ہو جاتے ہیں۔ کیا سڑکوں پر گاڑیاں چلانا بند کر دی جائیں؟ حالانکہ یہ سب حادثے انسان کو باہوش کرتے ہیں اور اسے مزید بااصول اور مہذب ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ گلے کٹنے کا معاملہ انتظامی اور عوامی ہوشمندی سے حل کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ایسی خاص قسم کی ڈوری بناتے ہیں، حکومت انھیں کنٹرول کرے، ان لوگوں کو پکڑے۔ عوام میں شعور بلند کیا جا سکتا ہے کہ وہ موٹر سائیکلوں پر بسنت کے دنوں میں احتیاط سے کام لیں، بچوں کو نہ بٹھائیں۔ کپڑے سے ڈھانپا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی تجویز رہی ہے کہ پتنگ بازی کے لیے خاص میدان اور جگہیں مختص کر دی جائیں۔ غرض کہ انسان ہر مسئلے کے سو حل نکال سکتا ہے۔ لیکن بسنت پر پابندی ہی کیوں ضروری سمجھی گئی؟ سیدھی سی بات ہے، ہماری عسکری ہیئتِ مقتدرہ اور مولوی نہیں چاہتے کہ عوام کو ان کی زندگیوں کا اختیار دیا جائے۔ عوام کہیں ان سے پر امن، خوشیوں بھری خوبصورت زندگی کا مطالبہ ہی نہ کر دیں۔ انھیں ہر وقت تقدیس اور ملکی سلامتی کے نام پر عسکریت پسند بنانا ہے۔ لاہوری بسنت نہ منائیں بلکہ واہگہ بارڈر پر جا کر بھارت پاکستان دشمنی کا مظاہرہ دیکھیں۔ چنانچہ پاکستانیوں کی تفریح بھی جنگجویانہ اور دشمنانہ جذبات ابھارنے والی ہوتی

Scanned with CamScanner

چاہیے، جہاں قوموں کے درمیان نفرت انگیز نعرے بلند کیے جائیں۔ قوم کے اندر مصنوعی احساسِ برتری پیدا کیا جائے۔ یقینی طور پر ہم جانے انجانے میں خود کو ثقافتی تباہی کی طرف لے جا چکے ہیں۔

نیا سال... منانا منع ہے!

یہ سال بھی الوداع ہونے والا ہے۔ وقت کا کام آنا اور چلے جانا ہے۔ تمام وجود وقت کے دریا میں بہہ رہے ہیں۔ سلسلۂ وقت لافانی ہے، وجود آتے اور چلے جاتے ہیں۔ انسان جو احساس اور شعور کے ساتھ زندہ رہنے والی چیز ہے، جو اپنی دنیا کا آپ خالق ہے، سارے سوال اور جواب اس کے اسی زندگی میں ہوتے ہیں۔ اس نے اعمالوں کا حساب خود اپنے اور اپنی نسلوں کو دینا ہوتا ہے۔ اس نے خود ہی سب نتائج بھگتنا ہوتے ہیں۔ انسان کی زندگی کوئی مذاق نہیں۔ اس کائنات میں صرف انسانی مخلوق ہی اپنے وجود کے ارتقا، حرکت اور ماحول کے ساتھ تفاعل میں پورے احساس، شعور اور جذبات کے ساتھ زندہ رہتی ہے، چنانچہ یہ زندگی ایک کٹھن آزمائش سے کم نہیں۔ امکانات کی دنیا، حیرانیوں کی دنیا۔ جا بجا دکھ تکلیفیں، بیماریاں، انجانے خوف ہر آن ساتھ چلتے ہیں۔ یہ دنیا انسان کے لیے اتنی موافقت والی نہیں تھی۔ اسے موافق کرنے کے لیے ہر آن کچھ عذابوں سے گزرنا ہوتا ہے، چنانچہ اس نے جانا کہ اسے اپنی زندگی اور حاصلات کا جشن منانے کا پورا حق ہے، جسے انسانوں نے کبھی نہیں چھوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے اس جہدِ حیات کے سفر میں خوشی، تفریح اور مسرت کے لمحے ضرور چرا کر رکھے ہیں اور یہی لمحے اس کی حیات کا نچوڑ ہوتے ہیں۔

جو قومیں اپنی زندگی کو خود بنا رہی ہیں، انھوں نے کبھی مسرتوں کے لمحات پر سمجھوتہ نہیں کیا، ورنہ حاصلِ زندگی رہ کیا جاتا ہے؟ انسان جنگلوں میں تھا، تب بھی اس نے رقص کیا، موسیقی کی دھن میں گایا، مستی میں جھوما۔ یہ اس کا اپنی کامیابیوں کو خراج تھا، اپنے ہونے کو سلام کرنا تھا، اپنی عظمت سے لطف اندوز ہونا تھا۔ اسی طرح اس برس بھی نئے سال کے موقع پر ترقی یافتہ قوموں سے تعلق رکھنے والے اور اپنی زندگیوں سے پیار کرنے والے اربوں لوگ اپنے وجود کو خراج پیش کریں گے۔ رنگوں، روشنیوں میں، موسیقی کی لے پر اپنے پیاروں کے ساتھ جشن منائیں گے۔ اس لیے کہ انھیں پتا ہے کہ یہ زندگی

Scanned with CamScanner

کچھ اتنی آسان نہیں ہے، وقت کا یہ دھارا ہر آن ایک چیلنج ہے، وہ کسی کے ساتھ بھی کسی بھی لمحے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ نئے سال کا لمحہ وقتِ حساب بھی ہوتا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو کچھ کھویا اور پایا ہوتا ہے، کچھ اچھا اور شاید کچھ اچھا نہیں ہوا ہوتا، وہ یاد آتا ہے۔ اپنے سفر سے سیکھنا ہوتا ہے، آنے والے وقت کے ساتھ پھر سے کچھ امیدوں کو باندھنا ہوتا ہے، اپنے اندر ایک نئی قوت اجاگر کرنی ہوتی ہے۔ یہ قومیں سچ مچ 'زندہ' ہوتی ہیں، پورے شعور کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہی ہیں، اور ایک ہماری طرح کی قومیں ہوتی ہیں جو محض زندہ ہونے کے واہمے میں زندگی گزار دیتی ہیں۔

ہمارے ہاں تہذیبی، موسمی اور عالمی تہوار منانے پر کفر کے فتوے لگ جاتے ہیں کہ لوگ کسی بہانے خوش کیوں ہونے لگے! پوری دنیا میں قوموں کے رنگارنگ جشن، کارنیوال دیکھنے کی چیز ہوتے ہیں۔ اِس ملک میں کسی عوامی میلے اور ثقافتی جلوس کا کوئی تصور نہیں جس میں عوام اپنی سرمستی کا والہانہ اظہار کر سکیں۔ صرف بسنت کا تہوار ایسا تھا جس کا مولوی سے کوئی تعلق نہیں تھا، جس میں کچھ ڈھول تماشا، ہاؤ ہو، گانا بجانا ہو جاتا تھا، خواتین اور لڑکیاں بھی حصہ لینے لگی تھیں۔ بنیاد پرستوں نے اس پر بھی پابندی لگوانے کے کئی بہانے تراش لیے ہیں۔ سال نو کی آمد پر اس ملک کی حالت قابلِ دید ہوتی ہے۔ قوم کو 'خوشی' جیسی 'فحاشی' سے بچانے کے لیے ہماری اسٹیبلشمنٹ ایک بنیاد پرست جماعت کے دباؤ پر پورے ملک کو سرِ شام قبرستان بنانے کے احکامات جاری کر دیتی ہے۔ شاپنگ مال شام ہی شام بند کرنے کی ہدایات جاری کر دی جاتی ہیں کہ کہیں کوئی شخص نیو ایئر منانے کے گناہ کا مرتکب نہ ہو جائے۔ ہوٹلوں کو خصوصی طور پر وارننگ دی جاتی ہے، خبردار اس عالمی تہوار پر کوئی تقریب منعقد کی یا اپنے گاہکوں کے لیے تفریح کا کوئی سامان بہم پہنچایا!

یہ اس رات کی بات ہے جب ساری دنیا عقیدے اور رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر نئے سال کے آنے کا والہانہ استقبال کر رہی ہوتی ہے۔ پاکستان میں سال بھر بے تحاشا چھٹیاں ہوتی ہیں، لیکن یکم جنوری کی چھٹی نہیں ہوتی! ہم وہ لوگ ہیں جن کا وقت کے ساتھ کوئی لینا دینا نہیں۔ ہم وقت کی رفتار اور تاریخ سے ماورا ہیں۔ شاید اسی لیے تاریخ اور وقت بھی ہمیں بھلا چکے ہیں۔ ترقی یافتہ دنیا کی غلامی اور ذلت آمیز پس ماندگی ہمارا مقدر ہے۔ ہم عجیب روحانی فلاسفی پر ایمان رکھتے ہیں۔ حقائق کی نفی ہوتی ہے اور توہمات پر لڑتے مرتے ہیں۔ کسی تہذیب کو اگر اس طرح کی نفسیاتی کیفیت میں باندھ دیا جائے جس میں حیوانی اور انسانی خونریزی کی علامتیں مقصدِ حیات بن جائیں تو اس سے زیادہ خوفناک

Scanned with CamScanner

ذہنی کیفیت اور کیا ہو سکتی ہے! یہ تو سادیت پسندی ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ اس طرح کا 'اسلام' صرف پاکستان اور سعودی عرب تک ہی محدود ہے، ورنہ دیگر مسلم اور عرب ممالک میں ثقافتی گھٹن کی یہ شکلیں موجود نہیں ہیں جنھیں مذہب کے نام پر اس ملک میں بزور نافذ کیا گیا ہے۔

پابندیوں کا مقصد خوشیوں کے وسیلوں کو مہنگا کرنا ہوتا ہے۔ اس ملک میں عیش و عشرت کا ہر سامان ہر اس شخص کو میسر ہے جو انھیں حاصل کرنے کی استعداد رکھتا ہے، اور یہ سب لوگ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے معزز اور ممتاز شہریوں میں شمار ہوتے ہیں۔ منافقت کے اس کھیل میں ۔ باست دان، باوردی اور سول بیوروکریٹ، جاگیردار، تاجر، صنعت کار، دینی رہنما، ادیب، شاعر، صحافی اور دانشور، سب شامل ہیں۔ ساری نیکی اور پرہیزگاری عام آدمی کے لیے رکھ چھوڑی ہے۔ عوام کو روزگار، تعلیم اور صحت کی سہولتیں ہی نہیں، حکمران طبقات سے زندگی کی دیگر خوبصورتیوں پر اپنا حق بھی مانگنا چاہیے۔ عوام کا خوشیوں پر حق تسلیم کر کے ہی مدرسہ اور جہادی کلچر اس ملک سے ختم کیا جا سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

سٹی پریس میں دستیاب مطبوعات

افسانے کی حمایت میں

شمس الرحمٰن فاروقی

قیمت: ۲۴۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

افسانے کی تلاش

نیر مسعود

قیمت: ۲۴۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

دھنی بخش کے بیٹے

حسن منظر

قیمت: ۶۰۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

دو مختصر ناول

حسن منظر

قیمت: ۱۶۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

خاطرِ معصوم

ضمیر الدین احمد

قیمت: ۱۸۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

ندیدی

حسن منظر

قیمت: ۲۰۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

شادیانے

نجیب محفوظ؛ ترجمہ: فہمیدہ ریاض

قیمت: ۱۸۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

یہ خانہ آب وگل

انتخاب وترجمہ: فہمیدہ ریاض

قیمت: ۲۲۰ روپے

ناشر: شہرزاد پبلی کیشنز، (کراچی)

Scanned with CamScanner

سٹی پریس میں دستیاب مطبوعات

بے افسانہ
مرزا اطہر بیگ
قیمت: ۲۰۰ روپے
ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، (لاہور)

غلام باغ
مرزا اطہر بیگ
قیمت: ۶۰۰ روپے
ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، (لاہور)

مغالطے مبالغے
مبارک حیدر
قیمت: ۲۰۰ روپے
ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، (لاہور)

صفر سے ایک تک
مرزا اطہر بیگ
قیمت: ۴۰۰ روپے
ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، (لاہور)

تعلیم اور ہماری قومی الجھنیں
ارشد محمود
قیمت: ۳۰۰ روپے
ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، (لاہور)

تہذیبی نرگسیت
مبارک حیدر
قیمت: ۱۵۰ روپے
ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، (لاہور)

سیلاب ڈائری
وسعت اللہ خان
قیمت: ۴۰۰ روپے
ناشر: پاکستان اسٹڈی سینٹر، (جامعہ کراچی)

تصورِ خدا
ارشد محمود
قیمت: ۲۰۰ روپے
ناشر: فکشن ہاؤس، (لاہور)

Scanned with CamScanner

شاعری

ریت پہ بہتا پانی

قاسم یعقوب

قیمت:160 روپے

خودکشی کے موسم میں

زاہد امروز

قیمت:120 روپے

مٹی کی کان

افضال احمد سید

قیمت:500 روپے

مٹی کا مضمون

فرخ یار

قیمت:150 روپے

سویرے کا سیاہ دودھ

پاؤل سیلان؛ ترجمہ: آفتاب حسین

قیمت:150 روپے

جنگ کے دنوں میں

ذی شان ساحل

قیمت:125 روپے

ای میل اور دوسری نظمیں

ذی شان ساحل

قیمت:150 روپے

نیم تاریک محبت

ذی شان ساحل

قیمت:100 روپے

بے یقین بستیوں میں

علی اکبر ناطق

قیمت:150 روپے

زندگی میرے پیروں سے لپٹ جائے گی

تنویر انجم

قیمت:350 روپے

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

آج
(پہلی جلد)

ترتیب: اجمل کمال

Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

ارشد محمود

R s.200

تیسری جنس

سندھ کے خواجہ سراؤں کی

معاشرت کا ایک مطالعہ

مؤلف: اختر حسین بلوچ

Rs.200

شہزادہ احتجاب
(ناول)

ہوشنگ گلشیری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.70

ریت پہ بہتا پانی
(شاعری)

قاسم یعقوب

Rs.160

اردو کا ابتدائی زمانہ
(تنقید و تحقیق)

(تیسرا ایڈیشن)

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.250

تبادلہ
(ناول)

وبھوتی نرائن رائے

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

Rs.200

اِنکی کے دیس میں
(ناول)

ولاس سارنگ

مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال

Rs.150

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 69 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، نرمل ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان میں: 700 روپے
بیرون ملک: 70 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ ''شب خون'' الٰہ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

۷۰

قیمت

۳۰۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،

صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner